

بہنوں کا اپنا نامہ

نومبر 2013

شعاع





نومبر کا شمار دے حاضر ہیں۔

نومبر میں نئے اسلامی سال کا آغاز بھی ہو رہا ہے۔

محرم الحرام - اسلامی سال کا پہلا مہینہ جو حق گوئی، بہادری، شجاعت، صبر و استقامت کے ایک عظیم واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ ایک ایسی جنگ جس کا مقصد حق و صداقت کا بول بالا کرنا تھا۔ جس کا واحد بیغا تھا، اللہ کی سر زمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام۔ اللہ کی سر زمین سے ظلم و جبر کا خاتمہ اور عدل و انصاف کا قیام۔ امام عالی مقام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جیسے فواید، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دستِ عظیم فاطمہ زہرا اور سیکر شجاعت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے تھے۔ ایک طرف امام عالی مقام اور آئینہ کے ہنر رفتار تھے۔ دوسری طرف لاکھوں کا لشکر۔ آئینہ جیسے تو باطل قوتوں سے مفاہمت کر کے اپنی زندگی بچا لیتے لیکن آئینہ نے بادشاہت اور آمریت کو تسلیم نہیں کیا۔ اعلا انسانی اقدار کی بقا کے لیے اپنی، اپنے اہل خاندان اور رفقاء کی قربانی دے کر وہ مثال قائم کی جس کی عظمت کو پوری دنیا نے تسلیم کیا ہے۔

امام عالی مقام کی شہادت نے وہ عظیم تاریخ رقم کی ہے جو تاقیامت راہِ حق پر چلنے والوں کے لیے رہنما اور شعل راہِ نبی رہے گی۔

سائرہ رضا کا مکمل ناول - جب ہم ملے،

فوال کا کردار آپ کو یاد ہو گا۔ تو ہیں - خود اعتماد، حساس - ایک مثالی بیٹی۔

پچھلے سال نومبر کے شمارے میں سائرہ رضا کا مکمل ناول "پہلی بار جب ہم ملے" شائع ہوا تھا، فوال اس ناول کا آخری کردار تھی۔ اس شمارے میں شائع ہونے والا سائرہ رضا کا ناول "جب ہم ملے" اسی کہانی کا تسلسل ہے۔ ناول کا اختتام ایک سوالیہ نشان پر ہوا تھا۔ سائرہ رضا نے اس میں اس محنت کو سلجھایا ہے۔

زندہ لوگوں کی جائز خواہشات، روایات سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ آگے بڑھنے والے، وقت کا ساتھ دینے والے ہی زندگی کو جیتے ہیں۔

فوال اس حقیقت کو مناسکی یا تاکام بھری۔ قلہ میں اس ناول کو پڑھ کر جان سکیں گی۔ بڑھ کر اپنی رائے ضرور کہیں گے۔ اس شمارے میں،

عفت سحر کا مکمل ناول - آئرن،

سیر احمد کا مکمل ناول - محبت میں مجرم،

قانونیہ، مصباح علی، مستقل عزیز شہزاد اور سیما بنت عالم کے افسانے،

رضانہ نگار عزان اور نیلہ عزیز کے ناول،

بندھن - فی وی فنکارہ صافیل اور فیصل سلیم، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک،

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں - امادیت کا سلسلہ،

خط آپ کے، شاعری راج لوہی ہے، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

اندھیرے چیر کر ان میں اُجالا تو ہی کرتا ہے

ہر ایسا کام اے اللہ تعالیٰ تو ہی کرتا ہے

شکستِ فاش دیتا ہے ہمیشہ تو ہی باطل کو

ہر اک موقعِ حق کا بول بالا تو ہی کرتا ہے

جہاں میں وقتِ پیدائش سے لے کر آخری دم تک

ہر انسان اور ہر حیوان کو پالا تو ہی کرتا ہے

بسا اوقات ہم مایوس ہو جاتے ہیں گھبر کر

ہر ایسے وقت میں مشکل کو ٹالا تو ہی کرتا ہے

زمیں پر نکل شگفتہ، آسمان پر نجمِ خوشنشد

ہے یہ کام تیرے کرنے والا تو ہی کرتا ہے

یہ بزمی اور اس جیسے کروڑوں ہی بشر ہوں گے

بچا کو بچنے کو کرنے سے سنبھالا تو ہی کرتا ہے

خالد بزنجی

دل میں اتمے حرف سے مجھ کو ملا پتا ترا

معجزہ حُسنِ صوت کا، زمزمہ صد ترا

ہے ہر اوجِ فن ترے حسنِ کلام کا غلام

بات تھی جاں فزا تیری، لہجہ تھا دلِ بارترا

جاں تری سر بہ سر جمالِ دل ترا آئینہ مثال

تجھ کو ترے وعدے بھی دیکھا تو ہو گیا ترا

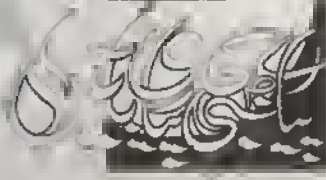
اے میرے شاہِ شرق و غرب، تانِ جویں غزل تری

اے میرے بولیا نشیں، سارا جہاں گدا ترا

میرا تو کائنات میں تیرے سوا کوئی نہیں

ارضِ تری سما ترا بندے تیرے خدا ترا

احمد ندیم قاسمی



## نکاح سے متعلق احکام و مسائل

### نکاح کی فضیلت

حضرت علقمہ بن قیس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے کہا۔ ”میں مثنیٰ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انہیں الگ لے گئے میں پاس بیٹھا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا۔

”کیا آپ پسند فرماتے ہیں کہ میں ایک کنواری لڑکی سے آپ کی شادی کروا دوں جس سے آپ کو گزرے وقت کی کچھ باتیں یاد آجائیں؟“

جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو محسوس ہوا کہ حضرت عثمان بن رضی اللہ عنہ کو اس کے سوا اور کوئی کام نہیں (بہنس کے لیے وہ انہیں الگ لے گئے تھے) تو مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں حاضر ہوا تو وہ فرما رہے تھے۔

”اگر آپ نے یہ بات کہی ہے تو اچھی بات ہی کی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اے جوانوں کی جماعت! تم میں سے جو شخص نکاح کی طاقت رکھتا ہے اسے چاہیے کہ شادی کر لے اس کی وجہ سے فطری حق رہتی ہے اور جسم (بدکاری سے) محفوظ رہتا ہے اور جسے (نکاح کی) طاقت نہ ہو تو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ خواہش کو کچل دیتا ہے۔“

فوائد و مسائل : 1- گزرے وقتوں کی یاد سے مراد یہ ہے کہ جس طرح آپ پہلے ازدواجی زندگی گزار رہے تھے اور اطمینان و مسرت کا وقت گزر رہا تھا اب پھر آپ کو شادی کی ضرورت ہے تاکہ آپ کو دوبارہ وہی خوشی اور وہی اطمینان و سکون حاصل ہو جس کا حصول شادی کے بغیر ممکن نہیں۔

2- شادی شدہ زندگی میں مایاں بیوی کی عمر میں نقاد کو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ اگر وہ بھی ہم آہنگی موجود ہو اور مرد اس قابل ہو کہ اپنی بیوی کی فطری ضروریات خوش اسلوبی سے پوری کر سکے تو ادھیر عمر مرد کم عمر عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔

3- تین افراد میں سے دو افراد کا تیسرے کو الگ کر کے بات چیت کرنا منع ہے لیکن اگر تیسرے آدمی کی دل شکنی کا اندیشہ نہ ہو تو بعض حالات میں اس کی گنجائش ہے ویسے بھی مذکورہ بالا واقعہ میں دونوں کے الگ ہو جانے کے باوجود حضرت علقمہ رحمۃ اللہ اتنے دور نہیں تھے کہ ان کی بات چیت نہ سن سکیں۔

4- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس وقت نکاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اس لیے انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ لڑکی والوں سے رابطہ قائم کیا جائے البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خیر خواہی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے فرمایا کہ نکاح واقعی ایک اہم اور مفید چیز ہے۔

5- نکاح کی طاقت رکھنے کا مطلب جسمانی طور پر نکاح کے قابل ہونا اور مالی طور پر بیوی کے لازمی

(ضرور) نکاح کرے اور جسے (رشتہ) نہ ملے وہ روزے رکھا کرے کیونکہ روزہ خواہش کو کچل دیتا ہے۔“

### فوائد و مسائل :

1- نکاح میرا طریقہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل و عیال والی زندگی گزارنا اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ یہ سوو نصاریٰ اور ہندوؤں وغیرہ کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے ہاں غیر شادی شدہ زندگی گزارنا اور بزرگم خلیش عبادت و ریاضت میں مشغول رہنا افضل اور قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔

2- نکاح کا ایک روحانی فائدہ یہ بھی ہے کہ اولاد کی صحیح تربیت کر کے انہیں اسلامی معاشرے کے مفید ارکان بنانا بھی ایک اہم نبی خدمت ہے اور دوسروں کو اچھے کاموں کی ترغیب دلانے سے خود سیدھی راہ پر گامزن رہنا آسان ہو جاتا ہے۔

3- مسلمانوں کے لیے اولاد کی کثرت شرعاً مطلوب ہے لہذا اس کے لیے کوشش کرنا یعنی نکاح کرنا اور ازدواجی تعلقات قائم رکھنا بھی شرعاً مسخ ہے۔

4- نکاح روحانی ترقی میں رکاوٹ نہیں۔

### محبت رکھنے والوں کے لیے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”انہیں میں محبت رکھنے والوں کے لیے نکاح جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی گئی۔“

### فوائد و مسائل :

1- دو خاندانوں میں دوستانہ تعلقات ہوں تو انہیں قائم رکھنے اور مضبوط کرنے کے لیے ایک دوسرے سے رشتہ لیانا چاہیے۔

2- کسی مرد اور عورت کا ایک دوسرے کی طرف میلان ہو جائے تو ناجائز تعلقات قائم کرنے کے بجائے نکاح کا جائز تعلق قائم کر لینا بہتر ہے تاہم اس میں نکاح کی دیگر شرائط یعنی عورت کے سرپرست کی اجازت، حق مهر، ایجاب و قبول اور گواہوں کی موجودگی

اخراجات پورے کرنے کے قابل ہونا ہے۔ موجودہ معاشرے میں رائج رسم و رواج پر کیے جانے والے بے جا اخراجات کی طاقت مراد نہیں۔ معاشرے سے ان فضول رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

6- نکاح کا سب سے بڑا فائدہ گناہ کی زندگی سے حفاظت اور جنسی خواہشات کی جائز ذریعے سے تسکین ہے۔ نکاح کرتے وقت یہ مقصد پیش نظر رکھنا چاہیے دوسرے فوائد خوبی حاصل ہو جائیں گے۔

7- فحاشی سے بچاؤ اسلامی معاشرے کی ایک اہم خوبی ہے اس کے حصول کے لیے ہر جائز ذریعہ اختیار کرنا چاہیے اور فحاشی کا ہر راستہ بند کرنا چاہیے۔

8- اسلامی شریعت کی یہ خوبی ہے کہ یہ انسان کی فطرت کے مطالبات کی فکری نہیں کرتی بلکہ ان کے حصول کے جائز ذرائع مہیا کرتی ہے۔

9- روزہ رکھ کر انسان نامناسب خیالات اور جذبات کو کنٹرول کر سکتا ہے اس وجہ سے فطری خواہش بھی بے لگام نہیں ہوتی اس لیے اگر کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کی شادی میں کسی وجہ سے تاخیر ہو جائے تو اسے چاہیے کہ نقلی روزے کثرت سے رکھے اور جذبات میں بیجاں پیدا کرنے والے ماحول اس قسم کے لڑچکر کے مطالعے جذبات انگیز نغمات سننے اور فلمیں وغیرہ دیکھنے سے پرہیز کرے تاکہ جوانی کا جوش گناہ میں ملوث نہ کر سکے۔

### نکاح سنت ہے

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”نکاح میرا طریقہ ہے اور جو شخص میرے طریقے پر عمل نہیں کرتا اس کا مجھ سے تعلق نہیں۔ شادیاں کیا کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی بنا پر دوسری امتوں پر فخر کروں گا جو (مالی طور پر) استطاعت رکھتا ہو وہ



وغیر وکلیا جانا ضروری ہے۔

## بے نکاح رہنا منع ہے

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو بے نکاح رہنے کی اجازت نہیں دی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اجازت دے دیتے تو ہم لوگ خسی ہو جاتے۔“ بخاری فوائد و مسائل :

1- حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ عبادت کا بہت شوق رکھتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ نکاح کر کے بیوی بچوں کے معاملات میں مشغول ہونے سے نفلی عبادات، یعنی نفلی نماز روزے کے مواقع کم ہو جاتے ہیں اس لیے بہتر ہے نکاح نہ کیا جائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بے نکاح رہنے کی اجازت نہ دی۔

2- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے کیونکہ ممکن ہے ایک کام بظاہر نیک ہی کا ہو اور بہت اچھا معلوم

ہو تاہو لیکن شریعت کی رو سے وہ صحیح نہ ہو۔

3- بدعت بھی بظاہر نیک ہی ہوتی ہے لیکن اس کے ظاہری نیک ہونے سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

خلاصہ سنت کام کتنا ہی اچھا معلوم ہو تاہو اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

4- اللہ کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ ہندو جیگوں یا عیسائی راہبوں کی طرح حلال چیزوں سے بھی پرہیز کیا جائے بلکہ کھانے پینے اور دیگر معاملات میں شرعی ہدایات پر عمل کرنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

حضرت سہرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے نکاح رہنے سے منع فرمایا۔

## فوائد و مسائل :

1- بے نکاح رہنے کو نیک سمجھنا غلط ہے خواہ یہ تصوف کے نام پر ہو یا قلندری کے نام پر یا کسی اور نام سے۔

2- نکاح تمام انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

3- انبیائے کرام نوری مخلوق نہیں بلکہ اشرف المخلوقات انسان ہیں اس لیے وہ نکاح بھی کرتے تھے اور ان کی اولاد بھی ہوتی تھی۔

## خاندن پر بیوی کے حقوق

حضرت حکیم بن معاویہ اپنے والد حضرت معاویہ (ابن حیدر رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔

”خاندن پر عورت کا کیا حق ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب کھانا کھائے تو اسے بھی کھائے جب کپڑا پہنے تو اسے بھی پہنائے چہرے پر نہ مارے اسے برا بھلا نہ کہے اور گھر بی بی میں (اس سے) علیحدگی اختیار کیے رکھے۔“

## فوائد و مسائل :

1- اسلام نے معاشرے کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے ہر فرد کے حقوق و فرائض کا تعین کر دیا ہے۔ ان کو پیش نظر رکھ کر معاشرے میں امن قائم کیا جاسکتا ہے۔

2- جس طرح مردوں کے حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ دلہن مثل الذی علیہن بالمرءوف (البقرة ۲۳۵) ترجمہ ”اور دستور کے مطابق عورتوں کے لیے مردوں پر دیے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے لیے عورتوں پر ہیں۔“

3- گھر میں امن و سکون قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال

رکھیں۔

عورت کی بنیادی ضروریات، یعنی خوراک، لباس اور رہائش وغیرہ مہیا کرنا مرد کا فرض ہے۔

4- مرد کو حق حاصل ہے کہ عورت کو غلطی پر مناسب تنبیہ کرے۔

5- اگر معمولی تنبیہ کا اثر نہ ہو تو معمولی سی جسمانی سزا بھی دی جاسکتی ہے لیکن چہرے پر مارنا منع ہے۔

لا یتطبیح کا ایک مفہوم یہ ہے کہ ڈانٹتے وقت نامناسب الفاظ استعمال نہ کرے جیسے عربوں میں رواج تھا کہ وہ کہتے تھے اللہ تو جھک ”اللہ تیرے چہرے کو فوج کر دے“ یا جھک ”اللہ“ ”اللہ تجھے بد صورت کر دے“ اس طرح کی گالی اور بد دعا سے اجتناب کرنا چاہیے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ چہرے پر نہ مارے زور سے مارنے سے چہرے پر نشان پڑ جائے گا اور چہرہ بد صورت ہو جائے گا اس لیے فرمایا کہ اسے بد صورت نہ بنادے۔

6- تنبیہ کے لیے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے وقتی طور پر بول چال بند کرنا جائز ہے لیکن بیوی کو گھر سے نکال نہ لایا خود گھر سے کئی دن کے لیے باہر چلے جانا مناسب نہیں۔ گھر میں دونوں کی موجودگی سے ناراضی جلد دور ہو جانے کی امید ہوتی ہے۔

## عورتوں کے حقوق

حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ جبۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے (اس دوران میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد و ثناء کی اور وعظ و نصیحت فرمائی (اس میں آپ نے کئی باتیں ارشاد فرمائیں) پھر فرمایا۔

”عورتوں کے بارے میں خیر کی وصیت قبول کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدی ہیں۔ تمہیں ان پر اس کے سوا کوئی اختیار نہیں۔“ لایہ کہ وہ واضح بے شرمی کا کوئی کام کریں۔ اگر وہ ایسی حرکت کریں تو ان سے بستر میں الگ ہو جاؤ اور انہیں مارو لیکن سخت پٹائی

نہ ہو۔ (اس تنبیہ کے نتیجے میں) اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگ جائیں تو ان پر (حق کرنے کی) راہ تلاش نہ کرو یقیناً تمہاری عورتوں پر تمہارا حق ہے اور تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔

تمہاری عورتوں پر تمہارا حق تو یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر اسے نہ بٹھائیں جس (کے گھر میں آنے) کو تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھر میں اس فرد کو آنے کی اجازت نہ دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ سنو! تم پر عورتوں کا یہ حق ہے کہ ان کے لباس اور خوراک کے بارے میں ان سے اچھا سلوک کرو۔“

## فوائد و مسائل :

1- وصیت نامہ کی نصیحت کو کہتے ہیں جس پر عمل کرنا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ”وصیت قبول کرو“ کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں۔ بہت سے صحابہ کرام جو جبۃ الوداع میں حاضر تھے ان کے لیے ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی وہ آخری ملاقات ہو کیونکہ اس سے تین ماہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ ان کے لیے یہ خطبہ واقعی آخری نصیحت (وصیت) بن گیا۔

2- خطاب اگرچہ جبۃ الوداع میں حاضر ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا گیا تھا تاہم یہ حکم قیامت تک آنے والے تمام مومنوں کے لیے ہے۔

3- مرد کو چاہیے کہ بیوی کے اخلاق و کردار کی نگرانی کرے تاہم بلا وجہ شکوک و شبہات میں مبتلا رہنا درست نہیں جب تک کوئی واضح مشکوک صورت سامنے نہ آئے۔

4- واضح بے حیائی سے مراد ایسی حرکت ہے جن پر روک ٹوک نہ کرنے سے بدکاری تک نفوت پہنچ سکتی ہے۔ زنا کا ارتکاب ہو جانے کی صورت میں دوسرے احکام ہیں جو قرآن و حدیث میں اپنے مقام پر مذکور ہیں۔

5- جب محسوس ہو کہ عورت اپنی غلطی پر پشیمان ہے اور اصلاح پر آمادہ ہے تو اس سے معمول کے

تعلقات قائم کر لینے چاہئیں اور بار بار گزشتہ غلطیوں کا طعنہ نہیں دینا چاہیے۔

6- بعض اوقات صورت حال اس قدر خراب ہو جاتی ہے کہ جسمانی سزا ناگزیر ہو جاتی ہے لیکن یہ اصلاح کی کوشش کا آخری درجہ ہے جہاں تک ممکن ہو معاملات کو اس مرحلے پر نہیں پہنچنے دینا چاہیے۔

7- اگر جسمانی سزا ضروری محسوس ہو تو اس میں بھی نرمی کا پہلو نظر ہونا چاہیے یعنی صرف اس حد تک سختی کی جائے یا سزا دی جائے جو تنبیہ کے لیے ضروری ہو اس سے زیادہ نہیں کیونکہ مقصد اصلاح ہے غصہ نکالنا یا بدلہ لینا نہیں۔

8- مہمانوں کی تکمیم ضروری ہے لیکن اگر کوئی ایسا شخص آتا ہے جسے خاوند اچھا نہیں سمجھتا تو عورت کو چاہیے کہ خاوند کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے اسے اجازت دینے سے معذرت کر لے یا کہہ دے کہ مرد گھر میں نہیں پھر آجائے گا۔

9- ناپسندیدہ شخص کو بستر نہ بٹھانے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غیر مردوں سے ناجائز تعلقات استوار کرنے کی راہ ہمارے ہاں نہ کی جائے۔ ان سے نرم لہجے میں ہنس ہنس کر بات کرنے کے بجائے سنجیدگی سے مختصر بات کر کے فائدہ کر دیا جائے۔ امام خطابی فرماتے ہیں۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اجنبی مردوں کو گپ شپ کے لیے اپنے پاس گھر میں آنے کی اجازت نہ دیں، جیسے عرب میں یہ رواج تھا اور اسے عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بروے کا حکم نازل ہونے کے بعد اس سے منع کر دیا گیا۔“ (حاشیہ سنن ابن ماجہ از محمد فواد عبدالباقی) ہمارے ہاں دیہات میں جہاں پروے کا اہتمام نہیں کیا جاتا اب بھی یہ صورت حال موجود ہے جو شرعی طور پر ممنوع ہے۔

10- بعض علماء نے فرمایا ہے کہ عورت اپنے محرم رشتہ داروں کو بھی خاوند کی اجازت کے بغیر گھر میں نہ آنے دے لیکن زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاوند کو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ عورت کے محرم مردوں پر

پابندی لگائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے رضاعی بچا کو گھر میں آنے کی اجازت نہیں دی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”وہ تمہارا چچا ہے اسے آنے کی اجازت دو۔“

لباس اور خوراک کے بارے میں اچھا سلوک یہ ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اچھا لباس اور مناسب خوراک مہیا کرے لیکن ایسے لباس سے منع کرنا چاہیے جو شریعت کی تعلیمات کے مطابق نہ ہو۔

### شوہر کی خوشنودی

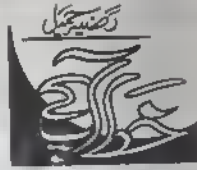
ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے۔ ”جو عورت اس حال میں فوت ہوئی کہ اس کا خاوند اس سے خوش تھا تو وہ جنت میں جائے گی۔“

### بہترین عورت

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”دنیا (عارضی) فائدے کی چیز ہے اور دنیا کے سازو بہاں میں نیک عورت سے بہتر کوئی چیز نہیں۔“

فوائد و مسائل :

- 1- دنیا کی چیزوں سے حلال طریقے سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے۔ ترک دنیا جائز نہیں۔
- 2- دنیا کی چیزیں اس انداز سے استعمال کرنی چاہئیں کہ آخرت میں فائدہ حاصل ہو۔
- 3- نیک عورت ایک بڑی نعمت ہے کیونکہ وہ دنیا کے معاملات میں بھی اچھی مشیر ثابت ہوتی ہے اچھی شریک حیات ہوتی ہے اور آخرت کے معاملات میں بھی خاوند سے تعاون کرتی ہے۔ اس طرح دونوں کو بلند درجات حاصل ہو جاتے ہیں۔
- 4- نیک مرد بھی عورت کے لیے ایک ایسی ہی نعمت ہے۔



خطا بھوانے کے لیے ہمارے  
ماہنامہ شعاع 37 - اردو بازار، کراچی۔  
Email: info@khawateendigest.com  
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔  
اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعا کریں۔  
اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سب کو ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔  
پہلا خط کوٹ مو من سے نیلم شراوی کا ہے۔ لکھتی ہیں۔

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں، بیشکی طرح بہت پیاری تھیں۔ ”ایک بھی مثال“ میں بشری کے ساتھ اچھا نہیں ہوا اگر اسی کا نام زندگی ہے۔ رخصانہ جی آپ کے ناول میں در بدر بھگتی وہ پیاری سی لڑکی ہی در حقیقت ”مثال“ ہوگی (آئیم ذاتی خیال ہے)۔ ”محبت جیت کی صورت“ پسند نہیں آئی (معدرت)۔ نیلم عزیز جی آپ کی سلسلہ وار آمد سے کس قدر خوشی ہوئی؟ لفظوں

میں اظہار ممکن نہیں ”دیکھ زہ محبت“ تو واقعی قلمی فانی سا ہے۔ محبت من محرم بہت اچھی اسٹوری ہے۔  
حاجا بخاری کا خط بڑھ کر ہمیں بھی حیرانی ہوئی، بھی شاہ غلطی کیوں نہیں کر سکتے؟ انسان تو ہے ہی خطا کا پتلا ہے۔ کینئر نبوی بی سے عشق پر رقم جذبول کو بھلا دیتے والی تحریر نکھوا میں (کزارش) نوال افضل کھن کے نام سے بہت مانوسیت ہو گئی ہے۔ ان کے انتخاب وغیرہ کو بار بار پڑھتی ہوں رابعہ بھری کا تعارف اچھا لگا خاص طور پر پسندیدہ کتابوں اور پسندیدہ مصنفین کا بڑھ کر خوشی ہوئی۔ ”کاسے کو بیانی بدلیں“ بہت شاندار تھی۔ کیا انیسہ سلیم کا ”ترک رسوم“ کتابی شکل میں ہے؟ انیسہ جی پلیز زیدو عطی، ہمارے ملاقات کروائیں۔

ج - پیاری نیلم اشعار سے آپ کی وابستگی کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی آپ اشعار اتنی توجہ سے دہنتی ہیں اور ناول افسانے ہی نہیں سلسلوں پر بھی آپ کی تھری نظر ہے۔ کینئر نبوی ناول لکھ رہی ہیں۔ جلد ہی آپ ان کی تحریر پڑھیں گی۔ انیسہ سلیم کا سلسلہ کتابی شکل میں نہیں آیا۔

کاسے کو بیانی بدلیں صوفیہ سرور کی اثر انگیز تحریر تھی۔ یہ نئی مصنفہ ہیں اور ہمیں ان سے بہت توقعات ہیں۔ اپنی فرخندہ آہنی کا ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیتے ہیں۔

سارہ مریم غولبی گرن اور اشعل نے سنجہ پور سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں۔

اپنا خط نہ پا کر اتنا غصہ آیا کہ جی چاہا سب کے خط بھاڑ ڈالوں۔ صائمہ جی بہت اچھے طریقے سے کہانی آگے بڑھا رہی ہیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق شاید کے کاموں کا بیٹا رامس ہے۔ ماہم اور شمن کا کردار ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ سارادان بنتی سنورتی رہتی ہیں۔ ہے ”رفض منک“ بہت اچھی جاری ہے۔ یہ تو پہلی قسط میں ہی پتا چل گیا تھا کہ ماورا کا ہیرو تیسور ہے۔ ویسے نیلم آپ کی ہر کہانی کا ہیرو ایک جیسا ہی کیوں ہوتا ہے؟ ”ایک بھی مثال“ میں بشری کو طلاق نہیں ہونی چاہیے تھا۔ اتنا بڑا جھگڑا تو نہیں تھا کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ دو بے نام کردار ان میں ایک تو مثال ہے دوسرا واقع ہوگا۔ عاصمہ کا اس بار ذکر ہی نہیں

تھا۔ پلیز کمپنی کو تیزی سے آگے بڑھائیں۔ حمیرا حمید کی کمپنی بہت اچھی جا رہی ہے۔ ٹالٹ اچھا تھا ایک جگہ رائٹر کا نام رخسانہ لکھا ہوا تھا تو ایک جگہ موش افخار۔ انہوں میں ”کاپے کو بیانی بدلیس“ اچھا لگا۔ بانی رائٹر دو اور مستقل سلسلے ابھرتے تھے۔

ج۔ سارہ ”مریم طوبی“ نکلن اور اشاعت خط شائع نہیں ہوا تو اتنا غصہ؟ غصہ سلطان سے ہے اچھی بات نہیں۔ بشری کو طلاق اسی غصہ کی وجہ سے ہوئی۔ اور دونوں کا گھر بزرگیا ٹالٹ موش افخار کا تھا۔ سوا ”رخسانہ نگار کا نام لگ گیا۔

فوزیہ ثمرت اور طیبہ عمران نے ہجرت سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں۔

اجی ابھی مجھے میری جانی بیچی بانی عمران کا مہیج اس کی ماں کی طرف سے ملا ”پیاری“ پیچھو جانو کیا کر رہی ہو؟“ اس غلام نے میری بانیہ کو یہ نہیں بتایا کہ آج اس کی پیچھو کی سالگرہ ہے بندہ موش ہی کر رہا ہے پر بانی سب سے پہلے سارہ اکرم کا ”دیمک زدہ جیت“ پڑھا۔ وہ صاحبہ جی کیا جوڑیاں سیٹ کی ہیں آپ نے اور کمپنی کے ایک پر صورت کردار نام کو جب یہ سب پتا چلے گا تو کیا حالت ہوگی اس کی۔ سیکرٹہ قہرستان کا ذکر آپریشن کے بعد سیکرٹہ کے ساتھ کیا ہوئے والا ہے۔ پلیز اس کردار کو زندہ رہنا چاہیے۔

حمیرا حمید ”محبت من محرم زبردست تحریر تھی۔ مجھے لگتا ہے افق کی ماں کا تعلق دو گاندھن کے باپ کے ساتھ۔ یہ تو اب آگے جا کر ہی کھلے گا کہ غلام علی غلام افق کا تیا، چچا ہے۔

ج۔ پیاری فوزیہ! آپ اس دن ہوں ہم آپ کو سالگرہ پر دوش کر رہے ہیں۔ آئندہ آنے والا ہر دن آپ کے لیے خوشی لے کر آئے،

حمیرا حمید کے ناول میں تو آپ کے اندازے بالکل غلط ہیں۔ رخسانہ نگار کے ناول میں دیکھتے ہیں ”آگے کیا ہوتا ہے۔ سیکرٹہ میں: ایک خالی ہے وہ محبت کہنا تو جانتی ہے“ مگر محبت کی قدر کرنا نہیں جانتی۔ ڈاکٹر غار جیسے مکمل لوگ اس سے ہمدردی تو کر سکتے ہیں مگر محبت نہیں اور جو اس

سے محبت کرتا ہے وہ اس کو دھکار رہی ہے تو آپ خود سوچیں اس کا انجام اچھا کیسے ہو سکتا ہے۔ زندگی کے خواب اپنی جگہ لیکن حقیقتوں کا سامنا بھی کرنا چاہیے اور انہیں تسلیم بھی کرنا چاہیے سرباب کے پیچھے دوڑنے والے بالا خراک دن تھک کر گر جاتے ہیں۔

ثمینہ اکرم نے لیاری کی کراچی سے لکھا ہے۔

”پیارے نبی کی پیاری باتیں“ کو اس مرتبہ میں نے کئی بار پڑھا۔ بندہ میں میں ایذا احمد کنول ایاز سے ملاقات اپنی رہی۔ اس کے بعد ”آپ کے خط“ کی طرف پیش قدمی کی سب سے پہلا خط ہماری پیاری رائٹر خانی کا تھا۔ ایک بار نہیں بار بار پڑھا۔ ایک قلم کار نے ایک قاری کی کئی کئی محسوس کیا۔ ”یونڈ بوند تماشا“ پر تبصرہ پڑھا کہ ہر باندن قاری کی طرح مجھے بھی بے حد دکھ ہوا۔ کمپنیوں میں سب سے پہلے ”محبت من محرم“ پڑھا۔

افق کا کردار پڑھ کر مجھے آئینہ رزائی کے ناؤ کی ہیروئن یاد آگئیں۔ ایسی باہمت، حوصلہ مند اور مخفی لڑکی جو ہر طرح کے مصائب و مشکلات سے عبور آتا ہو کر اپنی زندگی کی جنگ لڑتی ہے۔ خالدہ ثار کا ”محبت جیت کی صورت“ ناول پڑھا۔ ”انا اور خد ساتھ لے کر جینے والے ہمیشہ تیارہ جاتے ہیں۔“ افسانہ ”بارہ رنگوں کا سوٹ“ بہت اچھا لگا۔ موش افخار کا ناول ”میرے ہم سفر“ کچھ نیا نہیں لگا۔ وہی بدگمانی، شکوک و شبہات اور آخر میں سب کچھ کلیئر۔

ثریا انجم کی تحریر ”دور اور دیوار“ سے ایک اچھا مہیج ملا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے محرم اور ناخرم کا فرق رکھا ہے۔ ”ایک جی مشل“ اس بار کمپنی دل کو دکھی کر گئی۔

11 نومبر 2012ء کی رات میرے شہزادے بیٹے کا جان لیوا ایکسیڈنٹ ہوا۔ جس کی یاد سے میرے دل کا ہر کونا مہلکا ہے۔

ج۔ پیاری ثمینہ! یہ حقیقت ہے کہ شعاع کی قارئین اور مصنفین کے درمیان ایک ان دیکھا رشتہ ہے اور وہ ایک دوسرے کی تکلیف کو اسی طرح محسوس کرتی ہیں جیسے کسی اپنے کی تکلیف کو محسوس کیا جاتا ہے۔ عدیل کا کردار اچھا ہوا نہیں ہے۔ جب دو عزیز ترین رشتوں کے درمیان کشمکش ہو تو انسان اسی طرح بے بس

ہوتا ہے۔ کبھی ماں کی طرف اور کبھی بیوی کی طرف۔ من و کھی تھی۔ ماں کے آنسو دل پر اثر کر رہے تھے۔ اپنی بات کے جواب میں ایسے میں بشری کا سٹھائی لے کر آتا ہے اشتعال ولا کیا اور وہ ایسا فیصلہ کر بیٹھا جس سے عرش کے کنکرے مل جاتے ہیں۔ اگر بشری تھوڑا سمجھ داری سے کام لیتی اور محض دل سے اسے سمجھا دیتی تو شاید حالات اس بچ پر نہ آتے۔

راولپنڈی سے مسرت ناز نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

اکتوبر کے اس شمارے میں مکمل ناول ”محبت جیت کی صورت“ بہت بہتر ناول تھا۔ بعض اوقات ماں باپ اولاد کے معاملے میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ اولاد کا مستقبل کیا ہوگا۔ روحینہ کا فیصلہ اس کمپنی میں ایسا لگا جیسے ”میری آواز تھی۔“ محبت کی بدعا سے زر لگتا ہے۔ ”یہ الفاظ پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اس سال فروری میں ایک تحریر بھی لکھی۔ اس کا نام ”اونٹن والے“ تھا۔ میں جانتا چاہتی ہوں کہ کیا ”اونٹن والے“ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔

ج۔ پیاری مسرت! شعاع میں کوئی تحریر ٹالٹ افسانہ، ناول یا کتنی سلسلے کے لیے انتخاب بھجوانے کے لیے پوچھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ شعاع آپ کا چاہا ہے۔ آپ کی کمپنی ”اونٹن والے“ اچھی ہے۔ ان شاء اللہ جلد شائع ہو جائے گی آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ آپ کچھ اور بھی لکھیں۔

کوثر خالد بڑا نوالہ سے شریک محفل ہیں۔

”ایک تھی مثال“ دکھ دے گئی۔ پہلے سے یہ بات معلوم تھی۔ محبت من محرم اس بار بڑا دل چاہنے والے کے ہر اک پہ جاں نکلے۔ ان شاء اللہ افق کا اینڈ بھیجی ہی ہوگا۔

”محبت جیت کی صورت“ نہایت سبق آموز خد اکرمے تاثر لائے۔ ”دیمک زدہ محبت“ اچھا موڈ آ گیا ہے۔ ہم جیلہ ماں کی باتیں ہر مل سننے کے لیے پیٹاب ملیں گے۔ ”میرے ہم سفر“ عبرت انگیز۔ ”بارہ رنگوں کا سوٹ“ الحمد للہ ”اللہ“ نے ہمیں جوانی میں ایسی خواہشوں سے دور رکھا۔ ہمیں صرف پیار کی تلاش رہی۔ ”رات کا رنگ“ اگر ہم رات کے رنگوں کے لیے ہر مل تیار رہیں تو روشنی ہی مقدور بنتی ہے۔ ”کاپے کو بیانی بدلیس“ صوفیہ تم نے رلا دیا۔ ”اک لمحہ“ ”پلیز پڑھا اور یہ لمحہ تمام رسالے پر بھاری رہا۔“ ”تاریخ کے جھوٹے“ ”ماں کی فوری موت بہت مزا آتا ہے۔“ اس بار ڈاکٹر عبدالقدیر کا پڑھ کر خاص مزہ آیا وہ پہلے ہی میرے موش ٹیوٹ ہیں۔ اب تو شعاع میں ان کا تازہ انٹرویو ہماری خواہش ہے۔

ج۔ پیاری کوثر! تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ نے ہر سلسلے پر بڑی باریک بینی سے تبصرہ کیا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے۔ دل سے شکریہ۔ ڈاکٹر قدیر خان کا انٹرویو ہماری بھی دلی خواہش ہے۔ کبھی موقع ملا تو ضرور کریں گے۔

آئینہ بچہ اور مشعل بچہ لکھتی ہیں۔

جون ’جولائی‘ اگست کے شماروں پر تبصرہ کر ہم بڑی مشکل سے آپ کی محفل میں تشریف لائے ہیں۔ جون کے اجالوں کے سفر نے جو کچھ دل میں پیدا کی ’جولائی کی برف کی کتلیوں‘ نے ختم کر دی۔ یعنی حق دار (پچا زاد) کو اس کا حق دے دیا۔ ”یونڈ بوند تماشا اور امتحان شیشہ کا“ بنت حوا کی بے بسی ظاہر کرتے غصہ دلا گئے۔ حیرت مجھے سعدیہ ملک پر ہے، مزے سے راحت جیں کی تحریر میں کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرت سارہ ’مریم‘ جو سفر پر سے بولیں ان پر ظاہر ہوتا ہے آپ کے دکھ میں برابر کی شریک ہوں اگر ایک ہفتہ کچھ پڑھنے کو نہ ملے تو میرا دم کھٹنے لگتا ہے کاپور راہ۔ میری

### اعتذار

پچھلے ماہ اکتوبر کے شمارے میں موش افخار کا ناول ”میرے ہم سفر“ شائع ہوا تھا۔ کمپنی پر موش افخار کا نام تھا لیکن فرست میں رخسانہ نگار عدنان کا نام لگ گیا۔ اس سہو کے لیے ہم دونوں مصنفین اور قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔



نافع رائے کے مطابق آپ کو ہر حال میں ڈائجسٹ پڑھنا چاہئیں۔ یہ آپ کا حق بھی ہے اور خوشی بھی۔

اقتضیٰ بولنے بالکل غلط لکھا محبت تو اب دنیا کے ساتھ ساتھ شعاع میں بھی خال خالی ہی ملتی ہے۔ وہ بھی سچائی، حقائق، روایات کے ترنگوں کے ساتھ، دہرا معیار، عید اور عیدیاں، ایک ہی تصور کے دو رخ۔ ویسے یہ ساس "ندوں والی باتیں مجھے نہیں بھائیں۔ عید کے شمارے میں ان کے بجائے کچھ چھپنا ہونا چاہیے تھا۔

ج۔ آئندہ آپ نے بہت تفصیلی اور دلچسپ تبصرہ کیا اور یقین کیجئے کہ ہمیں بہت پسند بھی آیا ہے۔ ہم بار بار اعتراف کریں گے کہ شعاع کی قارئین بہت ذہین ہیں۔ کماؤں کے بارے میں اتنے درست اندازے لگاتا اور ان کی اصل روح کو سمجھتا ان کی ذہانت کو ظاہر کرتا ہے۔ صفحات کی بجزوری نہ ہوتی تو ہم آپ کے خط کا ایک لفظ بھی نہ کاتے، شعاع کی پسندیدگی کے لیے دل سے شکریہ۔

افشال حاجی جعفر کراچی لیاری دریا آباد سے شریک محفل ہیں لکھا ہے۔

اکتوبر کا ناسل بہت اچھا تھا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں بھی بہت اچھی تھیں۔ اس بار صائمہ اکرم کا "دیکھ فوہ محبت" تو بہت بہت اچھا تھا۔ مکمل ٹائل میں خالدہ ثار کا "محبت جیت کی صورت میں" اچھا تھا۔ پورا شعاع قابل تعریف تھا۔

ج۔ افشال! اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کی مغفرت کرے۔ (آمین)

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ آپ کے بھائی لکھنے پڑھنے کے شوق میں تعاون کرتے ہیں۔ یہ جان کر بہت خوش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سب کے بھائیوں کو یہ توفیق دے امید ہے کہ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

رابعہ تحسین نے ممتاز آباد ملکان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

میں نے آپ کے رسالے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جو قدم قدم پر میرے کام آیا۔ یقین کیجئے اگر آپ میرے سامنے ہوں تو میں آپ کو سیلوٹ ضرور کروں گی۔

"محبت جیت کی صورت" عجیب لگا۔ سب کچھ تھا۔ لیکن بے ساختگی نہیں تھی۔ خاص کر روحینہ کے کردار میں۔ "اک لمحہ" صبیحہ اقبال، شہناش "ایک تھی مثال" اچھا جا رہا ہے۔ پلیز لہنا نہ کرنا۔ "محبت یمن" محرم "اچھا ہے۔ زبردست ہے۔ مجھے یہ ٹائل ڈیڈی نذیر احمد کے ناولوں کی طرح پھسپھسا سا لگا۔ کیونکہ پلاٹ طے شدہ لگ رہا ہے۔ لیکن ایک چیز کی خوشی ہے کہ گوہر خانوں کو محنت کا صلہ مل رہا ہے۔ کیونکہ میں خود گھر میں اجرت پر سلائی کرتی ہوں۔ لیکن بچوں کے جوڑے کے کوئی بھی بچاس یا ساٹھ روپے سے زیادہ نہیں معاوضہ دیتا۔ بلکہ لوگ اسے بھی زیادہ سمجھتے ہیں۔ مجبوری سے یہ چلاواتے بیروں میں سڑی تو آئی ہے۔ مجھے سب سے اچھی کمانی میرے ہم سفر لگی۔ کتنے اچھے پیارے ہیرو ہیروئن تھے۔ "در اور دیوار" کے بارے میں میرا کہنا ہے کہ اس کمانی کو ضرور پڑھیں، بلکہ بار بار پڑھیں۔

ج۔ پیاری رابعہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی فرمائش پوری نہیں کی جاسکتی۔ میڈم نور جہاں اور خالدہ ریاست کا کوئی انٹرویو ہمارے ہاں شائع نہیں ہوا۔ البتہ خالدہ ریاست پر ایک مضمون ضرور شائع ہوا تھا۔

بہت اچھی بات ہے کہ آپ کام کرتی ہیں۔ معاوضہ کم ضرور ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں کرتا۔ ان شاء اللہ کبھی نہ بھی آپ کو اپنی محنت کا پورا اجر ضرور ملے گا۔ آئندہ خط لکھ کر نہ پھانسیے گا۔ فوراً پوسٹ کر دیجئے گا۔

سانہ ارم لکھتی ہیں۔

غجاب کے ایک چھوٹے سے گھوٹ میں رہتی ہوں اور فی اے کر رہی ہوں۔ شعاع اور خوانین کو کب پڑھنا شروع کیا، کچھ یاد نہیں۔ حمد و نعت کے بعد سب سے پہلے سمیرا حمید کو پڑھا۔ سمیرا جی ویری گڈ مگر پلیز بھی لکھا، کچھ بالکا پھلکا بھی، کیونکہ آپ کی تحریریں پڑھ کے میں سب سے پہلے یہ سوچتی ہوں کہ سمیرا جی کے ارد گرد کیا سب اتنے شہیدہ لوگ بستے ہیں کہ یہ لڑکی بھی دل کھول کے نہ ہنسی۔ نبیلہ عزیز کی تو بات ہی نہ کریں۔ ہمارا نبیلہ جی کی وجہ سے جھکڑا ہو جاتا ہے کہ اب ڈائجسٹ پہلے کون پڑھے۔ افسانے ابھی سارے پڑھے نہیں۔



ج۔ سارے! آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی اور اس سے زیادہ خوشی یہ جان کر ہوئی کہ آپ گاؤں میں رہ کر ہی اے کر رہی ہیں اگر کسی وجہ سے خط یا دوسری کوئی تحریر شائع نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مایوس ہو جائیں۔ خط شائع نہ ہونے کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ شعلہ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نوشابہ اکبر نے مٹھیل انگ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

ہمارے گاؤں میں ایک ہی دکان ہے جہاں سے شعلہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ خالدہ ثار کا ناول ”محبت جیت کی صورت“ بہت بہت اچھا تھا۔ سروق پر پاؤں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھنے سے ایمان تازہ ہو گیا۔ میری ایک چھوٹی سی ریکویسٹ بھی ہے ایف ایم 101 کے آریجے حسین رضا کا انٹرویو بھی شامل کریں۔ موش افکار کا ”میرے ہم سفر“ دل کو بھانپ گیا۔ افسانے تو سب اچھے تھے لیکن ”مصابیح علی“ کا افسانہ ”رات کا رنگ“ اور ”صوفیہ سرور“ کے افسانے بہت اچھے لگے۔ راہبہ بھری! آپ نے تو میری ہی اسٹوری لکھ دی۔ آپ کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔

ج۔ نوشابہ! شعلہ کی ہیزم میں خوش آمدید۔ ہمیں اندازہ ہے۔ شعلہ حاصل کرنے کے لیے آپ کو کس دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ شعلہ کی کامیابی کا راز آپ لوگوں کی یہ محبتیں ہی تو ہیں۔ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کرنی ہے گا۔

اقراء نے لید سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

رقص بسل بہت اچھا ناول ہے محبت من محرم کچھ خاص نہیں لگا اور میرا پسندیدہ ناول ”دیمک زہ محبت ہے“ انسانوں میں کاہے کو بیانی صوفیہ سرور نے تو مجھے رلا ہی ڈالا۔ ایک اور سلسلہ شروع کر دیں ستاروں سے قیمت کا حال جس میں ہم سوالات بھیج کر اپنے مستقبل کے بارے میں جان سکیں۔

ج۔ پیاری اقراء شعلہ کی محفل میں خوش آمدید جو لوگ کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں کامیاب دیتا ہے۔ آپ زہمت کی ”آپ کا خط شامل ہے۔“

شعلہ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ستاروں کے ذریعے

قسمت کا احوال بتانے کا کوئی بھی سلسلہ ہم شروع نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس پر یقین نہیں ہے۔ قسمت کا حال نہ کوئی جان سکتا ہے نہ بتا سکتا ہے۔ اور نہ کوئی ہوئی کو نال سکتا ہے یہ صرف اللہ کو معلوم ہے۔ اندرا گاندھی نے سولہ بجوئی ملازم رکھے ہوئے تھے جو روزانہ اسے ستاروں کی چال بتاتے تھے لیکن ان سولہ بچوں میں سے ایک بھی یہ نہ بتا سکا کہ اس کے پاؤں گاڑنے کے دستہ میں ایک آدمی اس کے لیے غلط ارادے رکھتا ہے اور ایک دن وہ اس کے ہاتھوں قتل ہوگی۔ اس کا بیٹا بچے گاندھی ایک تقریب میں ہم ملاست ہونے سے مارا گیا۔ تو آپ خود سوچیں اس علم کی کیا حقیقت ہے۔

سدرہ متول ملک سے شریک محفل ہیں لکھا ہے۔

سب سے پہلے ”ایک تھی مثال“ پر تبصرہ کر دیں گی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا عدیل نے ج میں بہت دکھ ہوا۔ کیا عدیل کو اپنی ماں اور سہیلی کا فکریا نہیں تھا کہ ”جذباتی ہو گیا۔“ نبیلہ عزیز کا رقص مکمل بھی ٹھک جا رہا ہے اور محبت من محرم میں تو ہمیں یوں لگ جیسے کسی غار میں قیامی میں آگئے اور پھر فرازم کی شادی ”ج“ میں اچھی قطع بھی اس دفعہ۔ محبت جیت کی صورت ایک۔ ٹھیک سی اسٹوری بھی جہاں بہرہ ویروں شروع میں ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے اور بعد میں ایک دوسرے کے علاوہ کوئی نظریہ نہیں آتا لیکن چلیں کوئی نہیں۔ ٹاٹ بیٹس۔

”دیمک زہ محبت“ بھی اچھی جارہی ہے، لیکن بہت سلو بھی۔ کیونکہ اور ڈاکٹر خاور کے درمیان آنکھ پھولی کپ تک چلے گی۔ افسانہ تو ہر دفعہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے بارہ رنگوں کا سوٹ بہت اچھا تھا۔ اس کے علاوہ مصباح علی کا افسانہ بھی بہت مزے کا تھا۔ ”کھابے کو بیانی“ آپ کو ایک بات بتانی ہوں میری ایک فرینڈ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جزی ایک اعنت ہے اس لیے آپ کو مجھے جزیز نہیں دینا چاہیے اور نہ یہ اعنت میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی تو اس کے والدین نے کہا اگر یہ اعنت نہیں لے کر جاؤں گی تو سسرال میں زیادہ اعنت ملامت ملے گی۔ ”دور اور دوبار“ ایک لمحہ ”میری بہت اچھے تھے۔ اس دفعہ انٹرویو کسی کا بھی اچھا نہیں تھا۔ (بہت معذرت کے ساتھ)۔“

ج۔ سدرہ ہر سلسلے کے لیے بھجوانے کے لیے صفحہ پر سلسلے کا نام لکھ دیں تو اچھا ہے ورنہ ضروری نہیں ہے

کیونکہ ہم انتخاب خود ہی کرتے ہیں۔ تمام سلسلوں کے لیے انتخاب ایک ہی لفافے میں بھجوا سکتی ہیں ”شعلہ“ کے ساتھ ساتھ ”میں آپ کے جوابات باری آتے پر ضرور شائع ہوں گے۔“

اقصیٰ متول نے نیالا ہور سے لکھا ہے

واہ بھی اس بار تو ناسٹل بے حد خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے مثال صاحبہ کی طرف بچے۔ انرف رشتہ جی۔ کیا غضب کر دیا آپ نے۔ مائیں ایسا کیوں کرتی ہیں۔ پہلے تو خود بپا کر لائی ہیں، پھر خود ہی بپا کر دیتی ہیں۔ دوسرا پر اسرار کرکٹر صوفیہ مثال کا ہے۔ رقص مکمل ناول جا رہا ہے۔ ”شکر ہے“ ”دیمک زہ محبت“ میں بھی کوئی مل جل ہوئی۔ بارہ رنگوں کا سوٹ بہت بہت آواز لگا۔ اک رات کا رنگ ”مصباح علی“ نے خوب لکھا ناظمہ عتدرا کی نوک جھونک نے مزہ دیا۔ محبت جیت کی صورت کچھ خاص نہیں لگا۔ برانامہ موضوع تھا۔ ایسی کامیابیوں میں کسی بھی ٹینشن زہ شخص کو شراب نوشی یا کچھ اور غلط کام پر بہت تارمل انداز میں دکھایا جاتا ہے۔ جبکہ لفظ کچھ ایسے ہوتے چاہئیں کہ سننے والے ٹوڑنے والے کو اس کام سے نفرت محسوس ہو۔ صبحہ اقبال نے اچھا لکھا۔ سادہ لفظوں میں گہری گھیت کر گئیں۔ موش افکار آپ نے بھی بہت پیارا لکھا۔ صوفیہ سرور آپ نے تو رلا دیا۔

میرے پاس شاید لفظ نہیں کہ اس درد کو بیان

کروں جو میں نے دل وروح کی گہرائی سے محسوس کیا۔ در اور دوبار شریا انجمن نے بھی بہت اچھا لکھا بلاشبہ جو حدود اللہ نے مقرر کی ہیں۔ ان سے تجاوز کا نتیجہ غلط ہی نکلتا ہے اور اب باری ہے۔ میرا حمید کی۔ میرا جی بے حد ہے حد خوب صورت لکھ رہی ہیں آپ۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ اور ساتھ رضا آپ کو مدد دیں؟

ج۔ پیاری اقصیٰ! ہمیں انوس ہے کہ بچھلی بار صفحات کی بھجوری کی وجہ سے آپ کا خط شامل نہ کر سکے۔ شراب نوشی حرام ہے اور اسلام میں کسی بھی نشہ کی کوئی گنجائش

نہیں ہے۔ یہ بات بار بار لکھی جا چکی ہے۔ آئندہ مزید خیال رکھیں گے۔ اس کا ذکر قابلِ نفرت الفاظ میں کیا جائے۔ ساتھ رضا کا ناول اس ماہ شامل اشاعت ہے۔

چک 108 شمالی سرگودھا سے ہاشمہ از تقریف لائی ہیں لکھا ہے۔

”محبت من محرم“ آنکھوں سے آنسو نکلنے کی کسریا قیہ ہوئی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان عرف عدل کو شوٹ کر دوں۔ ساریہ نے عدل کے منہ پر جوتے مارے بہت خوشی ہوئی ”دیمک زہ محبت“ ”صائمہ اکرم“ یہ نہیں اتنا اچھا کیسے لکھ لکھتی ہیں۔ میں نے تو آج تک گاؤں میں کسی بڑے بوڑھے کے منہ سے ایسی باتیں نہیں سیں جیسی سکینہ کے امں ابا کرتے ہیں۔ ”دیری اسٹریٹ“ ”نبیلہ عزیز“ آپ نے تو اس دفعہ خوش گردیا۔ یور حیدر کے ساتھ تو بہت ہی اچھا ہوا ہے۔ لیکن بلیر نبیلہ جی اتفاق کا بھی تھوڑا سا پتا میں کیا وہ کھٹکا ہوا ہے! ”ایک تھی مثال“ عدیل نے واقعی اپنے بیوقوف ہونے کا ثبوت دے دیا۔ ”محبت جیت کی صورت“ خالدہ ثار کی اسٹوری مجھے بہت اچھی لگی۔ یہ اسٹوری میں پہلے بھی پڑھ چکی ہوں۔

”اک لمحہ“ میرے خیال سے حراجیسے لوگوں کو یہ پڑھ کے عقل آجانی چاہیے۔

ج۔ پیاری ہا! انہیں بے حد انوس ہے کہ آپ کے خط تاخیر سے ملنے کے باعث شامل نہ ہو سکے اور آپ کو مایوسی ہوئی۔ آپ کی کامیابی بھی پڑھی نہیں گئی۔

سرور کی شخصیت	
ماؤل	عائشہ
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موبی رضا

مذمتامہ خواتین و انجمن اور ادارہ خواتین و انجمن کے تحت شائع ہونے والے مہر جوں ایات شعلہ اور ایاتہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقی محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت میں کاپی یا ڈیجیٹل یا کسی اور سلسلہ وار قطعہ کے کسی بھی حصے کے استعمال سے پہلے ہاشمہ از تقریف سے تحریر اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ان کا قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



حصار میں ہیں؟“  
”ارے نہیں! لیکن وہ میری زندگی کا ایک بہترین رول تھا۔ یہ وہ خواتین کے مسائل اور ان کی خواہشات پر مبنی کھیل تھا۔ جب میں نے یہ ڈراما کیا تو میری شادی گودوی سال ہوئے تھے تو گھروالوں نے اور خاص طور پر میرے شوہر اور میری ساس نے بہت مائنڈ کیا تھا کہ میں نے اس قسم کا رول کیوں کیا اور جب یہ سیریل آن ایر آتا تھا تو نہ گھروالے دیکھتے تھے اور نہ ہی سسرال والے خیر۔“

”آپ کو احساس ہوا کہ آپ نے ایک غلط وقت میں اس رول کا انتخاب کیا؟“  
”اللہ تعالیٰ میرے شوہر کی لمبی عمر کرے۔ میں جب بھی یہ رول کرتی۔ گھروالوں کا رویہ ایکشن بھی ہوتا کہ

## دستک دستک

شہابین رشید

کیوں کیا۔۔۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ آرٹسٹ کو ہر طرح کے رول کرنے چاہئیں۔ آرٹسٹ خود تو ویسا نہیں ہوتا۔ وہ تو رول کے اندر ہوتا ہے۔“  
”پہلے اور کن کرداروں کو یادگار کہیں گی؟“  
”میں سمجھتی ہوں کہ میں نے اب تک جتنا بھی کام کیا ہے۔ وہ سب یادگار ہی ہے۔ کیونکہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے تمام سیریلز ہٹ گئے ہیں۔ خواہ وہ ”اک نظر میری طرف“ ہو۔ ”میں عبدالقادر ہوں چاند پر دستک“ آذر کی آئے گی بارات“ ہو یا ”میرے چارہ گر“۔ ”یعنی کی آئے گی بارات“ ہو ”تہائیاں“ ”کسی کزیاں“ اور ”میرے ورد کو جو زباں ملے۔“ سب ہی بہت ہٹ گئے اور سب میں ہی میرے کردار کو پسند کیا گیا۔“

علیشہ

”کیا حال ہیں جی۔۔۔ اور کہاں غائب ہیں؟“

”بالکل ٹھیک۔۔۔ اور کچھ گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے غائب ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں نے فیلڈ سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ بلکہ بہت جلد آپ کو اسکرین پر نظر آؤں گی۔“  
”سنائیچ تھا کہ آپ نے فیلڈ چھوڑ دی ہے؟“  
”نہیں! نہیں۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں نے بتایا نا کہ کچھ گھریلو ذمہ داریاں تھیں اور پھر ایسا کوئی رول ملا بھی نہیں کہ فوراً قبول کر لیتی۔“  
”اک نظر میری طرف“ کے بعد آپ کا کوئی قابل ذکر سیریل نظر نہیں آیا۔ کیا ابھی تک اسی رول کے

”علیشہ! آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ کم عمری میں ہی اس فیلڈ میں آگئی تھیں؟“  
”جی بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ میں تقریباً دس یا گیارہ سال کی تھی تو مجھے ایک کمرشل کی آفر آئی تھی۔ گھروالوں نے بڑی مشکل سے اجازت دی کیونکہ ہمارا تعلق چٹھان گھرانے سے ہے اور ابھی کام کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ پشاور میں مل ہونا پڑا۔ ہم تقریباً چار سال پشاور رہے۔“  
”شوہر کی دنیا سے تو کٹ آف ہو گئی ہوں گی آپ؟“

”جی بالکل۔۔۔ سمجھئے کہ چار سال کا گپ آیا۔ پھر جب چار سال کے بعد واپس آئی تو ”گگ“ ٹی وی پر اپلائی کیا۔ مجھے ”ڈی جے“ کے لیے منتخب کر لیا گیا اور میں نے ”فائٹور کس“ کے نام سے میوزک کا پروگرام کیا۔ اس پروگرام نے بھی مجھے بہت پہچان دی۔ بس تو پھر جب ”ڈی جے“ سے دل بھر گیا تو اداکاری کی طرف آگئی۔“

”اور جب اداکاری سے دل بھر گیا تو؟“  
”تو کچھ بھی نہیں۔ گھر بیٹھ جاؤں گی۔ ویسے اداکاری سے دل نہیں بھرے گا۔ کیونکہ اداکاری میں دراصل بہت ہے۔ جس کام میں یکسانیت ہو۔ دل اسی سے بھرتا ہے۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟“  
”سب کو سب کچھ پتا ہے میرے بارے میں اور میری بہنوں کے بارے میں۔ چلیں ابچر بھی بتا دیتی ہوں کہ 16 ستمبر 1985ء کو پید ہوئی۔ اصل نام صائمہ تھا۔ مگر میوزک کے بعد نام تبدیل کر لیا۔ بس ایسے ہی۔ چٹھان ٹھیک سے تعلق ہے۔ بھائی کوئی نہیں ہے۔ بس ہم چار بہنیں ہی ہیں اور ہم تین بہنیں اسی فیلڈ میں ہیں۔ میں نے بی ایس سی تک تعلیم حاصل کی ہے۔“

”اور شادی؟“  
”جی میری شادی 2009ء میں ”رعیان



درانی“ سے ہوئی۔ میری پسند کو گھروالوں نے بھی پسند کیا اور دونوں گھرانوں کی رضامندی سے ہماری شادی ہوئی۔“

”میاں صاحب آپ کے کام کو پسند کرتے ہیں؟“  
”جی بہت۔ میں ان کی اجازت سے اس فیلڈ میں مسلسل کام کر رہی ہوں۔ لیکن ساتھ ساتھ مجھے اپنی گھریلو ذمہ داریوں کا بھی احساس ہے اور میری پہلی ترجیح میرا گھر ہے۔ کھانا میں زیادہ تر خود ہی پکاتی ہوں کیونکہ مجھے کوئنگ کا شوق ہے۔“  
”ہوں گئے اب جب آپ کا نیا سیریل آئے گا تو تفصیلی بات کروں گی۔“

صنم بلوچ

”کیسی ہو صنم۔ اور آج کل تمہارا مارننگ شو تو اچھا جا رہا ہے۔ لیکن اگر ڈراموں کی بات کریں تو ”ڈنگر“ بہت اچھا جا رہا ہے۔ کیا ریسپانس مل رہا ہے؟“  
”بہت اچھا۔ بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ بلکہ میں

”اس لیے کہ ایک تو مجھے مزہ لگ گیا تھا مار تنگ شوکا اور دوسری بات یہ کہ میں ڈراموں میں کم کام کرتی ہوں۔ مگر بہت سوچ بچار کے بعد۔ ایک کے بعد ایک ڈراموں میں آکر لوگوں کو بور نہیں کرنا چاہتی۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ لوگ میزناٹم پڑھتے ہی یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ اس سیریل میں مصمم ہے تو سیریل یقیناً ”اچھا ہی ہوگا۔“

”مطلب، کیسے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا کردار ہٹ جائے گا؟ راسخ کام پڑھ کر یا صرف اپنا کردار پڑھ کر؟“

”نہ راسخ کام پڑھ کر نہ اپنا کردار پڑھ کر۔ بلکہ میں پوری کہانی پڑھتی ہوں۔ اس میں اپنا کردار دیکھتی ہوں اور پھر مطمئن ہو کر کام کرنے کی ہائی بھر تی ہوں۔“

”راسخ تمہارے کام سے مطمئن ہوتی ہیں؟ کبھی کسی نے خود سے کہا کہ آپ اچھا کام کر رہی ہیں؟“

”جی، احمیدہ احمد خود سے فون کر کے مجھے کہتی ہیں کہ تم اچھا کام کر رہی ہو۔ تب دل بہت خوش ہوتا ہے اور مزید اچھا کام کرنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ پھر مرین جبار کی بھی عادت ہے کہ وہ میری بہت حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔“

”مضمم! تمہیں بولڈ کرداروں میں نہیں دیکھا۔ آفرز نہیں آئیں یا تمہیں پسند نہیں ہیں؟“

”آفرز تو بہت ہوتی ہیں۔ لیکن میری طبیعت کا حصہ نہیں ہے بولڈنس۔ مطلب میں ویسے بہت بولڈ ہوں۔ مگر لباس کے معاملے میں نہیں۔ مجھے تو بغیر آستین کے ٹیڑے پہننے بھی پسند نہیں ہیں۔ بہت مشرقی ٹاپ کی لڑکی ہوں۔“

”اچھا! تو پھر کیا شادی کے بعد شوہر چھوڑ دیں گی؟“

”نہیں نہیں۔ شوہر میں تو میں اب بھی کم ہی آتی ہوں اور بہت ڈسٹنٹ رول میں۔ لیکن اگر میرا شریک سفر کے جاکے کلم نہیں کرو تو نہیں کروں گی۔ کیونکہ مجھے گھر میں رہنا اور گھرواری کرنا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ گھر میں ہوتی ہوں تو بہت سادگی کے ساتھ

جہاں جاتی ہوں۔ اسی بات ہو رہی ہوتی ہے۔“

”اچھا کلم کیا رائے ہے لوگوں کی؟“

”مختلف لوگوں کی مختلف رائے ہے۔ کوئی کرن (ڈرامے کا کردار) کو برا کہہ رہا ہے تو کوئی سکندر کو برا کہہ رہا ہے۔ ملی جلی رائے ہے ویسے زیادہ تر لوگ تو کرن کو برا کہہ رہے ہیں۔“

”کم کیا کہتی ہو؟“

”دیکھیں! جہاں لڑکی اسٹراٹگ ہوتی ہے۔ راضی لکھی ہو اور یہ نتیجہ کیسے کہ میں اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی ہوں تو وہاں لڑکی کی یہ اکثر ٹھیک ہے۔ مگر جہاں لڑکی کمزور ہوتی ہے۔ وہاں وہ ہر بات کو برواشت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور پھر یہی مجبوری مرد کو مزید خراب کرتی ہے۔“

”گھوٹا اسٹراٹگ لڑکی کو طلاق لے کر گھر بیٹھ جانا چاہیے؟“

”طلاق کا فعل برا ہے۔ صلح کی گنجائش رکھنی چاہیے اور دونوں کو بیٹھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ ہمیں اپنی آئندہ زندگی میں کیا کرنا ہے اور کن اصولوں کے تحت زندگی گزارنی چاہیے۔“

”خیر دیکھتے ہیں کہ اس سیریل کا کیا اختتام ہوگا؟“

”ہاں! ضرور دیکھیے گا۔ احمیدہ احمد بہت بڑی رائسز ہیں۔ کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہوتا ہے ان کی تحریروں میں۔ وہ میری پسندیدہ رائسز ہیں۔“

”اور آج کل کیا کیا پروجیکٹس زیر تکمیل ہیں اور کیا کیا تکمیل کے مراحل طے کر چکے ہیں؟“

”جی، اچھے زیر تکمیل بھی ہیں۔ کچھ مکمل بھی ہو چکے ہیں۔ کام اتنا ہی کرتی ہوں۔ جتنا آسانی سے کر سکوں۔ کیونکہ مار تنگ شو بھی کرنا ہوتا ہے تو پھر اتنا تاہم نہیں دے پاتی۔“

”تم نے ایک بار کہا تھا کہ مار تنگ شو کی وجہ سے میں ڈراموں کو وقت نہیں دے پاتی۔ اس لیے تم نے مار تنگ شو کو خیر یاد کہہ دیا تھا۔ پھر دوبارہ خواہش کرنے کی وجہ؟“



بغیر میک اپ کے رہتی ہوں۔“

”اپنا روٹے تمہیں؟“

”جی ڈرنا سیرل“ ”دانشان“ میں بہترین اداکارہ کا ٹکس ایوارڈ پاکستان میڈیا کا ایوارڈ 2011ء میں اور بی بی سی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔“

”شہرت مسئلہ بنتی ہے؟“

”نہیں! کیونکہ سر سوار نہیں کیا۔ کبھی مسئلہ بنی تو شہر کو خدا حافظ کہہ دوں گی۔“

مایا علی

”کیسی ہیں جناب؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”مک نئی سنڈریلا“ کے بعد ایک بار پھر آپ اسکرین پر چھائی ہوئی ہیں۔ بہت اچھا پر فارم کر رہی ہیں ”کھویا کھویا چاند“ میں۔“

”شکریہ۔ لوگ بھی تعریف کر رہے ہیں تو اچھا لگ رہا ہے۔ محنت وصول ہو جاتی ہے۔“

”مک نئی سنڈریلا“ کے بعد آپ غائب کہاں ہو گئی تھیں؟“



”اچھا ہے نایک دن ملے۔ لوگ یاد تو کریں کہ ”مایا علی“ اتنی تھی کسی ڈرامے میں۔ اب نظر نہیں آتی۔ اب گپ کے بعد اتنی ہوں تو لوگوں نے بہت پسند کیا ہے اور مجھے خود بھی اچھا لگ رہا ہے۔“

”ہنگام کی وجہ کیا تھی؟“

”کوئی خاص نہیں۔ ریکارڈنگز چل رہی تھیں۔ بس اسی لیے گپ الگ الگ کر دیتے رہیں گے تو ان شاء اللہ آپ سب کو نظر آتی رہوں گی۔“

”اچھے کر دیا کا کیا پیمانہ ہے آپ کی نظر میں؟“

”وہ کر دیا جس پر کئی میں (Base) کرتی ہو۔ پھر میری ایک بہت ہی اچھی سامی فنکارہ مہم بلوچ نے ایک بے کی بات مجھے بتائی ہے کہ کر دیا کو قبول کرنے سے پہلے اسکرپٹ کا مطالعہ ضرور کر لیا کرو۔ کیونکہ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کر دیا آپ کو آفر ہوا ہے اس میں کتنی جان ہے۔ بس میں نے یہ بات کر دے باندھ لی ہے۔“

”آپ نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ جب آپ اس فیلڈ میں آئیں تو والدین راضی نہیں تھے۔ کیوں؟“

”والدین نہیں صرف والد۔ امی تو ہمیشہ سے چاہتی تھیں کہ میں اس فیلڈ میں آؤں اور انہی کی سپورٹ کی وجہ سے ہی تو میں اس فیلڈ میں آئی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ ”ہاس کیونیکیشن“ کی طالبہ ہونے کی وجہ سے ایک نیوز چینل میں انٹرن شپ کی تو اسی چینل سے ایک پروگرام کی میزبانی کی آفر آئی اور میں نے اس پیشکش کو قبول کر کے چند پروگرام کیے تو والد صاحب نہ صرف خالص ناراض ہوئے۔ بلکہ انہوں نے نئی دین تک مجھ سے بات بھی نہیں کی۔“

”اچھا؟ مگر اب تو والدین چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اس فیلڈ میں آئیں۔ کیونکہ اب تو یہ فیلڈ بھی باقاعدہ ایک ”برڈ فیشل“ فیلڈ ہے؟“

”جی ایسی بالکل۔ مگر تاہم نہیں۔ کیونکہ والد صاحب

”میری کہانی اور راولا کوٹ کی خوب صورت دواویوں میں۔ سچ بہت موزا تھا۔ پہلا سیریل اور اتنی حسین اور دلکش جگہیں۔ کبھی نہیں بھول پاؤں گی اس سیریل کو اور ان حسین مناظر کو جن میں ہم نے شوٹ کیا۔“

”محنت سے سب کچھ حاصل ہوا ہے یا قسمت سے؟“

”میرا خیال ہے کہ محنت سے ہی سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔“

”میری کہانی اور راولا کوٹ کی خوب صورت دواویوں میں۔ سچ بہت موزا تھا۔ پہلا سیریل اور اتنی حسین اور دلکش جگہیں۔ کبھی نہیں بھول پاؤں گی اس سیریل کو اور ان حسین مناظر کو جن میں ہم نے شوٹ کیا۔“

”محنت سے سب کچھ حاصل ہوا ہے یا قسمت سے؟“

”میرا خیال ہے کہ محنت سے ہی سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔“

”کو کچھ اعتراض تھا۔ خیر پھر سب کے کہنے پر اور اس بات پر کہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ والد صاحب مان ہی گئے اور اب وہ خالص خوش ہیں میرے اس فیلڈ میں آنے پر۔“

”کیا آپ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی ہیں جو اس فیلڈ میں آئی ہیں اور آپ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟“

”جی ہاں۔ پہلی لڑکی ہوں جو اس فیلڈ میں آئی ہوں۔ اسی لیے مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اب اگر کوئی اور اس فیلڈ میں آنا چاہے گا تو میرا نہیں خیال کہ اسے کسی بھی قسم کی مشکل ہوگی۔ کیونکہ میری مثال سامنے ہوئی سب کے۔“

”کھویا کھویا چاند اور اس سے پہلے ”اک نئی سنڈریلا“ ملک کے پہاڑی مقامات پر عکس بند کیا گیا۔ کیا محسوس کیا اپنے ملک کے بارے میں؟“

”بھئی کہ اپنا ملک بہت خوب صورت ہے۔ ہم دوسرے ملکوں کی خوب صورتی کی تعریف کرتے ہیں جبکہ ہمارا ملک خوب صورتی سے بھرا ہوا ہے۔ ”اک نئی سنڈریلا“ میں جتنے خوب صورت مناظر میں نے اپنے ملک کے دیکھے۔ اپنی لائف میں کبھی نہیں دیکھے تھے اور ان مناظر کو دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارا ملک کتنا خوب صورت ہے۔“

”کن مقابلتہ پر یہ شوٹ ہوا تھا؟“

”میری کہانی اور راولا کوٹ کی خوب صورت دواویوں میں۔ سچ بہت موزا تھا۔ پہلا سیریل اور اتنی حسین اور دلکش جگہیں۔ کبھی نہیں بھول پاؤں گی اس سیریل کو اور ان حسین مناظر کو جن میں ہم نے شوٹ کیا۔“

”محنت سے سب کچھ حاصل ہوا ہے یا قسمت سے؟“

”میرا خیال ہے کہ محنت سے ہی سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔“

”میری کہانی اور راولا کوٹ کی خوب صورت دواویوں میں۔ سچ بہت موزا تھا۔ پہلا سیریل اور اتنی حسین اور دلکش جگہیں۔ کبھی نہیں بھول پاؤں گی اس سیریل کو اور ان حسین مناظر کو جن میں ہم نے شوٹ کیا۔“

”محنت سے سب کچھ حاصل ہوا ہے یا قسمت سے؟“

”میرا خیال ہے کہ محنت سے ہی سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔“

”میری کہانی اور راولا کوٹ کی خوب صورت دواویوں میں۔ سچ بہت موزا تھا۔ پہلا سیریل اور اتنی حسین اور دلکش جگہیں۔ کبھی نہیں بھول پاؤں گی اس سیریل کو اور ان حسین مناظر کو جن میں ہم نے شوٹ کیا۔“

”محنت سے سب کچھ حاصل ہوا ہے یا قسمت سے؟“

”میرا خیال ہے کہ محنت سے ہی سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔“

”میری کہانی اور راولا کوٹ کی خوب صورت دواویوں میں۔ سچ بہت موزا تھا۔ پہلا سیریل اور اتنی حسین اور دلکش جگہیں۔ کبھی نہیں بھول پاؤں گی اس سیریل کو اور ان حسین مناظر کو جن میں ہم نے شوٹ کیا۔“

ماہنامہ کرن

نومبر 2013 کا شمارہ شمارہ

”محضان خواجہ“ سے شامین رشید کی ملاقات،

”میری بھی سنٹیے“ میں شبیو شریف کی باتیں،

”آواز کی دنیا“ سے عظمیٰ بلوچ کی گفتگو،

”مقابلہ ہے آئینہ“ میں سونیا اہانی،

نبیلہ عزیز اور فوزیہ یاسمین کے ڈوٹ کی اشعار،

شفق افشار، فرخ بخاری، فاطمہ گل، فرحان اختر اور فرحت عمران کے

عمل ناول،

سعدیہ مزید آفریدی، رحمان احمد بخاری، سدرہ الحسنی مصباح نوشین

اور لکھی طائر کے ناول،

سید وضواریہ، بشریٰ احمد نورینی، صابر نصیر احمد کے افسانے

اور مستقل سلسلے،

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

ن سب

”طلب نبوی ﷺ سے علاج“

کرن کے شمارے کے ساتھ کرن کتاب بھروسہ سے خدمت و فلاح فرماتے ہیں۔



## شادی مبارک ہو

# عنبین ہمارے عدلی گوندل ترجمنہ ہمارے عصر عباس

## بشری گوندل

طرح عزیز کیا انجوائے کرے گی عصر کی شادی کو۔ ہمارے تجویز کو نامعقول قرار دے دیا گیا اور شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی۔ پھر سب کی دوڑیں لگ گئیں۔ انہی نازیہ (عزیز کی ساس) جب بھی آتیں مجھ سے پوچھتی ہیں۔ ”تم نے اپنے جوڑے بننے کے لیے دے دیے ہیں؟“ اور میں ہنس دیتی۔ ”کمال۔ ابھی بری اور جینز کی خریداری تو مکمل ہو جائے پھر دیکھیں گے۔“

”میرا تو مشورہ ہے کہ پہلے ہم لڑکیاں لڑکیاں جا کے اپنے ڈرنسز کے آؤر ڈرے آئیں۔“

خوشحال بعض اوقات بے پاؤں اور بہت آہستہ آہستہ دل کی دلیز کو چھونے لگتی ہیں اور گھر کے دیوار در بھی ان خوشیوں بھرے لمحات کو بڑی دیر تک محسوس کرتے رہتے ہیں اور جب شادی کے شادیائے بچے ہیں پھر تو خوشیوں کا انداز ہی نرالا ہوتا ہے رنگ ہی جدا ہوتے ہیں بہت دیر تک رہنے والے سچے اور بچے رنگ۔!

قارئین کرام۔۔۔ آج میں نے آپ سے شیئر کرنی ہے میری مند اور میرے دیور کی ایک ہی دن بھگتائی جانے والی شادی کی گہما گہما۔۔۔ حالانکہ ہم نے بہت رولا ڈالا کہ کچھ دنوں کا درمیان میں وقفہ رکھ لیں۔ اس

”نانا! آپ لڑکی ہیں کیا۔؟“ شرمندہ حیران ہو کر پوچھتی۔

”تو اور کیا! میں کس سے سانس لگتی ہوں؟“ اور میں جلدی سے ٹٹی میں سر ہلاتی کہ وہ اتنی ٹینگ اسارٹ اور ایکٹو ہیں کہ جوان بچوں کی ہاں نہیں لگتیں۔ اور پھر۔۔۔ ویل انجو کینڈا، ڈسینٹ اور بہت نفیس طبیعت کے حامل عدیل بھائی اور بھی ساری خوبیوں کے مالک ہیں۔

میں تو بر ملا عزیزن سے کہتی ہوں کہ ”وہ تمہاری کسی نیکی کا صلہ ہیں“ قدر کرنا ان کی۔

”تپ نے بشری باجی ہماری شادی کی مبارک باد کوئی نہیں دی۔“ عدیل بھائی جب بھی آتے ہیں ہٹکھو کرتے ہیں۔ میں اگرچہ ان کے اصرار کو بہ خوبی سمجھ رہی تھی کہ وہ ڈائجسٹ کے ذریعے مبارک بادی وصول کرنا چاہتے ہیں لیکن میں کنفیوژ تھی کہ وہ شادیوں میں دو نمائندگان تھے کس طرح احاطہ تحریر میں لائیں۔ کون سی بات رہنے دوں کون سی باتوں کس کا ذکر گول کروں کس کو ہائی لائٹ۔

علیحدہ بابی کی دن رات کی بھاگ دوڑ۔ میرے میاں خوشنود صاحب کے چھوٹے پسینے۔ عمران بھائی کی منقطع سے واپسی۔

عزیزن کی فرینڈز یعنی اور صبا دوپہر کو اس وقت آگئیں جب عزیزن پارکر جا چکی تھی۔ میں نے بھی ڈھولک ان کے سامنے رکھ دی کہ۔ ”لو! رات کے لیے سرسل کر۔“ لوگ کہتے ہیں دور کے ڈھول سہانے لیکن ڈھول قریب بجاتے بھی اتنی ہی سہانے لگتے ہیں۔ مجھے زبردست تاکید کی تھی کہ جنہیں مہمانوں سے پہلے ہال میں موجود ہونا چاہیے یہی تکہ میں گھر کی بڑی بوسہ خضر اور عزیزن کی اگلائی بھا بھی ہوں۔ جبکہ محسن اور زاہد کی شادی پر تو تہنید بھی ساتھ ہوگی ان شاء اللہ اور میں جلدی کرتے کرتے بھی جب ہال میں پہنچی تو کافی مہمان آچکے تھے۔ کمرے کی آنکھ روشن ہوئی تو میں تیار ہوئی کہ دو چار فوٹو بوالوں۔ یادگار کے طور پر

کہ علیحدہ باجی (کزن) نے مجھے کھینچ لیا۔

”شرم کرو، تمہیں تصویریں بنوانے کی بری ہے اور مہمان ہال میں انٹر ہو کر خود اپنے لیے فکشن ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”کیوں، فکشن گھونگی ہیں کیا؟“ میں بد خواص ہو کر بٹٹی کیونکہ میری ساری توجہ اب بھی کمرے کی کمری و شوخ آنکھ پر تھی جو کسی اور جانب متوجہ ہو چکی تھی۔

”لا حول و لا یقہ کوئی قوی اسبلی کی فکشن تھوڑی ہیں کہ ایک بار اگر کھو گئیں تو چھ ماہ سال کے بعد؟“

”نہیں گ۔“ میں ہیرانی اور کچھ دیر کے لیے کمر۔ کو بھول بھال کر مہمانوں کی طرف بڑھ گئی۔

”واہ! بھئی۔ بڑی پیاری لگ رہی ہو۔“

لوگوں نے میری تعریف کی۔

میں نے دل میں شکر ادا کیا کہ فیشن وغیرہ کا رولٹ یقیناً اچھا ہی آیا ہے چلو شکر ہے میرے پرے ہو گئے لیکن ایک ویٹر نے اگر میری کنگ کا، فیشن اور میک اپ کا ستائش کرتے ہوئے میرے جوان جہان ارمانوں پر ہائی ڈال دیا۔

”آئی جی! مبارک ہو۔“ وہ کوک لے کر آیا اور سب کی ہنسی کے فوارے چھوٹ گئے۔ اقرار دینے، ”میرا صائمہ، ریشہ، سمیرا، کلثوم۔ سب دانت نکال رہی ہیں اور میں ہکا بکا کھڑی تھی۔“

”آئی جی! باجی سو کا نوٹ نکالیں وہ بے چارہ کب سے کھڑے۔“ وہ باقاعدہ انا اڑانے لگیں۔

”تم لوگ اپنے حسن کا صدقہ دے دو منہی لڑکیاں!“ میں جل جلی گئی مگر وہ بھی ڈھینٹ تھا پانچ سو کا نوٹ لے کر ہی تلا۔

عصر بھائی اور عزیزن کو مہندی کی رسم کے لیے پھولوں اور ٹوٹوں کی برسات میں اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ دونوں ہی پیارے لگ رہے تھے۔ عصر بھائی نے اسی سال فریضہ حج ادا کیا تھا چنانچہ ان کے چہرے کا نور سب کو متاثر کر رہا تھا۔ دونوں بہن بھائی ساتھ ساتھ بیٹھے

بہت شاندار لگ رہے تھے اور او اس بھی۔ سب کی آنکھیں ہلک گئیں کہ خوشی کے اس اہم موقع پر اسی ابو نہیں ہیں۔ ماں باپ کی کمی تو پوری زندگی ہی محسوس ہوتی ہے اور اس کمی کو کوئی بھی رشتہ پورا نہیں کر سکتا۔

سسرال کی طرف سے آئے پہلے جوڑے اور پھولوں کے خوشنما گنوں میں غزیرین بہت معصوم اور پیاری لگ رہی تھیں۔ نظر لگ جانے کی حد تک۔ اور نظر تو لگ ہی جاتی ہے جیسے مجھے لگ گئی تھی (خدا جانے کس کی) مجھے اچانک گرمی کا شدید احساس ہوا تھا۔ میں فوراً "ہندی کا تھال رکھ کے پٹی مگر یہ کیا۔ اف میرا پیچی براؤن خوبصورت نیا کور سوٹ۔ جسے آگ پکڑ چکی تھی۔ صدمے سے میرا برا حال تھا۔ ریجہ کو روٹے دیکھا تو پتا چلا کہ تھل میں جلتی موم بتیوں سے اس کے بالوں کو آگ لگ گئی تھی۔ میں اسے چپ کرانے لگی۔

"پچھو! شکر ہے ہمارے بالوں کو آگ نہیں لگی۔" نور فاطمہ اور نوال معصومیت سے بولیں تو میں ہنس دی۔ ایسے موقعوں پر ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی ہوتی ہے۔

تقریباً گیارہ بجے ہندی کی خوبصورت تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

اگلے دن چونکہ دوبار تہیں تھیں۔ اس لیے بھاگ دوڑ اور افرا تفری بھی زیادہ تھی کیونکہ غزیرین کی رخصتی کے بعد عصر کی بارات لے کر محلواں جانا تھا اور انہوں نے پابندی وقت کی خاص تاکید کی تھی۔

"یا اللہ! ہر کام خوش اسلوبی سے ہو۔"

دل میں دعاں مانتے ہوئے ہم لوگ قافہ تیار ہو کر ہال میں پہنچے۔ مہمان آنا شروع ہو چکے تھے۔ بارات آنے سے پہلے بری دکھائی تھی اور گھڑوں کی رسم گزنی تھی۔ قارئین گھڑوں ہمارے ہاں کی ایک خوبصورت رسم ہے۔ پھولوں کی لڑیوں سے سجاکھڑا چچی مائی یا بھابھی اٹھاتی ہے اور گھر کے سربراہ سے پیے

وصول کرتی ہے۔ مہووی اور کیمروں کی تیز چکاچوند روشنیوں اور گزرنے والوں کے جھرمٹ میں میرے سر پر گھڑوں کی گئی اور چچی کوڑنے دھال ڈال کر پورے ہال کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔

تقریب گھڑوں کو سب لوگ سراہ رہے تھے اور میرا خیال ہے اس میں زیادہ کمال چچی کوڑ کا ہی تھا۔ ابھی یہ رسم ختم ہی ہوئی تھی کہ بارات آگئی بینڈ باج کے ساتھ۔ ہرنونگ بچ گئی تھی اور ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھولوں کا ٹوکرا نہیں مل رہا تھا۔ ہم لوگ حیران پریشان ادھر ادھر اور بارانی خواتین ہال میں داخل ہو کر "جھبھ" ڈال رہی تھیں اور ساتھ ساتھ شکوے بھی جاری تھے کہ پھولوں سے استقبال ہونا چاہیے تھا ہمارا۔ عابدہ بائی کے دل غم نے ہی کام کیا بولیں۔

"وہ پھول ہم نے اس لیے نہیں بھینکے کہ پاؤں کے نیچے آکر مسلے جاتے ہیں اور آپ لوگوں کے سلیپ ہونے کا خطرہ الگ۔"

"چلو خیر ہے۔" میں نے آتئی نازیہ کو گلے لگایا۔ "آپ اتنی پیاری لگ رہی ہیں کہ پھولوں کی کیا اوقات۔"

"ہیں واقعی؟" وہ پورے دل سے خوش ہوئیں۔ "اور میں کوئی لگ رہی ہوں دیکھ لے کی اماں۔"

"نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔" میں نے رزور نفی کی کہ وہ واقعی بہت پیاری لگ رہی تھیں اور شہینہ بھی گرین سوٹ میں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھنے والی شہینہ اسکول کی طالبہ ہی لگتی ہے۔ حماد بھی بڑا پیارا لگ رہا تھا آتئی کے تینوں بچے بہت بہت سیکھے ہوئے باخلاق ہیں یقیناً والدین کی اچھی تربیت کا نتیجہ ہے۔

شہزادوں سی آن بان رکھنے والے عدیل بھائی دو لمے راجہ کے روپ میں بہت شاندار لگ رہے تھے اور ان کے پہلو میں چینی ہوئی غزیرین۔ پرفیکٹ اور بیونی فل کپل۔ اور جب وہ فیملی کو ٹوٹوٹ کر رہے تھے تو



میں نے آگے بڑھ کر انکل ظفر اور آئی تازیہ کو مبارک باد دی کہ اللہ ان کی فیملی کو نظرد سے محفوظ رکھے۔  
عدیل بھائی! آپ نروس تو نہیں ہو رہے؟ ”عدیل بھائی کو اسٹیج پر سالیوں کے جھرمٹ میں تیسری مرتبہ ماتھے سے پسینہ صاف کرتے دیکھ کر میں نے پوچھا۔  
”نہیں نہیں، کوئی نہیں۔“ وہ اس روز دوا کیوں والی ساری تیزی اور چرب زبانی بھولے ہوئے تھے۔

”پنے حق میں بولیں۔ اس طرح تو لگ ہی نہیں رہا کہ آپ لاء جیسے شے سے وابستہ ہیں۔ جبکہ سنا ہے وہاں تو گونگے بھی بول پڑتے ہیں۔“  
پھر مجھے بتا چلا گیا کہ درحقیقت وہ شرما نہیں رہے تھے بلکہ ان کی ساری کی ساری توجہ اپنے جوتے کی طرف تھی کہ ان کی ذرا سی چوک سے پاؤں پڑنے کے بیٹھی سالیان فائدہ نہ اٹھالیں۔

”یہ مٹھائی صرف دو اما کے کھانے کے لیے ہے؟“  
انکل عظمت نے پوچھا جو ایک صوفے پر اپنی دونوں پیو پوں کے درمیان بیٹھے چکر رہے تھے۔  
”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ آپ دو دفعہ کھا چکے ہیں۔“

”دودھ کے پیسے نہیں، جلدی کریں۔“ اقرار نے اصرار کیا۔  
”تب ڈیمانہ کریں۔“ انکل عظمت نے نوٹوں کی گلدی لرائی۔

میں نے کہا۔ ”زیادہ نہیں، کیونکہ گھر کی بات ہے“ اس لیے صرف پانچ لاکھ۔“

”وئے! ایک جوتے کی اتنی قیمت؟“ لمبی ناک والا کاشی شالابن کے کچھ زیادہ ہی شوخ ہو رہا تھا۔

”بھی زندگی میں اتنی رقم دیکھی ہے؟“ یہ سوال حاد نے کیا۔

”کنج دیکھ لیں گے۔“ قرآنے آرام سے کہا۔  
”تم نے کنج قتل ہو جانا ہے کاشی کے بچے! میں نے اس کے ہاتھوں پہ بیگسارا۔“

”مفل، تو ہو چکا ہوں، اتنی خوبصورت تیار شیراز

لوگوں کو دیکھ کر۔“

اس کی ٹھنڈی آہ میں نفس پڑی۔ ”شرم کرو تم!“  
”اے دودھ تو آپ لوگوں نے پلایا ہی نہیں۔“  
حاد کو اچانک دودھ کی طلب ہوئی۔ میں نے فوراً اپنے بیگ سے نکال کے سعد حسن کا فیڈر پیش کیا تو سب کے قبضے نکل گئے۔

”رکھ لے یا را! اگلے سال کام آئے گا۔“ یہ کاشف کی سرگوشی تھی جو ہم سب نے سن لی۔

پھر رخصتی ہوئی اور یہ باراتی بھی عصر بھائی کی بارات کے ساتھ اپنے پیڑ باجے سمیت شامل ہو گئے۔

وہاں جاکے زائد کے دوستوں نے زبردست ہنگامہ ڈالا اور نوٹوں کی بارش کروی۔ ہمارا شاندار طریقے سے استقبال کیا گیا۔ میرا دو سال کا بیٹا سعد حسن چاچو کا شہ بالا بنا ہوا تھا لیکن وہاں جاکے میری گود سے ذرا ترانہ

وہاں سے شام ڈھلے ہی دلہن لے کر گھر کو لوٹے۔

تہمینہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ہر کوئی سراہ رہا تھا۔

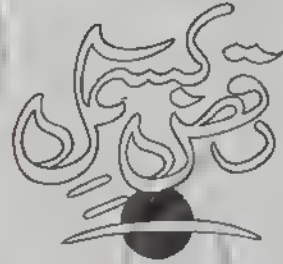
گھر آتے ہی کسی گاڑی کی ڈکی سے بھولوں کا وہ گشہ نوکر امل گیا تو سب نے جی بھر کے دلہن پر بھول پھینکے۔ فوٹو شوٹ ہو رہا تھا اور میں نے ہائی ہیل پاؤں سے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھی کیونکہ پاؤں سوچ چکے تھے۔ سعد حسن کو تہمینہ کی گود میں بٹھایا تھا۔ یہ

ہمارے ہاں کی رسم ہے۔ چھوٹا بچہ دلہن کی گود میں بٹھا کے اس سے پیسے وصول کیے جاتے ہیں۔

خوبصورت رسول ڈھیر بول دو نقول کے ساتھ یہ دونوں شادیانہ انتقام پذیر ہوئیں۔

اللہ رب العزت تہمینہ اور عصر عباس کو عزیز بن اور عدیل گوندل کو ہمیشہ شاد آباد اور ہنستا بنا رکھے۔ آمین۔



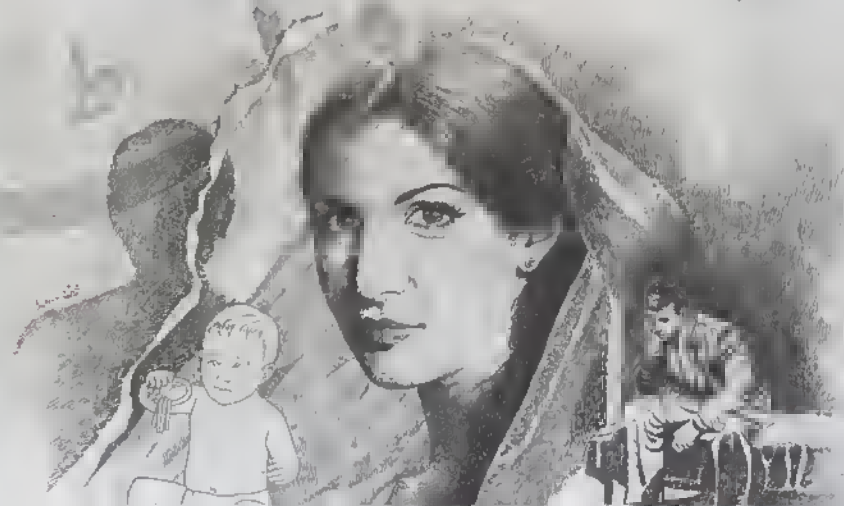


مادرِ مرضی عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلتا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ مادرِ خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

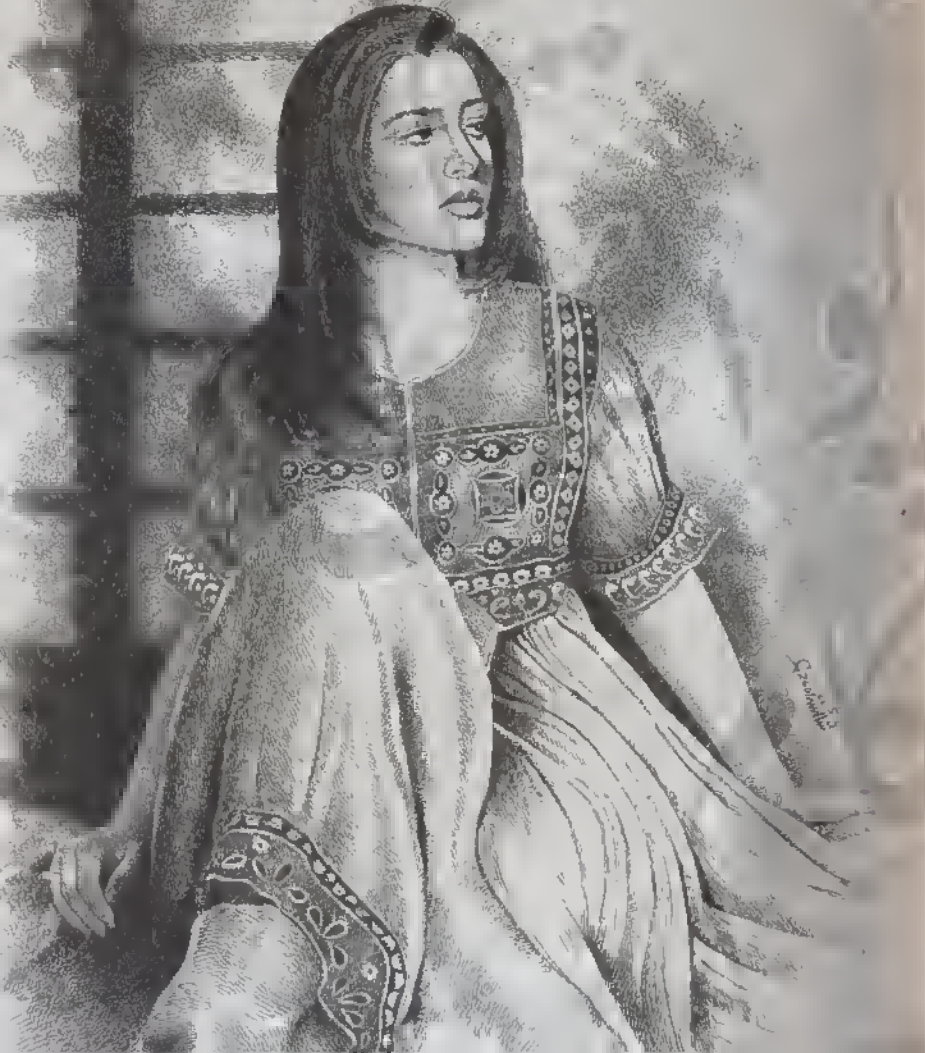
فارہ اپنی شہینہ خالہ کے بیٹے آفاق بزدلی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لا تعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منورہ حیمہ اپنی بہن شہینہ بزدلی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً ساسا کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتمیزی پر تھاہو کر دلپس چلی جاتی ہیں۔

منورہ شہینہ اور نیو کے بھائی رضا حیدر کے دوست بچے ہیں۔ یونیورسٹی اور عزت حیدر۔ یونیورسٹی میں سے اور بے حد شان دار رہنمائی کا مالک ہے۔ ولید رحمن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹینس حائل نہیں ہے۔ نیو کے بیٹے سے فارہ کی بہن حسد جاتی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں دم دھکا ہوتے دیکھ کر اپنے خواہ کوہو رہی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر یونیورسٹی کو فون کرتا ہے۔ یونیورسٹی اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔



— ۵ —  
پانچویں قسط



عمیں سوچنے لگتی ہے۔ عافیہ بیگم مادر کو موبائل خریدنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ تیور ایک میٹنگ کے سلسلے میں فیصلی آباد جاتا ہے۔ واپسی میں ٹریفک جام میں اس کی نظر بس میں بیٹھی مادر پر پڑ جاتی ہے۔ وہ اسے دیکھتا رہتا ہے۔ آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ شہینہ اور اشتیاق بزدلی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ شہینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

اس کے قدم پتھر گئے تھے اور چہرے پر اک طمانچہ سا ہوا تھا۔  
آخر اس کے ماں باپ نے اس کے ہاتھ کے لمس کو اور اس کے بازو کے سہارے کو دھکا دیا۔ اس کے لیے اس سے بڑی ظالمت اور اس سے بڑی اذیت اور کیا ہو سکتی تھی بھلا؟ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور کانوں میں سائیں سائیں ہی ہونے لگی۔  
”ٹھو ٹھینہ! اندر چلے۔“ انہوں نے خود آگے بڑھ کر ٹھینہ یزدانی کو سارا دبے کر اٹھایا اور اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ آفاق وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

\*\*\*

اشتیاق یزدانی خاصی گہری غینو سو رہے تھے۔ جب کسی کے کراہنے کی آواز پہ ان کی فینڈ کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کمرے میں لٹکھا سا اندھیرا تھا اور کراہنے کی آواز ہاتھ روم کی طرف سے آرہی تھی۔ سوہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے اور فوراً ”ہاتھ بڑھا کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیٹ جلا دیا۔  
”ٹھینہ!“ انہوں نے بیڈ کی طرف دیکھا۔ بیڈ خالی تھا۔ اشتیاق یزدانی کے چپکے چھوٹ گئے تھے۔ وہ ایک دم اٹھ کر ہاتھ روم کی طرف بھاگے۔

”ٹھینہ! ٹھینہ!“ وہ ہاتھ روم کے پاس ہی قایلین یہ اونڈھے منہ گہری ہوئی تھیں۔ انہوں نے ان کے قریب دو زانو بیٹھے ہوئے بمشکل انہیں سیدھا کیا۔ لیکن ان کے پکارنے کے باوجود ٹھینہ یزدانی کے منہ سے کراہنے کی آواز کے سوا اور کوئی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

”ٹھینہ! کیا ہوا ہے تمہیں؟“ آنکھیں کھول۔ ٹھینہ۔“ اشتیاق یزدانی حد سے زیادہ پریشان ہو گئے۔ ٹھینہ یزدانی کی اس تشویشناک حالت پہ ان کے ہاتھ پیر پھول گئے اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔  
”ٹھینہ!“ انہیں بار بار پکارنے کے بعد جب کچھ نہ سوجھا تو وہ انہیں وہیں چھوڑ کر بول کھائے ہوئے باہر کی طرف لپکے اور ملازموں کو زور زور سے آوازیں دیتے ہوئے سیڑھیاں ہاتر آئے۔

”ساجد! ساجد! راجو! راجو! کہاں ہو تم لوگ؟“ انہوں نے باہر لان میں نکلتے ہی ملازموں کو اور بھی زور سے پکارا تھا اور جیسے جیسے ان کی آواز کانوں میں پڑتی گئی تھی۔ سب کے سب ملازم گہری غیند سے اٹھنے کے باوجود بھی بھاگے آئے تھے۔

”غفوب! تم جلدی سے گاڑی نکالو۔ بیگم صاحبہ کو لے کر اسپتال جانا ہے۔“ وہ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہہ کر دوبارہ اپنے بیڈ روم کی طرف بھاگے اور پھر بڑی مشکل سے ملازموں کی مدد سے ٹھینہ یزدانی کو اٹھا کر گاڑی تک لے آئے اور ابھی انہیں گاڑی میں ڈال ہی رہے تھے کہ باہر شور کی آواز سن کر گہری غیند سویا آفاق بھی اٹھ کر باہر نکل آیا۔

”ساجد! کیا ہوا ہے؟ یہ شور کیسا ہے؟“ آفاق نے باہر سے سنائی دینے والی ملازموں کی اور اشتیاق یزدانی کی آوازوں کے متعلق پوچھا۔

”اے صاحب جی۔! آپ کو نہیں پتا۔؟ بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ کچھ ہوش نہیں ہے۔ اسی لیے بوے صاحب جی ان کو لے کر اسپتال جا رہے ہیں۔“ ساجد نے غلبت میں بتایا اور ٹھینہ یزدانی کا دلہٹا لے کر باہر چلی گئی۔

آفاق دم بخود رہ گیا۔ اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس کی ماں بیمار تھی۔ بے ہوش تھی اور اسے کسی نے خبر ہی نہیں دی۔ وہ مطمئن بے خبر سو رہا۔ اس کی طبیعت کا احساس ہونے ہی وہ ایک دم سرپٹ بھاگا۔

لیکن تب تک اشتیاق یزدانی گاڑی میں سوار ہو چکے تھے۔  
”ایا۔! پیلز رکیس۔ کہاں جا رہے ہیں آپ۔؟ کیا ہوا ہے ماما کو۔؟ آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں؟“ وہ بیڈ کی طرف سرخس گاڑی کی کھڑکی میں جھپکے ہوئے خاصے روپائے لمبے میں بولا۔  
”ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تمہارے لیے مر چکے ہیں۔“ انہوں نے انتہائی سخت اور تلخ انداز میں کہتے ہوئے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور ڈرائیور ان کے اشارے پر رفتار بڑھاتے ہوئے گاڑی نکال لے گیا۔  
آفاق اپنے باپ کی اتنی بے گانگی اور لاعلمی پہ ششدر رہا ہو گیا۔ انہوں نے کتنی آسانی سے اسے پرایا اور خود سے الگ کر دیا تھا۔ کچھ بتائے بغیر ہی چلے گئے تھے۔

\*\*\*

”بھائی۔! بھائی۔! انہیں پلیز۔! مجھے اسکول ڈراپ کرویں۔ میں لیٹ ہو رہی ہوں۔“ ککو نے انتہائی گہری غیند سے ولید کو کندھے سے پکڑ کے جھجھوڑ دیا اور وہ جو تقریباً ”صبح چار بجے“ اگر بستر پہ گرتے ہی غیند سے بے سدھ ہو گیا تھا اس اچانک حملے پہ ہڑبکا گیا۔

”کیا بات ہے ککو! کیوں جگا رہی ہو؟“ ولید نے کافی بول کھائے ہوئے انداز میں پوچھا۔  
”مجھے اسکول جانا ہے۔ میں لیٹ ہو رہی ہوں۔ پلیز! مجھے ڈراپ کرویں۔“ ککو نے ایک بار پھر جیسے التجا کی۔  
”میں ڈراپ کروں؟ تو وجہ کیا ہے؟“ اس نے چھوٹے بھائی کا پوچھا۔  
”بیچارہ ہے۔ بخار ہے اسے۔“ ککو جھنملائی۔

”اوہ! تو یہ مسئلہ ہے۔“ وہ سنتے ہی اٹھ کر بیڈ گیا اور اپنے سوئے ہوئے اعصاب کو ٹھکانے پہ لانے کی کوشش کی۔  
”چھا! ٹھیک ہے۔ تم تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں پھوڑ آتا ہوں۔“ وہ اپنے اوپر سے چادر پرے ہٹا کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”بھائی! میں آل ریڈی تیار ہوں۔ بس آپ کے تیار ہونے کا انتظار ہے۔“ ککو اس کی عتاب دہانی پہ خفگی سے بول۔

”اوہ! سو ری سو ری ہارنڈ۔ مجھے بھی بس تیاری سمجھو۔ تم چلو۔ میں آیا۔“ اس نے ککو کے خفگی بھرے انداز پہ مسکراتے ہوئے اس کا گال تھپکا۔ وہ سر ہلا کر باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے دو منٹ بعد اپنا تالیہ کندھے پہ ڈالے وہ بھی اپنے کمرے سے باہر آیا اور انتہائی ڈھیلے ڈھالے اور ست سے انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

”اے۔! اس نے تمہیں جگا دیا؟“ زبیدہ بیگم دوسرے کمرے سے وحید اور ککو کے کپڑے دھونے کے لیے لے کر ابھی باہر ہی نکل رہی تھیں کہ ولید کود کچھ کر ٹھٹک گئیں۔ کیونکہ انہیں پتا تھا کہ ولید رات بھر کام کرنے کے بعد صبح منہ اندھیرے تھکا ہوا آیا تھا۔

”ظاہر ہے جگانا تو تھا ہی۔ وہ بے چاری اور کیا کرتی؟“ ولید نے کندھے اچکا۔  
”لیکن میں نے اسے کبھی نہیں تھا کہ اسے میں پھوڑ آتی ہوں۔ پھر بھی وہ باز نہیں آئی۔“ زبیدہ بیگم کو بیٹی پہ غصہ آیا۔

”تو اچھا کیا ناس نے کہ مجھے جگا دیا۔ آپ اتنی دور کیسے جاتیں اور کیسے آتیں۔ اس نے تو آپ کا بھلا ہی سوچا ہے نا؟“ ولید نے نرمی سے سر جھٹک کر دوبارہ ہاتھ روم کی طرف قدم بڑھا دیے۔



”میرے بھلے کو چھوڑو۔ مجھے تو تمہاری فکر ہو رہی ہے۔ تمہاری غنیمت بھی پوری نہیں ہو سکی۔“ وہ متفکر ہونے لگیں۔

”اے ڈونٹ وری امی! غنیمت پوری نہ ہونا تو اب روٹین کا حصہ ہے اور روٹین کے ساتھ انسان خود بخود ایڈجسٹ ہو جاتا ہے۔ اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے بھلا؟“

وہ لاپرواہی سے کہتا نہ مانے کے لیے ہاتھ روم میں گھس گیا۔ زبیدہ بیگم افسوس سے سر ہلاتی ہوئی اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ وہ ان تینوں بہن بھائیوں کے بغیر چلنے پھرنے الگ الگ کر کے رکھنے لگیں۔ کیونکہ وہ پہلے ولید اور وحید کے کپڑے دھو کر رکھتی تھیں اور بعد میں کککو کی اور اپنی باری آتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایسا ہی کر رہی تھیں کہ اتنے میں ولید نما کر ہاتھ روم سے نکل بھی آیا اور یالوں میں تولیہ رکھتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک چارپائی پر رکھے کپڑوں کے ڈھیر پر نظر پڑے ہی وہ ایک دم ٹھنک گیا اور بے ساختہ پکار اٹھا۔

”امی!“ اس نے اتنے دل بدلا دینے والے انداز میں پکارا کہ زبیدہ بیگم کے ہاتھ سے صرف کا پیکٹ چھوٹ کر پورے زور و شور سے گھومتی واشنگ مشین میں جا کر ا۔

”ہائے میرے اللہ! کیا ہو گیا؟“ وہ دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی طرف بلیں۔

”میری بلیو شرٹ!“ وہ تیرکی سی تیزی سے لپک کے کپڑوں کے ڈھیر کے پاس آیا اور اس میں سے اپنی بلیو اور بلیک کانٹنگ والی شرٹ بھیجنے کے نکال لی۔

”اے!“ کیا ہو گیا ہے تمہاری بلیو شرٹ کو؟“ زبیدہ بیگم کا دل ابھی تک ٹھکانے پر نہیں آیا تھا۔

”ہوا نہیں ہے۔ مگر ہونے ہی والا تھا کہ میری نظر پڑ گئی اور یہ شرٹ بال بال بچ گئی۔ وہ تو پھلا ہو کککو کا جس نے آج مجھے زبردستی دجا دیا۔ ورنہ آپ نے تو میرے کف افسوس لے کر پورا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ اللہ کی رحمت تو بس ہمانہ تلاش کرتی ہے۔“ ولید اس شرٹ کو بڑی چاہ سے بھاڑ پوچھ کے پلٹ گیا۔

”مگر یہ شرٹ تو ابھی وحلی کہاں۔ اتنے دنوں سے کھوئی سے لگی ہوئی تھی۔“ وہ حیران ہوئیں۔

”یہ شرٹ دھل چکی ہے امی۔ اور اتنے دنوں سے کھوئی سے نہیں میرے دل سے لگی ہوئی تھی۔“ وہ آہستگی سے زرب لب کہتا ہوا ذرا سا مسکرایا۔

”کیا؟ کیا کیا تم نے؟“ وہ اس کی بات سن نہیں سکی تھیں۔

”کچھ نہیں! میں بس یہ کہہ رہا ہوں کہ اس شرٹ کو دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے میں اب اسے الماری میں رکھ رہا ہوں۔“ وہ ذرا سارے کٹے کے بعد پھر کمرے کی طرف بڑھا۔

”کیوں؟ ایسی کیا بات ہے اس شرٹ میں کہ اسے دھونے کی بھی ضرورت نہیں ہے؟“ وہ مسلسل حیرانی کی زد میں تھیں کیونکہ ولید کا کبچہ کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔

”امی! ابوں سمجھ لیں کہ ساری بات ہی اسی ایک شرٹ میں ہے۔“ وہ جاتے جاتے پھر ٹھہرا۔

”اچھا! تو یہ بات ہے۔“ وہ جیسے کچھ کچھ سمجھ گئی تھیں۔

”ہوں۔ یہی بات ہے۔“ اس نے مبہم سا اقرار کیا۔

”کون ہے وہ؟“ زبیدہ بیگم کا انداز دستانہ ہو گیا۔

”میرے نزدیک۔ خوشبو کا پیکر۔“ اس نے ایسے مسکور لہجے میں بتایا جیسے اس کے لہجے میں اس کی خوشبو بس گئی ہو۔

”بھائی!“ کککو اسے ابھی تک کندھے پر تولیہ ڈالے کھڑے دیکھ کر ایک دم چیخ اٹھی۔ ولید اس کی چیخ پر گڑبڑا کہ اس خوشبو کے حصار سے باہر آیا۔

”وہ نو!“ اس نے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے برآمدے میں لگے وال کلاک کی سمت دیکھا۔

”بس یا ربس! میں دوست میں آیا۔“ وہ کککو سے کہتا اپنے کمرے کی طرف بھاگا اور اپنی شرٹ الماری میں رکھنے کے بعد دوسری شرٹ پہن کر بہن بھائیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

”چلو! آجاؤ اب!“ وہ کککو کو اشارہ کرتے ہوئے بائیک نکالنے لگا۔

”اے امی! خدا حافظ!“ اور پھر وہ بہن بھائی آگے پیچھے خدا حافظ کہتے گھر سے باہر نکل گئے۔



صبح کا وقت تھا اور کراچی کی سڑکیں تھیں۔ جن سے اس وقت ٹریفک کا اتنا ہجوم تھا کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں تھی۔ جب روڈ پہ کوئی سٹپل سرخ ہوتا تو آگے پیچھے ایک دوسرے کے تعاقب میں بھائی دوڑتی گاڑیاں ایک ہی جگہ پہ چابی والے کھلونے کی طرح اسٹاپ ہو جاتیں اور ان رکی ہوئی گاڑیوں میں بیٹھے لوگ بے چینی کے مارے حرکت میں آجاتے۔

اور ولید رحمان گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں کی بے چینی سے لطف اندوز ہوتا اپنی بائیک پہ بیٹھا گنگناہے ہوئے اوھر اوھر دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے ذرا فاصلے پہ کھڑی گاڑی میں بیٹھی ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر مسکراہٹ اچھائی۔ ”جواب! وہ لڑکی بھی مسکرائی۔ جس پہ ولید نے دوبارہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”بھائی!“ کککو نے اسے پیچھے سے کافی آہستگی سے پکارا۔

”ہوں۔؟“ اس نے فوراً گردن موڑ کر کککو کو دیکھنے کی کوشش کی۔

”لفٹ سائیز پہ بھی ایک گاڑی ہے۔ وہ لڑکی بھی آپ کو ہی دیکھ رہی ہے۔ اس کی طرف بھی دیکھیں نا۔ کتنی پیاری ہے۔“ کککو نے اسے کسی اور طرف متوجہ کرنا چاہا۔

”کککو!“ ولید نے اسے سر زلزل کرتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھنا چاہا۔ مگر کککو کو دیکھنے کی کوشش میں اس کی نظریں اس طرف کھڑی اس گاڑی پہ جا پڑی۔ جس میں بیٹھی لڑکی بقول کککو کے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”عزت!“ ولید کے ہونٹوں پہ اک غیر محسوس سی جنبش ہوئی۔

اور وہ لڑکی اس غیر محسوس سی جنبش سے بھی پہچان گئی تھی کہ اس کے ہونٹوں نے کس کا نام چھوا ہے وہ بہت دیر سے اسے ہی تو دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ بخانے کہاں کہاں اور کس کس کو دیکھ رہا تھا۔ مگر عزت حیدر کی طرف دیکھتے ہی وہ ٹھنک گیا اور اس کے ہونٹوں کی گنگناہٹ ایک دم ٹھم سی گئی۔ پھر وہ آہستگی سے نظریں پھیر کر دوبارہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

بے ساختہ عزت نے اسے پکار کر متوجہ کرنا چاہا۔ لیکن پھر اس کی بائیک کے پیچھے بیٹھی یونیفارم میں بلبوس انتہائی نو عمری لڑکی کو دیکھ کر اسے خود پہ قابو پانا پڑا اور وہ اسے پکارتے پکارتے رگ رگی۔ اتنے میں سٹپل بھی گر بن ہو گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گاڑی بڑھا کہ اس کی بائیک کے آگے لے آتی وہ ایک دم اپنی بائیک اڑا لے گیا اور دوبارہ پلٹ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی عزت لب بھینچتے ہوئے اسٹیرنگ پہ مکار سید کر کے رہ گئی۔



اتنے سارے لوگوں میں اتفاق بزدانی مجرم بنا کھڑا تھا۔ کیونکہ شینہ بزدانی کو ہارٹ انٹیک ہوا تھا اور تقریباً ”سب ہی اس ہارٹ انٹیک کا ذمہ دار اتفاق بزدانی کو ہی سمجھ رہے تھے۔ آخر رات کو ہی تو شینہ بزدانی کو پتا چلا تھا کہ اتفاق نے فارہ کو فون کال کی تھی اور اس فون کال میں اس نے فارہ سے جو کچھ کہا تھا اسے جان کر وہ دل پہ صدمہ نہیں سہا رہی تھیں اور رات کے تین بجے انہیں دل کا دورہ

ڈرا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے بستر سے ٹھیک ٹھاک اٹھی تھیں اور واٹس روم سے واپس آتے ہوئے اچانک سینے میں اٹھنے والے درد سے دوہری ہو کر نیچے فرش پر جا گری تھیں۔ تب سے اب تک بے ہوش پڑی تھیں۔ وہ سب ان کے ہوش میں آنے کے منتظر بیٹھے ان کی زندگی کے لیے دعا کر رہے تھے۔

جبکہ وہ دونوں باپ بیٹا اپنی اپنی جگہ پہ چپ خاموش اور گم غم سے بیٹھے تھے۔ کوئٹہ چار سال پہلے بھی ان کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہو چکا تھا اور اس نقصان کے بعد وہ دوبارہ کسی ایسے نقصان کا حوصلہ اور ہمت نہیں رکھتے تھے جو انہیں ایک بار پھر خالی کر کے رکھ دیتا۔ اسی نقصان کو سوچتے ہوئے وہ اندر سے خوف زدہ سے بیٹھے تھے۔ لیکن زبان سے اظہار نہیں کیا رہے تھے۔

البتہ وہاں موجود سب جانتے تھے کہ وہ دونوں باپ بیٹا کیوں چپ ہیں۔ اور کس خوف نے ان کی قوت گویائی سلب کر رکھی ہے۔

اسی لیے رضا حیدر نے اسے برابر بیٹھے اشتیاق برودانی کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ کہاں جانتے تھے کہ وہ کس کیفیت کی زد میں ہیں۔

”نیکم۔! تم لوگ بریشان نہ ہو ان شاء اللہ! آئینہ جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔ اللہ سے ہمیشہ بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔ ابھی تو اسے اپنے بیٹے کی شادی کرنی ہے۔ اس کی خوشیاں دیکھنی ہیں۔ اپنے امان پورے کرنے ہیں۔“ رضا حیدر نے ان کا کندھا تھپکا۔

”ہو نہ! ایسی شادی؟ کیسی خوشیاں؟ اور کیسے امان حیدر بھائی؟ ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے جس کی شادی جس کی خوشیاں اور جس کے امان ہم پورے کریں گے۔ ہمارا صرف ایک ہی بیٹا تھا اور وہ چار سال پہلے مرجکا ہے۔“ اشتیاق برودانی کے ایسے سفاک الفاظ پر راجہ بیگم، منورہ رحیم اور نیرواہ کے گلے ملنے میں آگئے۔ اتفاق نے بھی اپنے باپ کی ایسی سفاک اور دل چیر دینے والی بات کہ گردن موڑ کر ان کے چہرے کی سمت دیکھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات بہت پتھر لیے سے محسوس ہو رہے تھے۔ اتفاق ان کے ایسے رویے پہ لب پہنچ کے رہ گیا۔ وہ اندر ہی اندر دوہری اذیت کا شکار تھا۔ لیکن اپنی اس اذیت کو بیان نہیں کیا رہا تھا اور کوئی اسے یا اس کی اذیت کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔

اس کے کتےال باپ بھی نہیں۔ بلکہ وہ بھی نہیں بچو اس کے بہت قریب اس کے سینے کے اندر اس کے دل میں رہتی تھی اور دل میں رہ کر بھی دل کی حرکات و سکنات سے انجان اور بے خبری تھی۔

اتفاق ایک دم وہاں سے اٹھ کر باہر نکل آیا اور طویل راہداری عبور کر کے باہر بیڑھیوں پر آکھڑا ہوا تھا اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ اس کے پاس اپنی اور اپنے ماں باپ کی اذیت کا کوئی حل نہیں تھا۔ اور جو حل تھا۔ وہ اسے کر نہیں سکتا تھا۔

مگر اب اس کے ارد گرد بے بسی کا گھبراہٹ ہو جا رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی وقت ہتھیار ڈال دے گا اور اس بے بسی کے ہاتھوں مجبور ہو جائے گا۔ آخر کب تک وہ ایسا لے بے بسی کی جنگ کو لڑ سکتا تھا؟

”اتفاق!“ اس کے بالکل برابر سے تیمور حیدر کی آواز سنائی دی اس نے چونک کر اپنے ہاتھ نیچے گرا لیے۔

”کیا پرالم ہے؟“ تیمور اس کے برابر کھڑا سامنے مین گیٹ سے لوگوں کی آمد و رفت دیکھ رہا تھا۔ البتہ مخاطب وہ اسی سے تھا۔

”نتھنگ!“ اتفاق نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا اور گہری سانس کھینچتے ہوئے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں پھنسا کر وہ بھی سامنے مین گیٹ کی طرف ہی دیکھنے لگا۔

”دکسی کو پسند کرتے ہو۔“ تیمور نے انتہائی سنجیدگی سے استفسار کیا۔

”ہاں!“ اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے سے کنبے میں اعتراف کیا۔

”دکس کو؟“ تیمور حیدر کا سوال بہت ہی چوٹ کا رہا تھا۔

”فادرہ رحیم کو؟“ اتفاق کا جواب بہت ہی چوٹ کا رہا تھا۔

”واٹ؟ فادرہ کو؟“ تو پھر تو پھر تم اس سے شادی سے انکار کیوں کر رہے ہو؟“ تیمور کو اچنبھا ہوا۔

”ہو نہ! اب کر رہا ہوں یا نہ؟“ اس نے کنبے سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ تم کہہ کیا رہے ہو؟“ تیمور کو الجھن ہوئی۔

”میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ میں فادرہ سے شادی سے انکار نہیں کر رہا۔ اگر میرے ماں باپ اس طرح خوش ہوتے ہیں۔ تو ایسے ہی سہی۔ وہ اپنی خوشی اپنے امان پورے کر لیں۔ وہ جب کہیں گے میں فادرہ کو لے آؤں گا۔ میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے۔“ اتفاق بے تاثر سے انداز میں کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

اور تیمور اس کے ایسے اقرار پر مزید الجھن کا شکار ہو گیا (یعنی وہ یہ سب ماں باپ کے لیے کر رہا تھا۔ اپنے لیے نہیں؟



”بال دیکھتے ہیں اپنے۔ کتنے خشک اور بے رونق ہو رہے ہیں؟“ بی گل نے اپنے قدموں کے قریب نیچے فرش پہ بیٹھی ماوراء کے بالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے خفگی کا اظہار کیا۔

”بالکل ہماری زندگی کی طرح۔ خشک اور بے رونق۔“ ماوراء نے لقمہ دیا۔ سلائی مشین پہ جھکی بی گل کا کرتا سلائی کرتی عافیہ بیگم کے ہاتھ تھکے انہوں نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر ماوراء کو دیکھا لیکن وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف متوجہ تھی۔

”میرا بچہ۔! اپنے بالوں کو بھی خشک اور بے رونق انسان خود بناتا ہے اور اپنی زندگی کو بھی خشک اور بے رونق خود ہی کر ماتا ہے۔ انسان کے بال اور زندگی انسان سے اس کی توجہ مانگتے ہیں۔ توجہ نہ دو تو بال اور زندگی —

اجازت دیران اور بے رنگ ہو جاتے ہیں۔ اچھے ہیں تو پھر اچھے ہی چلے جاتے ہیں۔ لاکھ سنوار۔ پھر نہیں سنورتے بلکہ ان کو سنوارنے میں الٹا تکلیف ہوتی ہے اور جب انسان اس تکلیف سے گزرتا ہے۔ تو پھر سوچتا ہے کہ وہ پہلے ہی توجہ دے لیتا تو اچھا ہوتا۔ کوئٹہ بالوں کو اور زندگی کو چمک دار بنانے کے لیے بڑے بڑے طریقے اور بڑے بڑے حربے آزمانے پڑتے ہیں۔“ بی گل تیل کی شیشی اٹھا کر ماوراء کے بالوں میں مساج کرنے لگیں۔

”کیوں بی گل۔! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو توجہ نہیں دیتے۔ میں طریقے بھی آؤں گی اور حربے بھی اور دیکھیں گے گاؤں زندگی کیسے چمک دار ہوتی ہے۔“ ماوراء نے نظر اٹھا کر عافیہ بیگم کو دیکھا۔ لیکن وہ سلائی مشین کے سامنے بیٹھی بی گل کا کرتا سلائی کرنے میں مصروف تھیں۔ ماوراء کی بات پہ انہوں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ یوں جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

”نن شاء اللہ۔! ایسا ہی ہو گا۔“ بی گل نے صدق دل سے کہا۔ عافیہ بیگم اندر ہی اندر ان کی بات پہ کڑھ کے رہ گئیں لیکن کہا پھر بھی کچھ نہیں۔

”آئینہ۔“ ماوراء نے بھی جواباً ”بڑے دل سے آمین کہا۔

اور بی گل ابھی اس کے بالوں میں تیل سے مساج کر رہی تھیں کہ اچانک ماوراء کا موبائل بج اٹھا موبائل

چونکہ پہلے ہی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے فارہ کا نمبر اس نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔

”کس کافن ہے؟“ کی کل نے ہاتھ روک کر پوچھا۔  
”فارہ کا۔“ وہ کہتے ہوئے فرش سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عافیہ بیگم نے چونک کر دیکھا۔ اور امو بائل لے کر بیڑھیان چھڑ رہی تھی۔

”اب موبائل لے کر دیا ہے تو پھر فون تو آئیں گے۔ صرف پاس رکھنے کے لیے، بیگم کھینے کے لیے یا محض دیکھنے کے لیے تو نہیں لیا اس نے۔“ کی کل نے تیل کی شیشی کا ڈسکن بند کرتے ہوئے کہا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عافیہ بیگم ایک بار پھر چپ چاپ دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئیں لیکن اس کے باوجود ان کا دھیان اور اکی تو آؤ کی طرف ہی تھا جو میٹ ورگ اور سکنلر پر ایلم کی وجہ سے فون سننے کے لیے چھت پہ چلی گئی تھی۔

”ہاں ہاں کوسہ میں سن رہی ہوں۔“ اور ایک ہاتھ میں موبائل پکڑے فون سن رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے تیل لگے بالوں کو سینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اور! وہ۔۔۔ شادی کے لیے مان کیا ہے۔“ فارہ کے لمبے میں دکھ کی لرزش تھی۔  
”کون؟“ اور اکادھیان اپنے گھر کے ساتھ والی چھت کی طرف چلا گیا تھا۔ اس لیے بدھیانی سے پوچھ بیٹھی۔

”وہی جو معذرت خواہ ہو رہا تھا۔“ فارہ کے اندر کی تنگی لمبے میں اٹھی۔  
”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ وہی جو محبت میں غلام نہیں ہوا۔ مگر معذرت خواہ ہو گیا تھا؟“ اور اکو جیسے یاد آگیا۔

”ہاں! وہی۔“ اب کی بار فارہ کا لہجہ دھما ہوا۔  
”تو کیا اب وہ غلام ہونے کے لیے تیار ہے؟“ اور اکے لہجے کی کاٹ کبھی کبھی بہت نمایاں ہو جاتی تھی اور وہ اسے چھانے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھی۔

”نہ تو مجھے نہیں پتا۔! بس اتنی خبر پچی ہے کہ وہ شادی کے لیے تیار ہے۔“ فارہ کے لمبے میں کسی خوشی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔

”دوسرے دن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر وہ تیار کیسے ہو گیا؟“ اور انے وجہ جانی چاہی۔  
”دو روز پہلے شینہ آئی کوہارٹ انیک ہو تھا۔“ فارہ نے آہستگی سے بتایا۔

”وہ۔۔۔ اچھا اچھا۔ تو اس غلام کی رضامندی کے پیچھے وجہ ہارٹ انیک ہے؟“ اور انے پرسوج اور سمجھنے والے انداز میں کہتے ہوئے سر ہلایا۔

”ہوں! بالکل۔“ فارہ نے اعتراف کیا۔  
”صدقے جاؤں اس ہارٹ انیک کے۔“ اور اکی طرف سے طنز کا ایک اور نشتر چلایا گیا۔ فارہ خاموش ہی رہی۔

”تو پھر اب آپ جناب کا کیا ارادہ ہے۔“ اور انے آگے کا پوچھا۔  
”میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ فارہ کا جواب انکار میں تھا۔

”مطلب۔؟“ اور اکا سوال نا سمجھی کے لیے ہوئے تھا۔  
”مطلب یہ کہ میں یہ شادی نہیں کروں گی۔“ فارہ نے اسے صاف صاف اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

”ہونہ۔! کون کتا ہے کہ تم یہ شادی نہیں کرو گی؟“ اور اکے لمبے میں استہزا اتر رہا تھا۔  
”کیا مطلب ہے تمہارا۔؟“ فارہ چونکی۔

”میرا مطلب ہے کہ تم یہ شادی کرو گی اور ضرور کرو گی۔ کیونکہ تمہاری ری تو پہلے ہی محبت جیسے مدار کی ہاتھ میں ہے۔ ساری نچائے گا اور تم ناچو گی۔ انکار کو تب بھی۔ انکار کو تب بھی۔ ناچنا تو تمہاری قسمت میں لکھا ہے۔ اس لیے ناچنا تو پڑے گا ہر صورت میں اور ہر حال میں۔ کیونکہ زندگی میں انسان کو صرف وہی چیزیں نجاتی ہیں۔ ایک اس کی مجبوری اور دوسری اس کی محبت۔ یہاں بھی یہ معاملہ صاف ظاہر ہے۔ آفاق برزاقی مجبوری میں ناچ رہا ہے اور فارہ رحیم محبت میں۔ اس لیے انکار کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔“ اور انے کہتے ہوئے کندھے اچکا ئے۔

”لیکن اور!۔! میں اس کی مجبوری سے شادی نہیں کروں گی۔ وہ میری محبت کو بیاہنے کے لیے تیار نہیں ہوا تو میں اس کی مجبوری کو بیاہنے کے لیے کیسے مان جاؤں؟ کیا اس کی مجبوری بڑی ہے میری محبت سے؟“ آج لگ رہا تھا کہ فارہ کا دل بہت ٹوٹا ہوا تھا۔ جس کی نوکیلی کرچیاں اس کے لمبے اور اس کے لفظوں سے ہی محسوس ہو رہی تھیں۔

”بڑی تو ہے نا۔! آخر ہارٹ انیک ہوا ہے اس کی اندر کو۔“  
”ن کوہارٹ انیک ہوا ہے اور! لیکن میرا ہارٹ ٹیل ہو سکتا تھا۔ جب اس نے معذرت کی تھی۔“ فارہ پھر سنی۔

”تمہارا ہارٹ ٹیل ہوتا۔ تو ہو سکتا تھا کہ وہ بھی تمہاری محبت کو بیاہنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ مگر تمہارا ہارٹ ٹیل نہیں ہوا۔ اس لیے وہ بھی تیار نہیں ہوا۔ لیکن اب اس کی اندر کوہارٹ انیک ہوا ہے تو وہ مجبوری کو بیاہنے کے لیے مان کیا ہے اور تمہیں کیا ہے؟ بیاہنے دوسرے بیاہ اچھا ہوتا ہے اور دوسرے بھی محبت کو بیاہ یا مجبوری کو بات تو ایک ہی ہے نا۔؟“ اور انے اسے سکون سے مشورہ دیا فارہ حیرت زدہ رہ رہی۔

”یہ تم کہہ رہی ہو اور!۔؟“  
”جی ہاں۔ یہ میں کہہ رہی ہوں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ دوسرا ہارٹ انیک تمہاری اندر کو آئے اور دو روز بعد تم مجھے کال کر کے کہو کہ میں شادی کے لیے مان گئی ہوں اور! ایک دن دو روز پہلے میری مٹی کوہارٹ انیک ہوا ہے۔“ اور انے اس کی ممکنہ رضامندی کا نقشہ ابھی سے کھینچ دیا۔ فارہ ایک دم جپ ہو گئی۔ کیونکہ اور اکچھ غلط بھی تو نہیں کہہ رہی تھی۔ آخر آفاق برزاقی کے انکار سے اتنی بڑی مصیبت آسکتی تھی تو پھر اس کے انکار سے بھی کوئی طوفان اٹھ سکتا تھا۔ جس کو محض سوچ کر ہی فارہ کا دل لرز گیا۔

”بہتر ہے کہ تم دونوں ایک ہی ہارٹ انیک سے مان جاؤ۔ تاکہ دوسرے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ دیکھو میں تمہاری دوست ہوں۔ میں کبھی بھی تمہیں غلط مشورہ نہیں دوں گی، لیکن اس مشورے سے عمل کرنا تمہاری اپنی مرضی ہے۔ تم خود سمجھو وار ہو۔ اپنے انکار کا ارادہ اقرار میں بدل دو۔ کیونکہ زندگی کے اس موڑ پر اس کی مجبوری اور تمہاری محبت کو تمہارے اقرار کی ضرورت ہے۔ اب قسمت میں آگے کیا لکھا ہے۔ یہ تم آگے جا کر جھٹنا۔“ اور انے بات ختم کرتے ہوئے فیصلہ قسمت پر اور فارہ کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔

لیکن فارہ اس وقت کچھ بھی کہنے کی حالت میں نہیں رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی کہے بغیر آہستگی سے فون بند کر ڈالا۔ اور ایک دم سے ساکت ہو جانے والے موبائل کو دیکھتے ہی اور پھر فارہ کی حرکت پر حقل سے سربجھٹک کر قدم بیڑھیوں کی طرف بڑھانے۔ کیونکہ سامنے والے گھر کی چھت پر کھڑا لڑکا مسلسل آئے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اس لڑکے کو گھورتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

وہ لڑکا چیتا۔ کوئی اچھی تھا۔ کیونکہ اگر اس محلے کا رہنے والا ہوتا تو اسے پتا ہو تاکہ وہ کس مزاج کی اور کس ناپ کی لڑکی ہے۔ اس لیے اسے تاڑنے کی جرات بھی بھی نہ کرتا۔ جیسے محلے کے باقی لڑکے نہیں کرتے تھے۔



”مجھے مجھے ایک بار اس سے پوچھنا تو چاہیے تھا کہ وہ عزت حیدر کے جذبات اور احساسات کو اگر جنک کر گیا ہے تو وجہ کیا تھی؟ کیا میں اسے اچھی نہیں لگی؟ یا اسے کوئی اور اچھی لگتی ہے؟ میں بغیر کسی وجہ کے اور بغیر کسی دلیل کے تو تم میری ذات کی نفی نہیں کر سکتے ناولید رحمان۔ اور نہ ہی مجھ سے اس طرح منہ موڑ سکتے ہو۔ تمہیں کچھ تو کہنا ہو گا۔ تمہیں کچھ تو بتانا ہو گا۔“

وہ بیڑ کراؤن سے ٹیک لگا لے بیٹھی لی وی وی دیکھ رہی تھی۔ جب اس کا دھیان خود بخود ہی ولید رحمان کی طرف چلا گیا اور وہ بے چینی سے لی وی کے چینل بد لے گئی۔ اسے ولید رحمان سے بات کرنے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور وہ اس مسلسل حل سوچنے میں لگا ہوا تھا اور مختلف آئیڈیاز اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔ جن کی وہ مسلسل نفی کیے جا رہی تھی۔

اس کے گھر کا ایڈریس کیا ہے؟ یہ بھی نہیں معلوم۔

وہ کہاں اور کیا جاب کرتا ہے؟ یہ بھی نہیں معلوم۔

یہاں تک کہ اس کا نمبر کیا ہے؟ یہ بھی نہیں معلوم۔

”نمبر؟“

وہ سوچتے سوچتے نمبر پر آکر انگ گئی۔ کیونکہ اگر اسے نمبر مل جاتا تو وہ آسانی سے اس سے بات کر سکتی تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ نمبر کہاں سے؟ اس کے ذہن نے خود ہی سوال اٹھایا۔

”تیمور بھائی۔“ اور جواب میں ذہن خود ہی تیمور کی طرف چل نکلا۔ لیکن دوسرا سوال ذرا مشکل میں ڈالنے والا تھا۔

”مگر میں تیمور بھائی سے ان کے دوست کا نمبر کیسے مانگ سکتی ہوں بھلا؟ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ تیمور بھائی مجھے ولید رحمان کا نمبر چاہیے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس سے کچھ پوچھنا ہے۔“

تیمور کی طرف چلتے چلتے اس کے سوچ کے قدم ٹھک گئے۔ وہ راستے سے پلٹ آئی۔

بے شک ان دونوں بہن بھائی کے درمیان بہت زیادہ ایڈراسٹنڈنگ تھی۔ لیکن ایسے معاملے پر اگر تو ہر بھائی کی طرح اس کی غیرت بھی اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو سکتی تھی۔ وہ اس کی غیرت کو آزمانے اور چیلنر نے کارسک نہیں لے سکتی تھی۔

مگر مسئلہ یہ بھی تھا کہ تیمور کے سوا ولید رحمان کا نمبر ایڈریس بھی تو کہیں اور سے نہیں مل سکتا تھا۔ ولید کا نمبر تیمور کے موبائل میں محفوظ تھا اور موبائل تیمور کے پاس تھا۔

”موبائل؟“ پہلے نمبر اور اب موبائل۔ اس کی سوئی انگ گئی تھی۔ اچانک وہ کچھ سوچتے سوچتے لی وی کا ریویو بیڈ پر اچھال کر بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے چہرے کے تمام تاثرات پر قابو پاتے ہوئے سٹیپر بہن کر باہر نکل آئی۔ اس کا رخ تیمور کے بیڈ روم کی طرف تھا۔

لیکن بیڈ روم کے دروازے کے قریب پہنچ کر اس کے قدم رک گئے۔ چند لمحوں دروازے کے باہر ٹھہر کر اسے اپنی ساری ہمتیں جمع کرنی پڑیں اور اس کے بعد کہیں اس نے تیمور کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دینے کی جرات کی تھی۔

”ہوں۔ کون؟“ اندر سے اس کی مصروف آواز سنائی دی۔ عزت نے دروازہ ذرا سادھ لکھ لکھ کر اندر جھانکا۔

”مے آئی کم ان سر۔“ عزت نے خاصے خوشگوار موڈ میں پوچھا۔ تیمور ایک دم چونک گیا۔

”ہیس ڈار لنگ۔ کم ان۔ کم ان۔ آخر تمہیں اجازت کی کیا ضرورت؟“ تیمور نے اسے دیکھتے ہی بے اختیار اپنے سامنے بیڈ پر رکے لیپ ٹاپ کو کیچھے سرکادیا اور اپنی پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ دروازے کو ذرا اور دھکیلتی ہوئی اندر آئی۔

”ہائے۔ کیا ہو رہا ہے اس وقت؟“ وہ متوازن قدموں سے چلتی اس کے بیڈ کے کنارے آ کے ٹک گئی۔

”بس۔ ادنیٰ جو روز ہوتا ہے کام کام اور کام۔“ تیمور نے کندھے اچکاتے ہوئے بیڈ پر بکھرے کاغذات، فائلز اور لیپ ٹاپ کی سمت اشارہ کیا۔

”مگر مجھے تو اس کام کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔“ عزت نے حیرت سے کہا۔

”وہ کیوں؟“ تیمور کو اس کی حیرت پر حیرت ہوئی۔

”وہ اس لیے کہ لی وی بھی چل رہا ہے لیپ ٹاپ بھی آن ہے اور فائلز بھی کھلی پڑی ہیں۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا اور کس نوعیت کا کام کر رہے ہیں؟“ عزت کی مصنوعی حیرت سنوڑ گئی۔ تیمور اس کی حیرت کا مفہوم جان کر بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”بس یا۔“ میرا کام کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک ہی وقت میں کئی کام کرنے پڑتے ہیں اور اس وقت بھی یہی ہو رہا ہے کام بھی کر رہا ہوں اور ساتھ ساتھ نیوز بھی سن رہا ہوں۔ کیونکہ اتنی فرصت تو ملے گی نہیں کہ میں یہ دونوں کام الگ الگ وقت پر کر سکوں۔ اس لیے مجھ جیسے آدمی کو سب کچھ ساتھ ساتھ کرنا پڑتا ہے اور ابھی تو شکر ہے کہ فرائض بند ہے۔ ورنہ وہ بھی کام کے دوران بھی کان سے لگا ہوتا۔“ تیمور بے چارگی سے ہنسنے ہوئے مسکرایا اور عزت کو سن کر افسوس ہونے لگا۔

”ہوں۔“ کانٹنٹ روٹین ہے آپ کی بھی۔ اتنا کام کرتے ہیں آپ۔ میں نے خواہ مخواہ آپ کو ڈسٹرب کر دیا اگر۔“ عزت معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولی۔

”ارے نہیں نہیں میری جان! مجھے تو بہت خوشی ہوئی ہے تمہیں یہاں دیکھ کر۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ تم یہاں کی کام سے آئی ہو۔“ تیمور نے پر شفقت لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ہاتھ چڑ کر نرمی سے تھپکا عزت ایک دم ٹھنک گئی۔

”کیا مطلب؟“ آپ کو کیسے پتا کہ میں یہاں کسی کام سے آئی ہوں؟“ عزت نے تیمور کے ہاتھ میں تھمے اپنے ہاتھ کو بمشکل لرزے سے روکا۔ کیونکہ تیمور کی بات یہ اس کے اندر کا چور بدک گیا۔ تیمور مسکرا دیا۔

”ناہم نہ لمحہ۔“ اس نے وال کلاک کی سمت اشارہ کیا۔ جہاں اس وقت رات کے ایک بجنے میں محض چار منٹ باقی تھے۔

”جی۔“ وہ میں بھی جاگ رہی تھی۔ اس لیے چلی آئی۔“ اس نے وال کلاک سے نظر ہٹا کر چہرہ جھکا لیا۔

”جاگ کھول رہی تمہیں؟“ تیمور نے نرمی سے پوچھا۔

”نہیں ایسے ہی ایک فریڈ سے ٹیکسٹ چیٹ ہو رہی تھی۔ لیکن مسیجنڈ کرتے کرتے اچانک میٹ ورک میں کوئی پرابلم آ گیا ہے اور مسیجنڈ نہیں ہو رہا۔ نہ ہی کال مل رہی ہے۔ اس لیے۔“ اس نے کہتے ہوئے بات ادھوری پھوڑ دی اور تیمور اس کا کام سمجھ گیا۔

”اس لیے جس میں میرا موبائل چاہیے ہے۔“ تیمور نے اس کی ادھوری بات کو مکمل کیا۔

”جی۔“ اس ٹھوڑی دیر کے لیے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”پاک۔“ جب ضرورت ہے تو پھر تھوڑی دیر کیا اور زیادہ دیر کیا۔ وہ چار جنک پ لگا ہے۔ لے جاؤ۔“ تیمور نے

اس کے سر پہ چپٹ لگاتے ہوئے کہا اور بیڈ کی دوسری سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”ٹھیک ہو بھائی! ٹھیک یو سوچ۔“ وہ تیزی سے اٹھی اور اس کا موبائل چار جگہ سے ہٹا کر ہر کھل گئی  
 اپنے بیڈ روم کی طرف واپس آتے ہوئے اپنے ہاتھ میں تھے تیور کے موبائل کو دیکھ کر اس کے من کی کلی کھل  
 اٹھی تھی۔

پھر اپنے بیڈ روم میں اگر دو اواز مقلد کیا اور پھر اپنے بیڈ پہ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد اس نے تیور کے  
 موبائل میں محفوظ تمام کانٹیکٹ نمبرز سے ڈیلو تلاش کیا۔ ولید کا نمبر ٹاپ پر آگیا۔ جس کو بڑی احتیاط سے اپنے  
 موبائل میں محفوظ کرتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لیے مطمئن ہو گئی۔ کیونکہ اب اسے ولید رحمان سے بات کرنے کے  
 لیے لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔

\*\*\*

ولید اپنی کسی رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں نیوز چینل کے آفس میں مسلسل بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ جب  
 اچانک اس کا موبائل بجنے لگا۔ پہلے تو وہ نظر انداز کیے اپنے کام میں لگا رہا۔ لیکن جب موبائل کی گھنٹی پھر پھر بجتی  
 رہی تو مجبوراً اسے موبائل نکال کر دیکھنا ہی پڑا۔ اسے موبائل کی اسکرین پر ایک انجان نمبر نظر آیا جس کے  
 باعث اس نے فوراً فون ریسیو کیا۔

”ہیلو!“ غلطی سے باوجود اس نے اپنے لہجے میں سکون اور ٹھہراؤ رکھا۔  
 ”ولید رحمان؟“ دوسری طرف نسوانی آواز آئی اور آواز بھی وہ جس کو سن کر ولید اپنے اندر تک ٹھٹک گیا۔  
 حالانکہ یہ آواز فون پر وہ پہلی بار سن رہا تھا۔ لیکن پہچانی ایسے تھی۔ جیسے صدیوں سے سنا آ رہا ہو۔  
 ”آپ کی خاموشی بتا رہی ہے کہ آپ ولید رحمان ہی ہیں؟“ اس کے لہجے کا سکون ولید کے سکون سے بھی  
 زیادہ دہڑھٹا۔

”جی! میں ولید رحمان ہی ہوں اور آپ۔“ اس نے اجنبی ہو جانا چاہا۔  
 ”آپ کی خاموشی یہ بھی بتا رہی ہے کہ آپ مجھے پہچان کر ہی خاموش ہوئے ہیں۔“ اس کا جواب استغنائیہ ما  
 تھا۔

”آپ نے فون کیوں کیا؟“ ولید نے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔  
 ”آپ کو خاموش کرنے کے لیے۔“ اس کا لہجہ پل بھر میں بدلا۔  
 ”کیا مطلب؟“ وہ الجھا۔

”ولید صاحب! مطلب پوچھنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن مطلب سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپ اگر  
 مطلب سمجھنے کا وعدہ کریں تو مطلب بتاتی ہوں۔ ورنہ رہنے دیں۔“ وہ بھی اپنی طرزی کی ایک سی لڑکی تھی۔  
 ”میں بہت مصروف ہوں۔ مجھے اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ اس نے ٹالنا چاہا۔

”مصروف تھے تو مطلب کیوں پوچھا؟ اور اگر پوچھ ہی لیا ہے تو ذرا سا حوصلہ پیدا کر س خود میں۔ ساری بات  
 کہہ دوں گی۔ بس آپ کی مصروفیت سے چند بل دور کار ہیں۔ پھر آپ کو میرے فون کا مطلب بھی سمجھ میں آجائے  
 گا اور اپنی خاموشی کی وجہ بھی پتا چل جائے گی۔“ اس کا لہجہ مبہم سا انداز لے رہے تھے۔

ولید تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اسے واقعی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور دوسری طرف وہ خفگی سے  
 جھنجھلائے لگی۔  
 ”ولید رحمان! آپ کو بات نہیں کرنی تو فون بند کر دیں یوں چپ ہو جانے کا کیا مطلب۔“ اس کی خفگی اور

جھنجھلاہٹ اس کے لہجے سے ہی نمایاں ہو رہی تھی۔  
 ”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں واقعی بہت مصروف ہوں۔“ ولید نے اپنے لیے اور انداز کی اجنبیت  
 پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”آپ فارغ عجب ہوں گے؟“ وقت بتا دیں۔ میں کال کر لوں گی۔“ اس نے اس کی مصروفیت کا صلہ نکالا۔  
 ”میری فراغت کا نام مقرر نہیں ہے۔ ایم سوری۔“ ولید نے معذرت کی۔  
 ”اؤکے! این یو ڈش۔ آپ کے پاس وقت نہیں ہے۔ میں کال نہیں کر لوں گی۔ مگر اس وقت آخری بات یہ  
 بتا دیں کہ آپ تیور حیدر کی بہن کو انٹرویو کیوں کر رہے ہیں؟“ اس کا جواب ہلکا ہوا تھا۔

”کیونکہ وہ تیور حیدر کی بہن ہے۔“ ولید کا جواب ہر جتہ آیا۔  
 ”اور اگر وہ تیور حیدر کی بہن نہ ہوتی تو۔۔۔“ اس کی برجستگی بھی کمال کی تھی۔  
 ”تو پوچھ لیں کچھ اور ہوتی۔“ وہ بھی بے ساختہ کہہ گیا۔

”پوچھ لیں کچھ اور ہوتی۔“ مطلب۔۔۔؟“ وہ الجھی۔  
 ”مطلب یہ کہ شاید پھر میں اپنی مصروفیت سے ٹائم نکال ہی لیتا۔“ اس نے اپنی مجبوری بتائی۔  
 ”وہ! تو پھر یوں کہیں تاکہ آپ صرف تیور حیدر کی بہن کے لیے مصروف ہیں۔ ورنہ آپ کے پاس سب  
 کے لیے فراغت ہے۔ سب کے لیے ٹائم ہے۔“ دوسری طرف اس کا لہجہ بجھ گیا اور ولید کو ایک بار پھر ٹھٹھٹا

پڑا۔  
 ”نہیں! میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ اس نے اس کی بات کی نفی کی۔  
 ”آپ نے جو کہا میں نے سن لیا۔ کوشش کر لوں گی کہ آئندہ آپ کی مصروفیت میں غلغلہ نہ ڈالوں۔ البتہ اس  
 کوشش میں میں کہاں تک کامیاب ہوتی ہوں۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں۔ مگر پھر بھی کوشش ضرور کر لوں گی۔ اللہ  
 حافظ۔“ غلطی ہی بل اس نے بات ختم کر کے فون بند کر دیا۔ اپنی ٹیبل کے قریب کھڑا ولید اپنے موبائل کو دیکھتا رہا  
 گیا۔

”عزت حیدر!“ وہ زرب لب بڑبڑایا اور پھر بے ساختہ لب بھینچ لے۔  
 ”تم نہیں جانتیں۔۔۔ تم کچھ بھی نہیں جانتیں عزت حیدر۔ زندگی میں سب کچھ بتانے کے لیے نہیں ہوتا۔  
 کچھ خاموش ہو جانے کے لیے بھی ہوتا ہے۔ محسوس ہو جانے کے لیے بھی ہوتا ہے اور محسوس ہونے کے لیے بھی  
 ہوتا ہے۔“ وہ دل میں بولا اور لیٹ گیا۔

میرے جسم سے اس کی خوشبو آج بھی آتی ہے  
 میں نے فرصت میں بھی خود سے لگایا تھا اسے

\*\*\*

شہینہ یزدانی کے اسپتال سے فارغ ہو کر گھر آتے ہی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ اشتیاق یزدانی اور شہینہ  
 یزدانی اتنے خوش تھے آج کل کہ کوئی بھی ان کی خوشی کی انتہا کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ اتفاق ان کی اس قدر خوشی  
 دیکھ کر اندر سے اور بھی افسردہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

اس کے ماں باپ کب سے اس مسرت کے انتظار میں تھے اور وہ انہیں یہ خوشی دے ہی نہیں پا رہا تھا!  
 لیکن اب جب انہیں اس خوشی کا پروانہ دے دیا تھا تو اسے اپنا دل بھی کچھ ہلکا ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ دل کے  
 بوجھ میں ذرا کمی محسوس ہوئی دل کی دھڑکن بھی بڑی سبک رفتاری سے دھڑکنے کا کام کرنے لگی۔ وہ شادی کے تمام

ہنگاموں اور تیاریوں کو کافی دلچسپی سے انجوائے کر رہا تھا۔  
ہر پریشانی اور ہزارہت کو بھول کر وہ دو سال پہلے والا اتفاقِ بددلی بن چکا تھا۔ جس کے خواب و خیال کی دنیا سے  
لے کر حقیقت کی دنیا تک صرف اور صرف فارہ رحیم کا راج تھا۔ اور اس دنیا میں وہ اس کے تابع رہتا تھا۔ اس کا  
غلام بن کے۔  
جہاں وہ اس کی بلکوں کی جنبش پہ حرکت کرتا تھا اور اس کی آنکھ کے اشاروں پہ سر جھکا تھا اور اگر وہ ابرو اچکا کر  
دیکھ لیتا تو جان پہ آتی تھی۔  
اور ایسا ہی اس کے ساتھ آج کل بھی ہو رہا تھا۔ دل غلامی پہ آنا اور دل غ دلیوں پہ بعد تھا۔  
لیکن کامیابی آج کل دل کو ہی حاصل تھی۔ کیونکہ دل نے دلغ کی طرف سے کان بند کر لیے تھے۔ وہ کچھ بھی  
سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بس اپنی سوچ میں رواں تھا اور زندگی کو انتہائی قریب سے محسوس کر رہا تھا۔

\*\*\*

”اسلام علیکم بابا۔“ اکیسے ہیں آپ۔؟“ تیمور تیار ہو کر آفس کے لیے نکل رہا تھا۔ جب اسے رضا حیدر کے  
بلاوے۔ ان کے بیڈروم میں آنا رہا تھا۔  
”وعلیکم السلام۔“ جیتے رہو خوش رہو۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ کیسے ہو۔؟“ وہ بیڈر پہ لیٹے ہوئے تھے۔ اسے  
دیکھ کر تکیے کا سارا لیتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور بیڈر کاؤن سے ٹیک لگالی۔  
”اللہ کا شکر ہے۔ میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس آفس کے لیے نکل ہی رہا تھا کہ آپ کا پیغام پہنچ گیا۔“ تیمور نے  
کندھے اچکا۔

”ہاں۔ اور اصل تمہیں یہ بتانا تھا کہ تمہیں فیصل آباد جانا ہے۔ ٹینہ اور اشتیاق کے ساتھ۔“ رضا حیدر  
نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی طبیعت کو ذرا فریش کرنا چاہا۔

”فیصل آباد۔“ ٹینہ آئی اور اشتیاق انکل کے ساتھ۔ مگر کیوں۔؟“ اس نے حیرانی سے سوال کیا۔  
”وہ لوگ اتفاق اور فارہ کی شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو  
کہا تھا، مگر تم جانتے ہو کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آج شام چھ بجے ڈانکر کے ساتھ اپائنٹمنٹ بھی ہے  
اس لیے میں نے ٹینہ سے کہہ دیا تھا کہ تم لوگوں کے ساتھ میرے بجائے تیمور چلا جائے گا اور تمہارے جانے کا  
سن کر وہ بہت خوش بھی ہے کیونکہ اسے پتا ہے کہ تم مجھ سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے سارے معاملات طے  
کر لو گے۔“ انہوں نے اسے آنا دیکھا۔

”معاملات۔“ اکیسے معاملات بابا جان۔؟ آپ کو پتا بھی ہے کہ میں صرف بزنس کے معاملات ہی طے کر سکتا  
ہوں اس کے علاوہ مجھے کسی اور چیز کی کوئی خبر نہیں ہے اور یہ شادی بیاہ کی تو بالکل بھی نہیں۔“ تیمور بدک گیا۔  
”خبر کھو گے تو خبر ہو گی نا۔؟ اور ویسے بھی یہ کون سا مشکل کام ہے۔ صرف ایک دوسرے سے مشورے کے  
ساتھ ڈیٹ فکس کرنی ہے اور مندی ناپوں، بارات اور رخصتی کی ٹائمنگ طے کرنی ہے۔ باقی کوئی چھوٹا موٹا  
مسئلہ ہوا تو وہ بھی ڈسکس کر لیتا۔ بس اتنا سا تو کام ہے۔“ انہوں نے بڑی سہولت سے اس سارے کام کو اتنا سا کام  
کہہ کر بات ہی ختم کر ڈالی تھی۔

”مگر بابا۔“ اچھے یہاں کام ہے۔ میں آفس چھوڑ کے کیسے جاسکتا ہوں بھلا۔؟“ وہ جھنجھلا نے لگا۔  
”جیسے اپنے کسی کام سے جاتے ہو۔؟“ رضا حیدر سکون میں تھے۔  
”مگر میں فیصل آباد۔“ تیمور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے فیصل آباد کی سڑکوں پہ دھلنے والی ایک ہنگامہ خیز شام

یاد آتی اور فیصل آباد کے لیے پابندیدگی کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔  
”جانتا ہوں، تمہیں فیصل آباد پسند نہیں ہے۔ مگر پھر بھی دعا ہے کہ تمہیں فیصل آباد پسند آجائے اور ایسا پسند  
آئے کہ تم بار بار وہیں جاؤ اور بھاگ بھاگ کر جاؤ۔“ وہ کہتے ہوئے مسکرائے۔  
”نہیں۔“ ایسی بات نہیں ہے، فیصل آباد اتنا برا بھی نہیں ہے۔ بس کسی شہر کسی جگہ پہ دل لگنے کی بات ہوتی  
ہے۔ دل لگ جائے تو سب کچھ پسند آ جاتا ہے۔“ وہ بہت آہستہ سے بولا۔  
”اوپ۔“ یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ کرے تمہارا فیصل آباد میں دل لگ  
جائے۔؟“ وہ معنی خیزی سے گویا ہوئے۔

”دعا تو بہت اچھی ہے مگر بس دعا تو اور اچھی ہو جائے گی۔ فیصل آباد میں آنا جانا آسان ہو جائے گا میرا۔“  
تیمور اپنے خیال کی تصدیق کسی کا پیڑ سجا کے مسکرایا۔  
”ہائیں۔؟ یہ تم کہہ رہے ہو۔؟“ نہیں حیرت کا جھکا لگا۔

”جی۔“ اب میں ہی کہہ رہا ہوں۔ آپ بس دعا کیجئے میں فیصل آباد میں دل لگانے کے لیے تیار ہوں۔ میرا  
مطلب ہے کہ فیصل آباد جانے کے لیے تیار ہوں۔ آپ ٹینہ آئی کو بتا دیجئے۔“ وہ کہہ کر ہر نکل گیا۔  
اور رضا حیدر حیران پریشان رہ گئے کہ تیمور کے منہ سے ایسی بات۔؟ حیرت ہی تو تھی۔

\*\*\*

”فارہ! میں نہیں آسکتی۔ تمہیں پتا تو ہے کہ میرا تمہارے گھر آنا کتنا مشکل ہے؟ امی اجازت نہیں دیں  
گی۔“ اور انے اسے ٹالنا چاہا۔

”مگر مارا۔“ اتم پہلے بھی تو ایک دو بار میرے گھر آچکی ہونا۔ وہ بھی آئی کی اجازت کے بغیر۔ تو پھر اب کیوں  
نہیں۔؟“ فارہ آفاق کی وجہ سے پہلے ہی ایک عجیب سی تکلف کا شکار تھی، اب ماورائے انکار پہ مزید روپا کسی  
ہوئے تھی۔

”فارہ! فارہ! پلیز پہلے کے آنے میں اور اب کے آنے میں بہت فرق ہے یا۔ پہلے میں دن کے وقت  
آئی تھی۔ وہ بھی صرف دس پندرہ منٹ کے لیے اور اب تم رات کے وقت آنے کا کہہ رہی ہو۔ وہ بھی دو تین  
گھنٹوں کے لیے۔ تو پھر تم خود سوچو کہ ایسے ٹائم میں، میں امی کی اجازت کے بغیر گھر سے کیسے باہر نکل سکتی ہوں  
۔؟“ اور انے انہاں سے سوال کیا۔

”مگر میں اور کیا کروں۔؟ کس سے کہوں کہ میں آئی ہوں۔ اور مجھے کسی کی پہلپ کی ضرورت ہے۔ یہاں  
میری کوئی نزن نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے سوا اور کوئی دوست ہے۔“ فارہ تو جیسے روہنے کو تھی۔

اور پھر چند خانے کے لیے خاموش ہو گئی۔ اسے فارہ کے بارے میں سوچ کر اس پہ ترس آیا۔  
”دلورہ! پتاؤ اور کس سے کہوں۔؟“ کس سے التجا کروں کہ میری شادی ہے اور مجھے کسی دوست کے  
سارے اور اپنائیت کی ضرورت ہے؟ میں اتنی خوشی کے باوجود اندر سے بہت پریشان ہوں اور مجھے اس پریشانی میں  
کوئی تسلی دینے والا چاہیے۔ کوئی ایسا جو مجھے۔ میری تکلیف اور میری اذیت سمیٹ سمجھ سکے۔“

فارہ کہتے کہتے رو پڑی اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ماورائے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ کوئی طنز اور  
کوئی چوٹ نہیں کر سکی اور نہ ہی اس نے کوئی سخت ست الفاظ کہے۔ بلکہ چپ کی چپ رہ گئی۔ فارہ نے آہستہ  
سے فون بند کر دیا۔

”اگر۔“ اچپ کیوں ہو گئی ہو پچ۔؟ سہیلی ناراض ہو گئی کیا؟“ بی گل کے سوال پہ وہ چونک گئی اور پھر



میرٹھوں سے اٹھ کر محسن میں پہنچی ان کی چابپائی بہ آہستہ۔  
 ”سہیل ناراض ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے حد درجہ سنجیدگی سے استفسار کیا۔  
 ”تو سہیل کو سہیل بن کر ماننا چاہیے۔“ بی بی گل کا جواب پر سکون سا تھا۔  
 ”اگر ماننا مشکل ہو تو؟“

”تو پھر سہیل آسانی سے کھو جاتی ہے۔ اور جو آسانی سے کھو جاتے ہیں وہ بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔“ بی بی گل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے تھپکا۔  
 ”نگہری گل میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔“ ماورا نے بے حد آہستگی سے نفی میں گردن ہلائی۔  
 ”تو پھر مرنالو۔“ ان کا وہی مشورہ تھا۔  
 ”ہوں! اب یہی سوچ رہی ہوں کہ ماننا تو پڑے گا ہی۔ مگر اس کو ماننے سے پہلے اسی کو ماننا زیادہ ضروری ہے۔“ ماورا کا انداز نکاتی پر سوچ سا تھا۔  
 ”تو ٹھیک ہے نا۔ جو زیادہ ضروری ہے پہلے وہ کرلو۔“ وہ تو ہر بات پر متفق اور پر سکون ہی تھیں۔  
 ”لیکن اسی آئیں گی تو تب نا۔؟“ پہلے تو سہیل اتنی دیر نہیں لگائی انہوں نے۔“ ماورا نے موبائل اسکرین پر ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا۔! بازار میں دیر ہو ہی جاتی ہے۔ ابھی آجائے گی۔“ فکر نہ کرو۔“ بی بی گل اٹھ کر بیٹھ گئیں۔  
 اور ماورا عافیہ بیگم کا انتظار کرنے لگی۔ کیونکہ اسے قارہ کے پاس پہنچنا تھا اور وہ لیٹ ہو رہی تھی۔



عافیہ بیگم کو ماورا کے جانے کا سن کر یوں لگا۔ جیسے کرنٹ چھو گیا ہو۔ وہ بدک گئیں۔ انہوں نے ماورا کو خاصی سخت نظروں سے دیکھا۔

”پیلیز! میری اور کوئی دوست نہیں ہے اور نہ ہی میرا کسی کے گھر آنا جانا ہے۔ بس صرف یہی ایک دوست ہے اور اب وہ بھی چار دن کی سمان ہے شادی ہو گئی تو کراچی چلی جائے گی۔ بعد میں پھر کب ملاقات ہوگی یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا۔؟ لیکن پلیز جتنا عرصہ وہ یہاں ہے اور جب تک اس کی شادی کا فنکشن ہے۔ تب تک ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی اور فنکشن اینڈ کرنے کی اجازت دے دیں۔ صرف اس بات پر بھروسہ رکھ کے کہ اللہ کے کرم سے اگر پہلے کبھی کچھ نہیں ہو اتوان شاء اللہ اب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کی بیٹی ماورا امرتھن آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔“ ماورا نے بڑے مضبوط لہجے میں انہیں دلایا۔ جس سے انہوں نے بی بی گل کی سمت دیکھا۔ وہ توازن سے اسی کی طرف وار تھیں اور اسی کی حمایت میں بولتی تھیں۔ اس وقت بھی انہوں نے اسی کی حمایت میں سر ہلایا۔

”جانے دو عافیہ! اللہ یہ بھروسہ رکھو۔ اپنے خوف کو اپنی بیٹی کی خوشیوں کے آڑے مت آنے دو اسے زندگی جی لینے دو اپنی۔“ انہوں نے آگے بڑھ کے عافیہ بیگم کے سر پہ ہاتھ رکھ کے ان کی ہمت بندھائی اور انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

”پی! میں آپ کے جسم کا۔ آپ کی ذات کا حصہ ہوں۔ میں آپ کا اپنا آپ ہوں۔ کیا آپ کو اپنے آپ پر بھی یقین نہیں ہے؟“ ماورا کا لہجہ اور سوال دونوں ہی دست عجیب سے ہو رہے تھے۔  
 اور وقتی طور پر عافیہ بیگم کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پہ جوں کی توں چپ چاپ بیٹھی رہ گئیں۔

”عافیہ۔! بی بی گل کی آواز پر وہ کسی گھرے خیال اور کسی گہری دلیل سے چونک گئیں اور پھر ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے ان دونوں کی سمت دیکھا۔  
 ”ٹھیک ہے۔! تم جانتی ہو۔ مگر اتنا یاد رکھنا کہ تم میری زندگی بھر کی جمع پونجی ہو۔ اگر اس جمع پونجی کو ذرا سا بھی نقصان پہنچاؤ تو زندگی میں بھی نہیں رہوں گی۔ کیونکہ میں پہلے بھی یہ نقصان اٹھا چکی ہوں۔ اب اور حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔“ عافیہ بیگم پھیلے لہجے میں کہہ کر وہاں رکی نہیں تھیں۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں اور وہ دونوں دیکھتی رہ گئیں۔

”بی بی گل! ماورا نے خاصی بے بسی سے ان کے چہرے کی سمت دیکھا۔  
 ”بس۔ بس۔“ تم جانے کی تیاری کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے ماورا کو پریشان ہونے سے روکا۔  
 اور پھر بی بی گل کے کہنے پر دل پہ افسردگی اور بد مزگی کا بوجھ لیے اٹھ گئی تھی۔ لیکن پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ تیار ہو کر ہر نقلی تو تب بھی اس کا یہی حال تھا۔  
 ”بی بی گل۔“ میرا کہیں بھی جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ میں کیا کروں؟ کیا کروں؟ آخر؟ ماورا خاصی بددل ہو رہی تھی۔ لیکن بی بی گل نے اس کا حوصلہ کرنے نہیں دیا۔

”کی بھو بیٹا! تم اس وقت کچھ مت سوچو۔ صرف یہ سوچو کہ تمہاری سہیلی تم سے ناراض ہے اور تمہیں اسے کسی بھی طریقے پر ماننا ہے۔ اس کی ناراضی کا مان رکھنا ہے۔ اگر نہ رکھا تو وہ تم سے کھو جائے گی اور تم کو ہمیشہ پشیمانی رہے گی۔ جبکہ عافیہ تمہاری ماں ہے۔ ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی۔ تم اپنی ماں کو ماننا سکتی ہو۔ جب چاہے اسے راضی کرو۔ ماں کو راضی کرنا اور رب کو راضی کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ سچے دل سے ایک بار بھی توبہ کرلو تو فوراً مان جاتے ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ تم اس وقت کشمکش کا شکار ہو۔ مگر بیٹا! میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم خوشی خوشی جاؤ۔ تمہاری نیت اچھی ہے۔ اللہ رحم کرے گا۔ شاباش۔ جاؤ جلدی جاؤ۔“ بی بی گل نے اسے بھرپور تسلی سے نوازا۔ ماورا کو بالآخر خیر مضبوط کر کے قدم اٹھانا ہی پڑا سو وہ ان کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے باہر نکل آئی۔  
 آخر ایک دن تو ایسا ہونا ہی تھا کہ اسے اپنی ماں کی مخالفت کے باوجود بھی کوئی قدم اٹھانا تھا۔ سو اس نے آج ہی اٹھالیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

**خواہن۔! انجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول**

☆ تھلیاں، پھول اور خوشبو      راحت جبین      قیمت: 250 روپے

☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں      فائزہ افتخار      قیمت: 600 روپے

☆ محبت میاں نہیں      لہنی جدون      قیمت: 250 روپے

مکتوبہ کا پتہ: مکتبہ دُعا و انجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

# عید میلاد

”اوہا ہلے لو کے! کسی زمانے میں وال بڑا مال ہوتا ہو گا۔ اب تو وال سب سے مہنگا مال۔ تو شکر کر، شکر سو بنا رہ کھانے کو وال تو رہتا ہی ہے اور وال کون سا پانی میں پکتی ہے۔ ساتھ میں نمک، مرچ، ہلدی اور تھن، اور کب پیاز، زیرے کا بھار، ہرا دھنیا، قصوری میتھی۔۔۔ چلو بھر بھی یا تیل ہو تو وال ایک گرساٹنے آئے کی دباڑی بھری کمائی تو وال ہی نکل لیتی ہے۔۔۔ مرغ مسلم اور برائی کہاں سے لاؤں؟“

مشاق احمد نے روٹی کا تھمہ منہ میں ڈال کر جباتے چباتے بات مکمل کی۔

”اور کیا میں نہیں جانتا کہ تیرے میکے میں کون سا زروے پلاؤ کی دیکھیں چڑھتی تھیں۔۔۔ جیسے ہم ویسے تم۔ خدا کی قسم میں طعنہ نہیں دے رہا۔“ اس نے غی نوٹی بیوی کے ماتھے پر ان گنت ٹپ دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی۔

”ہاں! لیکن اماں سکول سے آتے ہوئے کینٹین کے چھوٹے چاول وغیرہ لے آتی تھی تو منہ کا زائنتہ بدل لیتی تھی۔ یہاں تو دوڑا دھانی ماہ میں وال، آٹھ اور وال کے علاوہ تیسری چیز ہی نظر نہیں آتی۔ میں تنگ آ گئی ہوں کھا کھا کر!“

مشاق نے نظر اٹھا کے بیوی کو دیکھا۔ اس کا لٹھے والا ہاتھ معلق ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی صفری کے سامنے چنگیر میں روٹی اور وال کی پلیٹ ویسے ہی دھری ہوئی تھی۔

”دیکھو سیانی۔۔۔ بشری سیانی!“ ان دو اڑھائی ماہ میں

مشاق کے لاڈلے پار کا آغاز اسی جیلے سے ہوتا تھا۔

”تم تو جانتی ہو باب میرا فاج کا مریض ہے، ماں کے گوڑے جواب دے گئے ہیں۔ پھر مجھ سے چھوٹے بہن بھائی بھی خرچے کے لیے میرا منہ دیکھتے ہیں۔۔۔ اب تم خود ہی بتاؤ یہ وال چاول کی ریڑھی سے میں روزانہ کپاچ پچاچ ہزار فوج کہاں سے لاؤں؟ بڑی مشکل سے ڈبرھ دو سو روپے کی بچت ہوتی ہے۔ جس میں گھر بھی چلانا ہوتا ہے اور ابائی کوئی کا خرچہ بھی نکالنا ہوتا ہے۔“

صفری نے آنسو پونچھے اور کہا ”یہ سب تو مجھے بھی پتا ہے۔ میں دل کو سمجھاتی بھی بہت ہوں۔ پر کیا کروں۔ مجھے چٹھنی چیزوں کا بہت شوق ہے۔ میں اتنے صبر والی نہیں ہوں“ آپ کی ماں بہنوں کی طرح کہ اگر آپ کی ریڑھی سے وال بیچ کر نہ آئے تو میں پانی میں نمک، مرچ گھول کر روٹی کھاؤں۔“

”تم حوصلہ کرو۔ ان شاء اللہ اچھے دن ضرور آئیں گے۔ تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟“ مشاق خدا سے رونا دیکھ کر ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھا تھا۔

”میں بھی کوشش کروں گا کہ وال چاول کی ریڑھی کے ساتھ کچھ اور کام دھندا شروع کروں۔ پر کیا کروں یار۔“ اس نے بات اوچھری چھوڑی اور چہرے پر حد ورجہ افسردگی طاری کر کے صفری کو دیکھنے لگا۔

”میں کچھ اور کام کر نہیں سکتا۔“

”وہ کیوں؟“ صفری نے بے ساختہ سوال کیا۔

”اس لیے کہ روزی روٹی کے پیچھے چوبیس میں سے

میں کھنے لگا اور غی نوٹی اکلوتی بیوی سے غفلت برتا بھی تو تم سے برداشت نہیں ہو گا ناں۔۔۔ پر کتنی ہو تو کسی دوسری جگہ کام شروع کر دیتا ہوں۔“ اس نے شرارت سے بیوی کو دیکھا۔

”کوہ منظور ہے۔۔۔؟“

صفری کم صبری ہو گئی۔ ہاں کتنی ہے تو پھنسی ہے۔ میاں کی شکل دیکھنے سے بھی جانے کی سنہ کتنی ہے تو پتا نہیں کب تنگ وال کافی منہ دیکھنے کو ملے گا۔ تنگ آ کر اس نے کہا۔

”آپ مجھے ای کی طرف چھوڑ آئیں۔“

ہفتوں بعد میکے جانے کا اتفاق ہوا۔۔۔ چھوٹے بہن بھائی تو اس کی شکل دیکھ کر ہی حق دق رہ گئے۔ وہ شادی کے بعد بھڑکیلے کپڑے لٹال لٹال ہوتے چہرے، چھن چھن کرنی چوٹیوں والی صفری کہاں مرمرائی؟ ماں کے سینے سے لگ کے اس نے اگلی پچھلی تمام کمرس پوری کر دیں۔

”اماں! لوہاں کی سب سے بڑی عیاشی وال روٹی ہے۔ میرے حلق میں وال بھرا نوالہ چھس جاتا ہے۔“ وہ آنکھوں کا پانی انگلی کی پور سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

”یہ کیا کہا تم نے؟“ ماں کلپارہ اوپر چڑھا۔

”تم ہاتھ پاؤں چھوڑ کے بیٹھ گئی ہو؟ دس جماعتیں میں نے اس لیے براہوائی تھیں؟ بجائے شوہر کی دل جوئی کے یہ سلوک کرتی ہو اس کے ساتھ؟ وہ بے چارہ ایک ریڑھی لگا کے سو دو سو روپے کمائے تو تمہارے زبان کے جیسے پر خرچ کر دے؟ بیمار باپ کے علاج اور گھر کے بلانے اور خرچ نہ کرے؟“

اماں کا جلال ہی جلال تھا۔ صفری نے آنکھ اٹھا کر باپ کی طرف نہ دیکھا۔ روتے روتے وہ بے دم ہو گئی تھی۔ پھر ممتا کا جوش کام میں آیا۔ اسے سینے سے لگا کے وہ خود بھی رو پڑیں۔

”اچھے برے دن ہر ایک پر آتے ہیں۔ لیکن اس



میں ایسے بیویں سے سبق سیکھتے ہیں۔۔۔ ہمارا باپ حق حلال کی کمائی کھلا آتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی نصیحتوں کی پیاری کھول دیتا تھا۔ شادی سے پہلے ان کا ایک لفظ سمجھ میں آیا۔ سنہ سمجھنے کی کوشش کی۔ جب تمہارا باپ حادے میں اچانک دنیا سے رخصت ہوا۔ مسائل کی کڑی دھوپ میں سلگنا پڑا تو ایک ایک لفظ کانوں سے نکل کر دماغ میں پہنچنا شروع ہوا تو دل کو سکون سا ہوا۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ سنہ دل تنگ کیا۔ ہاتھ بہ ہاتھ رکھ کے بیٹھنے کی میرے مذہب میں قطعی منع تھا۔ نہیں۔۔۔ ہمارے باپ نے اٹھنے بیٹھنے ایک ہی بات سمجھائی کہ انسان کی شان کپڑوں اور گھریا سے

نہیں اس کے کردار سے ہے۔ سو الحمد للہ! پورے محلے میں کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ دیکھ سکھ میں پورا محلہ شریک ہوتا ہے۔ کیا یہ اس کا احسان نہیں؟ میرے پاس تو دنیا کی کوئی تعلیم نہیں۔ پھر بھی کبھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ تم تو ایک نہ دو پورے دس سال سرکار کے اسکول میں بڑھتی رہی ہو۔ کیا تمہیں وہاں سے کوئی ہنر نہ ملا زندگی گزارنے کا؟

”ای! کیا کروں میں۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔“ وہ روہی ہو کر رہی۔

ابا نے اسے تھکی دی۔  
 ”انگو! مشتاق کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اپنا حلیہ درست کر۔ رو رو کر آنکھیں سجا رہی ہیں۔“  
 اس نے ابھی غسل خانے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ابا کے فون پر بیل ہوئی۔ اپنا نام سن کر وہ کھنکی۔ فون بند کر کے ابا اس کی طرف آئیں تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ جگمگا رہی تھی۔  
 ”مشتاق کا فون تھا کہ آج صغریٰ ہمیں رہے میرے وال چاول ایک ہوٹل والوں کو اتنے پسند آئے ہیں کہ انہوں نے اپنے ہوٹل میں ملازمت دے دی ہے۔ دو توں وقت کا کھانا اور موٹر سائیکل بھی ہو کر والوں کی طرف سے ہو گا۔ مستقل ملازمنوں کے لیے اور بھی بہت سی سہولتیں ہیں۔“

صغریٰ اس ایک سی بات سوچ رہی تھی۔ اس کی ایک خواہش منہ سے نکلی۔ رب نے پورا کر دی۔ وہ اب ہوٹل کے کتے پکوان بھی کھا سکتی ہے لیکن۔۔۔ کتنی معمولی سی خواہش کے لیے وہ بلا کر ہوئی؟ بندے بندے کی بات ہوتی ہے۔ خواہش تو ابا جہ سے بھی کی تھی۔ کتنی بڑی خواہش کہ تاقیامت ان کی کوشش ان خواہش کو زندہ رکھا جائے گا۔ اپنی اور ان کی خواہشوں کے تقابلی جائزے سے؟ ندامت اسے ملی وہ اس لذت سے کہیں زیادہ تھی! اچھا کھانا کھانے کے بعد اسے ملا کرتی تھی۔ اور شاید آئندہ ساری زندگی ملے بھی ملے! اس ایک چیز مل گئی وافر۔ اللہ پرمان توکل پیار۔

”تم اپنے علم کو کام میں لاؤ۔ ابا جہ سے سبق سیکھو۔ جب بننے کا پانی اور مجھوروں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ جب روئے زمین پر کوئی اپنا یا پر اپنا ان کے پاس نہ تھا۔ اٹوٹس پڑوس سسرال، میکے کا نام و نشان نہ تھا۔ اس لٹی و دق صحرا میں جب بھوک اور پیاس نے ان اور بیٹے دونوں کو شے میں قابو کر لیا تھا۔ اس تنہا عورت نے موت کا مقابلہ کیا۔ اس نے رہتی دنیا تک ثابت کر دیا کہ حالات کا رونا نہیں روتے۔ بلکہ کر گزرتے ہیں۔ مسائل اسباب پاس نہ بھی ہوں۔ بس کوشش کرنے کے لیے پاؤں کی ایزی زمین پر سے اٹھاوے ہیں۔ پھر اللہ بھی پیٹا نے بدل لیتا ہے۔ وہ کوشش اور کارگزاری کو پسند کرتا ہے۔ اس باپ کی دلہل میں اترنے کے بجائے توکل اور تدبیر کرنے والوں کے صدمے میں قیامت تک کے لیے زم زم کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔“ ابا لمحہ بھر کو سانس لینے لگیں۔ پھر اپنی بات جاری رکھی۔

”تم تو جوان جہان ہو۔ میاں کاسیہ اللہ نے سر پر سلامت رکھا ہے۔ تم بھی کچھ کرو۔ کڑھائی سلائی کاغذ جانتی ہو۔ اسے کام میں لاؤ۔ گھر میں بیٹھ کر تعلیم جاری رکھو۔ مندوں کو اپنے ہنر میں ساتھ ملاؤ۔ تم بھوکے بڑکتوں اور رشتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔“

مفتے کا دن تھا۔ سو ٹفک کارش معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ موسم کئی روز سے ابر آلود تو تھا۔ مگر اتنا سہانا نہیں کہ کسی چنگ یا آونگ کا موڈ سن سکے۔ آج موسم بھی گویا اپنے شباب پر تھا۔ تب ہی المیاں کراچی کی بڑی تعداد سڑکوں پر تھی۔  
 ”اوہ! کیا مصیبت ہے یہی۔ پچھلے پچیس منٹ سے یہیں بچنے ہوئے ہیں۔ آپ ہارن تو بجائیں نا۔ تاکہ آگے والے کھسکیں تو سہی۔“ اسماء غوث آمیز بے زاری سے گویا ہوئیں۔ اچھا موسم! دیک ایڈ اور شوہر تیار کا خوشگوار موڈ۔

سارے ہی پس پوانٹھن سبکاتھے۔ تب ہی تو اسماء بڑے دھڑلے سے ”شاپنگ پلس لاگ ڈرائیو“ کی فرمائش کر گئیں۔ جو فیصل نے بنا رو و قدر کیے پوری کرنے کی باہی بھی بھری۔

نیچتا شمع رنگوں والے لان کے نئے برائڈ سوٹ میں جی سنوری سی اسماء اور سفید کاٹن کے آرامہ شلوار سوٹ میں فیصل اپنی سفید بیش قیمت گاڑی میں سڑک پر رواں تھے۔

”ہارن بجانے سے کیا ہو گا۔ سڑک آگے تک بلاک ہے۔“ ان کی نظرس دینا اسکرین پر تھیں۔

”ایک تو آپ میری سنتے بھی تو نہیں سب سے کہہ رہی ہوں پچھوڑیں اس علاقے کا پچھا۔ یہ علاقہ بھلا اب متول لوگوں کے رہنے کے قاتل بھی کہاں رہا ہے۔ ذرا سڑکوں کا حال دیکھیں۔ لوگوں میں تیز نام کی کوئی چیز نہیں۔ اوپر سے مارا ماری الگ اور اگر بھی کافین یا ڈیفنس جانا بڑ جائے تو ایک گھنٹہ تو راستے ہی میں لگ جاتا ہے۔“ وہ سخت ناراض تھیں۔

”کیوں اس علاقے میں انسان نہیں رہتے۔ اور تم سے کسی نے کہا کہ یہ متول لوگوں کے رہنے کی جگہ نہیں؟“ وہ بھی گرم ہوئے۔ حالانکہ گاڑی کا اسے پوری طرح کام کر رہا تھا۔

”لو۔“ انہوں نے سیدھا ہاتھ نکالیا۔ ”کہے گا کون۔“ ذرا موں میں جب کسی کا غریب رشتہ وار دکھایا جاتا ہے تو وہ عموماً ”اسی علاقے سے تعلق رکھتا



امت الغریب شہزاد

ماکی کسپانی

ہے۔“ ان کی معلومات متقد تھیں۔

”بس! رہنے دو یہ ڈرامے۔“ انہوں نے سر جھٹک کر ”اس میں تو نامعلوم کیا کیا کچھ دکھاتے اور بتاتے رہتے ہیں۔ ڈیڑھ دو کروڑ سے کم کے گھر نہیں ہیں یہاں۔“ گاڑی ذرا سا آگے کھسکی۔

”بس! بس! کچھ نہیں جانتی۔ آپ جلدی سے گلشن والے پلاٹ کی تعمیر شروع کروائیں۔ کم از کم اس سے تو بہتر ہے۔ وہ علاقہ۔“ وہ اصرار کرنے لگیں۔



”کو شش پکر رہا ہوں۔ دعا کرو انبالہ والوں کا ٹھیکہ مجھے مل جائے۔ پورے پانچ ہولڈز بنانے والے ہیں وہ۔ اگر یہ ٹھیکہ مل گیا تو وارے نیارے سمجھو۔“

اندرونی جذبات سے ان کا چہرہ ہنسنے لگا۔

”ہائے اللہ! فرط انبساط سے ابارہ کی چیخ ہی نکل گئی۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ بس کل ہی سے مدرسے کے بچے بلوا کر ختم کروانا شروع کرتی ہوں۔ ضرور ہی ہمارا بیڑا پار ہوگا۔“ وہ مار مار کر خندیت کے آنکھیں بند کر کے کہنے لگیں۔

”ہاں! ہاں! ضرور کروانا۔ فی الحال تو وہ دعا یاد کرو۔ جو اللہ نے ٹرنک میں چھپنے جانے کی صورت میں پڑھنے کو بتائی تھی۔“ پتینتیں منٹ بعد بلا خزان کا صبر جواب دے گیا تھا۔

”آپ کی اماں تو دعاؤں کا چلن پھرنا اشتہار تھیں۔ سوتے وقت یہ دعا پڑھو کھاتے وقت وہ دعا پڑھو۔ اور تو اور بارش کے برسنے اور بادل کے گرجنے تک کی دعاؤں انہیں ازبر تھیں۔ اب اتنی تو اتر سے وہ دعائیں بتائیں گی تو انسان کو خاک پا رہے گا کہ کون سی دعا کب مانجی ہے۔“ وہ استہزائیہ کبھے میں بولیں۔

”ہاں! یہ تو ہے۔ اہل کو ہر موقع کی مسنون دعائیں یاد تھیں۔ مجھے راشد اور فاطمہ (چھوٹے بہن بھائی) کو انہوں نے ساری دعائیں یاد کروائی تھیں۔ میں تو اب ان کے سکھائے سارے سبق بھول بھال گیا۔ ان دونوں کو شاید یاد ہوں۔“ وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولے۔

”چھوٹیں دعاؤں کو۔ آپ ہارن بجائیں۔“ وہ پہلو بدل کر بولیں۔

”ایک تو یہ شوہر نای مخلوق۔ لاکھ اس کے لیے اپنا پتہ پانی کرو۔ گرنے اپنی اماں کے ہی گائے گا۔“ وہ منہ دوسری طرف کر کے خاموشی سے باہر دیکھنے لگیں۔

دل میں البتہ بڑا ہٹ جاری تھی۔

”ہاں! یاد آیا۔ تیسرا کلمہ۔ تیسرا کلمہ پڑھنے کو کہتی تھیں اہل۔ جب کبھی ٹرنک میں پھنس جاؤ۔ تیسرے کلمے کا ورد شروع کرو۔ دیکھنا، کتنی آسانی سے

رش سے باہر نکل آؤ گے۔“ فیصل کے دل میں اہل کی آواز گونجی۔ اس نے زرب و ورد شروع کر دیا۔ دس منٹ بمشکل گزرے ہوں گے کہ ٹرنک رواں ہو گیا۔

”صد شکر! انہوں نے گہری سانس لی۔

”دیکھا! یہ جو آپ کے ساتھ کھڑے اتنے لوگ ہارن بجا رہے تھے۔ اسی وجہ سے آگے والوں کو ٹھکنے کا خیال آیا۔“ وہ یوں غرور بولیں۔ جیسے اس میں ان کا کمال ہو۔

”جی نہیں! میں دعا پڑھ رہا تھا۔ اس وجہ سے ٹرنک رواں ہوا ہے۔“ وہ اب سراب کو ٹھکے کے پل سے اتر رہے تھے۔

”ہونہ۔“ انہوں نے سخت سے سر جھٹکا پھر بولیں۔ ”یہ آپ کے گھر اپنے کی لاجب میری سمجھ سے باہر ہے۔ زندگی میں کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو۔ لگ جائیں گے دعائیں مانگنے، وظیفے کرنے، خیر! یہ بھی نہ کریں تو کیا کریں۔ بیٹھے بیٹھے تو یہی کچھ ہو سکتا ہے نا۔ مسائل کا پرمیکٹیکل حل نکالنے کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانے پڑتے ہیں۔ جو انہیں گوارا نہیں۔“ وہ طنز پر بولیں۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولے۔ گاڑی اب کلشن چورنگی عبور کر چکی تھی۔

”ایسی ہی بات ہے فیصل! شیخ صاحب! وہ چاہا کر بولیں۔“ آپ کے گھر والے عمل کرنے کے بالکل بھی شوقین نہیں۔ اماں کی ہر وقت کی آؤٹ آف ڈیٹڈ نصیحتوں نے انہیں کہیں کاندہ چھوڑا۔ صبر، قناعت، شکر گزاری سے آخر انہیں حاصل ہی کیا ہوا؟ ابامیاں تو آپ کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ آپ انٹر میں تھے۔ آپ نے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ یہی تو وہ پرائنٹ ہے جو راشد کے بگاڑ کا باعث بنا۔ آپ تو کما ہی رہے تھے۔ ذرا جو اس بندے نے ہاتھ پیر ہلانے کا سوچا ہو۔ الٹا آپ پر جو ہٹا رہا۔ انہوں میں تھا وہ اس وقت۔ ایسا کوئی چھوٹا بچہ بھی نہیں تھا۔ کچھ نہ کچھ محنت تو کر ہی سکتا تھا۔ مگر نہ جی۔“ انہوں نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ ”جب بیٹھے بٹھائے مل رہا ہو

تو کون بے کاریں پسند رہا ہے روپیٹ کی کام کیا اور لگ گئے سرکاری نوکری سے۔ گریڈ چوہہ کے نوکر لگے تھے اور آج شاید پندرہ سولہ کے ہو گئے ہوں۔ یہ ہے ان کی ترقی کی رفتار۔ میں آپ کی زندگی میں نہ آئی تو آپ کا بھی یہی حال ہوتا تھا۔“ انہوں نے وقوف سے کہہ۔

”ہاں! یہ تو تم واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تمہاری یہ کوائف تو میں واقعی تسلیم کرتا ہوں۔ اماں تو ہمیشہ قناعت پسندی، حلال محرام ہی کے اسباق پڑھاتی رہتی تھیں۔ اب بھلا ان سب کے سارے بھی زندگی گزرتی ہے۔ گاڑی اب شاہراہ فیصل پر اتنی کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ فیصل کے اعتراف پر وہ مزید زور و شور سے بولیں۔ ”آج کل جس کے پاس پیسہ ہے۔ بس اسے ہی جینے کا حق ہے۔ معاشرے میں عزت، ٹائم، مقام سب کچھ پیسے ہی کا روپ منت ہے۔ میرے بہن بھائی سب ہی ماشاء اللہ بہت پیسے والے ہیں۔ ایسے میں آپ خود سوچ سکتے ہیں ان کے سامنے میری تنقیدی سبکی ہوتی تھی۔ بھلا بھیاں میرے معمولی سے لان کے سونوں، بھوتوں، بچوں کے ٹکے ہی کے اسکول میں پڑھنے اور پرانے دفینوں کے بنے آپ کے مکان کا کتنا فراق اڑاتی تھیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے۔“ ان کی آواز گلو کی ہو گئی۔

”خیر! واضح کہ۔ کیوں اپنا خون جلا رہی ہو، گزریے وقت کی تکلیف وہ باتوں کو یاد کر کے میں تو گھٹا ہوں

”سیلو! بند زفری لگا ہوا تھا۔ انہوں نے فون ریسیو کیا۔ اسارہ بھی تباہیدہ آنسو پونچھ کر آنے والی کال کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

”کیس گھر سے ہو۔ ایک تو سارا زارا جی بھر کے لٹکے ہیں۔ رشیدہ (ملازمہ) نہ ہو تو نا معلوم گھر کا کیا حشر کریں۔“

وہ اپنی سوچوں میں غلط تھیں۔ تب ہی چونک پڑیں۔

”اجھا! راشد بیمار ہے۔ کیا ہوا ہے اسے؟“ وہ سنبھل کر پوچھنے لگے مبادا کچھ مانگنے ہی کے لیے فون نہ کیا ہو۔ یہی خیال، بیک وقت ان کی نصف بہتر کے دل میں بھی آیا تھا۔

”گڈنی پر اہلم کوئی ایسی پر اہلم تو نہیں کہ جس کے لیے اسپتال ایڈمٹ ہونا پڑے۔“ وہ جرح کرنے لگے۔

”اجھا۔۔۔ اجھا! فاطمہ سے زیادہ ہو گیا تھا۔ خیر! اب کیا مسئلہ ہے۔ ٹرنٹ ملے گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ لا پرواہی سے بولے۔

”دیکھو مجھے فاطمہ! میں جانتا ہوں اسے بڑے بھائی کے دلائے یا۔ بسلی کی کوئی ضرورت نہیں۔ یاد نہیں اس نے مجھے بھرے مجھے میں کیسا بے عزت کیا تھا؟“ اسارہ کے پہلے سے کرخت چہرے پر کچھ اور سختی چھا گئی۔

”میں نے اسی روز اس سے مرنے جینے کا تعلق ختم کر لیا تھا۔ اب تم مجھے کیوں مجبور کر رہی ہو؟ کیا چاہتی ہو تم کیا تم سے یہ ٹیٹل فونک رابطہ بھی ختم کر لوں؟“ وہ کرختی سے بولے۔ اسارہ بڑی بے چین بیٹھی بیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

”تم تو وہاں دینی میں بیٹھی ہو۔ تمہیں یہاں کے حالات کا علم نہیں۔ میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ بچوں کے اسکول کی فیس بھی نہیں دے سکا ابھی تک۔ خود میں اتنے دن بیمار رہا ہوں۔ میں نے تو اس کی طرح پیسہ بٹورنے کے لیے اپنی بیماری کا ڈھول نہیں پٹا۔ تم نہیں چیتیں ہزار کی بات کر رہی ہو۔“ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے۔ تب ہی سرعت سے اسارہ نے ان کا بازو دبا کر گویا کچھ اشارہ دیا۔

”بھئی! پانچ دس ہزار بھی مشکل ہیں۔ تم مجھ سے کہہ رہی ہو۔ کم کیوں نہیں دے رہیں؟“ اپنی دانست میں انہوں نے چال چلی۔

اسارہ کی شکل پہ ”یہ ہوئی نابات“ والے تاثرات جگ گئے۔

”اجھا۔۔۔ اجھا! وہ چکی ہو تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ یہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی تم نے خوب کئی فاطمہ۔

کے بعد سے اس سے مرنے جینے ہر طرح کا تعلق ختم نہ میرے مرنے پر کوئی آئے۔ نہ کسی کے مرنے پر میں جاؤں گی۔“ وہ بے لگب لہجے میں بولیں۔

”ہاں۔ اور کہہ رہا تھا کہ اہل نے خاص طور پر تلقین کی تھی کہ میرا بیسہ ان کی نئی منزل میں کام نہ آئے۔ برا آیا نیک پارسا کہیں کا۔ یقین کرو اسارہ! اس دن سے وہ میرے دل سے مکمل طور پر اتر گیا تھا۔ میں نے بھی قسم کھالی تھی کہ اس کی میت میں بھی نہ جاؤں گا۔“ وہ سخت طیش کے عالم میں بولے گاڑی اب کورنگی سے ڈی۔ ایچ۔ اے کی طرف مڑ رہی تھی۔

شام ڈھل رہی تھی۔ موسم بہار ستور سناٹا تھا۔ ”چھوڑیں جی۔۔۔ کیوں اس کی بکواس یاو کر کے اپنا موڈ غارت کر رہے ہیں۔ پہلے زمزمہ چلیں گے؟“ بیٹھل کا نمروڈی ریوٹ کنٹرول“ اسارہ کے پاس تھا۔ جدھر چاہتیں ٹھون کرویتیں۔

”ہاں! پہلے شاپنگ کر لو۔ پھر دودریا کی طرف جاتے ہیں۔“ وہ بھی اپنے آپ کو سنبھال کے خوشگوار کچے میں بولے۔

”کتنے سوٹ لوں؟“ وہ شرارت سے پوچھنے لگیں۔

”جتنے جی چاہے۔“ انہوں نے فراخ دلی سے کہہ کر احتیاط سے موڑ کاٹا۔ مگر موڑ کے دوسری طرف سے آتا ہوا بجزی کانڑک بہت جلدی میں تھا۔

ڈیفنس کی پر اسراریت بھری خاموش فضا میں ایک ہولناک دھماکہ سا گونجا۔

تیز رفتار ٹرک سفید بیش قیمت گاڑی کو لمبے میں تبدیل کر کے فرار ہو گیا۔ کار میں موجود زندگی سے بھرپور وہ دونوں نفوس موقع ہی پر زندگی کی بازی ہار گئے۔

زندگی۔

جو اتنی ہی ناپائیدار ہے۔ جتنا کہ رست پر بنا گھر وندہ۔ دوسرے دن ان کے جنازے میں راشد اپنی پیاری کے باوجود بھی شریک تھا۔

بچے تو میرے کچھ چھوٹے ہی ہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ کسی کو میرا احساس نہیں۔ اسارہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔۔۔ اچھا! خدا حافظ ہو نہ۔“ آخر میں حقارت سے سر جھٹکا ٹیکرینٹ کا علاقہ شروع ہو گیا تھا وہ بڑی احتیاط سے ڈرائیو کر رہے تھے۔

”اسارہ! موڈ تباہ کر دیا۔ بتاؤ ذرا۔ وہ راشد جس نے مجھے اہل کی تجنیزو عقین یہ کہہ کر نہیں کرنے دی کہ میرا بیسہ حرام کا ہے۔ میں اس کی عیادت کو جاؤں گا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولے۔

”اور دیکھا آپ نے انی۔ بن کو؟ کیسے میرا ذکر سنتے ہی فون بند کر دیا اور اس کی کیسی وکالت کو رو دی تھی۔ میں نے تو آپ کو پہلے ہی کہا تھا۔ آپ ہی بے وقوف ہیں۔ جو ان کے لیے مرتے رہتے ہیں۔ ورنہ انہیں تو ہمیں فون تک کرنا گوارا نہیں۔ کریں گے بھی تو اپنے ہی مطلب کی بات کریں گے۔ آپ بھول گئے۔ کتنی درشتی سے اس روز اس نے آپ سے بات کی تھی؟ اہل کو کوئی ہم نے تو تیار نہیں کر ڈالا تھا۔ جتنے روز وہ اسپتال میں ایڈمٹ رہیں۔ آپ تو دی گئے ہوئے تھے مجھے انہوں نے فون تک کرنا گوارا نہیں کیا اور بعد میں عیادت نہ کرنے آنے کا الزام لگا دیا۔“ انہوں نے دھیمے سے سوز سے لہجے میں کہہ کر گویا جلتی پر تیل ڈالا۔

”ٹھیک کہتی ہو تم۔ یہ راشد شروع ہی سے میری ترقی سے جلتا رہا ہے۔ خود کو جو ایسا موقع نہیں ملا۔ اہل کے انتقال والے روز یاد ہے اس نے کیا کہا تھا؟“ ان کے ہاتھ اسپرنگ پر گڑ گئے۔ جبرے مچھ گئے اور بھنویں تن گئیں۔

”ہاں! اہل۔ کیسے بھول سکتی ہوں میں۔“ وہ چمک کر بولیں۔

”بھابھی بیگم آپ کو جنم کی طرف گھسیٹ لے جا رہی ہیں اور آپ بنا مزاحمت کے گھسیٹے جا رہے ہیں۔ اپنے آخری ایام میں اہل آپ کی آواز سننے کو ترستی رہیں۔ مگر بھابھی بیگم نے آپ کا نمبر نہیں دیا۔ نہ ہی ان کی عیادت کو آئیں۔ ہاں بھئی! ہزاروں کیرٹے ہیں بھابھی بیگم میں۔ میں نے تو اسی روز تہہ کر لیا تھا آج

## عفت سگر طاہر



ہلکی پھلکی نفیس سی کڑھائی سے سجایا اور آف  
وائٹ کریم کلر کاسوٹ اس کے متناسب سے سرانے پر  
عجب ہی ہمارے رہا تھا۔ کمر تک آتے بالوں کی چوٹی کو  
آخری بل دے کر ریوینڈ چڑھاتے ہوئے اس نے  
چوٹی کو جھٹکے سے کمر پر پھینکا تو اس کے لبوں پر خوشگوار  
سی مسکراہٹ تھی۔

آج ایسا آپ اسے خود ہی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس  
نے پلٹ کر کاش کا دیشا اٹھایا۔ سیاہ دیشا جس پر کہیں  
کہیں چھوٹے چھوٹے سے آف وائٹ پھول کڑھے  
تھے۔ دوپٹے کے چاروں طرف آف وائٹ گلر کی اینچ  
بھر کی پٹی تھی جس پر چھوٹے چھوٹے سیاہ رنگ کے

## مکمل ناول





سلامت رہے۔ لائیں مار دی تو آج تو۔۔۔ عاقب کے لب و لہجے کی شوشی نے اسے جھینپنے پر مجبور کر دیا۔  
”کواس مت کرو۔“  
”تو تمہاری تعریف کواس ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

اس کی نگاہ ابھی بھی زہن کے اچھوتے روپ پر تھی۔ تمنا تاچرو جس کا سن رہا تھا۔

”سچی کہہ رہے ہو؟“  
”دھر آؤ۔ پھر بتاؤ۔“

وہ فوراً ”لو فرہوا تو زہن کو وہاں سے بھگانا پڑا۔ مگر دل ایک الگ ہی لے میں دوڑ رہا تھا۔

عاقب کی ذرا دیر کی توجہ بھی اس کے جذبات کو برہا دیتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ تائی امیں عاقب کے ساتھ اسی کو سوچے ہوئے ہیں۔ تب ہی تو وہ بلا خوف و خطر اس کے سنگ خوابوں کے سفر پر نکل جایا کرتی تھی۔

\*\*\*

فیصل نے گاڑی اس عالی شان بیگلے سے ذرا قافلے پر روکی۔ پوش ایریا میں باؤہ ایک شاندار بیگلہ تھا۔ جس کے مینوں کی امارت پر کوئی شبہ نہیں تھا۔

عافیہ پر بیچان طاری ہونے لگا۔ اس بیگلے کی خوب صورتی تھی یا اس کے مینوں کی امارت کا عیب۔ اسے لگا کہ ابھی بول نہیں پائے کی اور آنکھیں نہیں کہ اس خواب گھر کا نظارہ کر کے نہیں ٹھک رہی تھیں۔

”کیا بات ہے۔ گھر پسند نہیں آیا میری جان کو؟“  
فیصل اس کے قریب ہو کر محبت سے پوچھ رہا تھا۔ عافیہ کسی خواب کی گرفت سے آزاد ہوئی۔

”یہ۔ تم یہاں رہتے ہو؟“ عافیہ کی آواز لرز رہی تھی۔

”ہاں۔ تو؟“ فیصل کے انداز میں بے نیازی تھی۔

”بائی گا۔ تم نہیں جانتے فیصل! یہ تو میرے خوابوں کا گھر ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ

کبھی حقیقت میں میرا ہو سکتا ہے۔“  
وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ گندی رنگت جذبات کی شدت سے تپنے لگی۔ کھور سیاہ آنکھوں کی چمک قابل دید تھی۔ فیصل کو اس پر بے اختیار ہمار آیا۔

”تم لڑکیاں بھی نا۔ کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خوش ہو جاتی ہو۔“ عافیہ نے جذباتی ہو کر اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔

”یہ چھوٹی بات نہیں ہے فیصل! اب میرے گھر والوں کے پاس تمہیں ریجیکٹ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔“

”جو تو ابھی بھی ہے عالی! میرے ابو کبھی بھی اس شادی پر راضی نہیں ہوں گے۔ چچا کی بیٹی کو مانگ رہا ہے انہوں نے میرے لیے اور مجھے اکیلے کے ساتھ تمہارے ابا تمہیں رخصت نہیں کریں گے کبھی اور جائیداد بھی تب ہی مجھے ملے گی جب میں شادی کر کے شادی کروں گا۔“ وہ پریشان تھا۔

”اس کی تم فکر مت کرو۔ تم ابا سے ملو گے تو وہ ز سے بہت متاثر ہوں گے اور تمہارے والدین بھی آہستہ آہستہ مان ہی جائیں گے۔“ عافیہ نے اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھوں کا پیرا بھر دیا اور بڑھاتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

”اور اگر ابونے مجھے عاق کر دیا تمہیں شادی کرنے کی صورت میں تو؟“ وہ عافیہ کا چہرہ کھوجتے جیسے اس کا امتحان لے رہا تھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو فیصل۔ اتنا انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتے وہ۔ اکلوتے بیٹے ہو تم ان کے اور کس کے نام کریں گے اپنا سب کچھ؟“ عافیہ نے اپنے چہرے کی بدلتی رنگت کو بڑی مہارت سے چھپایا تھا۔

”خیر۔ گھر سے تو نکل ہی سکتے ہیں۔ بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گی تم بھی۔“

”میری فکر مت کرو تمہ میں تمہارے ساتھ ہر ہم کے حالات کا سامنا کر سکتی ہوں۔“ عافیہ کے لب و لہجے میں پختہ عزم تھا۔

”تمنی ناؤنگ سی تو ہو میری جان۔ میں اپنی وجہ سے تمہیں کسی شکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“ فیصل کی محبت پر وہ مسکرا دی پھر قاف خیرے بولی۔

”ڈونٹ وری جناب۔ ایسے بھی کوئی مشکل حالات نہیں آنے والے ہیں ہزار کی جانب ہے میری اور ترقی کے چاندن الگ۔“

”ہاں۔“ فیصل سر ہی سانس بھرتا سیدھا ہو بیٹھا اور گاڑی اشارت کرنے لگا۔ پھر ایک نظر عافیہ کے سونے چہرے کو دیکھ کر طمانیت بھری مسکراہٹ سے بولا۔

”اس بات کی تو تسلی ہے مجھے۔“ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ عافیہ سائیڈ مرر میں سے بیگلے کا عکس دیکھ رہی تھی۔ اس نے فیصل کے لفظوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔

\*\*\*

”کمال رہ گئی تھیں۔ آج پھر اتنی دیر کر دی آنے میں۔“ امال عافیہ کی شکل دیکھتے ہی شروع ہوئی تھیں۔ وہ برآمدے میں رکھے صوفے پر بیٹھ کر ٹھکے انداز میں سینڈ ٹرائڈ کرتے تھے۔

”میں کیا پوچھ رہی ہوں؟ نو سے پانچ والی تو کوری میں سات کا ہے تو بجنے لگے اب؟“ امال کا انداز ٹیکھا تھا اور عافیہ کی ہر داشت بس بیس تک تھی۔ ترقی کر بولی۔

”اگر میں بیس ہزار کمانے والا بیٹا ہوں تو یہ سوال کبھی مجھ سے نہ کیا جائے۔“

”خدا کی ماسہ۔“ امال کو غصہ آیا۔ ”ٹوکے اور لڑکی کی آوازوں کی الگ حدود ہوتی ہیں بیٹا رانی۔“ غصے میں وہ اسے پونہ کی مخاطب کرتی تھیں۔

”چچا ابل۔ اب آتے ہی میری سوار نہ ہو جائیں۔ چائے پانی اس گھر میں کوئی پوچھتا نہیں۔“ آنے جانے کا پوچھنے سب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ”وہ بے زاری سے بولی۔ تو امال کو اپنا لب و لہجہ زرا بدلتا پڑا۔

”ارے تو میں کون سا اپنے فائدے کے لیے کہتی ہوں۔ تمہارا ہی بھلا ہے اس میں۔ کل کو سسرال کے

جوتے کھانے سے بچ جاؤ گی۔“ عافیہ کے لبوں پر فیصل کی یاد سے مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو۔ وہاں اپنے ٹھٹا ہوں گے۔ یہ چند ہزار کی نو کوری توڑی کروں گی میں۔“

”چند ہزار۔۔۔ ارے کم بخت پورے بیس ہزار کما تی ہے۔ شکر خدا کا پڑھائی میں اچھی تھی تو نو کوری بھی شیخ صاحب کی سفارش سے اوپنی جگہ لگ گئی۔“ امال نے گھر کا۔

”یہ تو گھر کے حالات کی وجہ سے کر رہی ہوں امال۔ سسرال جا کے میں شو پر نہیں ہالوں گی۔“

وہ ٹیکھی ہوئی۔ امال کچھ کہنے لگی تھیں کہ اسی وقت زہن ٹھنڈے ٹھار شربت کا جگ اور گلاس ٹرے میں رکھے چل آئی۔ عافیہ کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔

وہ یقیناً ”اس وقت چلوے کے آگے کھڑی تھی۔ عافیہ کی آواز سن کر شربت بنالائی تھی۔ تھمائی رنگت ہمار کا سا جو بن سہا ہلباس میں دو ٹک رہی تھی۔ عافیہ کو لگا کہ آدے میں یک نیت روشنی ہی ہو گئی ہو۔

”یہ لیں جی۔ ٹھنڈا ٹھار شربت۔“

پتیلی پر ٹرے رکھتے ہوئے اس نے جلدی سے شربت کا گلاس بھر کے عافیہ کو پیش کیا۔ سرخ مرطوب لبوں سے جھلکتے ہموار وچک دار دانٹوں کی لکیر۔ اس کی مسکراہٹ بہت خوب صورت تھی۔

عافیہ کو خواہ مخواہ غصہ آنے لگا۔

”یہ۔ نیا سوٹ پہن کے تم بچن میں کام کر رہی تھیں؟“ اس کی تیوری کے بل زہن کو گڑبڑا گئے۔

”نہیں۔ میں۔ وہ نہا کے آج پرانا تو پھر۔“

”اری آنکھیں کھول کے دیکھ۔ کیا کہاں۔ تمہارا بی

”ٹھیک نہیں رہتی۔“ اماں نے وہ بات شروع کی جس کے لیے وہ ”پتلی“ ڈال کے بیٹھی تھیں۔  
 ”کس کی شادی کے لیے؟“ وہ سرسری انداز میں پوچھ کر شربت کے گھونٹ بھرے گئی۔ اماں نے اسے قدرے گھور کر کہا۔  
 ”خارہ ہے اپنے بیٹے کی شادی کے لیے۔“  
 ”تو کیوں؟“

خالی گلاس پانی پر رکھتی اطمینان بلکہ بڑی بے اعتنائی سے کہتی وہ اٹھ گئی تو اماں مسکرا دیں۔ اشتیاق سے بولیں۔

”تو کیا پھر کون سا مہینہ رکھوں شادی کا؟“ وہ اندر جاتے جاتے رک گئی پھر ان کی طرف پٹی۔

”آپ کیوں رکھیں گی۔ جن کا بیٹا ہے وہ رکھتے پھر سن تاریخیں۔“ وہ اس کی سادگی پر مسکرا دیں۔

”میری بے وقوف۔ تاریخ تو لڑکی والے ہی دیتے ہیں نا۔ تمہارے ابا تو اگلا مہینہ ہی کہہ رہے ہیں۔ یہ تو پتلی پر سرسوں جمائے والی بات ہوگئی۔ پر جب سے عمر کی زبانی آیا کا حال سنا ہے دل پریشان سا ہے۔ اس لیے میں بھی راضی ہوگئی۔“ وہ تھیلا ”گویا تھیں۔“

عافیہ کی بیٹیشالی کے بل گھرے ہوئے۔

”اگلا کس کی لڑکی؟“ وہ قدرے زور سے بولی تو اماں ٹھیک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”یہ کون سی منصوبہ بندیاں کر رہی ہیں آپ؟ کون سی شادی کس کی شادی۔؟ میں تو ابھی سوچ بھی نہیں سکتی شادی کلا۔ اپنا کیریئر بنانا ہے میں نے۔“ اس نے صفا جھانڈا میں لکھا تو وہ ہل گئیں۔

”دلغ تو ٹھیک ہے تیرا۔ سالوں پرانی منہ زبانی کی بات ہے ہم دونوں بہنوں میں اور پھر مجھے کون سا نہیں پتا تھا۔ دو سال پہلے گجرات گئی تو عمر کو بند کیا تھا تو نے۔“

راضی ہو گئی شادی پر۔ ”تو تیرے لیے میں بولیں۔“

”چچا پتا تھا میرا۔ اور اماں ابیں کراچی جیسے جگہ خیر شہر ہے اٹھ کے گجرات جا کے نہیں بس سکتی۔“ اس نے سخی سے جواب دیا۔

”نہ۔ تو یہ اب یا کیا ہے تجھے؟ آتے ہی کیوں نہیں کہہ دیا کہ وہاں شادی نہیں کرے گی۔ تیری طرف سے ہاں کہہ دی تھی میں نے آپا کو۔“ اماں کو غصہ آنے لگا۔

”غلطی کی نا۔ مجھ سے اجازت لے کے بات کرتیں۔“ وہ اطمینان سے کہتی ان کا پارہ چڑھانے لگی۔

”بے غیرت۔ تو نے ہی تو آکے عمر کی تعریفوں کے بل باندھے تھے۔“

”نری شکل و صورت ہی ہے۔ نوکری تک تو ملی نہ تھی جناب کو۔“ وہ حقارت سے بولی۔

”چھوٹی موٹی نوکری تو کر رہی رہا ہے۔ ساتھ ہی کوئی بڑا امتحان بھی دے رکھا ہے اس نے۔ اعلا نوکری کے لیے۔“ اماں نے اسے تسلی دلانا چاہی۔

”مجھے تو معاف ہی رکھیں اور اپنا بھی صاف کر دیں۔ میں بیاہ کے اتنی دور پہنچان کے چھوٹے شہر میں نہیں بیٹنے والی۔ شادی میں کراچی ہی میں کرلوں گی۔“

وہ صفا جھٹ بلکہ بے پرواہی سے لفظ انداز میں کہتی بولیں پٹی تو زینب غالباً جھک اور گلاس اٹھانے آئی تھی۔

عافیہ نے رک کر اسے گھورا۔

”اور تم۔ یہ سوٹ تبدیل کرو اور دھوکے اچھی طرح پرپس کر کے میری الماری میں لٹکا دو۔“ حکم صادر کرنا وہ اندر چلی گئی تو منہ کھولے کھڑی زینب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”ناہ۔ غدی۔“ غمزدگی۔ ”اماں کو بیشی کی عادت سے کراہیت آئی۔“

وہ اکثر اپنی استعمال شدہ چیزیں زینب کو دے دیتی تھیں مگر وہی چیزیں جب زینب پر تھیں یا اسے جگا دیتیں تو اکثر وہ دوبارہ اپنی چیز بانگ لگی تھیں۔ زینب آنسو

پٹی خاموشی سے برتن اٹھانے لگی۔

”تو فکر نہ کر زینبی اس سے اچھا جو اسے کے دل کی تجھے اس کی تو عادت ہے غمزدگی والی۔“

اماں نے اس کا دل رکھنا چاہا۔ زینب اسی خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”ایک دفعہ شادی ہو جائے عافی کے ساتھ میری۔ سب سے پہلے اسی کھنی کو سیدھا کرلوں گی۔“ جگ

گلاس سنگ میں رکھ کر اس نے تھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اشتقاقت خود کھائی کی تھی۔ پھر اپنے دوپٹے کو ہاتھوں پر پھیلا کر حسرت سے دیکھا اور آہ بھر گئی۔



رات کھانے کے بعد اماں اور اماں کی میزنگ ہوئی۔ جلدی ہی اماں کے حضور عافیہ کی طلبی ہوگئی۔

عافیہ کو ادبی بات کی امید تھی۔ اس کا ہومورک بھی مکمل تھا وہ بہت اعتماد کے ساتھ ان کے سامنے گئی۔

”ہاں بیٹی جی یا یہ تمہاری اماں کیا کہہ رہی ہے۔ تمہیں اب عمر سے شادی پر اعتراض ہے؟“

اماں بات گھمسانے پھرانے کی عادت نہیں تھی۔ ایک بات کہہ دینا اور پھر اس کو حرف آخر میں کراچی پر

جم جانا ان کی عادت عظیم تھی۔ اس لیے ان کی زبان سے کوئی فرمان جاری ہونے سے پہلے عافیہ ان پر اپنا طعن نظر واضح کر دیتا چاہتی تھی۔

”جی ابا! سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں آپ لوگوں سے اتنی دور جانا نہیں چاہتی۔“

”دو سرا صوبہ ہی ہے ہماری دو سر ملک تو نہیں جو ویزا لے کر آنا چاہیے۔“ اماں تڑخیں۔ اماں نے انہیں گھور کر دیکھا۔ اپنی بحث میں کسی اور کے ڈانڈا لگ

انہیں پسند نہیں تھے۔

”تم کرلو بات۔“

”چھ! اچھا۔ آپ کر سن۔“ اماں گھڑیا سنیں۔

”دوسرے یہ کہ عمر کے پاس ڈھنگ کی نوکری تو ہے نہیں سارا خرچ عثمان بھائی چلا رہے تھے اور وہاں جاکے اگر میں نے ہی نوکری کر کے شوہر کو پالنا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ میں شادی ہی نہ کرلوں۔“ وہ

سینجیدگی سے بولی۔

”وہ نوکری کر رہا ہے۔ آج کم تنخواہ والی ہے کل زیادہ والی بھی کرے گا۔ بہت مختصری پچ ہے۔ سی ایس ایس کا امتحان دے رکھا ہے اس نے۔“

اماں کو بھی عمر پسند تھا۔ حالانکہ وہ ایک باری کراچی آیا تھا مگر فون پر ان کا عمر سے رابطہ رہا تھا۔ سو وہ اس کے خیالات و افکار سے اچھی طرح واقف تھے اور مستقبل کے عزائم سے بھی۔

”آہم سو رہی ابا! مجھے پھر بھی عمر سے شادی نہیں کرنی۔ مجھے کوئی دل اسٹیبلشمنڈ بندہ چاہیے۔ میں بیٹھ کے اچھے فیور کا انتظار نہیں کر سکتی۔“ اماں نے اتنے صاف گوانڈا ز پر غور نہ کیا۔

”اور وہ کون ہے؟“ عافیہ کے چہرے کا رنگ بدلا مگر ارادہ نہیں۔

”جی ابا۔ فیصل ہے۔ اپنا پروڈنل بھی بنا چاہتا ہے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

## ظلم و ستم میں



فلاح و جبین

قیمت - 400/- روپے

منجانبہ کا پتہ:

فون نمبر: 32735021  
 مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
 37 اردو بازار، کراچی

میرے لیے۔ ”سر جھکاکے آہٹکی سے بولی۔  
 ”تم نے اسے بتایا نہیں کہ تمہاری سالوں پہلے سے بات طے ہے۔“ ابا کا لہجہ تیز تھا۔  
 ”وہ بچپن کی بات تھی ابا! اور پھر جب میرے پاس ایک بہترین آپشن موجود ہے فیصل کی صورت میں تو میں عمر کے ساتھ ٹھٹھن بھری زندگی کیوں کرنا دوں۔“  
 وہ بھی ان ہی کی اولاد تھی۔ اپنی کہہ کے ہرگز کرنے والی۔ صفحہ نمبر انداز میں بولی۔  
 ”اچھا۔ تو وہ کہاں کا لائٹ صاحب ہے؟ نام پتا تو بتاؤ اس کے اجداد کا؟“ ابا نے سنجی سے کہا تو عافیہ کے لبوں پر پرتفاخر سے مسکراہٹ کھل گئی۔  
 ”مشہور انڈسٹریلسٹ ہیں مرزا فرمان علی۔ ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔“  
 ”وہ مرزے ہم ملک ذات پر اوزی سے ہی باہر ہیں وہ تو۔“ ابا نے ہاتھ جھاڑے۔ گویا بات ہی ختم۔  
 ”ذات سے باہر ہیں انسانیت سے نہیں ابا! ہماری طرح کے انسان ہیں وہ بھی۔“ عافیہ کو برا لگا۔  
 ”کل کہو اس لوڈے سے۔ اپنے باپ کو لائے ہمارے گھر۔ پھر پتا چلے گا انسانیت کے کس درجے پر ہے وہ۔“  
 ابا نے قطعی مگر طنزیہ لہجے میں کہا تو عافیہ کا دل دھڑکا۔ مگر اس وقت ہمت کی ضرورت تھی سو وہ بھی ہمت کر کے کہہ ہی گئی۔  
 ”وہ اکیلا آئے گا فی الحال۔ آپ پہلے اس سے مل لیں پھر اس کے باپ سے بھی مل بیجئے گا۔“  
 ابا نے تیوری چڑھا کر گہری نگاہ اس پر ڈالی۔  
 ”اچھا۔ تو پہلے وہ جائزہ لینے آئے گا ہمارا؟“  
 ”اس نے کون سا گھر راباؤ رہتا ہے ابا! آپ اس کا عیاش بن بنگلہ دیکھیں گے تو دنگ رہ جائیں گے۔ محل لگتا ہے پورا۔“ عافیہ کی آنکھیں چمکیں۔  
 ابا نے ہنسرے پھٹکارا ابھرا۔ پھر قطعیت سے بولی۔  
 ”تم بلاؤ تو سہی کل اسے۔ مگر ایک بات سن لو۔ اگر میں اس پہلی ملاقات میں اس سے مطمئن نہ ہوا تو تم

چپ چاپ پہاڑ کے عمر کے ساتھ پنجاب چلی جاؤ گی۔“  
 ”مجھے یقین ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ فیصل سے ملاقات آپ کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دے گی۔“ عافیہ نے از حد یقین سے کہا۔  
 عافیہ کے جاتے ہی ابا نے آنکھوں پر دو بڑے کالم رکھا اور چکوں پہ چکوں روٹنے لگیں۔ ابا نے ٹاکواری سے انہیں دیکھا۔  
 ”ہائے عاقب کے ابا۔ یہی دکن کا بیٹا ہی رہ گیا تھا۔ لڑکی اپنے منہ سے اپنا رشتہ بتاتی پھر رہی ہے۔ ناہل کسوں آپ سے اتنا نہ ہوا ایک پھپھڑی مار دیتے اس کے منہ پر۔“  
 ”جاہلوں دلی باتیں مت کرو۔ جو پہلے ہی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بے غیرتی سے اپنی پسند کی شادی کا اعلان کر رہی ہے اسے اور باغی کر دیتا۔“  
 ”نہ ملک صاحب! میں اپنی آیا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ وہ بے چاری بیمار۔ ہو کے ہاتھوں تنگ۔ اس بے چاری نے تو میری سوچا کہ دوسرے بیٹے کے لیے بھانجی لے جائے گی تو سارے دل درود ہو جائیں گے۔ وہ بھی چار دن سکون کی زندگی گزارے گی مگر یہاں تو کیا ہی پلٹ دی اس کلیدی عافی نے۔“ ابا کے بین جاری ہو چکے تھے۔  
 ”اری نیک بخت! کل آئے تو دے اس لوڈے کو۔ پتا چل جائے گا کہ تیرے پاس کسوتا ہے۔ ہم بھی تو دیکھیں ایسا کون سا کروڑ پتی پسند کر لیا اس نے۔“ ابا نے بات لپٹی۔ مگر ابا کی سول سول ان کی تسلی پا کر بھی دیر تک جاری رہی۔



”السلام علیکم!“ اس کے انداز میں موجود تھ کاٹ نے ابا کے سامنے خوش دلی کا لبادہ اوڑھ لیا۔  
 ”وعلیکم السلام! جیتا رہ میرا بچہ۔“ ثقاہت ان کی آواز پر غالب تھی مگر ان کی آنکھوں اور چہرے کی رونق عمر کو دیکھتے ہی لوٹ آتی تھی۔  
 ”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ وہ ان کا ہاتھ تھام کر

حرارت چیک کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔ رات سے انہیں بخار تھا۔  
 ”ٹھیک ہوں اب تو۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچا۔  
 ”ٹھیک کہاں ہیں۔ ابھی بھی بخار ہے آپ کو۔“ وہ فکر سے بولا۔  
 ”کچھ کھایا یا بھی ہے آپ نے؟“ اسے دھتکا۔  
 دھیان آیا۔ وہ صبح جاتے وقت بطور خاص بھابھی سے ان کے لیے کھجوری یا دلہ بٹائے کا کدہ لیا تھا۔  
 ان کی نگاہ بے اختیار سائڈ ٹیبل پر پڑے ڈھکے ہوئے برتنوں کی طرف اٹھ گئی۔ پھر وہ جلدی سے بولیں۔  
 ”ہاں۔ تم بتاؤ۔ تم نے بھی لپچ کیا یا ابھی تک بھوکے ہی ہو؟“  
 انہوں نے صاف بات پلٹی تھی۔ عمر اٹھ کر دستر خوان اٹھا کر کھانا چیک کرنے لگا۔ قیمہ مڑ کا سالن اور ساتھ میں تھوڑی روٹی۔ اس نے لب بچھینچے پھر وہ تیزی سے باہر کی جانب بڑھا۔ تو وہ برا فروخت سی ہو گئیں۔  
 ”عمر بات تو سنو میری۔“  
 مگر وہ دھڑکتا ہوا سیدھا ڈرامہ دیکھتی بھابھی کے سر پہ جا کھڑا ہوا۔  
 ”میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ ای کو بخار ہے انہیں کوئی ہلکی پھلکی غذا بٹائے دیجئے گا۔“ وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا تو پھر بھی مارے جذبات کے لہجہ تیزی تھا۔  
 بھابھی نے مجبوراً اپنے پسندیدہ ڈرامہ سے نظر ہٹا کے اسے ٹاکواری سے دیکھا۔  
 ”وہ بریس تو ٹھیک تھا۔ میں نے چیک کیا تھا اور ویسے بھی قیمہ مشرب تھا۔ میں نے کوئی دال دلیہ نہیں جو تم یوں لپٹیش کرنے آگئے ہو۔“  
 ”بیار آئی تو قیمہ مڑا جو اے نہیں کر سکا بھابھی۔ میں نے جو آپ سے کہا تھا کہ انہیں۔“ وہ کہنے لگا تھا مگر اس کی بات کاٹ کر وہ غصے سے

بولیں۔  
 ”تم کون سا کہیں کے فخر لگے ہوئے ہو۔“ میں کہہ گیا تھا۔ اتنا ہی خیال تھا تو خود بتا جاتے ماں کے لیے خاک کھینے۔ میں تین بچوں میں انجی کس کس کو دیکھوں۔ اوپر سے اسی صاحب۔ میرا دیا کھانا کھانے کے بجائے خود چلے بنائے کچن میں پہنچ گئیں۔ لا کے بیچ صحن میں میرے جینز کا کپ بھی پھوڑا اور چلے بھی پھینا لی۔ بھی نہیں اتنی ہمت تو بستر پہ پڑی رہیں مگر نہیں۔ میرا آرام تو کسی کو بھاتا ہی نہیں۔  
 بھابھی کے دواوے۔ ان کی بے کاری خود ترسی۔  
 عمر نے دانتوں پر دانت جملے۔ ایک دوا انہیں سن کے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ماں نے دن کس کسمیری کے عالم میں گزارا ہو گا۔ وہ بونہی سلگتا ہوا اپس آ گیا۔  
 ”کیوں گئے تم باہر۔ میں نے کہا بھی ہے اس کے منہ منت لگا کرو۔“ اسی کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔  
 ”میں کی تیسری ان کی۔ پہلے یہ آپ کا گھر ہے پھر ان کا۔“ جو تے اتارتے ہوئے سنجی سے کہتا وہ سلپہ پاؤں میں از ستاداش روم میں گیا اور ہاتھ منہ دھو کے جلدی ہی باہر نکل آیا۔  
 ”آپ نے ہی انہیں سر پہ چڑھا رکھا ہے ای! لوگوں کو دیکھیں ذرا کیسے ہووے کو کھینچ کے رکھتے ہیں۔“ تو لیکے سے ہاتھ منہ صاف کرنا وہ سنجیدگی سے بولا۔  
 ”اچھا بس اب۔ سن لے گی تو عثمان تک بات پہنچائے گی۔“ اسی نے دبے لفظوں کہا۔  
 ”کنے دس انہیں اور عثمان آپ کا بیٹا ہے جانتا نہیں کہ اس کی ماں کس طبیعت کی ہے۔“ عمر کو غصہ آیا۔  
 ”اب وہ بھی تو اس کے بچوں کی ماں ہے ناپیلا۔“ وہ بے بسی سے بولیں۔  
 ”بچوں کی ماں ہے۔ اس کی تو ماں نہیں ہے نا۔“ عمر نے تیوری چڑھائی۔  
 ”اچھا بس اب۔ بات ختم کرو۔ کھانا گرم کر کے



لاؤں تمہارے لیے؟ انہوں نے بات بدلی۔  
 ”آپ بیٹھیں۔ میں خود گرم کر لوں گا۔ بلکہ آپ کے لیے بھی کچھ لاتا ہوں۔“ وہ اٹھ کے چلا گیا۔  
 تھوڑی دیر کے بعد وہ ٹرے میں اپنا کھانا اور ان کے لیے چائے بسکٹ لے آیا۔  
 ”بس۔ اب تو ایک ہی حسرت ہے، جلدی سے عافیہ کو یہاں کے لے آؤں۔ پھر میرے بھی سکھ کے دن آئیں۔“ اسی نے چائے میں بسکٹ ڈبوئے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔ عمر کے ہونٹوں پر اس ذکر سے مسکراہٹ پھیل گئی۔  
 ”ایک ہو بھگت رہی ہیں اس سے دل نہیں بھرا آپ کا۔ ایک اور لانے چلی ہیں۔“  
 ”مارے میری ماں جانی کی اولاد ہے۔ میرا ورد محسوس کرے گی۔ سر آنکھوں پر بٹھا کے رکھے گی۔ دیکھا نہیں جب یہاں آئی تھی تو کتنا خوش تھی تمہارے ساتھ اور میری بھی سنی چاہت کرتی تھی۔“ اسی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔  
 ”وہ تو ہے۔ مگر سوہن کر لو کیاں، بہت بدل جاتی ہیں شاید۔“ عمر نے اپنا خیال پیش کرتے ہوئے نوالہ منہ میں رکھا۔  
 ”ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تمہاری خالہ فاطمہ سے بات کی ہے میں نے۔ جلد ہی کوئی مثبت جواب دے گی۔ وہ بھائی جان تو ویسے ہی تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔“ عمر کو بھی یہ ذکر اچھا لگا رہا تھا۔  
 عافیہ وہ سال پہلے پختاب آئی تھی اور ان کے ہاں مہینہ بھر کے کئی تھے۔ کھلے ڈلے باجول کی پروردہ عافیہ نے دنوں میں عمر سے بے تکلفی قائم کر لی۔ ہنسی مذاق ملا گیا۔ کچھ بچپن سے طے شدہ رشتے کا بھی احساس تھا۔ عافیہ کو عمر کی پر سنائی اچھی لگی۔ عافیہ کی طبیعت میں چھا جانے کا عنصر زیادہ تھا۔ اس کے برعکس عمر کی طبیعت دھیمی اور مقابل کا مان رکھنے والی تھی۔ اس وجہ سے وہ عافیہ سے کچھ دتا محسوس ہوتا تھا۔ بہر حال عمر کی یہ کوئی عافیہ کو بہت پسند آئی۔ اور وہ اسے مستقبل کے کھلے اشارے دیتی واپس کراچی گئی

تھی۔  
 ”ہفتہ بھر میں رزلٹ آنے والا ہے اسی۔ دعا کیجیے گا۔ بہت اچھی پوزیشن آئے۔ پھر تو بہت شان دار ہوئے تھے۔“ عمر نے امید سے کہا۔  
 ”کیوں نہیں میرے بچہ ان شاء اللہ بہت اچھا رزلٹ آئے گا بالکل تمہارے گمان کے مطابق۔“  
 اسی نے فوراً ”دعا کی تو وہ مسکرا کر کھانا ختم کرنے لگا۔  
 ☆ ☆ ☆  
 آج فیصل کو اباسے ملنے آتا تھا۔ وہ آیا اور اباسے ساتھ ڈرائنگ روم میں بند ہو کے بیٹھ گیا۔ باہر عافیہ کے دل کو گویا پھنسے لگ گئے۔ چائے بھی عاقب کے ہاتھ منگوائی گئی۔ ایک کھٹے کی مینٹنگ کے بعد فیصل کو ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے سے ہی خدا حافظ کہہ دیا گیا۔ اماں تک کو ملاقات نہ کرنے دی گئی۔  
 ابابھر آئے تو سنجیدہ تھے۔ چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ معن میں کچھ سیڑیوں کی طرف آئے تو اماں کے ساتھ ساتھ عافیہ بھی اوپر ہی آ بیٹھی۔ اسے امید تھی۔ جس طرح فیصل نے اسے متاثر کیا تھا۔ ویسے ہی ابابھی اس سے متاثر ہوئے ہوں گے۔  
 ”کیا بنا ملک صاحب، کیا تھا لڑکا؟“ اماں کے اشارے پر بھی وہ ڈھیٹ بن کے بیٹھی رہی تو انہیں اس کے سامنے ہی پوچھنا پڑا۔  
 ”فیل۔ فیل۔“ ”سرو۔ بے اعتنا لہجہ عافیہ پر بجلی سی کرا گیا۔  
 ”کیا مطلب ہے اباس بات کا؟“ وہ تڑپ ہی تو اٹھی۔  
 ”ہو نہ! گاڑی لے کے رعب جانے گیا۔ اپنے باپ کی دولت کا گھٹو۔“  
 ”صاحب جانید او ہے۔ اتنا عالی شان بنگلہ۔“  
 عافیہ احتجاجاً ”بولی۔ مگر وہ تیرے لیے اس کی بات کٹ گئے۔“

”بہت کچھ اس کے باپ کا ہے۔ صرف ایک گاڑی لے کے دی ہوئی ہے۔ اس نے بیٹے کو چڑھ چھوٹنے کے لیے۔ سب پوچھا ہے میں نے فارغ، نکلا پھر تا ہے۔“  
 ”کھم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے اباس۔“  
 ”کیوں۔ ساری عمر باپ کے ٹکڑوں پر پڑا ہے؟“  
 ”آغا۔“  
 ”سارے بزنس کا اکلوتا وارث ہے۔ وہ باپ کے لاٹ۔ پیار کی وجہ سے دھیان نہیں دیتا کام کلج کی طرف۔“ عافیہ نے فیصل کی حمایت کی۔  
 ”بہر حال میرے تو کسی بھی سوال کا خاطر خواہ جواب نہیں دیا اس نے۔ میں بالکل بھی مطمئن نہیں ہوں اس لڑکے سے۔“  
 اباسے صاف گویا کا مظاہرہ کیا۔ عافیہ مرنے والی ہو گئی۔  
 ”کیا بات کہیں ابابوہ کوئی سڑک چھاپ آ دی نہیں ہے۔ فارغ بیٹھ کے بھی کھائے تو دولت ختم نہ ہو ان کی۔“  
 ”بہر حال۔ میں تمہیں وہ فیصل سنا رہا ہوں۔ جو اٹل ہے اور آخری۔“ اباسے اونچی آواز میں کہا تو ان کے دنگ بچے نے عافیہ جیسی بد لحاظ لڑکی کا دل بھی دہلا دیا۔  
 ”صرف تمہاری خوشی کی خاطر میں اس لڑکے سے تمہاری شادی کرنے کو تیار ہوں۔“ اباسے منہ سے گویا پھول جھڑپے۔ عافیہ نے جھٹکا کھا کر ان کی طرف دیکھا۔  
 ”میری صرف اور صرف ایک شرط ہے۔“ وہ بے حد سرد و پاش کجے میں بولے۔  
 ”کئی اباس۔“ وہ مثبت ہوئی۔ مگر اندر سے سخت بے قرار۔  
 ”اس سے کوئی نہیں، باپ کو لے کے آئے۔ وہ باقاعدہ تمہارا رشتہ دیں۔ جیسے شریفوں کا طور طریقہ ہے۔“ اباس کا انداز قطعی تھا۔ عافیہ گزرتی۔  
 ایک عین پہ تو فیصل کا کس کمزور پڑا تھا اور اباسے

بھی اسی پوائنٹ پر ہاتھ مارا تھا۔  
 ”اباس۔ میں بات کروں گی اس سے۔ لیکن اس کی کچھ گھریلو مجبوریوں ہیں۔“ عافیہ نے کہا۔  
 ”بیٹا ہے اس نے مجھے بچا کی بیٹی منگیتے رہے اس کی۔ ابھی سے اپنے ماں باپ کو لائن پہ لگائے گا تو ہی اس گھر میں تمہاری جگہ بنے گی۔ ورنہ تو تمہیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں وہاں اس عالی شان محل میں۔“ اباس نے طنز کیا۔  
 بات تو ان کی سو فیصد درست تھی۔ مگر فیصل کے والدین تو کبھی مر کے بھی عافیہ کا رشتہ مانگنے نہ آتے۔ یہ بات فیصل نے اسے شروع میں ہی بتادی تھی۔  
 ”میں پھر بات کروں گی اس سے۔ شاید کوئی راستہ نکل ہی آئے۔“ عافیہ بچھ سی گئی۔ اباسے انگلی اٹھا کر اسے متنبہ کیا۔  
 ”یاد رکھنا عافی! میں نے اپنی غیرت کو سلا کے تمہاری اتنی خدما کی ہے۔ لیکن اگر وہ لوگ رشتہ مانگتے نہ آئے تو اس سے بڑھ کے کوئی بات نہ کرنا۔ میں تمہیں کسی چور دروازے سے ان کے بنگلے میں داخل ہونے کی اجازت کبھی نہیں دوں گا۔“  
 اباسی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ عافیہ نے نظر جھکا لیا۔  
 ”جی ایسا۔“ ہنسی سے کہا۔ مگر اندر تو طوفانی تھل چھل مچی تھی۔  
 ☆ ☆ ☆  
 وہ آفس سے نکلی تو پروگرام کے مطابق وہ گاڑی لیے موجود تھا۔ عافیہ فرنٹ سیٹ پہ آ بیٹھی۔  
 ”کسی پارک میں لے چلو۔ سکون سے بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔“ وہ است سی تھی۔  
 ”خیریت تو ہے نا۔ تمہارے اباس نے مجھے ڈیجیٹل تو نہیں کر دیا ہے۔“ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ خوش دلی سے پوچھنے لگا۔  
 ”شاید۔“ تمہیں کیسے پتا چلا؟“ عافیہ نے ترجیحی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”جیسے وہ طارق عزیز بن کے سوال پوچھ رہے تھے۔ اسی سے مجھے لگ رہا تھا کہ دل سے وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ پھر پارک آئے تک وہ دونوں خاموش ہی رہے۔ بروقت پارک میں قدرے سائیز پر وہ دونوں چلتے ہوئے ایک بیچ پہنچے۔

”اب بتاؤ تفصیل سے۔ کیا ارشاد فرمایا تمہارے ابا نے؟“ فیصل کے انداز سے کوئی پریشانی ظاہر نہ تھی۔ ”اب اس رشتے پر راضی ہیں۔“ عافیہ نے کہتے ہوئے رک کر فیصل کو دیکھا جس کے چہرے پر حیرت پھیلی تھی۔ پھر کمری سانس بھر کے بولی۔ ”مگر رشتہ لے کر تمہارے والدین آئیں تو۔“

”دوسری ایک کام ہو نہیں سکتا۔“ ”تم میرے ابا کو نہیں جانتے فیصل! ان کا اس رشتہ کے لیے راضی ہو جانا ہی کسی معرکے سے کم نہیں۔“ ”اور تم میرے باپ کو نہیں جانتیں۔ میرے تمہارے ایشو کا علم ہوتے ہی وہ اپنی بیٹی سے میرا نکاح بدھاوا دیں گے۔“

فیصل نے ٹھنڈے ٹھارے لہجے میں جواب دیا۔ ”تم ان کے اکلوتے بیٹے ہو فیصل۔ ذرا بلیک میل کر دے تو انہیں مانتا ہی پڑے گا۔“ عافیہ نے اپنی سی کوشش کی۔

”تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو مجھے کیا شوق ہے۔ خوری کا یا کئے کئے کے لوگوں کی باتیں سننے کا۔“ وہ ہنرک اٹھا۔ تو عافیہ دھیمی پڑ گئی۔ پھر وہ بھی خود کو کمپوز کرتے ہوئے قدرے نرمی سے بولا۔

”یہ خاندانی جائیداد اور برنس کے معاملے ہیں جان! تم نہیں سمجھو گی۔ میری اور شانہ کی شادی کی صورت میں شانہ کے حصے کی جائیداد اور برنس شیئرز ہمیں ملیں گے۔ یہ بات تو طے شدہ ہے۔ اب تم سے تو فقط محبت کے بارے شادی کر رہا ہوں۔ ورنہ کیا حاصل ہو رہا ہے مجھ سے تمہارے ابا اتنی شرطیں رکھ رہے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے فیصل! لیکن اب کیا ہو گا۔ ابا نے

”تمہارا رشتہ قبول کرنے کی یہی ایک شرط رکھی ہے۔“ عافیہ بے بسی سے بولی۔ پر آسائش زندگی کا خواب دور جاتا محسوس ہوا تھا۔

”شادی میں نے تم سے کرنی ہے جان من۔ تمہارے ابا سے نہیں۔ ان کے راضی ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ تو عافیہ نے نا اچھی کے عالم میں اسے دیکھا۔ وہ مسکرایا۔

”کیا کچھ غلط کہا میں نے؟“ ”مگر ابا کی رضامندی کے بغیر یہ شادی کیسے ہوگی؟“ ”شادی کے لیے ابا کا نہیں بلکہ دولہا اور دلہن کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔“

وہ اطمینان سے کہتا اس کے باغی ذہن کو نئی سوچ کی باگ تمہارا تھا۔ عافیہ گم سم سی تھی۔

عافیہ نے ابا کو صاف لفظوں میں بتا دیا کہ فیصل کے گھر والے اس رشتے پر کسی طور پر راضی نہیں۔ اس لیے انہیں فی الحال فیصل ہی پر انکشاف کرنا پڑے گا۔ مگر ابا متاثر نہ کیا ہوتے انہوں نے ہاتھ ہی جھاڑ دیے۔ ”فاطمہ فون کر د اپنی آبا کو اور شادی کی تاریخ طے کر لو۔“

”ابا۔“ عافیہ سکتے میں آ گئی۔ جبکہ ابا کے تودل کی کلی ہی کھل اٹھی۔ بن سے کیا وعدہ بھالنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔

”میں نے کہا ملک صاحب! اچھا متکن ہے۔ عالی کے ساتھ ساتھ عاقب کو بھی بننا ڈالیں۔ گھر کی بچی ہے نہ نہ پھر ہی میں کھپ جائے گی۔“ ابا بے حد خوش تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ سوچتے ہیں اس کا بھی کچھ۔“ ابا نے پر مٹ جاری کر دیا۔ چن میں کھڑی نہ نہ تو خوشی کے مارے لگسے ہی ہو گئی۔

عاقب سے شادی ہو جانے کا مطلب تھا۔ اس گھر میں ایک مستبر حیثیت ملنا اور یہ کلہوٹی عافیہ بھی بیاہ کے

دور رخ ہو جائے گی۔ متوقع آزادی کا خیال ہی اس کے روم روم میں خوشی بوڑانے کو کافی تھا۔

چن کا فون آیا تو وہ الجھا ہوا تھا۔ ”امی۔ کیا جلدی ہے آپ کو عمر کی شادی کی۔“ اسے کوئی ڈھنگ کی نوکری نوکری لگنے دیں۔ ایک اور ذمہ داری ڈال رہی ہیں اس پر۔ جو بھالنے کے انہی وہ قابل بھی نہیں ہوں۔“ اس کے منہ میں یقیناً ”بیوی کی ذہان تھی۔“

”تم بے فکر ہو۔ اللہ کے فضل اور عافیہ کے ٹیک نصیب سے امتحان میں بہترین نمبروں سے کامیاب ہوا ہے۔ وہ۔ پڑی اعلا نوکری لگے گی اب اس کی۔“ امی بے حد خوش تھیں۔

کل ہی فاطمہ نے فون کر کے اگلے ماہ شادی کی تاریخ دی تھی۔

”پھر بھی امی۔ ذرا سوچ سمجھ لیں۔ عمر اس کی ذمہ داری اٹھالے گا؟“ وہ دبے لفظوں میں جواب نہیں سمجھتا چاہ رہا تھا۔ وہ ایک دم سے ان کے ذہن میں کلک ہوا۔

”تم بے فکر ہو بیٹا۔ ساری ذمہ داری وہ خود ہی اٹھائے گا اور اپنی شادی کا خرچ بھی ان شاء اللہ۔“ ان کا لہجہ جھجک سا گیا۔ ایک ہی روٹی پہ پلٹنے والے کیسے اپنے رزق جدا کر لیتے ہیں۔

”چل چل ٹھیک ہے پھر تو جیسا وہ مناسب سمجھے۔ میرا تو آپ کو بتا ہی ہے۔ ڈھنگ کی نوکری نہیں مل رہی۔“

بیشکل ہی گزارا۔ ”وہ اپنا رونا رونا لگا۔“ ”خدا بہتر کرے گا بیٹا۔“ ابا کے دل نے خیر ہی دعا دی۔ وہ خوش تھیں۔

اور عمر مطمئن۔ اس گھر میں آنے والی یقیناً اس کی ماں کو بہت سکھ اور عزت دینے والی تھی۔

”خدا کے لیے کسی طریقے سے اپنے ابا کو راضی کر د فیصل۔ بلکہ اپنی امی کو نائیں تو سدا کی رحم دل ہوئی ہیں۔ وہ یقیناً تمہارا ساتھ دیں گی۔“ عافیہ نے

شادی کی تاریخ طے ہونے والی بات فیصل کو بتاتے ہوئے احتجاج کر ڈالی۔

”گنا فیصل کی بحث ہے یا رانہ حاصل نہ وصول۔ ہمارے گھر میں فقط ابو کا فیصل جلتا ہے اور بس۔“ فیصل آکر اٹھا بولا۔

”تو پھر۔ بیٹھ کے شادی کا دن آنے کا انتظار کروں؟“ عافیہ کو غصہ آیا۔ سچ ناظم میں وہ اس کے ساتھ چھوٹے سے ریٹورنٹ کے ٹیبلن میں موجود تھی۔

”ہاں۔ انتظار کرو۔ اپنی اور میری شادی کے دن کل۔“ وہ خوشی سے بولا۔

”تم بس گاڑی کی آڑی دھول دیکھتے رہ جانا اور ابا مجھے عمر کے ساتھ رخصت کر دیں گے۔“ عافیہ نے جل کر کہا۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تم لکھ رکھو۔ رخصت تو تم میرے ساتھ ہی ہوگی۔“ وہ حد درجہ مطمئن تھا۔ عافیہ کا دل اس کے یقین بھرنے لہجے پر ٹھہرنے لگا۔

شاید تب تک اس کے والدین راضی ہو جائیں۔ ”مگر تم حین شادی والے دن بھی اپنے گھر والوں کو راضی کر کے لے آئے تو میں تمہارے ساتھ چل پڑوں گی فیصل۔“ وہ جذباتی ہو کر بولی۔

”ڈونٹ دری جان۔ تم شادی کی اچھی سی تیاری کر دیں۔ زیور کپڑے خوب دل لگائے خریدو۔ تاکہ گھر والے تمہاری طرف سے مطمئن رہیں۔ میری جان لیا در کھو۔ آخری چال ہماری ہی ہوگی۔“

وہ اس کا ہاتھ تمام کے یقین سے بولا اور اس کا ہاتھ لیوں سے لگایا۔

خوب صورت سی مسکراہٹ عافیہ کے لیوں پر پھیل گئی۔

زینب کا موڈ صبح سے خراب تھا۔ جب سے عافیہ نے اس کے پیروں سے اپنی گلابی اور سیاہ وڈی چپل اتروائی تھی۔

”کھینچی غنڈی“ اللہ کرے مر جائے دے کے  
چیس واپس لینے والی۔  
اس نے کئی ہی دفعہ آنسو پونچھے تھے۔  
”ہائے۔۔۔ کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ میرے  
گورے گورے پیروں میں۔“ اس نے حسرت سے  
سوچا۔

چپل خاصی مہنگی تھی۔ مگر اس کی پٹی ڈھیلی پڑ گئی تو  
عافیہ نے یوں ہی الماری کے خانے میں ڈال دی۔ نئی  
جوتیوں نے اسے اس چپل کی یاد بھی بھلا دی۔ دو دن  
پہلے اس نے زینب سے الماری صاف کروائی تو وہ چپل  
شاید بطور مزدوری عنایت کر دی۔ زینبی تو اسی پر خوش  
ہو گئی۔ فوراً ہی محلے کے بچے کو بھیج کر جوتی سلائی  
کروائی اور پہن لی۔ مگر اس کا شوق دو دن ہی پورا ہوا  
تیسرے دن عافیہ کی نظر اس کے پیروں پر پڑی تو اسے  
خیال آیا کہ اچھی خاصی خوب صورت چپل تھی۔  
جب زینب کے پیروں پر اتنی اچھ رہی ہے تو یقیناً اس  
کے پیروں میں بھی اتنی ہی خوب صورت لگتی ہوگی۔  
اس نے فوراً ہی حکم صادر کیا کہ یہ چپل انارکے  
الماری میں رکھ آؤ۔ زینب کا دل حسب عادت ٹوٹ  
پھوٹ گیا۔  
”مجھے تو بس ہر کوئی اپنا مطلب نکالنے کے لیے  
استعمال کرتا ہے۔ زینبی یہ گردو زینبی وہ گردو۔ اس کے  
بعد کون زینبی گھٹس کی زینبی۔“  
وہ سخت برگشتہ آؤرہ تھی۔

\*\*\*

عافیہ نے دل اور جیب کھول کر اپنے لیے زیور اور  
کپڑے خریدے تھے۔  
”اسی سیونگڑ کو ہاتھ بھی مت لگانا۔ اکلوتی بیٹی ہو۔  
باپ کے پیسے ہر شے بناؤ۔“ فیصل نے مشورہ دیا۔  
پھر وضاحت بھی کر دی۔  
”کل کو جانے کیسے حالات ہوں۔ کچھ عرصہ اگر  
مشکل کاغذی پڑی تو کچھ میرا بیٹک بیلنس اور کچھ تمہاری  
سیونگڑ سے کام چل جائے گا۔“

”یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا اور ویسے بھی میرا خرچہ  
نکل کے میری ساری تنخواہ بینک میں ہی جاتی ہے۔ اب  
تو میری تنخواہ کا ایک سو بیس تک لینا حرام سمجھتے ہیں۔ تو  
مسکرائی۔  
”اوہو۔۔۔ یعنی کہ خاصی بھڑکی آسانی ہو۔“ وہ  
ہنسنا تو عافیہ اترائی۔  
”کیسی کیسی۔“

\*\*\*

فیصل کی لارڈ لائی پر عافیہ پریشان تو بہت تھی۔ مگر  
معاملے کو اٹھانے والے انداز میں لے رہا تھا کہ وہ بھی بل  
جاتی۔ شادی میں محض ایک ہفتہ بلی رہ گیا تھا۔  
لڑکے والے ہندی سے ایک روز پہلے کراچی آتے  
اور دو دن یہاں رہ کر واپس لے کر جاتے۔ سب  
پر وگرام طے تھا۔ جب فیصل نے فون پر بڑے جوش  
سے اسے بتایا۔  
”مبارک ہو عافی! ای، ابو کو راضی کر لی لیا میں  
نے۔ وہ میرا پو پوئل لے کر آئے کو تیار ہیں۔“  
”واقعی۔۔۔ وہ خوش ہو گئی۔  
”ہاں۔۔۔ تم بتاؤ۔۔۔ آج۔۔۔ ابھی۔۔۔ شام کو۔۔۔ کس  
وقت آؤں انہیں لے کر؟“ وہ محبت سے پوچھ رہا تھا۔  
”میں اب اکوٹیا ہی ہوں۔ وہی طے کر سکتے ہیں۔ یہ شرط  
بھی تو انہوں نے ہی رکھی تھی۔“ وہ غرط مسرت سے  
بولی۔

اس کم عقل کو ذرہ برابر بھی احساس نہ تھا کہ اس کی  
شادی طے ہو چکی ہے اور محض ایک ہفتے بعد بارات  
آنے والی ہے۔ اس نے جا کر پہلے اپنے تئیں یہ خوش  
خبری الماں کو سنائی۔  
”ہائیں۔۔۔“ وہ کھلے منہ اور پھٹی آنکھوں سے اسے  
دیکھتی رہ گئیں۔ ”گیا کہہ رہی ہے کہ بخت۔“  
”جی۔۔۔ اوف۔۔۔ ابانے ہی تو کہا تھا کہ فیصل کے گھر  
والے اگر رشتہ لے آئے تو وہ میری اور فیصل کی شادی  
ہو جانے دیں گے۔ مبارک ہو لالہ! فیصل کے ماں  
باپ مل گئے۔“ وہ تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

اماں کو تو ٹوٹ کر ہوش آیا۔ اسے دو ہتھڑ سید کیے  
”اسی حرام خور بے غیرت، کیسی کلمہ ہی ہے تو۔  
اری لالہ نہ اتنی تجھے شادی سے پہلے دن پہلے دوسرا  
رشتہ لاتے۔ جیسا باپ کو چاہا تو کدی سے نہیں کھینچ  
لے گا تیری۔“ ماں ایسا چپچپ کہ حلق میں خراشیں پڑ  
گئیں۔ کھانسی شروع ہو گئی۔ زینب بھاگ کے پانی  
لائی اور گلاس ان کے منہ سے لگا دیا۔ ان کی آواز ابا کو  
ڈرانے لگی۔  
”گیا تمہارا لگا رکھا ہے یہاں۔“ وہ غصے میں تھے۔  
”چار لوگ آئے بیٹھے ہیں اور تم نے یہاں اپنا ڈھونڈ چلا  
دیا۔“

”مجھ سے کیا پوچھتے ہیں عاقب کے ابا! اس بد ذات  
سے پوچھیں۔ جس کے چپھن شریفوں والے نہیں  
رہے۔“ وہ دھپے میں منہ دیے ہتھ پھیک کر رو دیں۔  
وہ حیرت سے عافیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ جس کے  
تاثرات کی خود سری اور ماتھے کی تیوری انہیں صاف  
محسوس ہو گئی تھی۔  
”کیا ہوا؟“

”اماں کی تو عادت ہے۔ جھوٹی سی بات کو کھینچ کے  
چپو ٹم نکالتی ہیں۔ میں نے تو صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ  
فیصل کے ابا، ابو مان گئے ہیں اور وہ شام کو انہیں میرا  
رشتہ مانگنے لارہا ہے۔“

ابا پر بھی لمحہ بھر کو سکتہ سا طاری ہوا۔ اس کے بعد تو  
انہوں نے نہ آؤں کھانہ نہ آؤں عافیہ کی چٹاپا پکڑ لی۔  
”خبردار۔۔۔ خوار جو میری عزت کا جتانہ نکالنے والی  
بات منہ سے نکالی ہو تو۔“ وہ دھیمے مگر خونخوار لہجے میں  
غرائے تھے۔ ”زندہ گاڑ دیں گا۔ اگر اب جو تمہارے  
منہ سے فیصل کا نام سنا تو۔۔۔ یہاں آیا تو ماں، باپ  
سمیت کفن میں واپس جائے گا کہہ دینا اسے۔“ ایک  
جھٹکے سے اس پرے وکیل کر وہ تن فتن کرتے واپس  
چلے گئے۔

عافیہ کے لیے ابا کا رویہ کھلی دھوکے بازی تھا۔ وہ

اجتناباً جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

\*\*\*

لاڈلہار میں پلی اکلوتی بیٹی نوکری کر کے خود سر و خود  
بھٹکار ہو چکی تھی اور خود غرضی تو اس کی فطرت تھی۔ وہ  
ان لوگوں میں سے تھی جو سب سے پہلے اپنے بارے  
میں سوچتے ہیں۔ اس سے پہلے سب اس کی ناراضگی کو  
اہمیت دیتے تھے۔ مگر اس بار تو اس کی ضد اور جرم اس  
قدر کڑا تھا کہ کسی نے بھی اس کے کمرہ نشین ہونے یا  
بھوک ہڑتال کرنے کا ٹولس نہ لیا تھا۔ فقط زینبی ہی تھی  
جو اس کے لیے چائے پانی کا کھانا لے جاتی۔

”دفع ہو جاؤ۔ کیوں بار بار آ جاتی ہو یہ سب لے  
کر۔“ عافیہ نے غصے سے ٹرے کو پرے دھکیلا۔ مگر ان  
دونوں زینب کا سوا اس قدر خوش گوار تھا کہ اسے اب  
عافیہ بے چاری سی لگنے لگی تھی۔

”کیا کرتی ہیں عافیہ جی۔ شادی ہو رہی ہے آپ کی۔  
یوں بھوک ہڑتال کرتی رہیں تو چرے کی رونق ختم  
ہو جائے گی۔ روپ نہیں آئے گا۔ کمن بن کے۔“

وہ مسکرائی۔ ”چچی رنک اور براؤن کنجوں جیسی  
شفاف آنکھیں عافیہ جی بھر کے جھلس ہو گئی۔

”سنئے اچھے تو ہیں عمر بھائی۔ آپ کے کمپیوٹر میں  
ڈیروں تصویروں ہیں ان کی۔“ اس کی خاموشی نے  
زینبی کی ہمت بندھائی۔

”تو تم لے لو اتنا اچھا ہے تو۔“ وہ غرا کر بولی تو زینبی  
سسم سی گئی۔

”تمہارا تو رنگ روپ ماند نہیں پڑا نا۔ تم کر لو یہ  
بھلائی۔“ عافیہ کی تو زبان گے آگے کھائی تھی۔

”نہ جی۔۔۔ تو بس۔ میں ایسا کیسے آپ کی ہندی  
والے روز میرا اور عاقب کا نکاح ہے۔“ اس نے  
گھبرا کر کہا۔ تو بات کے آخر میں رنگت میں سرخی  
اترنے لگی۔

”تو جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ بھگڑاؤ ڈالو جا کے تمہاری  
کون سا زندگی برباد ہو رہی ہے، میری طرح۔“ عافیہ



نے غصے سے کہا تو زینبی کا دل برابر پڑنے لگا۔ عافیہ کسی کی خوشی میں تب ہی خوش ہوں۔ جب خود وہ خوش ہوئی تھی۔

”مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ چڑیل کے مسکن میں۔“  
وہ نے اٹھا کر بدلی سے پلٹ گئی۔



عافیہ کی خاموشی نے اماں کو اس کی طرف سے خاصا لا پرواہ کر دیا تھا۔ ویسے بھی آج شام عمر کے گھر والے آجائے والے تھے۔ کل پانچوں ’ہندی‘ پرسوں بارات کے بعد وہ واپس لے کے پتھاب نکل جاتے۔ عاقب نے اسے ڈھونڈ لیا۔ آئی خواتین کے لیے چائے بناتے ہوئے کچن میں جا لیا۔

”ابا۔۔۔ میری واپس یہاں چھپی بیٹھی ہے۔“ وہ ایک دم سے بولا تو چھپتی میں چائے چھانتا اس کا ہاتھ لڑا۔ گرم گرم چائے کر کر اس کے پاؤں کو جلا گئی تھی۔

”اللہ۔۔۔ اس کے جملہ کامزہ کیا خاک لیتی۔ پاؤں لال سرخ ہو گیا۔“

”سوری۔۔۔ سوری۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ چائے ڈال رہی ہو۔“ عاقب نے فوراً کان پکڑے۔  
وہ خاموشی سے پلٹ کے نے اٹھانے لگی۔

”اے ابا۔۔۔ براغور ہے زینبی محترمہ کو۔ میں بات کرنے کو مرا جا رہا ہوں اور تمہیں پرواہی نہیں۔“ وہ خفا ہوئے لگے۔

زینبی نے مسکراہٹ دی۔ دل روئی کے گلے کے طرح ہلکا ہلکا ہو رہا تھا۔ اس دن کے تو وہ خواب بنا کرتی تھی۔

”وہاں چائے کا انتظار ہو رہا ہے۔“ باریک سی گونئی سے سجاوین کھر کا سون اس پر کھل رہا تھا۔ عاقب نے آج سے پہلے اسے ہمیشہ گھر کی مرئی سمجھا تھا جو وال جا کرتی ہے۔ مگر آج اسے احساس ہوا کہ کون سا

بیر اس کی آغوش میں مگر نہ والا ہے۔

”کل ہمارا نکاح ہے زینبی۔“

وہ جذباتی ہوئے لگا۔ آگے بڑھ کے اس کے دلوں شانوں کو جکڑا۔ زینبی کے جذبات میں بھی تلاطم چل کر اس نے برے حوصلے سے نگاہ اٹھا کر عاقب کو دیکھا۔ اونچا لہا ہندی رنگت اور اچھے نقوش والا عاقر اس کا خواب تھا یا شاید اپنی حیثیت بدلنے کے لیے استعمال کیے جانے والا ذریعہ۔

”زینبی۔“

عاقب کی نگاہ کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی غماز آتا۔ زینبی نے بے سرعت اس کے ہاتھوں کو اپنے شانوں سے پرے کیا۔

”ہوش میں رہو۔“ اس کا تینہ ہی جملہ ابھی من میں ہی تھا کہ اس نے عاقب کے چہچہے عافیہ کو دیکھا۔

”یہاں کون سی فلم کی ریکارڈنگ چل رہی ہے؟“ اس کا طنز لہجہ اچانک ہی گونجا۔ عاقب کے جذبات ہرن ہو گئے۔

”دھ۔۔۔ پانی۔۔۔ پینے آیا تھا میں۔“ کھسکا کر کتا، بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہا ہر چلا گیا۔ زینب مڑ کر نے اٹھا کر نکلی۔

”کافی آوارہ ہو تم بھی۔“ عافیہ کا کڑوا لہجہ اس کے اعصاب پر چلبک کی طرح ہر سا۔

”تم نے کیا کیا ہے۔ وہ خود آیا تھا نہیں۔ میں آجائے بنا رہی تھی۔“ زینبی روپائی ہوئے لگی۔

”اوری چل۔“ بکواس تو اس کے سامنے کر جوئے جانتا نہ ہو۔ کیسے ابھی سے انگلی نہ بھاڑی ہے اسے۔

”اشاروں، اشاروں میں یہاں گئے تھے۔ پہلے بھی جا نہیں کیا کیا گل چھریے اڑا چکی ہوگی۔ ہم تو چھٹی اعتبار کے بندے ہیں۔“ بھی غور ہی نہیں کیا۔

عافیہ کی ذہنی گراؤٹ کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ زینب پہلی پر پڑی۔ ایسے کھنڈا الزامات۔

اسی وقت لڑکے والوں کے آنے کا شور مچ گیا تو عافیہ اسے حیلگی نگاہوں سے دیکھتی کچن سے نکل گئی۔

زینب نے دھندلائی آنکھوں کو بے دردی سے ہتھیلیوں سے مرگڑا۔  
دل یک نکت ہی بو جھل سا ہو کر جیسے دھویں سے بھر گیا تھا۔



عمر کی فلی کے ساتھ خاندان کی چند خواتین اور مرد بارات کے طور پر آئے تھے۔ رات سکون کے ساتھ عزری۔ اوپر ہی منزل پر سب کے فنی بستر لگا دیے گئے تھے۔ تین کمروں میں چند لوگ آسانی سے سو گئے۔ البتہ عمر کو عاقب کے ساتھ کمرہ شہر کرنا تھا۔ عمر نے گرم جوش سے اسے ہونے والے نکاح کی مبارک باد دی۔

”صبح ناشتے کے لیے آگئی زینبی ہی گھن چکر بی ہوئی تھی۔ اماں کو عافیہ کی سستی اور ہڈ خراپی بری طرح کھلی۔“  
”اے علی کو جگاؤ۔ تمہارا ہاتھ بنا دے کچھ۔“ انہوں نے زینبی کو نکارا۔

”رہنے دیں ناں اماں! واپس ہے وہ کام کرتی اچھی لگے گی بھلا۔“ زینبی نے بچے دل کے ساتھ مسکرا کر کاتو وہ تھلا نہیں۔

”تمہاری بھی تو شادی ہو رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بندہ تخت نشین ہو کر بیٹھ جائے۔“

تپا کے سامنے عافیہ کی ہڈ خراپی انہیں بالکل بھی نہیں بھاری تھی۔ اتنے سارے مہمانوں کو بھلا اکیلے زینب کی سنبھال پائی۔ عمر کی بھابھی صاعقہ کے ہاتھ بھی طنز کا مرقع لگا۔

”بھئی، ہم تو سہماں ہیں یہاں ورنہ خود ہی اٹھ کے سب بچا لیتے۔ اب کون واپس لے دیکھتا ہے اور پھر گھر آئے مہمانوں کی خاطر داری۔“ تب اماں کو اٹھنا ہی پڑا۔ اور کڑے تیور لے کے عافیہ کے کمرے میں گئیں۔

”ہم قدر بے حیا اور ڈھیٹ لڑکی ہے۔ یہ رات ایک بار شکل دکھا کے دوبارہ پلٹی نہیں خالہ کی طرف ہونے والی ساس ہے۔ اتنا بھی لحاظ نہیں کیا کجغنت

نے۔“

وہ دردانہ دھکیلتی اندر آئیں تو بستر خالی پا کر دل مطمئن ہوا۔ عافیہ اٹھ کئی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ وہ یقیناً ’واش‘ روم میں تھی۔ وہ بیڈ پر تھیں۔

”شکر ہے اسے بھی عقل آئی کچھ۔“ وہ اس کی گوشمالی کرنے کے خیال سے وہیں بیٹھی تھیں۔ تب ہی انہیں دھیان آیا کہ بیڈ کی چادر بے ممکن تھی اور سفید چادر تہ کی ہوئی پیروں کی طرف پڑی تھی۔ عافیہ اتنی سکھ تو نہ تھی کہ اٹھتے ہی چادر تہ کر کے بیڈ شیٹ درست کر کے پھر ہاتھ روم جاتی۔

”زینبی نے کیا ہو گا سب کچھ صحیح۔“ انہوں نے ذہن کو دوسری طرف لگایا۔

پھر انہیں خیال آیا کہ زینبی تو مستقل کچن میں سر کھپا رہی ہے۔ ان کا دل گھبرانے لگا۔ واش روم میں بالکل خاموشی تھی۔ پانی گرنے کی آواز تک نہ تھی۔

پھر ان کی نگاہ واش روم کے ادھ کھلے دردانے کی جھری پر پڑی۔ وہ بدقت اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھیں۔ واقعی دردانہ کھلا تھا۔ انہوں نے دردانہ دھکیلا تو واش روم خالی۔

”یہ صبح کہاں دفع ہو گئی۔“ ان کا دل گھبرا گیا۔  
دردانے تک جا کر انہوں نے زینبی کو نذر نذر سے آواز دیں تو وہ بھاگتی ہوئی آئی۔

”عالی کہاں ہے؟“ انہوں نے متوحش انداز میں پوچھا تو وہ ان کے شانے کے اوپر سے کمرے میں جھانکتے ہوئے بولی۔

”واش روم میں ہوں گی۔ میں تو صبح سے ادھر آئی ہی نہیں۔“

”میرے خدا۔۔۔ وہاں مہمانوں میں دیکھ۔ وہاں نہ ہو۔“

”ادھر تو بالکل بھی نہیں ہیں۔ وہ سب تو واپس دیکھنے کو بے تاب ہیں۔ ابھی ناشتا دے کے آ رہی ہوں سب کو۔“

زینب نے تین سے کہا تو وہ لڑکھڑاسی گئیں۔ بے ممکن بیڈ شیٹ تہ کی ہوئی چادر جیسے رات اس بستر پر

کوئی سویا ہی نہ ہو۔ زینب نے گھبرا کر انہیں قہام لیا اور بیڑہ لایا تھا۔

”نہیں۔ تو تھک ہے آپ کی؟“  
”زینب! الماری چیک کر عانی کی۔“ انہوں نے ڈوبتی آواز میں کہا تو وہ جیسے ان کی ذہنی حالت پہ شک کرتی ان کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”الماری میں تھوڑی چھپی ہوں گی وہ۔“  
”الماری میں زیور دیکھ کجخت۔ کپڑا لادیکھ اس کرموں جلی کا۔“

وہ دلی آواز میں دھاڑیں تو گھبرا کر زینب نے عافیہ کی الماری کے دونوں پٹ کھولے۔

کل تک بیٹنگ زینب جوڑے لنگ رہے تھے خانوں میں تہہ در تہہ پڑے تھے ان کی نگاہ بے اختیار الماری کی سائیں پر پڑی۔ جمال عافیہ کے جینز کے کپڑوں کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ وہ جگہ آب خالی تھی۔ ڈوبتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ وہ تیزی سے آگے بڑھیں اور الماری کا لاکر کھولا۔ وہ کسی فقیر کے کاسے کی مانند خالی تھا۔

”ہائے۔“ ان کی آواز میں غم و اندوہ تو تھا ہی۔ مگر کچھ ایسی کیفیت بھی تھی جس نے زینب کو لرزادیا۔  
”راکھ ڈال گئی ہمارے سروں میں۔ عافیہ تیرا بیڑا غرق ہو۔“ وہ رو دین۔

زینب کی پیشانی پسینے کے قطروں سے چمک اٹھی۔  
”اے مہر زام سے وہیں بیٹھ گئیں۔“  
”تائی! اے۔“

”زینب! مریگے ہم لوگ جتنا زہر نکل گیا آج تیرے تاپا کی عزت کا۔ بھاگ گئی وہ بے غیرت گھر سے۔“  
”تائی! میں منہ بہ دیشا ڈالے تین کر رہی تھیں۔ زینب کو لگا اس کے قدموں تلے زین نکل گئی ہو۔“

زینب نے چوڑی کی طرح سارے گھر میں دیکھ لیا۔ مگر وہ نہیں تھیں تھیں بھی۔ مجبوراً ”ابا کو کمرے میں بلانا پڑا۔“

”کیا مصیبت ہے۔ ہزار کام پڑے ہیں وہاں اور یہاں تم۔“ وہ کچھ غصے میں اور کچھ جھنجھلائے ہوئے

اندرا داخل ہوئے مگر اہل کو روتے کر لاتے دیکھ کر گھبرا گئے۔

”دیکھا ہوا نیک بخت؟“ عاقب سرخ چہرے لیے تیز قدموں کے ساتھ اندر آیا۔  
”کہاں گئی ہے وہ؟“  
”کون۔ کیا ہوا کچھ بتاؤ؟“

”ملک صاحب۔ لٹ گئے ہم عزت کا جتنا نکال گئی ہماری بیٹی۔“ اہل بلک اٹھیں۔  
”ابا! کھڑا کر پیچھے بٹے۔ پچھی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ عاقب نے جلدی سے بڑھ کے انہیں سنبھالا۔

”عانی کہاں ہے؟“ وہ بے اعتباری سے اہل عاقب اور روئے چہرے والی زینب کو دیکھ رہے تھے۔  
”وہ۔“ وہ تو نہیں ہیں گھر میں۔ الماری بھی خالی ہے۔ کپڑے زیور سب۔“ زینب کو بے لحد قیامت لگ رہا تھا۔ ابا کے منہ سے غراہٹ سی نکلی اور بس۔ وہ

وہیں ڈھسے گئے تو جوان جناب عاقب سے بھی نہیں سنبھالے گئے۔ زینب بے اختیار اس کی مدد کو آگے بڑھی تھی۔

خالد اور عمر کو یہ سب بتانا ایک اور قیامت تھا۔ مگر اہل نے بڑی بس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔  
”ان کی رنگت فتنہ برائی۔ عمر نے سختی سے دانت پیچھے۔ کنپٹیوں کی ریشیں نمایاں ہو گئیں۔ صاعقہ بھاگتی کے ہاتھ ایک نیا شوہر لگا۔“

”اے۔“ تو ہمیں کیا یہاں بے عزت کرانے کے لیے بلوایا تھا۔“  
”نہ میری بیٹی رات کو تو گھر ہی تھی۔ ملی تھی تم لوگوں سے۔ پتا نہیں کس کے برکات سے میں آگے۔“

اہل ہونہک کے رو دیں۔ جھوٹ بوتیں بھی تو کس منہ سے، ٹینشن سی ٹینشن۔ بارات کے ساتھ آئے مہمانوں کا خیال۔

ساری عمر کی جمع ہو گئی۔ ایک عزت۔ کراچی دامن لینے آئے تھے۔ اب کیا کہتے سب

سے؟

بارستہ دامن کے واپس جاتی؟  
عمر کا دلخ خراب ہونے لگا۔ خالد روئے لگیں تو ان کی طبیعت بگڑ گئی۔

”میں کیا منہ دکھاؤں گی براہ روی والوں کو۔ سرسالی عزیز ہیں میرے۔“  
وہ اپنی جگہ صحیح تھیں۔ ابھی معاملہ فقط گھر کے لوگوں کے درمیان تھا۔ مگر کسی کو تنگ پڑ جاتی تو۔

اہل کی طبیعت کی خرابی عمر بھاری پڑنے لگی۔  
”تمنا! بھڑا دیا آپ لوگوں نے ہمارا۔ اگر لڑکی کی مرضی نہیں تھی تو پہلے بتا دیتے۔ ہمارے لڑکے کو کون سا لڑکیوں کی کمی تھی۔“ صاعقہ بھاگتی ان کے لئے

لے رہی تھیں۔ اہل نے ہاتھ جوڑ دیے۔  
مگر فقط ہاتھ جوڑنے سے معاملہ نہیں بننے والا تھا۔ سب کو ابا کے ساتھ سرجوڑ کے بیٹھنا پڑا۔

زینب کا دل گھبرانے لگا۔ سب ڈرا تنگ روم میں بند ہو گئے تھے۔ ابا کا صوبہ الجھا، عمر کی بلند آواز، تائی اہل کے بین صاعقہ کا تنکھا انداز گفتگو۔

دروازے سے کان لگا کے کھڑی زینب کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ عراوچی آواز میں کافی کچھ بولی رہا تھا۔ ابا کی آواز میں شکستگی تھی۔ معافی کی طلب تھی ہار تھی۔

دروازہ کھلا تو وہ گھبرا کر سیدھی ہوئی۔ نگاہ عاقب کی بس ہوئی آنکھوں سے ملی۔ اسے دیکھ کر لب بھیچنا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

سب باری باری چلے گئے تو اہل باہر آئیں اور ہونٹ کھڑی زینب کا ہاتھ قہار کر کھینچی ہوئی اپنے کمرے میں لائیں پلٹ کر دروازہ لاگ کیا۔ زینب تھکری کھڑی گئی۔ اہل اس کا ہاتھ تھامے اپنے بستر تک لائیں۔ اسے اپنے سامنے بیٹھا۔

”یہ دیکھ زینب!۔“ ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔  
وہ ہڑوا کر حواس میں آئی۔  
”یہ کیا کر رہی ہیں تائی! میں کسی کو نہیں بتاؤں گی یہ بات۔“ ان کے ہاتھ کھولے۔

”نہ میری بیٹی۔ یہ بات تو چھپنے والی نہیں ہے۔ ہاں مگر اپنی آپا کی عزت بچانے کے لیے جتنے راستے ہیں ہمارے پاس۔“

”وہ کیا؟“ زینب کا بیڑا دل گھوا ہوا تھا۔  
”تیرے تایا نے کہا ہے۔ آج نکاح کر دیتے ہیں عمر کے ساتھ۔ چپ کر کے ولسن بن کے بیٹھ جانا۔ میری آپا کی عزت رہ جائے گی۔ بڑی مشکل سے عمر مانا ہے اب تو اعتراض نہ کرنا۔“

اہل کے ہاتھ پھر اس کے آگے بندھ گئے تھے۔ زینب کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ پچھی آنکھوں میں عاقب کی لالہ ہوئی نگاہیں در آئیں۔  
تو ایک بار پھر اس کے نصیب میں عافیہ کی باتزن آگئی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

\*\*\*

حالات خراب، اس کا موڈ خراب اور سب سے بڑھ کے یہ کہ اس کی قسمت خراب۔  
جہاں آج اس کا اور عاقب کا نکاح ہونا تھا۔ وہاں اب اس کا اور عمر کا نکاح ہو رہا تھا۔ مہمانوں میں سے کسی کو بھی حقیقت کا پتا نہیں چلا۔ لمبے گھونگھٹ والی نکاح کی ولسن اور اس کے بعد میک اپ سے سنی سنووری عافیہ کے پرانے مگر کلاہنی جوڑے میں لمبوس۔

زینب کے جنم کو وہ جوڑا کٹ کٹا ہوا تھا۔ وہ خوش تھی۔ زندگی نے ایک دم سے کروٹ بدل کر سب کچھ اٹھل پھٹل کر دیا تھا۔

ایسے میں اس کی سراسیمگی کو اس کی واحد جگہ وار دوست نے کم کرنے کی کوشش کی۔ جب نکاح کے بعد وہ اسٹور میں کھسی زار و قطار روئے جاری تھی۔ تائی اہل کے حکم کے بموجب اسے چپ کرانے میں جب وہ ٹاکام ہو گئی تو تقریباً ”چلا ہی اٹھی۔“

”تمہارا مسئلہ کیا ہے زینب؟“  
”نہ می ہو کیا۔ دکھائی نہیں دے رہا قسمت نے کیا کھیل کھیلا ہے میرے ساتھ؟“ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھ کر وہ غرائی۔ کہ فقط ایک وہی تو تھی جس پر وہ

79

79

79

غصہ کر سکتی ہو سکتی تھی۔  
 "۴" سے کہتے ہیں ٹرننگ پوائنٹ۔ "اطمینان سے کہتے ہوئے سامعہ نے اس کا بازو تھلا اور باہر کی طرف برومی اور دوس جاعتیں تو وہ بھی برومی ہوئی تھی۔ اس سے الجھنے لگی۔ سب سے نظر بچا کر سامعہ اسے کھینچتے گھسیٹتی پھرتی لے آئی۔  
 "جہاں بھلا میری زندگی میں اب سکھ آرام آنے لگا تھا۔ قسمت کھلنے لگی تھی کہ پھر سے قسمت نے دھوکا دے دیا۔" میرس کی دیوار سے ٹیک لگائے وہ ہہہہک کر رو پڑی۔  
 "کیا پتا تمہارے سکھ اور آرام کا راستہ اب کھلا ہو۔" سامعہ آرام سے بولی۔  
 "ساری عمر عافیہ کی اتار پٹنی ہے میں نے۔ اب شوہر بھی اسی کا چھوڑا ہوا۔" زینبی سے تو بات ہی مکمل نہ ہو پائی۔ سامعہ نے تاسف سے اس کے بچتے آنسوؤں کو دیکھا۔  
 "کتنے سال برتا ہے اس نے اس چھوڑے ہوئے شوہر کو؟ طنز سے پوچھا۔  
 "نام تو گیا نا اس کے ساتھ اور ان دونوں کی دوستی بلکہ عشق کے قصے عافیہ سنا چکی ہے مجھے۔ یہ بڑی بڑی تصویریں ہیں دونوں کی عافیہ کے کپیوٹریں۔" وہ پٹے سے ناک پونچھتے ہوئے وہ لال گلابی ہو رہی تھی۔ بڑے دکھ سے بولی۔  
 "یہاں ہی عشق ہو تا تو یوں بھگوٹوں کی طرح اسے چھوڑ کر بھاگتی؟ کچھ بھی نہیں تھا ان دونوں کے درمیان۔" سامعہ نے قہر کا مظاہرہ کیا۔  
 "وہ تو بات لے آیا نا جو عشق میں سچا ہے۔"  
 "یہ تمہاری قسمت کی بارات تھی۔ اسے آٹائی تھا زینبی۔ اب اڑکے پٹاب جانے سے تو رہیں تم۔"  
 "۴" چمکی بھلی عافی سے شادی ہو رہی تھی۔ کیسے ٹھاٹھ ہوتے اس گھر میں میرے عافیہ بھی دفع دور ہو جاتی۔"  
 "اس کا کوئی ایک غم تھوڑی تھا۔ اب دوسرے کی دم پکڑ لے۔"

"لو کی۔" سامعہ نے بے اختیار غصہ کنٹرول کیا۔  
 "کیا ٹھاٹھ ہوتے یہاں تمہارے؟ اتنے ساروں سے تمہاری تائی تمہیں اپنی بیٹی کی اتار پٹنی رہی ہیں کبھی بازار سے دلایا بھی تو کبوتر۔ یا وہ جوان کی بیٹی نے رز پکچٹ کر دیا ہو۔ یہ ٹھاٹھ کراتیں تمہیں؟ مفت کی نوکرائی ہو، تجھے فارغ بیٹے سے بیاہ رہی ہیں تمہیں۔"  
 سامعہ نے دو آنکھیں مزید اس کے ہاتھ میں تھام لیں۔ مگر جو جان بوجھ کے اندھا اس کا دارو کیا؟  
 "تمہیں کچھ نہیں پتا۔" زینبی نے پھر مظلوم بنا چاہا۔ مگر سامعہ اس پر بھاری تھی۔ تیر لہجہ میں بولی۔  
 "مجھے سب پتا ہے اور تم سے زیادہ پتا ہے اور اب تم یہ مظلومیت کا لبادہ اتار دو زینبی! خدا کا شکر ادا کرو کہ ایک عزت دار گھر میں ملے بیاہ کے جا رہی ہو۔ اس گھر کی بیٹی بھاگی ہے۔ جسے وہ بیاہنے آئے تھے مگر دیکھ لو سر منہ پیٹ کے تمہاری تائی اور تایا کی عزت اچھالنے کے بجائے نہ صرف اپنی عزت سنبھال رہے ہیں۔ بلکہ ان لوگوں کی عزت بھی ڈھک کے جا رہے ہیں تمہیں بیاہ کے۔"  
 "یہ تو ان لوگوں کا بڑا پن ہے۔" زینبی کچھ کچھ متفق ہوئی۔  
 "تو اب تم لوگ بھی چھوٹے پن سے نکل کے انہیں کوئی بڑا پن دکھا دو۔" سامعہ نے طنز کیا۔ پھر اسے سمجھانے لگی۔  
 "یہ تو سوچو بے وقوف لڑکی کہ اس کی قسمت میں تمہیں بیاہ کے لے جانا لکھا تھا۔"  
 "۴" اور عجب پتا نہیں ان سب کا وہاں جا کر مجھ سے کیا رویہ ہو۔" وہ اندر سے بہت سی باتوں سے خوف زدہ تھی۔  
 "کچھ نہیں ہو گا۔ عافیہ کی خالہ بڑی اچھی خاتون ہیں۔ تمہاری تائی سے زیادہ حوصلے والی اور صبر برداشت والی۔ کوئی اور عورت ہوتی تو بہن کی عزت اتار دیتی اور پھر تم سے تو سب راضی ہی ہوں گے اتنے نازک وقت میں سب کی عزت بچا رہی ہو تم۔ ورنہ تو دونوں گھر کی ناک کٹ چلی تھی۔"

سامعہ نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے ایک لخت ہی روشنی میں لاکھڑا کیا تھا۔ سبک روہو کا جھوٹا اس کے چہرے سے نکل رہا۔  
 "۴" نے ہلے۔ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ "اس کی براؤن آنکھیں جگمگا رہیں۔  
 "اب تو سب کی نظروں میں میری ہی اہمیت ہو گی۔"  
 "بالکل۔ اور یہی تو تم چاہتی تھیں اور اس کے لیے تم عاقب جیسے دلیے نئے سے شادی کرنے کو بھی تیار تھیں۔" سامعہ نے اطمینان سے کہا تو وہ کھلکھلا دی۔  
 "واقعی۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ مجھے تو اپنی ایک حیثیت چاہیے تھی اور وہ مل گئی۔" سامعہ نے سکھ کا سانس لیا۔  
 آگے کی زندگی میں چاہے کیسے ہی امتحان کیوں نہ ہوتے فی الحال تو مطلع صاف تھا۔  
 ایسی اطمینان تھا جس کی بدولت اگلے روز ناک بھوں چڑھا کر عافیہ کا پرانا مگر خوب صورت سا کالہ لانی جوڑا اس نے پہن ہی لیا۔  
 "کبے سفر کی وجہ سے بری لے کر نہیں آئے وہ لوگ۔ وہاں جا کر تو عیش ہی ہوں گے تمہارے۔"  
 سامعہ کی تسلی نے جوڑے کی جبین کو قدرے کم کیا۔ ساتھ ہی بے ساختہ گدھ بھی ہوا۔ تائی اماں سے اتنا نہ ہوسکا کہ نکاح (چاہے وہ ہی کیا تھا) کے موقع پر چار جوڑے اس کے بھی لے لیتیں۔  
 سامعہ بچ کر رہی تھی۔ گھر کی مرغی دال برابر۔ دنیا دار کی تھی۔ ورنہ اگلے دن وہ لوگ بنا کچھ کھائے پینے والے سے نکل پڑتے۔ اسے مودی اور تصویروں کے لیے عمر کے ساتھ بیٹھا پڑا۔ اب زینبی کا موڈ اچھا تھا اور شاید وہ واحد نفس تھی جو اس فتنکشیں کو انجوائے کر رہی تھی۔ باراتوں کو تو دلہا کا سیاہ سا انداز ہی الجھن میں ڈال گیا تھا۔ یہ وہ عورت تھی جو پرسوں کے سفر میں ان کے ساتھ اپنی دلہن لینے نکلا تھا۔  
 مزین کا سفر تھا۔ کچھ ایسی طبیعت کی خرابی بہانہ بنی

واپسی جلدی ہو گئی۔ تائی اماں نے بیمار بہن کے پاؤں تھام لیے۔  
 "تمہارا کیا قصور؟ جس کی قسمت میں جو تھا مل گیا۔" بڑے حوصلے سے کہہ کر وہ بہن سے وداعی ملیں۔  
 زینبی نے تائی اماں سے ملے ہوئے مصنوعی منہ بسور۔ اب تو نئی زندگی کا ایسا جتس ہو چلا تھا کہ سب نقصان اور گھٹائے بھول گئے تھے۔ اس کے برعکس تائی اماں یوں اسے پیچھے پیچھے کے روئیں جیسے اپنی اکلوتی نازوں کی کو بیاہ کر دوسری بیٹھنے والی ماں رو یا کرتی ہے۔  
 واپسی کا سفر محض انسانوں کا نہیں۔ مختلف سوچوں کا تھا۔  
 \* \* \*  
 اگلے روز وہ شمالی علاقہ جات کی طرف نکلنے والے تھے۔  
 عافیہ نے کسل مندی کے انگوٹھی لیں۔  
 "دولن ہوٹل میں ہی ٹھہرے رہتے۔"  
 فیصل نما کے بھی نکل آیا تھا۔ پیٹٹ، بنیان میں ملبوس وہ بال سنوار رہا تھا۔  
 "میری جان جو خرچا یہاں کرتا ہے وہ ناردون ایریا میں کر لیں گے۔ ہنی مومن کے دوران تو یوں بھی پیسے پر لگا کے اڑتا ہے۔" منہ جاتے ہوئے عافیہ کو اٹھنا ہی پڑا۔  
 "تمہارے پاس کچھ رقم ہے تو دے دو۔ مل ملا کے کافی ہو جائے گا۔" نکلتے ہوئے فیصل نے کہا تو سر ہلا کر عافیہ نے اپنے بیگ میں سے پرنس نکال کر بیس ہزار اسے تھما دیا۔ ہوٹل سے باہر نکلے تو فیصل کے پیچھے بڑھتی وہ تھکی۔ فیصل گاڑی کی ڈکی میں سلمان رکھ رہا تھا۔  
 "یہ تو تمہاری گاڑی نہیں ہے۔"  
 "جیسے بیٹھو تو بتاتا ہوں۔" فیصل ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ تو وہ بھی گاڑی میں



بیٹھ گئی۔

”نی الحال تو گھر والوں کو بھٹک بھی نہیں پڑی ہماری شادی کی۔ بس میں نے یہی کہا ہے کہ نارودن امیراؤ کی سیر کو جا رہا ہوں دوستوں کے ساتھ۔ اپنی گاڑی لیتا تو کوئی بھی واقف کار فوراً پہچان لیتا۔“ وہ بتا رہا تھا۔

”کچھ کیش تو نکالو ایتنے بینک سے۔“ عافیہ کو اپنے بیس ہزار یاد تھے۔ ناک چڑھا کر بولی۔

”اوہ کاموڈو پہلے ہی خراب ہے جانم اسیرو تقریباً کا سنتے ہی انہوں نے محنت کی غفلت اور کام کام پر لیکر دنا شروع کر دیا۔ ایسے میں کیش بانٹنا تو جوئے پڑے۔“

وہ مسکرا رہا تھا۔ مگر عافیہ تو مسکرا بھی نہیں پائی۔ اس کی شکل دیکھ کر فیصل ہنس دیا۔

”ہم ہی تو عشق کے اور بھی بہت سے امتحانات باقی ہیں۔“ اس کا مطلب پاکر عافیہ کھسکی۔

”وہ تو بھٹک ہے نہیں تو اس لیے پریشان ہوں کہ لمبے سفر کے لیے نکل رہے ہیں ہاتھ میں کھلا پیسہ ہوتا چاہیے۔“

”تھم گھنا تو سننی، کیسا شان دار ہنی مون ہو گا۔ بلکہ یہ تو ٹریل ہے۔ اصل ہنی مون تو تب ہو گا جب میں ہمیں یورپ چھمانے لے جاؤں گا۔“ وہ نقاخر سے کہتا عافیہ کو سرشار کر گیا۔

واقعی۔ اب جلدی کس بات کی تھی۔ فیصل اس کی مٹھی میں تھا تو سب کچھ اس کی دسترس میں تھا۔ جلد باید بروہ اپنے باپ سے سب کچھ حاصل کرنے والا تھا۔ گنگناٹے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتے فیصل کو اس نے بڑے پیار سے دیکھا تھا۔

\*\*\*

وہ ٹرن میں پہلی بار سفر کر رہی تھی۔ اس لیے دلہن ہونے کے باوجود شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر تمام راستے کھڑی سے لگی باہر کی رونقیں دیکھتی رہی۔ عمر نہ جانے کہاں بیٹھا تھا۔ ایک بار بھی بھولے سے جو اس طرف پھٹکا ہو۔

ای کی طبیعت ناسازی تھی۔ تمام راستے منہ پر دھڑکا ڈالے پڑی رہیں۔ زہنی کو شک تھا کہ وہ رورہی ہیں۔ مگر اس نے زیادہ غور کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

یوں بھی۔ وہ تو نئی زندگی شروع کرنے جا رہی تھی۔ جو پہلے سے اس زندگی کا حصہ تھے وہ اپنے غلوں اور خوشیوں کے ساتھ جی رہے تھے۔ مگر زہنی نے فی الحال اس زندگی سے کچھ تجربہ نہ حاصل کیا تھا۔ اسی لیے سامعہ کے دیے خواب اس نے اپنی آنکھوں میں سجا لیے تھے۔

تمام راستے سامعہ بھابھی ان کی گھنٹی کی ماڈرن چلتی رہن سرگوشیاں کرتی اور ٹھٹھے لگاتی رہیں۔ بھابھی کے ہاتھ تیر چار اور چھ سالہ غیب اور مطہب البتہ تھکی ہوئی دیر ”چچی دلہن“ کے اور گرد ہی رہے۔ پھر نیند آنے پر ماں اور نانی کی گود میں پڑنے کو رہے۔

تھکا دینے والے طویل سفر کے بعد ٹرن سبکرات کے اسٹیشن پہنچی۔ سب پر سامان سمیٹنے اور ٹرن سے اترنے کی فکر سوار ہوئی۔ تب اتنے ٹھٹھوں کے سفر میں پہلی بار عمران کے ڈبے میں آیا۔ وہ ماں کی نگاہ میں جتا تھا۔ انہیں سہارا دے کر دروازے کی طرف بڑھنا۔ زہنی شش و پنج میں جتا کھڑی تھی۔

”یہاں تک خود آئی ہو بھو! آگے بھی خود ہی چلنا پڑے گا۔ ہاں کسی سہارے کے عادی کر لو خود کو۔“ سامعہ بھابھی کی ماں عاتقا ”ٹھٹھا لگا کے کہتی۔ اس کے پاس سے گزریں تو وہ بھی خاموشی سے ان کے پیچھے چلی دی۔ دوسری رشتہ دار خواتین نے اسے ویسائی پروٹوکول دیتے ہوئے اسٹیشن کے باہر کھڑی ہائی امیں میں بٹھایا۔ جیسا کہ نئی دلہن کو دیا جاتا ہے یہ ہائی امیں عمر کا دوست لے کر آیا تھا۔

اسٹیشن سے محض دس منٹ کے سفر کے بعد وہ گھر پہنچ گئی۔ ای کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے تمام رشتہ دار اور تو اور بھابھی کی ماں اور بہن بھی راستے ہی میں اتر گئی تھیں۔ انہیں علم تھا۔ گھر جاکے اور کوئی رسمیں کرنے والی حالت تو کسی کی ہے نہیں۔ سو گھر تک

آتے محض زہنی، سامعہ بھابھی اور بچے، امی اور عمری بچے تھے۔ عمر فرٹ سیٹ پر بیٹھا دوست سے خوش گفتگو تھا۔

گھر پہنچ کر عمر نے ہی ماں کو سہارا دے کر گاڑی سے اتارا۔ بھابھی اپنے بچوں کو لیے اتریں۔ عمر دروازے کا لاک کھول رہا تھا۔ زہنی سر سے پھٹکتے ڈوپٹے کو صحیح کرتی نیچے اتر آئی۔

اسے قدرے باؤسی ہو رہی تھی۔ یہاں تو نئی دلہن والی کوئی صورت حال ہی نہ دکھائی دیتی تھی۔

عمر ماں کو سہارا دیے ان کے کمرے میں لے گیا اور وہ تین رویہ۔ برآمدے میں گھرے بڑے سے صحن میں تنکا کھڑی انگلیاں موڑتی رہ گئی۔ سامعہ بھابھی بچوں کو کمرے میں چھوڑ کے آئیں تو اسے یوں ہی کھڑا دیکھ کر مسکراہٹ بانی اس کی طرف آئیں۔

”ہائیں۔ یہ نئی ٹوپی دلہن کو چھوڑ کے عمر کہاں چلا گیا؟“ ان کی اواکاری بڑی فطری تھی۔ زہنی سٹپٹا گئی۔

”وقت خالہ جان کی طبیعت خراب ہے۔“ عاقب اور عافیہ کی دیکھا دیکھی وہ بھی انہیں خالہ ہی کہتی تھی۔ ”چٹاک۔“ تھیں کمرے میں چھوڑ آؤں، عمر کو تو شاید ساری رات تمہارے یہاں کھڑے ہونے کا خیال ہی نہ آئے۔“

وہ کہتی آگے بڑھیں۔ زہنی خاموشی سے ان کے پیچھے بڑھ گئی۔ ایک کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے لائٹ جلائی تو وہ دنگ رہ گئی۔ گھر عادی حواوٹ سے منکس رہا تھا۔ زہنی کا دل لہرا سا گیا۔

”ہائیں۔“ بھابھی نے تانسف سے آہ بھری۔

”نہن کیا سچا ہے اور قدرت ہمارے لیے کچھ اور ہی لکھے ہوئے ہوتی ہے۔ اب دیکھو۔ ایک ایک شے کو عمر نے عافیہ کے استقبال کے لیے سجایا تھا۔ مگر اس کم تخت کی قسمت میں ہی نہ تھا۔“ زہنی تجل ہی ہونے لگی۔

بھابھی کو اچانک کچھ خیال آیا تو ان کا انداز راز دارانہ ہو گیا۔

”ویسے کئی کمال وہ؟ تھیں تو ہوتا ہی ہو گا۔ کہیں پکا

یارانہ ہو گا اس کا۔ تب ہی تو عین شادی کے روز گھر والوں کے سروں میں خاک ڈالے نکل گئی۔“ وہ خطر نگاہوں سے زہنی کو دیکھ رہی تھیں۔

”وقت۔“ واٹس روم کہاں ہے؟“ زہنی کا سوال غیر متعلق تھا۔ بھابھی کی باتوں کو بریک لگی تو وہ بد مزہ ی ہو کر رہ گئیں۔

”یہ ایجنڈا ہاتھ ہے۔“ انہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”میرے کپڑوں کا ایک بیک تھا۔ سیاہ رنگ کا۔“ وہ جھجکی۔

”سامان تو سارا باہر صحن میں پڑا ہے۔ جا کے دیکھ لو بھی۔“ میرا تو ٹھکانے سے برا حال ہو رہا ہے۔ ابھی نیت یہ جا کے ٹھکان کو ساری کٹائی سنائی ہے اور ویسے۔“ وہ صفا چٹا انداز میں کہتی اس کے قریب جھک کر راز داری سے بولیں۔

”اب تم بھی آرام کرو تو بہتر ہے۔ ہماری ساس کم از کم آج کی رات تو عمر کو ادھر بٹھانے بھی نہیں دیں گی۔“ خواخوہ اپنی نیند خراب مت کرنا۔“ پھر آہ بھر کے بولیں۔

”قسمت تو خراب کر رہی لی۔“

وہ چلی گئیں تو زہنی نے سکون بھری سانس لی اور دلچسپی سے کمرے کی آرائش اور پھولوں کی لڑیوں کی حواوٹ دیکھنے لگی۔

دل میں ایک آہ سی تھی۔ عمر کمرے میں ضرور آئے گا۔ سو واٹس روم سے فریش ہو کے نکل آئی۔ باہر جا کے اپنا بیک ڈھونڈنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اپنے پرانے کپڑے تو ساتھ لانے کے قابل نہیں تھے۔ سامعہ نے ہی اس کے بیک میں عافیہ کے گھر میں پہننے والے کئی ایک جوڑے ڈال کے ساتھ کر دیے تھے۔ وہ کپڑے سے ٹیک لگائے فریش سی بیٹھ گئی۔

وہ خطر تھی کہ عمر آ کے کن الفاظ میں اس کا شکر گزار ہوتا ہے۔

”بھئی اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ جی حضوری کرنا پھرے گا تمہاری۔“ سامعہ نے کہا تھا۔

زہنب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آن ٹھہری۔ وہ ذرا کھسک کر ٹھیک طریقے سے تکیے پر لیٹی۔

آہ۔ اسے سرور سا آیا۔

اینا کمرہ گونا بستر

ملکیت کے احساس نے بڑے نقاخر سے دل میں جگہ بنائی۔ تیز رفتار چلتے غصے کی ٹھنڈی ہوائے کب اسے نیند کی داوی میں پہنچا دیا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی تھی۔

اسی کے بار بار کہنے پر عمر کمرے میں داخل ہوا تو زہنب کو بے سدھ سوئے پا کر ان ہی قدموں واپس لوٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

”عاقب۔ عاقب۔“

اباں کی متوحش سی آواز۔ انہوں نے عاقب کو بری طرح جھنجھوڑ کر اٹھایا تھا۔

”اٹھ دیکھ تو سہی۔ تیرے ابا کو کیا ہوا۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی۔“

وہ ساری رات کا جاگا، ابھی آنکھ لگی تھی مگر یوں اچھل کے اٹھا جیسے سویا ہی نہ تھا۔

ابا کی حالت ٹھیک نہ تھی۔ شدید ڈیپریشن اور ٹینشن نے دماغی خلیوں کو سخت متاثر کیا تو نتیجہ فالج کی صورت نکلا۔

بار عیب سے ابا۔ جن کے قدموں کی دھمک سے زمین ٹھہر جاتی اور جن کی آواز سے وہ لوگ دبک جایا کرتے تھے اب بے بس سے بستر پر پڑے تھے۔ ان کا دایاں بازو اور ٹانگ بے حرکت تھی اور زبان بھی متاثر ہوئی تھی۔

اباں نے جھولیاں پھیلا پھیلا کر ان کی زندگی اور عافیہ کی بربادی کی دعائیں مانگیں۔

اسپتال کے کوریڈور میں عاقب حوصلہ ہار کر ان کے شانے میں منہ چھپا کر رو دیا۔

بہن غیرت کو لٹکار گئی تھی اور باپ کی۔ بے بسی نے عاقب کے غصے میں کون جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

اسے ان دیکھے ہو جھ سے یک لخت ہی اپنے شانے بو جھل ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

صبح اگر بھابھی اسے نہ جگاتیں تو وہ جانے کتنی دور تک خواب خرگوش کے مزے لیتی رات ہی۔ چند لمحوں کے سوئے ذہن کے ساتھ بھابھی کو روکتی رہی۔

”اب اٹھ جاؤ دلہن رانی۔ سویرا نکل آیا۔ نکلنے والے بھی نکل گئے اور تم یہاں سوئی پڑی ہو۔“

ان کا مخصوص کچھ سمجھنا ہوا۔ مگر سمجھ میں نہ آنے والا انداز۔ زہنی بے اختیار اٹھ بیٹھی۔ اوھر اوھر دیکھا۔ بھابھی خوب سمجھیں۔

”کوئی بھی نہیں آیا رات بھر اوھر۔ ہم نے تو پہلے ہی اشارہ دے دیا تھا۔ اسی حضور کے تیور ہی نہیں لگ رہے تھے عمر کو کمرے میں بھیجنے والے۔“

بھابھی کی جگہ اتنی آسانی سے تو کسی کو نہیں دے سکتیں نا اور عمر بے جا چلے چلے۔ ”وہ مزہ لے رہی تھیں۔ زہنی کے کان کھڑے تھے۔“

”ایک ایک شے عافیہ کے لیے سجا کے گیا تھا۔ اب وہیں تمہارے ساتھ رات گزارنا تو اسے قیامت ہی لگتا۔“

وھڑوھڑوھڑو

زہنی تھکے اوپر سے کوئی ٹرین گزری۔

برتا ہوا مرد سافہ کی اترن

”اب یہ تو ماں کو چاہیے کہ تمہاری قربانی کا خیال کرتے ہوئے بیٹے کو سمجھائے مگر نہ جی۔ یہاں تو جو مسکین اور مظلوم ہے کسی کو دیا جاتا ہے۔ اچھے بدلے نکالیں گے تم سے عافیہ کے۔ اٹھ جاؤ اب ناشتا کرلو۔“

اسے اچھی طرح ”ٹھنسا“ کے اب وہ ناشتے کا مڑا سنار ہی تھیں۔ زہنی کے لیے تمام حقیقت ناقابل قبول اور ڈراؤنی سہی مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ رات سے ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہ لگی تھی اور اب محدہ ہائیاں بے رہا تھا۔

وہ جب چاہتا نہ دھونے اٹھ گیا۔

ناخن کے دوران بھابھی نے کھل کر عافیہ اور عمر کے رویوں کی آنکھوں واپسی حقیقت بیان کی تھی جس کی پارت زہنی کو جینے پر مجبور کر گئے۔

”اب خود سوچو۔ اتنی نزدیکیاں اور بے باکیاں کوئی مرد اتنی جلدی بھلا سکتا ہے؟ کیا کیا نہیں سوچا ہو گا اس نے عافیہ کے بارے میں۔“

بھابھی شادی شدہ تھیں۔ روانی سے بولتی جارہی تھیں مگر زہنی کس پل صراط سے گزر رہی ہے یہ انہیں خبر نہ تھی۔

اسے رونا آگیا۔ ناشتا نہ کر چکی تھی۔ بھابھی نے برتن سینے۔ زہنی کی بیگنی پلکیں وہ دھچک چکی تھیں۔

”بے وقوف ہو تمہ رو کے بڑوں کو کھاؤ کی تو کھلا کے مار ڈالیں گے ماں بیٹا تمہیں۔ یہاں تو مقابلہ کرنا پڑے گا ان کی چالبازوں کا تمہیں۔“

بھابھی نے زہنی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار تھمایا۔

”میں بھلا۔ کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے تو ان لوگوں کی عزت چاہی ہے۔“

وہ بے بسی سے بولی تو آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر رخساروں پر ٹھک گئے۔ بھابھی جنکیں۔

”وہی تو۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تمہارا پلڑا بھاری ہے ذرا سی بھی نری دکھاؤ کی تو سر پہ چڑھ کے تاج کا عمر تمہارے۔ اب اگر احسان کیا ہی ہے تو اسے ٹھیک طرح سے جتاؤ بھی۔“

نئے سبق نئے انداز۔

زہنی کو جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا کہ اس کو اس نئی زندگی میں کیا حکمت عملی اپنانی ہے۔

باہر کھٹکا ہوا تو بھابھی بڑے اٹھا کے پلٹیں۔

”آج کا ناشتا تو میں نے کروایا۔ مگر آئندہ سے تم جانو اور تمہارا کام۔ میں تو بھی بمشکل اپنا اور بچوں کا کام کرتی ہوں۔ باقی تم جانو اور تمہاری ساس اور میاں جانیں۔“

ایک دم سے اتنا بے اختیار لہجہ اور بے مروت انداز۔ زہنی آنکھیں پھاڑ کے انہیں دیکھ کے رہ گئی۔

یہ تو لگتی تھی کھلا، عمر ای کو تمام کے اندر لارہا تھا۔ شاید وہ لوگ ڈاکٹر کے پاس سے ہو کے آ رہے تھے۔

کمروں کے آگے برآمدہ تھا اور برآمدے کو لوہے کی مضبوط چابیوں سے کوریڈور میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور ان چابیوں پر تیز دھوپ سے بچاؤ کے لیے چھین لٹکانی لگی تھیں۔ جس کی وجہ سے برآمدے اور کمروں میں ٹھنڈک کا احساس نمایاں تھا۔

زہنی برآمدے ہی میں فرنج کے پاس پرکھی چار کرسیوں والی میز کے گرد کھڑی کر رہی تھی۔ عمر اس کے پاس سے گزرا۔ وہ منہ اٹھائے دیکھے مگر نہ سلام نہ دعا۔ اسی خودی رکھیں وہ غڑھل ہی تھیں۔

”انداز آؤ میرے پاس۔“ انہوں نے کہا تو وہ ان دونوں کے پیچھے چل دی۔

عجیب سی شادی عجیب سی سسرال۔ عمر نے انہیں سہارا دے کر بستر پر بٹھایا اور پتھلا خال اسپر پر چلا دیا۔

انہوں نے اشارے سے زہنی کو اپنے پاس بلایا۔ عمر باہر نکلنے لگا تھا۔

”تم کہاں جا رہے ہو۔؟“ اسی نے نقاہت زدہ لہجے میں اسے روکا۔

”نیند آ رہی ہے مجھے۔ تھوڑا آرام کروں گا۔“ وہ بیٹا مڑے کہہ کر چلا گیا۔

زہنی دل ہی دل میں اس سے نفار ہو گئی۔

”اب نیند آ رہی ہے موصوف کو اور ساری رات کیا بل چلائے رہے ہیں۔“

”ساری رات کا جاگا ہوا ہے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی نا، ابھی سرویا تار ہا اور کبھی ٹالیں۔“ اسی نے پیار سے عمر کا کرکھا۔

زہنی کڑھی (اچھی مصروفیت لگا رکھا تھا بیٹے کو)

”تم بیٹا۔ ٹھیک سے سوئیں۔“ وہ یوں پوچھ رہی تھیں جیسے وہ اس گھر میں سونے کے لیے ہی تولی لگی گئی تھیں۔

”جی۔“ سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔

اسی نے رک کر جیسے کچھ سوچا۔ جانے الفاظ جمع کر رہی تھیں کہ بہت پھر بڑے محل سے بولیں۔

”بیچھے جو کچھ ہوا اے بھول جانا زہنب اب یہ آسانی سے زندگی میں آگے بڑھ سکوگی اور اب یہ

تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم عمر کو بھی وہ فتح یادیں بھلا دو۔ تمہاری وہ پری ذمہ داری ہے بیٹا۔  
لوٹی۔ یعنی یہ تو نہ ہنگ لگانے کے موڈ میں ہیں اور نہ پٹکری اور رنگ بھی جو کھا چاہ رہی ہیں۔  
اس نے تپ کے سوچا۔ مگر منہ سے فقط ”جی“ کہہ کر سر جھکا لیا۔

\*\*\*

صاعقہ بھابھی صرف اپنا اور اپنے بچوں کا کام کرتی تھیں اپنا کمرہ اور اس کے آگے کا برآمدہ صاف کر لیتی اور بس۔  
جبکہ اگلے ایک ہفتے میں باقی سارے گھر کی ذمہ داری زینب پر آن پڑی۔  
”بھئی تم تو اکیلی جان ہو۔ کچن بھی سنبھال سکتی ہو۔ میرے تو بچوں ہی کے کام ختم نہیں ہوتے۔ سالن وغیرہ تو میرے بچے کھاتے نہیں۔ بس میں ہی ذرا سالن کی۔ بھئی تم لوگ تین جاہیں ہو۔ پکانا تو تمہیں ہی چاہیے۔“ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اپنی جان چھڑائی۔

اب وہ تھیں اور کھیل کے پروگرامز۔ وہاں سے اٹھیں تو اسے کاپ پہ میاں کے ساتھ گپ شپ شروع ہو جاتی۔ ان کے دونوں بچے ذنب اور مطلب چوٹی سے نوٹرو اور چپس بنوا کے کھا لیتے۔  
ذنب کے دل میں بسی اپنے گھر کی خواہش پوری ہونے لگی۔ الماری کھولی تو بری کے جھگڑے ڈھنگ پر لٹکے کپڑوں نے آنکھیں خیرہ کر دیں۔

پھر وہ روز بھاڑ پوچھا لگاتی ڈسٹنگ کرتی مزے کا کھانا پاتی اور پھر شٹن سے نکلنے کے بعد بری کا ایک سوٹ چڑھا کے بیٹھ جاتی۔ کچھ خدا نے روپ بھی دیا تھا اور الزب انداز بھی۔ سو بہت سی باتیں وہ دل پہ نہ بتی تھی مگر یہاں یہ ہو کہ بٹنے سنورنے کے بعد دل کسی کی توصیفی نگاہ کے لیے محنت لگا۔

اسے اپنے آپ میں گمن بھر پور زندگی گزارتے دیکھ کر عمر کے انداز میں مزید سرومہری سی اثر آتی تھی۔

جب سے زینی بیاہ کے آئی وہ ایک بار بھی اس سے ہر کلام نہ ہوا تھا۔ سامعہ کو فون کیا تو اس نے جی بھر کر لٹاڑا۔  
”وہاں جا کے سب کو بھول ہی گئی ہو۔ تمہارے بے کو فالج نے اودھ مو اکر دیا ہے۔ عافہ تو سمجھو ان کے لیے مری گئی۔ عاقب اب تباہی کی جگہ کام کر کے گھر کی ذمہ داری سنبھال رہا ہے۔“

وہ بھونچکی رہ گئی۔ خالہ کے سامنے ہی صوفے میں دھنس کر رہ گئی۔

”کیا ہوا۔ خیریت تو ہے؟“ وہ پریشان ہوا تھیں۔  
زینی نے ساری چٹا کمرہ سنائی۔ جسے انہوں نے صبر سے سنا اور پھر بڑے حوصلے سے بتایا۔

”میں جانتی ہوں۔ تبا کا فون آیا تھا۔ سچ پوچھو تو ان سے یہ تو آزمائش ہی آگئی ہے۔ مگر انہوں نے ہم میں سے کسی کو بھی وہاں آنے سے منع کر دیا۔ فون پہ بی بی اور عمر احوال پوچھ لیتے ہیں۔ تمہیں اس لیے نہ بتایا کہ تمہارا دل پریشان ہوگا۔“

وہ پتا نہیں واقعی سچ کہہ رہی تھیں یا اپنی سنگدل پد سے ڈال رہی تھیں۔  
زینی سول سول کرتی ای اور عمر دونوں سے برگشتہ ہو گئی۔

”ہو نہ ہو اگر سنبھال رہی ہو۔ کراچی بھیج کے ہاتھ سے تھوڑا کٹواؤ اس کے تمہیں یہ لوگ۔“  
صاعقہ بھابھی نے آنکھیں نہچا کے اس کے دکھ کو اور بڑھایا۔ زینی کا دل ہر شے سے اچھٹ ہونے لگا۔

\*\*\*

اس نے الماری میں ڈسٹنگ پر ترتیب سے لٹکے ان گنت کپڑوں پر ریاست سے ہاتھ پھیرا۔ اب تو کسی رنگ۔ دل لپٹا نا ہی نہ تھا۔

”جس کے نام کی یہ بری ہے۔ وہی میرا نہیں تو یہ سبب۔“ اس نے بے دلی سے الماری کے پٹ بند کر دیے تھے کھٹکے پر پلٹ کر دیکھا تو عمر بستر کے کنارے لٹکا جھک کر شوڑا اتار رہا تھا۔ زینی کو غصہ آیا۔

وہی غصہ جو کبھی کبھار سامعہ سے لڑکے اتارا کرتی تھی اب عمر کے سر جاکڑی ہوئی۔  
”اب کو میں نظر نہیں آتی؟“ اس نے عمر کے ہاتھوں کو تپتے رہتے دیکھا۔ اس نے نظر اٹھا کے لہجہ بھر کر زینی کی طرف دیکھا پھر شوڑے بیڈ کے نیچے کھسکا۔ اپنے سپر زینے اور اٹھ کھڑا ہوا۔  
اب وہ زینی کے بالقاتل تھا۔ زینی نے اس کے بلوس سے اتھنی خوشبو کو بہت اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

”میں حقیقت سے نظر پر لانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اور کون ہے یہاں جو نظر آئے گا۔“ عمر کے لیے میں ایک سنگتی ہوئی کیفیت تھی۔

”مجھے کسی نے تبا لبا کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ میں وہاں جاتی ان کا حال پوچھنے۔“ زینی نے احتجاج کیا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ان لوگوں نے ہی منع کر دیا ہے وہاں آنے سے۔ فون پہ حال پوچھ لو تم بھی۔“

”مگر مجھے جلتے قہر۔“  
”اب جانا نا۔“ وہ لکھتے ہی سر دھجے میں بولا۔  
وہ دواش روم کی طرف بڑھا۔

”میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آئی ہوں۔“  
زینی نے اسے جتایا۔ کمال ہے میری قربانی اسے دکھائی ہی نہیں دیتی۔

اب بتا نہیں اس کی بہت میں کیا اثر تھا۔ وہ رکابی نہیں بلکہ پلٹ کر اس تک واپس بھی آیا۔  
”جانتا ہوں۔ بے فکر ہو تم جو تمہاری مرضی سے ہوئی کرنا مجھے بار بار جتنا ناہت۔“

سردارہ سپاٹ انداز۔  
وہ دواش روم جا چکا تھا۔ زینی جھرجھری سی لے کر بیدار ہوئی۔ اس نے ٹکس کر سوچا۔

”ان لوگوں کو تو بس نوکرانی چاہیے گھر کے لیے اور وہ ل کی عافہ یہاں آئی تو کتنا وہ ڈوٹی۔“  
وہ ای اور عمر سے برگشتہ ہونے لگی۔

\*\*\*

مری نیو مری ایو یہ تک گھوم پھر لیا۔ عافہ کا دل اس ہنسی مون سے بھر گیا۔ کیونکہ پرس خالی ہونے کو تھا۔

وہ اب واپس جا کے جلد از جلد فیصل کے محل نما بیٹھنے۔ اپنی حق داری جتنا چاہتی تھی۔  
آخر وہ اس بیٹھنے کے اکلوتے وارث کی بیوی تھی اب اسے سوچ کر ہی سرشاری ملتی۔

فیصل کی لمبی گاڑی میں ایک بار لفٹ لینے سے اس کے تو بھگ ہی محل گئے تھے۔

عافہ نے زندگی میں کبھی گھائے کا سودا نہیں کیا تھا۔ عمر جیسا جذبات میں کھرا بندہ چھوڑ کے اس نے لاکھوں میں کھٹنے والے شخص کو چتا تھا۔ اسے اپنے بروقت فیصلے پر ناز ہو نا۔

”فیصل۔ گھر کب چلیں گے؟“  
”کیا بات ہے۔“ فیصل نے اس کی کمر کے گرد ہاتھوں کی گرفت باندھی۔ عافہ نے ناز سے منہ بسورا۔  
”مور ہو گئی ہوں میں۔“ فیصل نے ہلکے سے جھٹکے سے اسے اپنے قریب کیا۔

”میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی۔ اب تو اس گستاخی کی خت سڑالے کی تمہیں۔“

اس کا انداز ذوق معنی اور لہجہ مسکراتا ہوا تھا۔ مگر عافہ کا دھیان تو اپنے پرس کی طرف اٹکا تھا۔ میں ہزار تو شروع سفر میں ہی اس نے فیصل کو پکڑا دیے تھے۔ اوپر کے پچاس ہزار میں سے بھی پانچ سات ہی اس کے پاس بچے تھے۔

اب یہ ستر ہزار فیصل کے لیے تو شاید ستر روپوں کے برابر تھے۔ مگر عافہ جیسی تختہ دار کے لیے تو ایک بڑی رقم تھی۔ مگر فیصل بے فکر تھا۔

”اب مجھے شائبہ بھی تم ہی کر دو گے۔ میرا پرس تو خالی ہو چکا۔“ عافہ نے اس کے شلے پر سر رکھتے ہوئے کہا تو لہجہ بھر کے توقف کے بعد وہ بولا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ ہم



یہاں رہ کر خاخواہ اپنی سیوگذاڑا رہے ہیں۔ آگے چل کے بتائیں کیسے حالات ہوں۔ ابھی واپسی پر شاید کرائے کا گھر بھی لے لیا ہو۔" عافیہ کو جھٹکا سا لگا۔  
 "کرائے کا گھر؟"

"سیدھا گھر لے جاکے ابو سے جوئے کھاؤں گا کیا؟" وہ مسکرایا۔  
 "وہ ہمارا بھی گھر ہے فیصل! اب میں سو ہوں اس گھر کی۔" اس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ فیصل کی گرفت اس کی کمر پر اور مضبوط ہوئی۔  
 "میں نے کب انکار کیا ہے جان! مگر راہ راست ابو سے نکل کر لیتا دانش مندی نہیں ہے۔ پہلے تو جا کے اسی ابو کو رام کرنا ہے۔ گلہ ان کے ذہن میں تمہارے لیے جگہ بنے گی تو گھر میں خود بخود ہی بن جائے گی وہ غصے میں عاقب بھی کر سکتے ہیں مجھے۔"

آگے کی مشکلات کا اندازہ کر کے عافیہ کمری سانس بھر کر رہ گئی۔

عمر بہت بے چارہ سا مٹھائی کا ڈبہ لے کر گھر آیا۔ مگر زینہ کا موڈ اس قدر خراب تھا کہ اسے کوئی بخشش نہ ہوا۔ سب کام چھوڑ چھاڑ کر مٹے میں آئی۔  
 "تھوڑی دیر بعد امی کی پکار سنی تو اسے مجبوراً ان کے کمرے میں جانا پڑا۔ دونوں ماں بیٹا جانے کس بات پر کھلے در در ہتھے مٹھائی کا ڈبہ بیچ میں کھلا پڑا تھا۔  
 "تم کہاں رہ گئیں۔" امی کو اس نے اتنے دونوں میں پہلی بار خوشی کے اس اثر میں دیکھا تھا۔  
 "میں نے کہاں ہوتا ہے۔ وہی گھر کے کام کاج۔ کچن کی ڈیوٹی اور واشنگ مشین۔" اس کا انداز لڑا مار تھا۔ عمر نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ مگر زینہ کا ارادہ اس سے دبے کا قطعی نہیں تھا۔ اگر وہ عافیہ کی یادوں میں ڈوب کر زندگی گزار سکتا تھا تو وہ بھی اپنا غصہ نکالنے میں آزاد تھی۔  
 "چھ! وہ سب تو ہوتا رہے گا۔ آگے مٹھائی تو کھاؤ۔" امی نے ماحول کو خوشگوار ہی رکھنا چاہا۔

مگر زینہ کا خاخواہ کی موت بھلنے کا کوئی سواڑ تھا۔  
 "یہاں کون سی کام والیاں بیٹھی ہیں۔ میں بھی خیر کروں گی نا اور میرا شہا کھانے کا موڈ نہیں ہے۔  
 کے تاثرات میں سنجیدگی اتر آئی۔ ایک شکایتی نظریہ کو دیکھ کر وہ اٹھ گیا۔

اسی آواز سن دیتی رہیں مگر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ (اچھا ہے نا۔ میرا دل چلائے والوں کا دل بھی چلا ہے) زینہ مطمئن ہوئی۔ امی کو تنگ ہوا۔  
 "خاخواہ موڈ خراب کر لیا۔ اتنی عالیشان پوسٹ نوکری ملی ہے میرے بیٹے کو۔ آج تو خوشی کا دن تھا۔" زینہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"دلخ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔ یہ کون سے طریقے اپنا رہی ہو تم۔ بجائے اس کے کہ تم وہاں اپنی ایک اہمیت بتائیں، اپنا اپنی حیثیت بھی کھو رہی ہو۔" سامعہ فون پر ہی اس پر چڑھ دوڑی۔ زینہ جڑ ہوئی۔

"کون سی حیثیت۔ نوکرانہ بنایا ہے مجھے۔" "نیکو مت۔ اپنا گھر ہے وہ تمہارا زینہ! یہ کیوں نہیں سوچتیں۔" سامعہ نے زور دے کر کہا۔ "یہاں بھی بیکار کاٹ رہی تھیں مفت کی۔" وہ یہاں سے بولی۔  
 "اپنوں سے مل کر اپنا گھر بنا ہے ساری! اب خالی اینٹ پتھروں سے ساری عمر پھوڑی رہوں۔"

"پاؤنڈ۔ اس لڑکی کو کیسے سمجھاؤں۔ جو قیامت ان لوگوں پر گزری ہے اس سے سنبھل تو لینے۔" انہیں سب تھک ہوا جگے گا۔  
 عمر اندر داخل ہوا تھا۔ زینہ نے آواز بھائی ظاہر یونہی کیا جیسے اس کی آمد سے انجان ہو۔  
 "ہاں۔ ان ہی یہ تو قیامت گزری ہے۔ مجھے تو کتنا دکھ ہوئی غم ہے ہی نہیں جیسے میرا بھی تو نکاح ہونے والا تھا عاقب سے اس روز۔ میری زندگی برباد نہیں ہوئی کیا؟"

عمر نے سب اچھی طرح سنا۔ زینہ کی اونچی آواز بھرتا بھرتا وہ لب بلبھتے تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے میں چلا گیا زینہ کی مٹھائی کے مسکرا دی۔  
 (اب بتا جاؤ گا موصوف کہ اتنی کئی گز مری نہیں ہوں۔ سنائی مختصر تھی تو میرا بھی ایک عدد ہو گیا تھا)۔

فیصل نے شاید کسی دوست کے ذریعے پہلے ہی بغور دست کر رکھا تھا۔ واپسی پر وہ اسے سیدھا کرائے کے گھر میں لایا۔  
 دو کمرے ایک باتھ ایک کچن، مختصر سا صحن اور بس۔  
 عافیہ کا دل بیٹھنے لگا۔

"یہاں رہیں گے، ہم؟"

"ابھی تو قیوم کی مہربانی ہے جو یہ ہلکا چھلکا سامان افرو تھری میں خرید کے گھر سیٹ کر دیا ہے اس نے۔" فیصل مطمئن تھا۔  
 عافیہ نے اس "عالیشان" سامان کو دیکھا۔ کوئی بیڈ یا چارپائی نہ تھی۔ زمین پر ڈبل بیڈ کا لگا اچھا کرا اور بر صاف تھری بیڈ شیٹ ڈال دی گئی تھی۔ سائیڈ پر رکھی دو کرسیاں اور بس۔ یہ ان کا بیڈ روم تھا۔  
 اس نے ساتھ والے کمرے میں جھانکا۔ وہ خالی بھاس بھاس کر رہا تھا۔ البتہ کچن میں چولہا سیٹ تھا اور گاڑی پر ہی ضرورت کے برتنوں کا ذخیرہ رکھا تھا۔ جو شاید سننے ہی خرید کے لیے گئے تھے۔ عافیہ کا بی بی لو ہونے لگا۔

"تم انوکھا سا فرنیچر ڈھونڈ کر لے لیتے فیصل! بالکل کسی غریب کی کیا گوارا رہی ہے۔" وہ صدمہ کی کیفیت میں تھی۔ عمر نے فکر تھا۔  
 "کر لیں گے بار بار پریشان کیوں ہوتی ہو۔ کون سا تم نے یا میں نے نوکری پھوڑ دی ہے۔" عافیہ نے تنک کر کہا۔  
 "تم سے شادی کے بعد بھی میں تنکے تنکے کی نوکریاں کرتی چھوں؟"

"تم ان بار بار تم کو آزمائش کی پہلی بیڑی پہ ہی تھک کے بیٹھ گئی ہو۔ کیا میں نے تمہیں پہلے سے یہ سب نہیں بتایا تھا؟" وہ بھی خفا ہوا تو عافیہ ٹھنڈی پڑ گئی۔

"مگر کب تک فیصل۔ پلیز بڑے گھر والوں سے بات کرو۔ مجھے ایسے گھر میں رہنے کی عادت نہیں ہے۔" اب کی بار اس کا انداز التجائیہ تھا۔ فیصل کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔  
 "آؤ ذرا اپنا زینہ بیڈ تو چیک کریں۔" ہاتھ بڑھایا مگر وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔  
 "اس سے بہتر ہے کہ میں جا کے کچن کا چولہا چیک کروں اور چائے بناؤں۔ ٹینشن سے سر درد شروع ہو گیا ہے۔"

اس کے جانے کے بعد فیصل گدے پر اطمینان سے نیمور اڑنا تک پر ناگنگ جمائے گنگلنے لگا۔  
 اس کے انداز و اطوار میں بلا کا اطمینان تھا۔

عمر کو اپنی جاب کی وجہ سے بہت خوب صورت گھر بھی ملا اور نچان دار گاڑی بھی۔  
 "امی! یہاں سے کچھ بھی نہیں لے جائیں گے سوائے کپڑوں اور انتہائی برسل چیزوں کے۔ دل فرشتہ گھرا ہے۔" عمر نے مسکرا کر کہا تو خدا کا شکر بجالا نہیں۔  
 صاعقہ بھابھی تو تفصیل سن کر ہی برا فروختہ ہو گئیں۔

"امی جی۔ آپ چلی جائیں گی تو میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟" ان کے لہجے کا وہ احترام بہت اچھی سا تھا۔ امی نے بڑی آہ سے عمر کی طرف دیکھا۔ مگر وہ صاعقہ بھابھی کی رنگ رنگ سے واقف تھا۔  
 عثمان بیرون ملک گیا تب عمر بڑھ رہا تھا اور امی وہ نوکری پر بھی نہیں لگا تھا کہ صاعقہ بھابھی نے خرچوں کے بڑھ جانے کا رونا رو کر اپنا ہر خرچ اٹک کر لیا تھا۔ اور نہ ہی کبھی عثمان کو قوت ملتی تھی کہ وہ بھائی نہ سہی

میں ہی کا خرچ الگ سے بھجوا دیتا۔  
 ”آپ اپنی ای کو بلوائیں یا پھر بھائی کے پاس چلی جائیں۔“ عمر نے صفا جھٹ انداز میں کہہ دیا۔  
 وہ دل موس کے رہ گئیں۔ بڑے سے لان والا شبنم دار سا گھر ان کی آنکھوں کے آگے ناچ رہا تھا۔  
 انہوں نے صحن میں پوچھا لگائی زینتی کو حسد اور رشک کی ملی جلی نگاہ سے دیکھا۔  
 (اس بے وقوف کو پتا ہی نہیں کیا روشن ستارہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہے)

\*\*\*

نئے گھر میں آکر زینتی تو گویا قوت گویائی ہی کھو بیٹھی۔  
 ”یہ ہمارا گھر ہے؟“ اس نے بے اختیار ہی پاس کھڑے عمر کا بازو ہلکا کر پوچھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ جھل سی ہو گئی۔ فوراً بات بدلی۔  
 ”مطلب یہ ہے آپ کو ملا ہے؟“

”ہوں۔“ وہ ہنس انداز میں کہہ کر ای کو بازو کے گھیرے میں لے کر اوپر اوپر کھوٹتے پھرتے گھر دکھانے لگا۔ زینتی اسے پیچھے سے زبان چڑا کر رہ گئی۔  
 اس نے خووی خووی خوشی سارا گھر انھوں سے چھو چھو کر دیکھا۔ (کاش عافیہ یہاں ہوئی۔ جل کے مر جاتی وہ تو۔)

اسے ہنسی آئی۔ واقعی عافیہ نے غریب کہہ کر ہی تو عمر کو ٹھکرایا تھا اور اب اگر وہ عمر کے ٹھٹھٹ دیکھ لے تو۔

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔  
 ٹھنڈے ٹھنڈے رواں پانی جیسی شفاف ہنسی۔  
 اندر سے نکلتے عمر نے بے اختیار مڑ کر اس من موچی کو دیکھا تھا۔

\*\*\*

ایک ہفتے کے اندر اندر گھر میں کام کرنے والی اور ساتھ ہی کھانا پکانے والی عورت بھی آ گئی۔  
 زینتی کو لگا اب وہ ملکہ بن کے بس بیڑ پہ بیٹھی حکم

چلایا کرے گی۔ مگر چند دنوں میں ہی اسے ہر شے دھول کی تھیں دکھائی دینے لگیں۔ آرام کر کر کر پڑیاں دیکھنے لگیں تو وہ کام والی کے سر پہ کھڑی ہو کر اسے کروانے لگی۔  
 مگر کھانا پکانے والی کا کیا کرتی؟ اپنے ہاتھ کے کھل کی ایسی عادت پڑی تھی کہ باور چن کے ہاتھ کا پکا پیر ہی نہ آتا۔  
 اسی بے چاری شاید موت میں گزارا کر رہی تھیں۔ مگر زینتی اس روز والی منہ ماری کے بعد انہوں نے لب ہی لیے تھے جب وہ کام کے بوجھ کی شکایت کر رہی تھی۔

”عمر کھل ہوتے ہو تو تم گھر میں بھی ناٹم کرو۔“ اسی اس پر خفا ہونے لگیں۔  
 ”نئی نئی جاب ہے اور پھر اتنی بڑی پوسٹ۔ تم ناٹلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا۔“ اس نے ٹھکرا کر ای منایا۔

آنکھوں سے بھری پلیٹ گود میں رکھ کر وہ نظریں گاڑے بیٹھی زینتی نے کن انھیں سے اسے دیکھا۔ اسے عمر کی مسکراہٹ اچھی لگی تھی۔  
 ”پیشانی اٹھاؤ بھی جی جی ہوئی ہے آپ کی۔“ اوپر بھی کوئی چھوٹی موٹی پوسٹ نہیں ہے۔ پھر یہاں ناٹلی کا مظاہرہ کیوں ہو رہا ہے؟

ای کا ارادہ شاید اس کے کان کھینچنے کا تھا۔  
 زینتی کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ انہوں کا دل ٹوٹنے لگی۔ وہ تو ابی کو عمر سے ملا ہوا سمجھ رہی تھی (صاف بھائی کے بقول)  
 ”حکم کریں آپ۔“ خوش حالی نے عمر کے منہ بھی بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔

”موسم بدل رہا ہے پتا! زینت کو مارکیٹ لے جاؤ۔“  
 شاپنگ کروالہ۔ وہ تو اتنی صابر ہے منہ سے کبھی کبھی نہیں۔ مگر تمہیں تو اپنے فرائض کا خیال رکھنا چاہیے۔“

زینتی کا دل بلیوں اچھلا۔ شاپنگ۔ زندگی میں بار۔ مگر عمر شاید کچھ کہہ رہا تھا۔

میرے پاس اتنا نام نہیں ہے۔ کل ڈرائیور بھیج دوں گا گاڑی کے ساتھ۔ جتنی جی چاہے شاپنگ کر لے۔“  
 ”اب یہ ڈرائیور کے ساتھ جا کے خریداری کرے گی۔“  
 ای ناراض ہوئیں۔ زینتی کا جی چاہا ان سے کہے، شاپنگ ہی کر لی ہے نا جس کو چاہے بھیج دیں بلکہ چہ اسی کو بھی بھیج سکتے ہیں۔ مگر پھر دل کو بجھا بجھا سا پا کر اس کا یہ جلد اندر ہی رہ گیا۔  
 (کو کیا یہ دل عمر کا ساتھ مانگ رہا ہے؟)

اسے اس سوچ کے ساتھ ہی خود پر بے یقینی ہوئی۔

\*\*\*

پہلی تنخواہ ملے ہی گھر کے اخراجات یہ اٹھ گئی۔  
 بیک سے وہ پہلے ہی اپنی تمام بچت نکال کر اپنی مومن پر اڑا چکی تھی۔  
 فیصل اپنے باب سے جو جیب خرچ لایا وہ عافیہ کی تنخواہ سے بھی کم تھا۔ بشکل گھر کا کرایہ اور غلے ہی ادا ہو سکے عافیہ تو زرب سی اٹھی۔

”اب ایسے گزارہ کریں گے ہم۔“  
 ”سوت ہارٹ“ پیار محبت میں تو بھوکا رہ کے بھی گزارہ ہو جاتا ہے۔  
 اس نے عافیہ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا مگر عافیہ کو اس کا وارنڈہ انداز نا اکل نہ بھایا۔  
 ”تم کہتے ہو گے مگر میں نہیں۔“ اس نے بے دیودر لٹا ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

(کس اسے کرائے کے مکان میں رکھ کے وہ بھول ہی نہ جائے) فیصل نے اسے خاصی ناراضی سے دیکھا۔

”جس یہ تھی تمہاری محبت؟“ عافیہ سنبل۔  
 ”میں نے اس طرح کی زندگی کا خواب نہیں دیکھا تھا فیصل۔“ اس کے ہر کہ اس سے پلٹ گئی۔  
 ”میں نے باب کو تو چھوڑ ہی آئی ہوں۔ یہاں بھی تم تنہائی کی مار دے رہے ہو۔ میں نے تو سوچا تھا کہ

تمہارے والدین میرے ماں باپ کی کمی کو پورا کر دیں گے۔“ وہ بڑی ڈرامے باز تھی۔ رقت آمیز لہجے میں بولتی فیصل کو کہہ بھر کو چپ کر وائی۔  
 ”تمہیں اچھا لگتا ہے کہ خود ہم لاکھوں کی گاڑی میں سفر کرتے ہو اور تمہاری بیوی بسوں میں خواہر ہوتی ہے اور پھر سب سے بڑھ کے یہ کہ اتنے امیر شخص کی بہو ہو کر معمولی سی جاب کر رہی ہے۔“  
 فیصل نے اسے خود سے الگ کیا اور بہت ٹھنڈا سا ہو کر رگدے پر جا بیٹا۔

”اس گھر کو دیکھو کیا یہ تمہارے رہنے کے قابل ہے؟ جہاں نہ سوئے کو بیڑ ہے نہ بیٹھنے کو صوف۔“ وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ فیصل سنجیدگی سے بولا۔  
 ”اور اگر یہ سب نہیں بھی نہ ملے۔ ابو مجھے عاقی کریں تو۔“

عافیہ کا دل بچنے کی مانند لرزا۔ وہ ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔  
 ”تمہیں اپنا حق ہر حال میں لینا ہو گا فیصل۔ مجھے دنیا کے سامنے تماشہ بنواؤ گے؟“ اس نے پیچھے بچنے لہجے میں کہا۔

”کس بات کا تماشہ؟ شادی کا وعدہ کیا تھا میں نے وہ نبھادیا۔“ فیصل مطمئن تھا۔  
 ”مگر میں اس گھر کی بہو بھی بننا چاہتی ہوں فیصل! مجھے اپنے گھر کا ماں بھی چاہیے۔“ وہ ضدی ہونے لگی۔ اس کی ماں اکثر مارا کرتی تھیں۔

”مقدر سے اتنی ہی ضد لگانی چاہیے، جتنی اپنے اختیار میں ہو۔ جہاں معاملہ اختیار سے باہر لگے وہاں اپنی ضد چھوڑ کر خدا کی رضامندی لینے ہی میں عافیت ہے۔“

”مگر عافیہ نے کبھی اس جیلے کی گہرائی میں اتر کر کوئی سیپ نہ پایا تھا۔“  
 ”تمہارا گھر وہی ہے جہاں میں ہوں عافی۔ اس گھر اور اس کے کینوں سے تمہارا کیا واسطہ؟“  
 وہ جیسے عافیہ کو آزار رہا تھا۔ مگر عافیہ اس امتحان میں کسی طور پورا اترنے کو تیار نہ تھی۔

”وہ عیش قدرت نے ہمارے نصیب میں لکھے ہیں  
فیصل پھر کیوں نہ ان سے مستفید ہوا جائے۔“  
”بہر حال۔۔۔ فی الحال تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب تک  
ابو کو منانہ لول۔۔۔ وہ تو پہلی فرصت میں ہی مجھے شانہ سے  
بیاہ دیں گے۔ مسلسل زور دے رہے ہیں شادی پر۔“  
فیصل نے بات ختم کر دی۔  
”تم کم از کم اب آؤ تو سنبھال لو فیصل! اب تک  
صرف گاڑی کا بیٹھول پھونکتے رہو گے۔“  
عافیہ کو اس کی لا پرواہی اب کھٹکنے لگی تھی۔ حالانکہ  
اس کا یہ بے نیاز اور لا پرواہ اسانڈا زنی عافیہ کو لوٹ کر  
لے گیا تھا۔

لاکھوں کی گاڑی میں بیٹھا خوش شکل سامر منٹوں  
میں اس پر لٹو ہو گیا تھا۔ یہ کیا تم مرتنے والی بات تھی۔  
”اگے۔۔۔ دو ایک ماہ انتظار کرو۔ پھر سب ٹھیک  
ہو جائے گا۔“ فیصل نے ٹھل سے کہا تو وہ ٹھنکی۔  
”مگر مجھے پیسہ چاہیے۔ جب تک بھی یہاں رہنا  
ہے، کم از کم اپنے معیار کے مطابق تو کروں اس گھر  
کو۔“ اس بار جیسے ہونج آکر بولا۔  
”تم اپنا زیور کیوں نہیں بیچ دیتیں؟“  
عافیہ دنگ سی اسے دیکھنے لگی۔

\*\*\*

عمر نے ماں کی بدایت ایک کان سے سن کر دوسرے  
سے اڑادی۔ اسے شاپنگ کے لیے لے جانے ڈرائیور  
ہی آیا تھا۔ اسی کو سخت غصہ آیا۔ اب جوان جہاں لڑکی  
کو ڈرائیور کے ساتھ کیسے بھیجتیں۔ خود ساتھ ہو لیں۔  
بہت برے دل کے ساتھ اس نے شاپنگ کی۔ مگر  
گھر آکے اس کا ایک بھی چیز کھول کے دوبارہ دیکھنے کا  
دل نہ چلا۔

تو کیا ساری زندگی وہ یونہی بیتانے والا تھا؟ عافیہ جیسی  
سنگدل اور بے حیا لڑکی کی یادوں میں کھو کر۔ اسے عافیہ  
یاد تھی۔ عافیہ کی بدکرداری وہ بھول گیا تھا کیا؟ زینب کو  
اپنی کیفیت کچھ سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ ڈھیروں کپڑے  
لے جوتے، جیولری۔ مگر پٹڑے میں تمام چیزیں رکھ

کے بھی۔ عمو والا پٹڑا بھاری تھا۔  
اسی کمرے میں آئیں تو وہ رو رو کر بے حال ہو رہی  
تھی۔ وہ حدود و جبر پشیمان ہو گئیں۔  
زینی کی ایک سی رٹ۔  
”گراچی جانا ہے۔ تایا ابا سے ملنا ہے۔ میرا دل  
گھبرا رہا ہے۔“  
ای نے لپک جھپک کر عمو کو فون کیا۔ منٹوں میں وہ  
گھر پہنچا۔  
”بھئی چنگی تھی۔ جانے اکیلے میں بیٹھے بٹھائے کیا  
ہو گیا۔“ عمر نے دیکھا رو رو کر اس کی آنکھیں سوج رہی  
تھیں۔

پھر ای نے گراچی چلنے کا حکم صادر فرمایا۔ زینی کے  
دل میں غمزدگی اترنے لگی۔ مگر عمو دیکھ گیا۔  
”کیسی باتیں کر رہی ہیں ای۔ اس گھر میں۔“  
”جو قسمت میں لکھا تھا وہی لے کے آئے تھے  
ہم۔ منہ زبانی کہہ دینے سے خون کے رشتے نہیں ٹوٹا  
کرتے عمر۔“ ای کا انداز اتار دیا تھا۔  
عمر چپ سا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔ پھر جھنجھلا کر باہر  
نکل گیا۔ اگلے روز اس نے اسی اور زینی کو ٹرین میں بٹھا  
دیا۔

”میں فارغ نہیں ہوں ابھی۔ جب آنا ہو بتا دیجیے  
گا۔ واپسی پہ خود لینے آؤں گا۔“  
اس کی نئی نوکری تھی پھر اونچی پوسٹ۔ اسی چپ  
ہو رہی۔ زینی نے لاتعلقی سے منہ پھیر لیا۔ عمر لب  
ہیچے کمر کی سے پیچھے ہٹ گیا۔

\*\*\*

تائی اماں اس سے لپٹ کے یوں بین کر کے روئیں  
جیسے ان کی سگی بیٹی سامنے آگئی ہو اور تایا لیا کو دیکھ کر تو  
ان کی بے بسی اور بے چارگی نے زینی کو بھی رلا رلا  
ڈالا۔

بارعب اور دنگ سے تایا ابالا چاری کی علامت  
بنے ہستہ پر بٹھے تھے۔ ملنے چلنے سے معذور۔ زبان کو  
بھی فالج مار گیا تھا۔ زینی کو دیکھ کر غول آں کرتے

آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تو وہ ان کے سینے سے لپٹ  
گئی۔ کیسی بد نصیب ہوتی ہیں وہ بیٹیاں جو اسنے شان و  
شکوت والے باپوں کے ٹھیلے مٹی میں دیوار کر ان کو  
یوں بستر سے لگا دی ہیں۔  
ابا جیسے مضبوط آدمی کو دوندے دھکے سے دل حکیل  
نہ سکتے تھے مگر عافیہ جیسی کمزور بیٹی نے ایک سی ہلے میں  
ان کی کمر زمین سے لگا دی تھی۔  
شاید اسی لیے مٹی کوئی نہیں مانتا؟  
عافیہ مست ہل گیا تھا۔

وہ عافیہ جس کی آنکھوں میں بے تکلفی آمیزے  
ہاکی ہوئی تھی۔ اب جیسے زینی کے سائے سے بھی بچ رہا  
تھا۔ بات کرتا بھی تو یوں جیسے کسی انجان اجنبی سے  
مفتگو ہو رہی ہو۔ زینی کا دل دہاں سے اچاٹ ہونے  
لگا۔

زینی نے بی جان سے تایا اماں کی خدمت کی۔ اس گھر  
میں کوئی بھی عافیہ کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ زینی کو واضح  
اہیت دی جا رہی تھی۔ تائی اماں تو جیسے میکے آئی بیٹی کی  
ایجنی ہوئی تھیں۔ زینی کو شدت سے احساس ہوا کہ  
یہ سب عمر کی بیوی بننے کا آغاز ہے۔

ای نے عمو کو فون کر دیا تھا۔ وہ انہیں لینے آ رہا تھا۔  
ساتھ ہی تایا اماں کی خبر گیری بھی ہو جاتی۔

اور پھر جس روز عمر آیا زینی کے چہرے پر انوکھی سی  
چمک اتر آئی۔ زینی نے دل لگا کے عمر کی پسند کی بریالی  
اور اچار گوشت بنایا۔ ٹائماں راز اور کھیرے کا کچھ مرسلاد  
اور پھر سارا لیموں پنچر ڈنکے پیٹھے میں فروٹ کسٹرو۔  
گرا کر م روٹی تان عافیہ لے آیا۔

مگر عمر نے اس پر ایک نگاہ بھی نہ ڈالی تھی۔ یوں  
جیسے کسی اور کی بیوی ہو۔ جبکہ وہ کھانے کے دوران  
بڑھ بڑھ کے اسے دیکھیں پیش کر رہی تھی۔

وہ تائی اماں سے باتیں کر رہا تھا۔ ای سے ہنس بول  
رہا تھا۔ مگر عافیہ نے بھانپ لیا کہ وہ زینی کو مسلسل  
نظر انداز کر رہا تھا۔

زینی نے رو رو کر برتن دھوئے۔

تب ہی ایک بے حد عجیب سی بات ہوئی۔ جو پچھلے  
ایک ہفتے سے نہ ہوئی تھی۔ وہ برتن دھو کر سلیب  
صاف کر کے پانی تو چہرے پر رگسکت و رینخت کے  
نشانات موجود تھے۔ عاقب کو غیر متوقع طور پر سامنے  
پاکر زینی نے بو کھلا کر دیکھنے سے چہرہ کڑا۔

”تم رو رہی ہو؟“ وہ عمو سے اسے دیکھ رہا تھا۔  
”نہیں۔۔۔ نہیں تو۔ میں کیوں روؤں گی۔“ وہ کمر گئی۔  
باہر نکلتا تھا۔ مگر اسے عجیب سا لگا۔ عاقب کچن کے  
دروازے کے عین درمیان میں پھیل کے کھڑا تھا۔  
”مجھ سے تو جھوٹ مت بولو زینی! ابلیں گیا ہوں میں۔۔۔“

اصالت دیکھ لی ہے میں نے۔ عمر اور تمہارے  
درمیان پھیل سرورہی۔ ”وہ جذباتی ہونے لگا۔  
زینی کے وجود میں سنسنات سی دوڑا تھی۔  
”وہ میرا شوہر ہے عاقب! اور تم خواستہ کے  
اندازے مت لگاؤ۔ بس تمہوڑا اٹھکے مجھ سے اتنے  
دل زبردستی جو رہی ہیں۔“

اس نے عاقب کی بدلتی نگاہوں کو سرعت سے  
محسوس کر لیا تھا جب ہی پر زور انداز میں اس کی نفی  
کی۔ مگر وہ جانے کیسے اندر کا بھدیا گیا تھا۔

”جھوٹ اس سے بولو جو تمہیں جانتا نہ ہو زینی!  
میں تو تمہاری چال سے تمہاری نگاہوں کے اندازے  
پہچان سکتا ہوں کہ تم ابھی تک وہی زینی ہو۔ منہ بند  
کلی۔“

بے باک تو وہ پہلے بھی تھا۔ مگر اتنا کھلا ڈالا انداز۔  
زینی کو انے کانوں کی بوئیں جتنی محسوس ہوئیں۔  
”میں عمر کی بیوی ہوں عاقب! امیرے راستے سے  
ہوں۔“ اس نے لہجے میں درشتی سنو کر بمشکل کہا۔

”اگلے صبح مت ہو زینی۔“  
وہ آگے بڑھ آیا۔ اس کے انداز میں وار فٹکی اور  
لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔

”بابائے نکاح والے دن ہی عمر سے کہہ دیا تھا کہ فی  
الحال وہ تم سے نکاح کر کے اپنی عزت بچائے بعد میں  
بے شک تمہیں طلاق دے دے۔ وہ تو راضی ہی نہیں  
تھا تم سے شادی پر۔“



”مضمون بائیں مت کرو۔ مجھے جانے دو۔“ زینی کو اس سے خوف محسوس ہوا۔

”یار کرو زینی! ہم دونوں کتنے خوش تھے اپنے رشتے سے اس روز نکاح طے تھا ہمارا۔“

وہ اسے بکارا تھا واپسی کی راہ دکھا رہا تھا۔ مگر زینی ان ہر کافوں سے نکل چکی تھی۔

”میں صرف اس لیے خوش تھی کہ تم سے شادی کے بعد شاید اس گھر میں میری حیثیت کچھ بہتر ہو جائے۔“ بھی تم نے دیکھا۔ کیسے عافیہ اپنی اترن۔ اپنے کپڑے اپنے جوتے مجھے وان کرتی تھی۔ آج تک اس گھر میں میرے لیے کوئی نیا جوڑا نہیں بنا۔ میں تو ای لاچ میں تمہارے سنگ رشتے سے بندھ گئی کہ اس گھر کی بیویں کر شاید مجھے اس اترن سے نجات مل جائے اور اترن بھی وہی ہے کہ جسے میرے بدن پر دیکھ کر عافیہ رہ نہیں سکتی تھی اور کتنی ہی بار اس نے اپنے دے ہوئے جوڑے مجھ سے اتراوے ہیں۔ ہمیں تو پتا بھی نہیں عاقب۔ ان حالوں میں گزارہ کرتی رہی ہوں میں یہاں اور تم۔ تم مجھے میرا ماضی یاد کر رہے ہو؟“ وہ بے حد گور ازیت پسند ہو رہی تھی۔ آنسو بنا شعوری کو بخش کے بنے جا رہے تھے۔

”بھول جاؤ عاقب۔ جیسے میں نے بھلا دیا اس ماضی کو۔ میں کسی کے نکاح میں گئی ہوں تو دل کی پوری رضا مندی کے ساتھ۔ اب وہ برا کرے یا بھلا، میری قسمت۔“ اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں۔ عاقب کا رنگ بدل گیا تھا اسے امید نہ تھی کہ زینی کیسا آئینہ اس کے سامنے لا رکھے گی۔

”کچن کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ عاقب اور زینی دونوں چونکے۔

دروازے میں عمر کھڑا تھا۔

زینی کا دل غوطہ کھا کر ابھرا۔ عمر نے عاقب کی ساری بکواس سن لی تھی۔

”چائے بنا دو چار کپ۔“ وہ نارمل انداز میں بولا۔

”جی۔ اچھا۔“ زینی جلدی سے چولے کی طرف پلٹ گئی۔ عاقب باہر نکل گیا تھا۔

زینی کا دل تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا اس کی طبیعت گھبرانے لگی۔

(جانے اس نے کیا کیا سن لیا ہو؟)

”میری چائے میں چینی ایک لی اسپون ڈالنا۔ اور پکینگ جلدی ختم کر کے سو جاؤ۔ صبح واپس جانا ہے۔“

”ہیں۔“ زینی کا تمام خوف اڑن چھو ہوا۔ مسکراہٹ سے چو کھل اٹھ پلٹ کر عمر کے تاثرات دیکھنے چاہے تو وہ چاچا تھا۔

زینی نے طمانیت بھری سانس لی۔

”تو گویا اس نے کچھ نہیں سنا۔“

\*\*\*

فیصل جس قدر اطمینان سے دو کمروں کے اس گھر میں رہ رہا تھا اسے دیکھ کے عافیہ کو لگتا تھا کہ وہ یونہی زندگی گزارنے کی پلاننگ کے ہوئے ہے۔ صبح ناشتا کر کے گھر سے نکلتا تو رات کے کھانے پر واپس آتا۔ عافیہ کی برواشت کی حد نہیں تک تھی۔ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اگر اس نے یونہی ہتھیار ڈالے رکھے تو فیصل کبھی بھی اسے اپنے گھر نہیں لے جائے گا۔ تب ہی اس رات جب وہ گھر پہنچا تو غصے سے بھری عافیہ اس کی منتظر تھی۔

”کھانا لے آؤ جلدی سے۔“

وہ ہاتھ دھو کر تھکے سے خشک کرتے ہوئے بولا اور دھوٹ اٹھا کر پی ڈی آن کرنے لگا۔

چپھلے ہفتے دل پر پھر رکھ کر عافیہ نے زبورات میں سے ایک سیشن گزری اور فرخ نے ہی لیا تھا۔

”کیوں۔ گھر سے کھا کے نہیں آئے یا وہاں تمہیں کوئی پوچھتا ہی نہیں؟“

فلٹر سے بھر پور یہ لمحہ اب فیصل کو اجنبی نہیں لگتا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آئے تھے عافیہ کے موڈ پر سے خوش دلی کی ساری بریں اترنے لگی تھیں۔

”میرا گھر یہ ہے عافیہ! جہاں میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا اور مطلوبہ جیتل لگا کر

کری میں دھن گیل۔

عافیہ تڑپ سی تو اٹھی۔

”ہیں ہے یہ ہمارا گھر۔ اور نہ ہی میں اس کا ایک میں مزید رہ سکتی ہوں۔ جو بھی ہو گا۔ دیکھا جائے گا۔ تم مجھے اپنے گھر لے کے چلو۔“ وہ چلائی۔ فیصل نے ہانکوا رہی ہے اسے دیکھا۔

”تم نے مجھ سے شادی کی تھی یا میرے گھر سے؟“

”دونوں سے۔“ وہ ذرا بھی پشیمان نہ ہوئی تھی۔

”وہ کے کے ساتھ اس کی مضبوط ملی پوزیشن بھی دیکھی جاتی ہے۔“

”میری پوزیشن بلکہ ہر ”چوہین“ تمہارے سامنے تھی بھرا بی بی جی کیوں؟“ وہ سختی سے بولا۔

”تم نے کہا تھا یہ چند دنوں کی بات ہے۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ہم چپھلے دو ماہ سے اس گھر کا گریہ بھر رہے ہیں اور اپنی آمدنیوں میں کھینچ تان کے گزارہ کر رہے ہیں۔ نہ ہو فلنگ نہ لائک ڈرائیو۔ کیا کیا خواب دیکھتے تھے میں نے۔“ وہ بددل ہو رہی تھی۔

فیصل اٹھ کے اس تک آیا اور اسے دونوں شانوں سے تھام کر پیار سے بولا۔

”کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم دونوں مل کے اپنی دنیا بسائیں۔ مل کے محنت کریں اور خوشیوں بھرا ایک محل تعمیر کریں۔“ کوئی محبت کرنے والی صاف ذہن کی لڑکی ہوتی تو شوہر کے اس محبت بھرے پیغام پر لپیک کتنی مکروہ کرنت کھا کر ہنسنے ہنی۔

”محنت۔ ہوش میں تو ہو تم؟ تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ساری جوانی جوتاں کھسکاتے دو سروں کی نوکیاں کرتے اور پہلی کا انتظار کرتے گزار دیں؟“

وہ بے یقین تھی۔ فیصل کو اس کے چہرے پر خوف سا دکھائی دیا۔

”تم کی سمجھ لو کہ تمہارے فیصل کی یہی حقیقت ہے۔ بھول جاؤ اس بنگلے اور اس کے کمینوں کو۔“

وہ دونوں بانو پھیلا کر گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم نے گھر میں بات کی اپنی شادی کی؟“ فیصل

ٹھکے ہوئے انداز میں پلٹ گیا۔

”ظاہر ہے۔ رات گھر نہ جانے کا کوئی جواز تو نہ بنایا تھا۔“

”پھر؟“ وہ بے تابی سے آگے بڑھی۔

”پھر یہ کہ اب ہمیں نہیں اپنی دنیا بسانی ہے۔“

فیصل کے اس مختصر سے جواب میں ایک قیامت چھپی تھی۔ عافیہ کو سانپ سیزم کی کھیل آج سمجھ میں آیا تھا۔ بڑی مہارت سے وہ ہندسوں کے بجائے سیزمیں سے چڑھ کر اوپر تک آئی تھی مگر تینوں پر موجود سانپ اسے ڈسنے کی تیاری میں تھا۔ یہ اسے علم نہیں تھا۔ شارٹ کٹ استعمال کرنے والوں کو اکثر نہیں ہوتا۔

”تمہیں تم خاموشی سے لوٹ آئے۔ کیسے مردہ تو تم فیصل۔ اپنا حق نہیں مانگ سکتے۔“

عافیہ کو اپنی زندگی کی یکم ختم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

بل کھا کے بولی۔

”سب کچھ کر کے دیکھ لیا اور اب میرا ہی کو تم بھی۔“

اس ٹاپک کو کہیں دفناؤ۔ میں پہلے ہی تمہارے رہنے سے نہیں ہو رہا ہوں۔ مجھے نہیں پتا تھا تم اس قدر بات پرست ہو۔ بجائے مجھے حوصلہ دینے کے تم اس بنگلے کو رو رہی ہو۔“

وہ تلخ ہوئے لگا۔

مگر عافیہ کو اپنے کسی فعل یا لفظ پر ذرہ برابر بھی شرمندگی نہ تھی۔

اسے تو اپنا نقصان سہہ ہاتھ رکھ کے رونے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے واپس ہو کر فیصل خودی کچن میں کچھ کھانے کے لیے دیکھنے چلا گیا۔

\*\*\*

وسیع و عریض شان دار بنگلے کو رشک و مسرت سے دیکھتے ہوئے عافیہ نے ذور تیل پر ہاتھ رکھا۔

زادیر کے بعد جو کیدار نے چھوٹا ٹیکسٹ واکا۔

”فیبہ صاحب سے ملتا ہے میں نے۔“ وہ ذرا سا شگوار بولی۔

”کلن سے صاحب سے ملنا ہے بی بی؟“ پھلن  
چوکیدار نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔  
عافیہ اس وقت بہترین لباس پہنے ہوئے تھی۔  
نازک سی گولڈ چوڑی اور ہاتھ میں قیمتی برس۔  
وہ اس گھر کے کمبلوں پر اپنا پہلا امپریشن بہت اچھا  
ڈالنا چاہتی تھی۔  
”فیصل صاحب۔ فیصل کے گھر والوں سے۔“  
چوکیدار نے چند لمحے ابھی نظروں سے عافیہ کو دیکھا۔  
پھر جیسے سمجھ آئے برسر لایا۔  
”اوپ۔ اچھا۔ فیصل کا مہمان اے۔ وہ تو بڑے  
صاحب کو فیکٹری لے کر گیا ہے۔“  
”اس کی ای تو ہوں گی گھر پر۔“ عافیہ غصہ وبات۔  
ہوئے بولی۔ اس چوکیدار کو تو وہ ضرور سبق سکھائے  
گی۔  
”ہاں۔ وہ اے۔“ چوکیدار نے سر ہلایا تو وہ نرج  
آکر بولی۔  
”مجھے اندر تو آئے وہ۔ ان سے ملنا ہے میں نے۔  
رشتہ دار ہوں ان کی۔“  
چوکیدار نے مشکوک نظروں سے سرتپا اسے  
دیکھا۔ اور پھر دروازے سے پیچھے ہٹ گیا۔  
اندرا داخل ہوتے ہی عافیہ کی طبیعت بشار ہو گئی۔  
وسیع و عریض لٹ کر گرین لائن۔ پوریکو میں کھڑی وہ  
شانداز گاڑیاں۔ وہ ماربل کی روش پر چلتی مسکور سی  
تھی۔ اسے لگا جیسے اس کے خواب آج تعبیر پا گئے  
ہوں۔  
”بی بی۔ کدو جاتا ہے؟“ چوکیدار کی کرخت آواز  
اسے یک بخت ہوش میں لائی۔  
”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“ وہ غصے سے بولی۔  
”مگر کدو جانا اے بی بی! تم تو فیصل کی اماں سے  
ملنے آیا تھا۔“ وہ تذکیرو تائیت کی ایسی کی عینی کرتے  
ہوئے بولا۔  
”ہاں۔ تو؟“ عافیہ نے اسے پھاڑ کھانے والے  
انداز میں دیکھا۔  
”وہ اور اندر نہیں اے۔ ان کی رہائش پیچھے

اے۔“ چوکیدار نے ناگوار سی سے کہا۔ وہ چپ کی  
ہو گئی۔ پھر مختار انداز میں پوچھا۔  
”بیچھے کیا ہے؟“  
”اور سب ملازموں کے سروٹ کوارٹر ہیں۔“  
چوکیدار کے لبوں نے الفاظ نہیں اس کے کانوں پر  
تیزاب اندر ملا تھا۔  
”اور فیصل۔۔۔ وہ کہاں۔۔۔؟“ عافیہ کی دنیا داؤ پر لگی  
تھی۔  
وہ دنیا جس کے لیے اس نے اپنی آخرت داؤ پر لگا  
دی تھی۔  
”اس کا کوارٹر بھی اور ای اے۔ ڈرائیور سے وہ  
بڑے صاحب کا گھر کی گاڑی بھی چلا تا ہے اور فیکٹری  
والی بھی۔“  
”ڈن۔ ڈن۔ ڈن۔ ڈن۔“  
تیز رفتار ٹرین عافیہ کے وجود کے پرچے اڑاتی نثری  
تھی۔ وہ بے یقینی سے چوکیدار کو دیکھنے لگی۔  
”آج کل تو وہ ڈیوٹی کے بعد کہیں چلا جاتا ہے۔  
نہیں رہتا۔ گھر میں کوئی کھٹ پٹ اے شاید۔“  
بے حد بدحواس ہو کر وہ وہاں سے چلی تو چوکیدار کو  
خوشہ ہوا اوچی ٹبل سے وہ ماربل پر پھسل گئی نہ  
جائے۔ مگر وہ کہاں جاتا تھا کہ عافیہ کن بلندیوں سے گر  
چلی ہے۔ گھر میں عافیہ نہیں ایک طوفان لوٹا تھا۔  
فیصل کے آنے تک پہلے تو وہ روٹی رہی پھر اس نے  
گھر کا سارا سامان بکھیر ڈالا۔ برتن توڑ دیے اور تو اور  
وی بھی زمین پر پھینک دیا۔  
اس وقت اگر فیصل اس کے سامنے ہوتا تو یقیناً  
اسے وہ قتل ہی کر ڈالتی۔  
فیصل اپنے مخصوص وقت پر آیا۔ پاس موجود چوچلا  
سے لاک کھول کے اندر داخل ہوا تو کچھ عجیب سا  
احساس ہوا۔ پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور بالکل  
خاموشی طاری تھی۔ سورنہ اس وقت عافیہ بی بی وی لگا کے  
بیٹھی ہوئی تھی۔  
وہ خوف زدہ سا ہوا۔ آگے بڑھ کر محن کی لائٹ  
چلائی اور تیزی سے کمرے کی طرف بڑھا۔

لائٹ آن کرتے ہی اس کا دل جیسے کسی نے شکنجے  
میں کس لیا۔ ہر شے الٹ پلٹ تھی۔ بی بی وی ایک  
طرف اونہا پڑا تھا غالباً اس کی اسکرین ٹوٹ گئی  
تھی۔  
فیصل کے ذہن میں پہلا خیال ڈکیتی کی واردات ہی  
کا آیا۔ وہ بے تابی سے کدے پر اونہا پڑی عافیہ کی  
طرف بڑھا۔  
”عافیہ۔ کیا ہوا میری جان؟“ اس نے اسے شانوں  
سے پکڑ کر سیدھا کہا۔ روپا چوٹسوچی آنکھیں بکھرے  
بال۔ وہ بی بی سی تھی۔ فیصل کا دل لرز گیا۔  
”جو بی بی لیں نہیں۔ کیا ہوا؟“ وحشت کے مارے  
فیصل نے اسے سمجھو ڈالا۔  
دیناٹ گئی ہے میری۔ مر گئی ہوں میں۔ وہ  
ہسٹریائی انداز میں چیخی تو وہ دم بخود رہ گیا۔  
”پور آئے تھے یہاں؟“  
”چور۔!“ وہ جیسے تخی سے بولی۔ ”کیا چوری کریں  
گے یہاں سے چور۔ ایک معمولی سے ڈرائیور کے گھر  
کیا چور کریں گے۔“  
فیصل ساکت سا ہوا۔ پھر اس نے طمانیت بھری  
سانس لی۔  
”شکر ہے خدا کا۔ میں تو ڈری گیا تھا کہ خدا ناخوستہ  
کوئی قیامت نہ ٹوٹ پڑی ہو۔“  
اس نے تشکر کا اظہار کرتے ہوئے عافیہ کو بانہوں  
میں لیا تو اس نے پوری قوت اور نفرت کے ساتھ فیصل  
کو پیچھے دھکیلا۔  
”قیامت۔ ابھی کوئی قیامت ٹوٹنی باقی ہے کیا؟“  
وہ ہلائی۔  
اس کے رد عمل پر فیصل کو کوئی حیرت نہ تھی۔ وہ  
پر سکون تھا۔ بالکل پر سکون۔  
”چلو اٹھ جاؤ۔ اب منہ ہاتھ دھوؤ اور کھانا لگاؤ۔“  
”دو نول ساتھ کھا میں گے۔“  
”تھو دھو کے باز فرما۔“ دھو لکے کے ڈرائیور اور  
جھوٹ پوٹے رہے میرے ساتھ۔“ عافیہ اس کے  
پیچھے لگی اور کالر سے پکڑ کے اسے کھینچا۔ بھوک

شیرینی بنی ہوئی تھی۔  
فیصل نے اس کالال بھجھو کا چہرہ اور وحشت سے  
بگڑتے خدو خال دیکھے۔ اور نرمی سے اپنا کالر چھڑاتے  
ہوئے بولا۔  
”میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے  
ایک بار بھی نہیں کہا کہ وہ بگڑے میرا ہے۔ میں نے  
صرف یہ کہا تھا کہ میں وہاں رہتا ہوں۔“  
”تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ تم وہاں ڈرائیور ہو اور  
اپنے ماں باپ کے ساتھ سروٹ کوارٹر میں رہتے  
ہو۔“ وہ ہلائی۔  
”تم نے پوچھا ہی نہیں۔“ وہ آرام سے بولا۔  
”تم حرام۔“ غم دھنے اور نفرت سے بے حال  
ہو کر وہ اسے گالی دینے لگی تھی کہ اس کا مطلب یا کر  
فیصل نے اس کے بالوں کو جڑوں سے مٹھی میں جکڑ  
لیا۔  
”تھو اس بند۔ اب مزید ایک لفظ نہ سنوں میں۔ تم  
جیسی بی لڑکیاں ہونی ہیں ماں باپ کے گھروں سے  
بھاگتی ہیں تو پھر ایک شوہر کے ساتھ بھی گزارہ نہیں  
ہوتا۔ عزت راس نہیں آری؟“ وہ ایک بالکل مختلف  
فیصل تھا۔  
عافیہ لنگ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے حواس  
میں آئی تو دیوانی ہو گئی۔ اسے نوجا کھوٹا دھکے دیے  
جو چیز ہاتھ میں آئی اسے دے ماری۔ مگر فیصل کے  
ایک زوردار ہتھرنے ہی اسے جکڑا کر کرنے پر مجبور  
کر دیا۔ وہ گالیاں بلکا کچ میں چلا گیا۔  
”امی۔!“ وہ بلک اٹھی۔  
ان تین ماہ میں اس نے پہلی بار ماں کو یاد کیا تھا۔  
\*\*\*  
ای کی نظروں سے کچھ بھی چھپا ہوا نہ تھا۔  
”کیا بات ہے نہ نہ۔ کیوں اتنی آزادی دے رکھی  
ہے تم نے عمر کو؟“  
آج بھی وہ رات کے کھانے پر نہ پہنچا تھا۔ ای نے  
نہ نہ کوٹو کا تو وہ شکایتی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”غلط بات ہے یہ۔ تمہارا شوہر ہے وہ۔ برا بھلا پوچھنے کا حق رکھتی ہو تم۔“

وہ دیکھتی تھیں عمر گس ضرورت کے وقت ہی زینبی سے مخاطب ہوتا تھا۔ اور زینبی تو جیسے اس گھر کے کاموں میں ہی خود کو الجھائے ہوئے تھی۔ اس کے پاس تو عمر کو مخاطب کرنے کا بھی نام نہ تھا شاید۔

”وہ تو شاید عافیہ کو بھول ہی نہیں پائے۔ میں نے ہی غلطی کر دی۔“ زینبی کو زوروں کا رونا آیا۔

”ختم سے کوئی بات کی ہے اس نے عافیہ کی؟“ امی پریشان ہوئیں۔

”جھگ سے کیوں کریں گے۔ خیالوں میں کرتے ہوں گے۔“ وہ نرمٹھے پن سے بولی۔ تو اس کی سادگی اور معصومیت پر وہ بے ساختہ ہنس دیں۔ پھر سچے لہجے میں بولیں۔

”بڑا صاف دل سے میرا بیٹا! تم دونوں کے درمیان غلط نہیں آگئی ہوں گی بس۔ ورنہ عافیہ تو کب کی ہمارے درمیان سے نکل چکی ہے۔“

”ہاں۔ بڑے صاف دل کا ہے۔“ زینبی جل کر بولی۔ ”کاش کہ ان کی نظر بھی اتنی ہی صاف ہوئی تو پتا چل جاتا کہ اندھے عافیہ سے زیادہ خوب صورت بیوی دی ہے انہیں۔“ عمر اندر داخل ہوتے ہوئے کھنکھار۔

”السلام علیکم۔“

زینبی یوں اپنی پلیٹ پہ جھکی جیسے کافی دیر سے کھانا ہی کھا رہی ہو۔

”کمال تھے تم؟ کب سے انتظار کر رہی ہے تمہاری بیوی۔ بھوکی بیٹھی ہے تمہارے لیے۔“ امی نے خود ہی اس کی خبر لینے کا سوچا تو اس نے اپنی اچھتی نگاہ زینبی کی پلیٹ پر ڈالی۔

”اچھا۔ افسوس ہوا۔ کہیں بھوک بڑھال پہ تو نہیں سے کب کی سو رہی؟“

زینبی کو صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی بھری پلیٹ پر نظر کیا جا رہا ہے۔ وہ جیز ہوئی۔ مگر اس سے اتنی بے تکلفی ہی کب تھی کہ کوئی جواب دیتی۔

وہ اب امی کی ڈانٹ کے جواب میں کلام کی لڑائی اور مصروفیات کا رونا روتا رہا تھا۔

زینبی کھانا ادا چھوڑ کر تیزی سے وہاں سے گئی۔ دونوں ماں بیٹے اسے دیکھا۔

”جاؤ۔ لے کے آؤ اسے۔ کھانا بھی دھونکے۔ نہیں کھایا اس نے۔“

انہوں نے گھر کا گرمی سانس بھرتے عمر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ جہاں ایک ماہ سے وہ اپنے رہائش پذیر تھے۔

وہ کمرے میں آیا تو وہ بیڈ پر بیٹھی گھنٹوں پر ٹھوکی نکالے بیڈ شیٹ کے زیر اس پر ان کی پھیر رہی تھی۔

”شکر ہے۔ میں تو سوچ رہا تھا۔ جاگتے ہی آنکھوں کے دریا کو بار کرنا پڑے گا۔“ عمر کے لب و لہجے میں موجود بے تکلفی نے زینبی کو چونکایا۔

”ہاں۔ آپ نے کون سی کسر اٹھا رکھی ہے رلا لے کی۔“ ثار انہی سے بولی۔

”اور تم نے دل جلائے کی۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

”میں نے۔ کب؟“ زینبی نے احتجاج کیا۔

”اس روز۔“ فون پہ کہہ رہی تھیں شاید اپنی دوست کو۔ عاقب سے نکلتے ہوئے کا دھک۔ ”وہ یا دھلا ہوا تھا۔ زینبی مجبور ہوئی۔

”وہ تو یوں ہی۔ آپ کو جلانے کے لیے مجھے تو بس نکاح کا شوق تھا۔ آپ سے ہو گیا تو نمک ہے۔“ عمر کا دل سینے میں لوٹ کر رہ گیا۔

یہ سادگی اور معصومیت۔ مگر گرجتی کے انداز۔ ”چھپے تین ماہ سے ہر پلٹے میں بھاری تھی۔“

”تو نکاح کے بعد کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں محترمہ۔“ عمر نے مسکراہٹ دی۔

”آپ نے کون سے اپنے فرائض ادا کر دیے ہیں۔“ وہ بے اختیار بولی پھر عمر کو دیکھ کر زبان دانتوں تلے دبائی مگر اس کا قصہ بدل چل کر گیا۔

”آپ تو بس طفرے کے تیر چلا سکتے ہیں۔ مجھ پر۔“ وہ بے اثر کر چلوں میں پاؤں پھسلنے لگی۔

عمر نے اپنی تمام تر ذہنی دلی آملگی کے ساتھ اس

ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ پچھلی ڈال کی طرح اس کے ساتھ آگئی۔

”تم بھی چلا تیر کچھ اپنی نظروں کے کچھ قاتل اداؤں کے۔“ اس کی وحشت سے پچھلی آنکھوں میں جھانکنا وہ مخمور انداز میں کہہ رہا تھا۔ زینبی کی جان ہوا ہونے لگی۔

”وہ۔ آپ تو عافیہ سے۔“

”شش۔“ اس نے اپنی انگلی زینبی کے نرم و گلابی ہونٹوں پر رکھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”اس بل۔ صرف میں اور تم۔“

”تو۔ پھر کھانا۔ کھا آئیں؟“ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔

”یہ خشک ہوتے حلق کے ساتھ منہ مانی۔ تو وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ زینبی کو لگا اس کی زندگی میں بھی ہمارے پھول کھل گئے ہوں۔“

\*\*\*

زینبی خوش تھی۔ بے حد خوش۔

گزری رات اس کے دامن کو خوشیوں سے بھر گئی تھی۔ عمر وہ قاتل نخیر لگنے والا شخص۔ جتنا اس کی کسی کوشش کے یوں اس کا ہوا تھا جیسے صدیوں سے اسی کا ہو۔

مگر کچھ لوگوں کو خوشیوں اتنی آسانی سے نہیں ملا کرتیں۔ یہ شخص ایک ہفتے بعد کی ہی بات تھی۔

اور یہ ایک ہفتہ اس نے عمر کے ساتھ جیسے خوشیوں کے ہنر ڈالے میں نہ کہ گزرا تھا۔ اس کے دل سے عمر اور ان کے خلاف ہر شکوہ ہر کدورت ختم ہو گئی۔

اس کو عمر کے ساتھ اس کے کسی کو لیک کے ہاں بچا جانا تھا۔ کج اس کا آف ڈے تھا کہ وہ جانے کہاں نکلا ہوا تھا۔

ڈور تیل بجی تو زینبی میگزین بند کرتی سیدھی ہو بیٹھی۔

”جہاں میں یہ کہیں رہ گئے۔ اور باہر شاید کوئی آیا

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہال آگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- سر درد، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 لاری بونوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں ہذا یہ کوئی مقدار میں تیار ہوتا ہے یہ بازار میں ایک دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کر سکتی ہیں۔ یہ ایک بول کی قیمت صرف = 100/- روپے ہے۔ دوسرے شہروں سے بھی آؤر بھیج کر جھڑا پارل سے عکوالیں رجنری سے منگوانے والے بھی آؤ اس حساب سے بگوا کریں۔

2 بوتلوں کے لئے = 250/- روپے

3 بوتلوں کے لئے = 350/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچہ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈو بھجئے گئے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس۔ 53۔ اورنگزب مارکیٹ، ریکٹر فور ایم اے جناح روڈ، کراچی  
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس۔ 53۔ اورنگزب مارکیٹ، ریکٹر فور ایم اے جناح روڈ، کراچی  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021



”وہ خود گلابی کرتی بستر سے اتری۔  
ایک نظر ڈر تنگ خیال کے آئینہ میں اپنا حلیہ  
دیکھا۔

پہلے کلر کاسفید کر ڈھائی سے مزین لباس بے شکن  
تھا۔ کانوں میں سفید گول والے بندے اور ان ہی کے  
ساتھ کی خوب صورت سی بالاس کی لمبی گردن کے گرد  
خوب صورتی سے لپٹی ہوئی تھی۔ یہ عمر کا اس کے لیے  
پہلا تحفہ تھا۔ اور اس کے ساتھ واہنی گلابی میں پینا  
وائٹ گولڈ کا انگن جو سفید گول سے مزین تھا۔ اسے  
خود پر نہیں۔ عمر کی زین پر پیار آیا تو وہ مسکرا دی۔ باہر  
سے اونچی آوازیں آئیں تو وہ خیالوں سے چوگی۔  
”نجانے کون آیا ہے۔“ وہ تیزی سے باہر نکلی۔ مگر  
پھر آنے والے کو دیکھ کر جیسے اس پر بجلی ہی گر پڑی۔

اسی سے لپٹ کر چٹکوں پہنکوں روئی عافیہ۔ زین  
کو لگا اس کے گھر کی چار دیواری کو سیلاب کی تند و تیز  
لہروں نے چھو لیا ہو۔ اسی بے حد خاموش تھیں۔  
زین کو دیکھ کر عافیہ لمحہ بھر کو توساکت سی رہ گئی۔ پھر  
ترپ کر اٹھی اور آگے بڑھ کے زین کے گلے لگ  
گئی۔ مگر زین کے ہاتھ اسے لپٹانے کو اٹھ نہ پائے  
تھے۔

”بس کرو عافیہ۔ بند کرو روتا۔“ امی کی ٹھہری آواز  
پر وہ زین کو چھوڑ کر پٹی اور رومال سے آنکھیں صاف  
کرتے ہوئے مظلومیت بھرے انداز میں بولی۔  
”کچھ اپنے گناہ تو دھو لینے دیں خالہ۔ ندامت کے  
آنسو ہوں سے غلطیوں کے نشان مٹیں گے نہیں مگر  
شاید ہلکے ہو جائیں۔“

لگ رہا تھا وہ زمانے کی ٹھوکر کھاکے آئی ہے۔  
”اکثر جو لوگ زمانے کو اپنی ٹھوکر میں جھٹتے ہیں زمانہ  
ان ہی کو ٹھوکر میں پر رکھ لیا کرتا ہے۔“ زین نے سوچا۔  
”زین۔ پانی لاؤ عافیہ کے لیے۔“

اسی نے اس سے کہا۔ تو وہ جلدی سے کچن کی طرف  
بڑھی۔ وہ تو خود وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ ملازمہ  
کے ہاتھ کو لٹو ڈٹک بھجا کر وہ وہیں کاونٹر سے ٹیک لگا  
کے کھڑی ہو گئی۔

”ہمت غلط کیا تھا میں نے خالہ! سب کالیں عمر  
مٹی میں ملا دی ہیں۔“ ہمت پچھتاوا ہے میرے  
میں خالہ ہمت۔ اپنی زندگی برباد ہوئی تو فلسفہ زندگی  
میں آیا۔“

عافیہ کی جذباتیت بھری رندھی ہوئی آواز زین کی  
مٹھی میں گر رہی تھی۔

امی خاموشی سے سن رہی تھیں۔ جبکہ زین کا جی  
رہا تھا۔ وہ عافیہ کی طبیعت صاف کر دیں۔ اسے طے  
دیں ڈیل کر دیں۔ کیسے شادی کے روز وہ دو گھروں کی  
عزت واؤپ لگا کے بھاگ گئی تھی۔ مگر وہ شاید بھائی  
سامنے پا کر اس کی جذباتیت کا شکار ہو چکی تھیں۔  
خاموشی سے اس کے آنسو پونچھتی اور صبر کرنے کی  
تلقین کر رہی تھیں۔

زین اب کب تک کچن میں چھپی رہتی حالات کا  
سامنا کرتا ہی تھا۔

”یہ میرا گھر ہے عافیہ کا نہیں۔ یہاں ماکن میں  
ہوں اور وہ فقط ایک مہمان۔ ان چاہی بہن چل  
مہمان۔“  
وہ خود کو یاد دلاتی مضبوطی کا درس دیتی باہر نکلی۔  
اس نے اسے دیکھتے ہی یاد دلایا۔

”مجھے تم کا وہ محسوس ہو رہی ہے زین! اور وہ اچھا  
لگتی ہے مجھے۔“

وہ ان کا مطلب سمجھ کر ان کا ہاتھ تھام کر انہیں  
کمرے میں لے آئی۔ پانی کا گلاس بھر کے انہیں چھل  
اور ان کی دوا نکال کے دی۔ دوا کھا کر وہ لیٹ گئیں۔  
”تمہارا آرام کروں گی میں۔“

زین مضطرب سی پٹی۔

”تم پریشان ہو رہی ہو؟“ امی کی پرسکون آواز نے  
زین کو کھیر میں مبتلا کیا۔

”آپ نے اس سے پوچھا نہیں کہ یہاں کیوں آئی  
ہے؟“

”مہمانوں سے ایسے نہیں پوچھا کرتے۔ وہ تو تنہا  
ہی جانے کے لیے ہیں زین۔“ انہوں نے اطمینان  
سے کہا تو لمحہ بھر انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ

دکھ جاکر اسے کھانے کا پوچھو۔ سفر سے آئی ہے۔  
دعوت میں جاتے ہوئے اسے میرے کمرے میں  
چھوڑ جانا۔“ امی کے کہنے پر وہ سر ہلا کر باہر گئی۔ جہاں  
عافیہ اب قدرے پرسکون حالت میں اوپر اوپر ٹھہر کر  
اس شاندار گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔  
زین کو دیکھ کر رشک و حسد کے طے انداز میں  
بولی۔

”تم نے ہمیشہ ہی میری اترن پر عیش کیا ہے۔“  
زین کی رنگت زرد پڑ گئی۔  
وہ کچھ دیر پہلے والی حالات کی ٹھوکر کی زد میں آئی  
عافیہ سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

بالکل نئی امی کے گھر والی عافیہ۔ نخوت زدہ انداز  
اور کمینگی کی حد تک فقط ”ایسا“ ”سوچنے والی۔“  
”میں کمرے سے چلی گئی تھی اس دنیا سے تو نہیں کہ  
تم نے جلدی سے عاقب کو چھوڑ میرے منگیتر سے  
نکل چڑھ لیا۔“ وہ پچھکاری۔

زین نے ہوش سے عافیہ کے رعب میں اس سے  
دب کر زندگی گزارنی تھی۔ اس کے پرانے کپڑے  
جو تے پہنے والی اس کے سامنے بھلا کیا پوچھتی؟ ہاں دل  
ہی دل میں اس کے خلاف محاذ باریک جنگ لڑتی رہتی۔  
مگر اب تو عافیہ حد ہی کر رہی تھی۔ اس نے ہمت جمع  
کی۔

”مگر اب وہ تمہارا منگیتر نہیں ہے۔ مت بھولو کہ  
اس وقت میں ہی تھی جو دونوں گھروں کی عزت بچا سکتی  
تھی۔“

”مثلاً؟“ وہ غرائی کی عیش و آرام کی  
ہلکی سی جھلک نے ہی اسے پاگل کر ڈالا تھا۔ ”کیا  
ہو سبابت واپس آ جاؤ؟ بناؤ کہیں کے“ سو داٹ؟ میں  
آج نہ سہی دل واپس آتی تو بھی عمر میرا انتظار کرتا۔  
اب اس وقت گزار چکے ہیں ہم اکٹھے۔“ وہ بے حیائی کی حد  
پر گئی۔

زین کے پردہ پہن پر صاعقہ بھائی کی کسی باتیں تازہ  
ہوئیں۔

”وہ سب ماضی کی باتیں تھیں عافیہ! عمر کا حال میں  
ہوں۔ اور ماضی بھول جانے کے لیے ہی ہوا کرتا ہے۔  
خاص طور پر سیاہ ماضی۔“ زین نے خود کو مضبوط بنائے  
رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے لمبے لمبے سخی بھری۔  
”کیوں بند کرو۔“ آنے دو عمر کو۔ پھر دیکھا کون حال  
ہے۔ اور کون ماضی کا قصہ بناتا ہے۔ ایسے ایسے قصے  
بتاؤں گی تمہارے اور عاقب کے کہ۔“

وہ شیطانیت بھرے انداز سے مسکرا کر حملہ آور  
چھوڑ گئی عمر زین کے وجود میں خوف آمیز سنسنہا ہٹ ہو  
گئی۔ وہ عافیہ کا مطلب اچھی طرح سے سمجھ گئی تھی۔  
”میرا عاقب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس سے  
میرے نکاح کی خواہش ناپی لہاں کی تھی۔“

زین کو روتا آیا۔ عافیہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ عافیہ  
محظوظ انداز میں مسکرائی۔  
”یہ تو میں جانتی ہوں تا عمر تو ہی سنے گا جو میں کہوں  
گی۔“

”خدا کے لیے عافیہ! اپنی زندگی تو بسا چکی ہو میرا گھر  
کیوں تباہ کرنے آ گئی ہو۔ جو پہلے ہی بڑی مشکلوں سے  
بسا ہے۔“

زین کے آنسو رواں ہو گئے وہ بے بسی کی انتہا پر  
تھی۔

تین ماہ پہلے ماں باپ کی عزت واؤپر لگا کر جانے والی  
بھلا اس کی عزت سے چھلنے کا ہے کو پچھلے گئی؟

”یہ میرا گھر ہے زین۔ تم صرف ایک صاحب ہو اور  
بس۔ یہ سب وہ ہے جس کے لیے فیصل کی طرف  
دوڑی تھی۔“ سرشاری سے کہتے وہ ہاتھ دائیں بائیں  
پھیلا کر گھومی۔

”مگر وہ ذلیل کو نکلا نکلا۔ مجھے کیا پتا تھا یہ سب مجھے عمر  
کی قسمت سے ملنے والا ہے۔“ وہ متاسف ہوئی۔ پھر  
اطمینان سے بولی۔ ”خیر۔ ابھی بھی کون سا کچھ بگڑا  
ہے۔“

”چلی جاؤ یہاں سے عافیہ۔ میں تمہیں اپنی زندگی  
جہاں کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“ وہ سرسراہٹ آواز  
میں بولی۔ عافیہ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ٹھیل

گئی۔  
”ہونہ۔“ ہمیں تو عادی ہو جانا چاہیے تھا اب تک جانتی نہیں ہو میری عادت کو۔ ہمیشہ میری اترن پہنی ہے تم نے۔ مگر جب وہ چیز تم پر پہنچی تو میں نے واپس لینے میں ایک منٹ نہیں لگایا۔ اب عمر کو کیسے چھوڑ دوں تمہارے ساتھ۔“  
اس کے سفاکانہ انداز پر زینی کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

اسی وقت عمر اندر آگیا۔  
وہ اپنے وہیمان میں ہمیشہ کی طرح سلام کرتا آتا تھا۔ زینی نے بے ساختہ عافیہ کو دیکھا جس کے اثرات بیکسر بدل گئے تھے۔

”عمر۔“ بے حد جذباتی انداز میں اسے پکارتی وہ آگے بڑھی اور عمر کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیسے ہو تم۔؟“  
عمر سادگت سنا عافیہ کو دیکھ رہا تھا۔  
زینی کا دل کسی نے مٹھی میں بکڑ لیا۔

سامعہ نے کہا تھا عمر کے دل پر عافیہ کا سایہ ہے۔ تو کیا وہ پھر سے کوئی متر پھوٹنے والی تھی؟

”مجھے معاف کرو عمر! دیکھو تمہاری محبت کتنی طاقت ور ہے ایک دن بھی سکون سے نہیں گزار پائی میں تمہارے بغیر۔ پس کسی کے ہنگامے میں آگئی تھی۔ تم سے دور تھی نا اسی لیے۔ کسی نے میرے معصوم جذبات کا رخ اپنی طرف موڑ لیا۔ مگر اس دل سے تمہاری تصویر اتر ہی نہیں پائی۔ ٹھکرا آئی ہوں میں فیصل کی نام نہاد محبت کو۔ تمہاری محبت جیت گئی عمر۔“

وہ جب زین بھی تھی اور اداکارہ بھی۔  
آنکھوں میں آنسو بھرے بڑے درویشے انداز میں تین ماہ کی ”داستان حیات“ سنا رہی تھی۔ عمر نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور نرمی سے بولا۔

”میں زینی سے شادی کر چکا ہوں۔“  
”تو کیا ہوا۔“ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں بھی تو فیصل کو چھوڑ کے تمہارے پاس آئی ہوں۔ تم بھی اسے چھوڑ دو۔“

یہ زینی کا گھر تھا اور وہ اس وقت وہاں مقبول کی طرح کھڑی تھی۔  
”اور زینی کا کیا ہو گا؟“ عمر کا سوال سن کر زینی کاچپ آنسوؤں سے بھینکنے لگا۔  
اب وہ بھلا کسی اور سے محبت کر پائے گی۔ زینی کے معصوم بے ساختہ محبت کو برتنے کے بعد بھی وہ سوچنے سے یہ سوال کر رہا تھا۔  
زینی کھڑے کھڑے مرنے لگی عافیہ قافرخسے مسکرائی۔

”اس کی تم فکر مت کرو۔ وہ میرا مسئلہ ہے۔ عافیہ میری بات بھی نہیں ٹالے گا۔ اور وہی زینی۔ تو اسے سدا سے میری اترن کی عادت رہی ہے۔ حتیٰ کہ شادی بھی میرے پھوڑے ہوئے منگیتر سے کر لی۔“  
عافیہ کو عمر بے وقوفی کی حد تک سیدھا سادہ لگا کر تھا۔ تب ہی اسے یہ زعم تھا کہ عمر اس کی غلطی کو معاف کر کے اسے اپنانے میں دیر نہیں کرے گا۔  
”لیکن میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے عافیہ!“ وہ شکر سا بولا۔

”وہ کیا۔؟“ عافیہ طمانیت سے مسکرائی تو عمر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اتنی دیر میں پہلی بار مسکرایا۔  
زینی نے اذیت محسوس کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

”وہ یہ کہ۔“ مجھے کسی کی اترن کی عادت نہیں ہے۔“  
عافیہ کو لگا اس کے آس پاس زوردار دھماکا ہوا ہو۔ عمر کے ایک ہی جملے نے اس کی ذات کے پر پھٹنے لگے۔

”ہانا کہ تم اپنی استعمال شدہ چیزیں زینی کو دیتی رہی ہو۔ مگر تم نے بھی یہ سوچا کہ وہی چیزیں زینی سے واپس لے کر تم بھی اس کی اترن پہنتی رہی ہو؟“  
وہ تحقیر آمیز انداز میں اسے اس کی اوقات دکھا رہا تھا۔

زینی کے آنسو تھم سے گئے عافیہ بے یقینی سے

کو دیکھ رہی تھی۔  
”میں نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تمہاری بد کرداری کو بھول کر تمہاری چند دفتوں کی محبت کو یاد رکھوں گا؟“  
عمر کے انداز میں ان کے لیے حقارت تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے زینی کے شانے پر بازو بچھلاتے ہوئے اسے خود سے قریب کیا تو وہ بے اختیار اس کے شانے سے لگ کے رو دی۔

”یہ وہ لڑکی ہے جس نے تمہاری اڑائی ہوئی بے غیبتی کی دھول کو اپنی فریاد برداری کے پانی سے دھو ڈالا۔ چاہے اسے عاقب سے محبت تھی یا اس کا نکاح اس کے ساتھ طے تھا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس نے اس وقت میری عزت کو سنبھالا دیا جب تم نے نہ میری عزت کپاں رکھا اور نہ اپنے شریف ماں باپ کی۔“

وہ جیسے مگر شعلہ بار بجے میں پھنکا رہا تو عافیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔  
”میری لیے تو فیصل کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے میں نے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے عمر۔“

”غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو جانے اپنے والدین سے معافی مانگو۔ میری زندگی کی تصویر مکمل ہو چکی ہے۔ یہ سب شبن و شوکت زینی کے نصیب سے ہے۔“ وہ بے زنی سے بولا۔

کتنی دیر خاموشی چھائی رہی تو اس کے شانے میں منہ دے کھڑی زینی نے سر اٹھکے دیکھا لاوارج خالی تھا۔ عافیہ کا سوٹ کیس بھی عتاب تھا۔ وہاں سے ناکام دنا سر ادا ہو چکی تھی۔

بے اختیار عمر کو دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ جینین کر چپے ہوئی۔ دینی دینی آنکھوں کے ساتھ وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔  
”وہ چلی گئی؟“ بے یقینی سے پوچھ کر سری سانس بھرے عمر نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر اپنے سامنے کیا اور مسکرا کر بولا۔

”اگے جانا ہی تھا۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ جس کا محل آٹا شان دار ہو وہ تاریک ماضی کو یاد رکھ کے

کیا کرے گا۔“ وہ بھولپن سے بولا۔ زینی سنبھل گئی۔  
”اور وہ کیا کہہ رہی تھیں تم امی سے۔ کہ اگر اللہ نے دل کی طرح مجھے نظر بھی صاف دی ہوتی تو پتا چلتا کہ عافیہ سے زیادہ حسین بیوی لی ہے مجھے۔ ذرا پاس آؤ۔ دیکھو تو سہی۔“

وہ مزید بولتے ہوئے قریب ہوا تو زینی کا بے اختیار تقصیر ہواؤں میں بکھر گیا۔ وہ کئی موقعوں پر اس کی گھٹگو سن چکا تھا۔ وہ مطمئن تھی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ عمر کے دل کے تمام موسموں پر اب اسی کی حکمرانی ہے۔

اور ادھر بسنے میں شرابور رکشے کے انتظار میں کھڑی عافیہ اپنی زندگی کی بازی دو سری بار بار کے دوفی ہوئی واپس جاری تھی۔

اسی زندگی کی طرف جس کے راستے اس نے خود تلاش کیے تھے کہ خدا بھی بھٹکے ہوؤں کو تب تک راستہ نہیں دکھاتا۔ جب تک کہ خود ان کے دل میں صحیح منزل تک پہنچنے کی لگن نہ جاگے۔

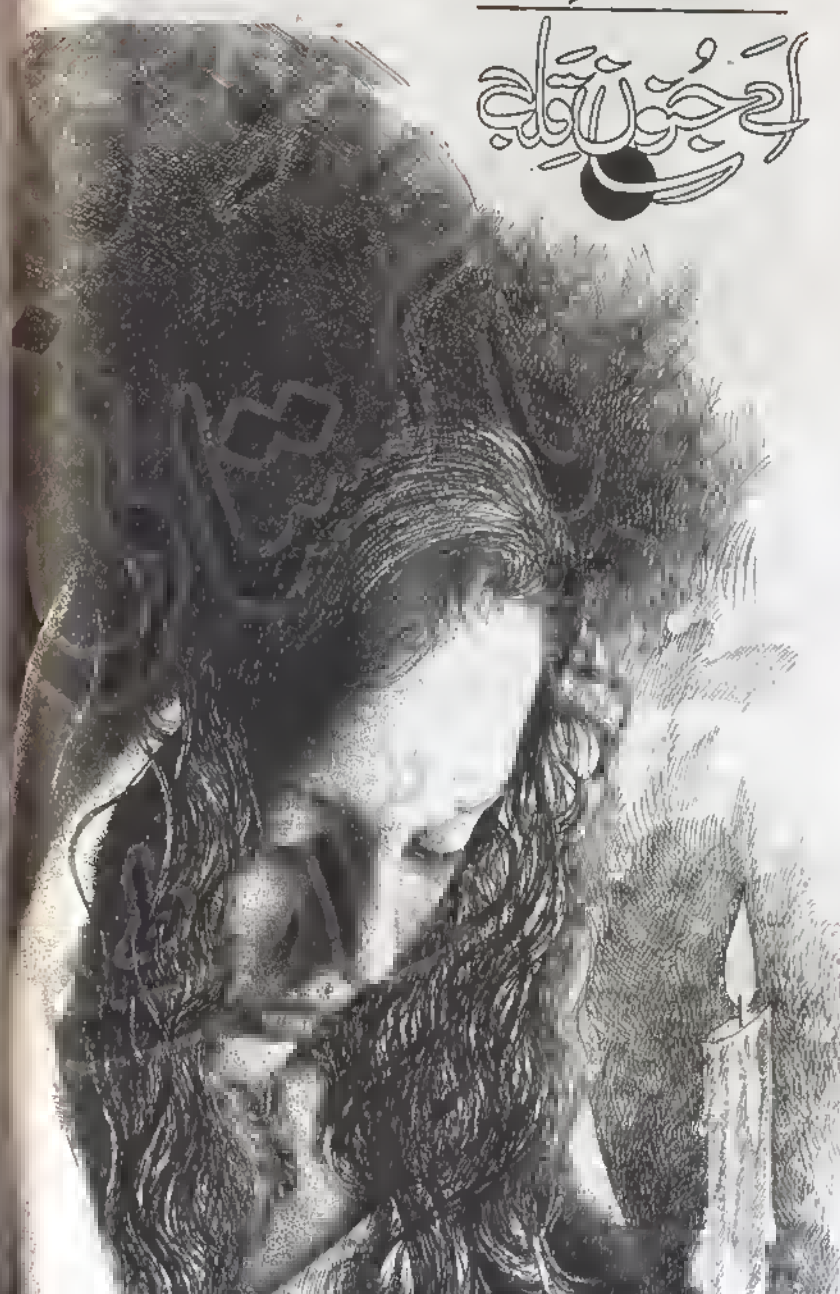


ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37 اردو بازار کراچی  
فون نمبر: 32735021





آج پھر اس کی گاڑی بڑے سے سیاہ آہنی گیٹ کے پار کی۔ چونکہ اس کو اپنے کانڈلات دکھا کر وہ اندر جانے کی اجازت طلب کرنے لگی اور اجازت ملتے ہی ہیش کی طرح تیزی سے آگے بڑھی۔ سامنے چوڑی سی لمبی سڑک تھی جو سرخ اینٹوں سے بنے کھلے سے برآمدے تک پہنچ کر ختم ہو رہی تھی۔ برآمدے میں لوگوں کا معمولی سا جھوم تھا۔ وہ بھی جھوم کا حصہ بن گئی اور تمام کارروائی پوری کرتے ہوئے اپنی مطلوبہ بیرک تک پہنچ گئی۔

وہ دونوں ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک دوسرے کے روزہ لکڑی کی تخت کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ وہ آج پھر اپنی پرانی آفرے کر آئی تھی۔ مدبرہ بہت عرصے سے اسے ایک ہی بات کے لیے قائل کر رہی تھی۔

”رضیہ! یلینا جان جاؤ۔ آخر تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ اس معصوم کو دیکھو، اس کا کیا قصور ہے؟ اس کے حصے میں کھلی فضا کیوں نہیں ہے۔ اس کا بھی تو آزاد آسمان پر حق ہے۔ پلیز رضیہ! ایئر لیٹین کرو میں اسے تعلیم دلاؤں گی، جینا سیکھاؤں گی۔ خدا کے لیے اس کے مستقبل سے مت کیلو۔ اسے دوسری رضیہ مت بناؤ۔“

اس کی مسلسل درخواست پر رضیہ کی نگاہیں اس کے چہرے سے نہیں اور معصوم بچی پر جا تھیں۔ ذرا دیر بعد اس کا وہ معصوم ہی بچی اس کی گود میں لیٹی اپنے ہاتھوں سے کھیل رہی تھی۔ وہ بھی رضیہ کے بچپن میں منہ چھپاتی تو بھی اس کے دوپٹے میں پھر فوراً ”چہو سامنے کر کے نور سے ہستی۔ غالباً“ وہ رضیہ کی توجہ جاننے کے لیے ہنس رہی تھی مگر کم صبر رضیہ رضیہ مسلسل اپنی گود میں پڑی بچی کو تنے جا رہی تھی۔ رضیہ نے بچی کے ہاتھ سے اپنا دوپٹا آہستہ سے چھڑوا کر اس کی ہتھیلیاں پھیلائیں اور پھر اپنی ہتھیلی اس کے ہاتھ جوڑ کر جانے کیا تلاش کرنے لگی۔ وہ اس بات سے بالکل انجان بنی تھی کہ مقابل اسے کیا سمجھا رہا ہے۔ رضیہ نے بچی سے نگاہیں ہٹا کر ذرا اسے

دیکھا۔ کیوں کہ وہ اب خاموش ہو گئی تھی اور یقیناً ملاقات کا وقت بھی ختم ہونے والا تھا۔ رضیہ اس کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے جانے لگیں۔

\*\*\*

”رجی سنی رتی۔“

لکڑی کی لونی بھونپتی برائے نام کھڑکی پر مسلسل دستک کے ساتھ مدھم سرگوشی ہو رہی تھی۔ یہ کھڑکی گھر کے پچھواڑے تنگ سی گلی میں کھلتی تھی۔

میتو کو پورا یقین تھا کہ رچی کھڑکی کے قریب ہی کہیں ہوگی۔ اسی لیے وہ ہلکی سی آواز کے ساتھ معمولی دستک دے رہا تھا۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ وہ کھڑکی کے ساتھ چارپائی جوڑے دنیا و باقیہا سے بے خبر پڑی سو رہی تھی مگر جیسے ہی دوسری سرگوشی کان کے پردے سے لگائی وہ ہڑبنا کر اٹھ بیٹھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے سوکھی کھاس جیسے بھورے بیل ہاتھوں سے جھاتے ہوئے کھڑکی کے قریب آئی۔

اس نے کھڑکی کی چڑچاہٹ روکنے کے لیے احتیاط سے ہاتھ جھا کر کھڑکی کھولی۔ لوہے کی سلاخوں کے سامنے میتو سا نیکیل جوڑے کھڑا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملتے ہی نہ صرف چوڑے ہر مسکراہٹ آگئی بلکہ آنکھوں میں خواب مچلے اور ہونٹوں پر گلاب بھی جلنے لگے تھے۔

”رک۔“ وہ ہاتھ سے اسے رکنے کا اشارہ کرتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ کھلے کچن میں جاسن کی ٹھنڈی چھاؤں تلے اس کا باپ منہ پر صافہ رکھے سو رہا تھا۔ ایک کونے میں اس کی ماں چولے سے سر کھپا رہی تھی۔

رجی نے چپل اتار کر ہاتھ میں لی اور دو بے پاؤں چلے بیرونی دروازے کی طرف پہنچ گئی۔ بغیر آواز پیدا کیے کھڑکی کھولی اور باہر گلی میں نکل آئی۔

پچھلے سے دروازہ بند کرنے پر آہٹ پیدا ہوئی جس پر اس کی ماں چوکی۔

”رجی سنی رتی سنی کڈے منی امہ۔“



وہ اسے آواز میں کستی دروازے تک آئی۔ باہر گلی کے دونوں جانب بھانکا مکروہاں نہ رہی تھی نہ اس کا نام نشان۔ وہ باہر چھا سکتے ہوئے اسے مسلسل کوٹنے لگائیں دیتی رہی تھی مگر رچی کی جانے بلا۔ وہ تو اپنے میتو سے ملنے گئی تھی۔ جو صرف اس کا تھلا صرف اور صرف اس کا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں ملنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ نہ اس کا غصیل باپ نہ ڈھنکی ماں۔

میتو رچی کا پھوپھی زاد اور بچپن کا منگیتھا تھا۔ ان کے گھر زیادہ دور نہیں تھے صرف چند گلیوں کا فاصلہ تھا اسی لیے ہر وقت آجاتا ناگہ ریتا تھا۔ یہ علاقہ حاصل پور کا نواحی تھا اور کلنی پسماندہ علاقہ تھا۔ اکثریت غریب غریا کی تھی۔ کھلے کھلے صحنوں میں دو تین درخت اور ایک دو کمرے ہی بنے ہوتے تھے۔ وہ دونوں ان صحنوں میں بل کر جوان ہوئے تھے۔

درختوں پر چھٹا، کھلی ڈنڈا، اسٹاپو پیٹھ گرم، غائر دوڑانا لڑکے لڑکی کافی فرق کیے ہمیشہ ساتھ کھیلنے تھے۔ میتو نے سائیکل چلائی سیکھی تو نہ صرف رضیہ کو سکھائی بلکہ اسے بٹھا کر پورا علاقہ بھی گھمایا۔ اور پھر یہ ان کا معمول بن گیا۔ وہ چھٹی لاتی دوپہر میں چوری سے باپ کی سائیکل نکالتا، رچی کو ساتھ لیتا اور حاصل پور کے نواح میں بنے قلعوں کی سیر کو نکل کھڑا ہوتا۔

سنانے میں بنے یہ چوڑی سرخ اینٹوں کے قلعے ان کی اونچی اونچی فصیح فصیح سفید سنگ مرمر کے محلات اور بارہ جن میں چھوٹے بڑے کئی فوارے نصب تھے۔ فواروں میں اچھلتا سفید ٹھنڈا پانی دیرانے میں اسے سیر کھیرتا، ان دونوں کو بہت متاثر کرتا تھا۔ وہ کئی کئی گھنٹے اس فوارے کے گرد بیٹھ کر مرمر کی دیوار پر بیٹھ کر گزارتے۔ اب بھی وہ اس دیوار پر بیٹھے دونوں پانی پانی چڑھائے تالاب کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ہلاتے تھے۔

”میتو! پاؤں ہلاتے ہوئے رچی دھیرے سے بولی۔  
”ہوں۔“ میتو نے سرسری سا کہا۔  
”میتو! مجھے بہت خوف آتا ہے۔“

میتو کے ہلنے پاؤں رک گئے۔ ”کیوں؟“  
”مگر وہ سب نہ ہوا جو تیری سیری چاہ ہے تو میرے میں تو مڑھاؤں گی قسم!“ وہ آنسو بھر کر بولی۔  
”میرے تیرے دسم۔“ وہ جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بولا۔  
”تو میری منگیتھی ہے۔ بچپن کی عمر تجھے مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکا۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔“

وہ نفی میں سر ہلاتا اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کی طرف کودا۔

”میتو! میں تیرے ساتھ کسی اور کو نہیں دیکھ سکتی میری سارہ رک جانے کی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے ہوئے بے بسی سے بولی تھی۔

”رچی! یوں نہ کہنا کہ محبت کو محبت ہی رہنے دے۔“  
پاگل پن نہ بنا۔ ”وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سائیکل کی طرف بڑھتے ہوئے رسلان سے بولا۔ ”تالاب! اسے گھر جانے کی فکر ہوئی تھی کیوں کہ فوارے کے ٹھنڈے پانی میں لہراتے اونچے پام کے درختوں کے چچ چھلکے سورج کا عکس جھللاتے ہوئے گم ہونے لگا تھا۔

یقیناً ”گالیاں اگلا اس کا اپنا تار بیٹھا ہو گا اور جانے ہی جو تیروں سے نوازے گا کہ سائیکل کہاں لے گیا تھا۔ اگر چوری یا بچکر ہو جاتی تو میتو تار کھا کر بیٹھراں کے پاس سر نیسوار کر بیٹھ جاتا۔ وہاں تھی۔ اسے بچکارے کی روٹی دے گی اور تنبیہ بھی کرے گی۔“ سارا سارا یہاں اس نے لٹی پھر کر جھلیا! ”مگر اس پر کسی تنبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

رچی کی طرف بھی یہی صورت حال تھی۔ اس کی گھاس جیسی چٹیا کو نذر اس اتنے جھٹکے دیتی تو آج جڑ سے نکل دے گی۔ کمر بڑھو کے برساتی مگر چند دن بعد سب بے کار جائے وہ پھر اس کے ساتھ نکل نکلتی ہوئی۔

آج بھی وہ بلج کی سیر کر کے مغرب کے بعد گھر پہنچے تھے۔ معمول کی طرح آج انہوں نے نہ مار کھائی نہ ڈانٹ نہ پھٹکار۔ بلکہ آج کچھ الگ ہو گیا تھا۔ انوں کے جھرمٹ پر راج و حلائی جاتا پورا چاند لہن کی خوش

رقص تھا۔ رات کے بڑے سے چھپن کر آتی چاندنی بدھم سرول میں سرکوشیاں کرنے لگی۔ آج اس کی پھوپھی باپ کی کرنے لگی ہوئی تھی۔  
رچی کا دل چاہتا تھا کہ لڑکیاں ڈالے اور وہ ڈال بھی لیتی کیوں کہ وہ ایسی ہی تھی۔ اگر اسے ماں اور باپ کی مار کا ڈر نہ ہو تو یقیناً ”اسے کل کا نکلت مل جائے گی۔ اسے وہ سب مل گیا تھا جس کی اس نے چاہ کی تھی، جس کے بغیر نہ وہ جی سکتی تھی نہ مر سکتی تھی۔ اس کی ہر دعا اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی۔

زندگی خوبصورت ڈگر پر رواں تھی۔ میتو اپنے باپ کے ساتھ اینٹوں کے بچھے پر کام پر جانے لگا تھا اور رچی کبھی فصل کی کٹائی پر بھی چلا جاتا۔ وہ سال بھر کا اناج جمع کر لیتا تھا۔ رات کو دونوں باپ بیٹا گھر آ جاتے۔ چاند کی شہری کرنوں سے غسل کرتے مٹی کے صحن میں چارپائیاں بچھائے پورا خاندان اکٹھے سوتا تھا۔ پھر سورج کی شعلوں پھونکنے ہی معمول کی زندگی آگے بڑھنے لگتی تھی۔

دن رات آگے پیچھے بھاگتے چار سال ہو گئے تھے مگر ان کے کچے آنگن میں کوئی قلعاری نہیں کوٹھی تھی۔ بیٹھراں نے رچی کا دائیوں سے بہت علان کر دیا۔ مٹی میں چڑھائیں مگر سب نے کار ہو کر نظر آتا تو بیٹھراں کا قلق شدت اختیار کرنے لگتا۔ وہ اپنی خواہش کی کچھ رمت بہتو میں بھی پیدا کر چکی تھی مگر وہ رچی سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس امر میں اسے قصور وار نہیں کر سکتا۔ نگار بننا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے جہاں ماں کی خواہش کو ٹال جاتا وہاں رچی کو پھر سے امید دلا سے دتا تھا۔



وہ ایک بازو آنکھوں پر رکھے چارپائی پر سیدھا لیٹا رچی سے بکلی پھٹکی باتوں میں مصروف تھا۔ آج کل برسات کی وجہ سے بچھے بند تھے اسی لیے وہ گھر پر تھا۔ رچی بھی اسی چارپائی پر اس سے پشت ٹکائے چٹایا باندھ

رہی تھی۔ وہ اس کی باتوں پہ صرف ہوں ہاں سے شامل تھی۔ اس کی تمام توجہ سامنے چلتی کوئل پر تھی۔ جو ڈال ڈال کو کئی موموں کے بدلنے کا تیار رہی تھی۔ رت بدلتی تو کوئلے نئے کھولنے بنانے لگتیں۔ انہیں سنوار تھیں ان کی حفاظت کرتیں کیوں کہ اس میں ان کے اندر بے پایے ہوتے۔

رچی اپنی چٹیا کوئل دیتی مسلسل کوئل کو تک رچی تھی۔ جو انار کے درخت سے پھول نوج نوج کر اپنے گھونٹے میں لے جا رہی تھی۔ انار کے درخت کے قریب ہی اوزار رکھنے کا مٹی سے بنا ہار تھا۔ کبھی کوئل اڑ کر اس پر بیٹھتی اور چونچ بھر کر اپنے گھونٹے میں لے جاتی۔ یقیناً ”وہ اپنے بچوں کے لیے خوراک کا بندوبست کر رہی تھی۔ کوئل کی متادیکھ کر رچی کی آنکھوں میں ایک سرخ میں سی ابھری۔

دروازہ کھلنے کی آہٹ پر اس کی نظر گھونٹے سے پھسل کر پرتی دروازے پر پھر گئی۔ جہاں بیٹھراں کے پہلو میں حلیمہ لہرائی ہوئی اندر آ رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں اپنے دوپٹے کا پلو گول گول گھماتے ہوئے خوش گلیوں میں مصروف آگے بڑھ رہی تھی۔

اسے دیکھتے ہی رچی نے دانت ایسے پیسے جسے منہ کڑوے بادام نے بھر گیا۔ وہ ایسا کیوں نہ محسوس ہوتا۔ اس نے رات کو دل کی گمراہیوں سے کچھ اور دعا مانگی تھی۔ رات جب پورا چاند شہری چاندنی کے ہالے میں تھا۔ جب ٹھنڈی چاندنی میں کھٹکتی مست پروا جس میں انار کے پھولوں کی خوشبو رچی تھی۔ جب رات کی رائی اور چٹیل سے خوشبو چرانا نچرا کھیزوا کا جھونکا ان کے بدنوں میں سنسانا بھر رہا تھا۔ جب ان کا خوبو اختیار نہ رہا تھا تو رات کے اس پچھلے پھر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھتے رچی نے رب سے دعا مانگی تھی۔

”اے سوہنے رب! میری گود بھی بھر دے۔“  
اور دن چڑھے تعبیر حلیمہ کی صورت نظر آئی تو اس کا دعاؤں پر سے یقین ڈگمگنے لگا کہ خوبصورت پھر کی دعا میں قبول نہیں ہو تیں۔ کم از کم اس وقت حلیمہ کو

دیکھ کر تو ایسے ہی لگا تھا۔

رجی نے نفرت سے ناک نہ ٹیڑھا کیا۔  
وہ دونوں جیسے ہی انار کے پیز کے نیچے سے گزریں تو  
کوئل وکیل کراڑی گئی۔ ان کے آگے بڑھتے ہی کوئل  
اپنی شان پر واپس آگئی تھی۔ مگر اب وہاں ایک اور  
چچھی بھی آگیا تھا۔ دونوں برہنوں کی چوچیں کچھ دیر  
لڑیں پھر شاخوں کے پتے ٹپنے سے دونوں ہی سسم کراڑ  
گئے اور کھونسلا شان پر تباہ ہوتا رہ گیا۔

حلیمہ، میتو کی نایا زاد تھی۔ جب سے اس کے  
والدین فوت ہوئے تھے، اس کی اپنے بھائی بھالو جوں  
سے خوب کھڑکی رہتی۔ کچھ اس کی بھالو جیں تیز طرار  
تھیں۔ کچھ حلیمہ ان سے دب باتھ آگے تھی۔ جب  
بات بحث ٹکرا کر سے برہ کر باٹھائی تک آجاتی تو  
بشیراں کو بلایا جاتا۔ وہ جا کر صبح کروائی اور چند دن کے  
لیے حلیمہ کو اپنے ساتھ لے آتی اور ایسا اکثر ہوتا  
تھا جن دنوں بچے بند ہوتے یا پھر میتو کسی وجہ سے گھر پر  
ہوتا۔ آج کل بھی بچے برسات کی وجہ سے بند تھے اور  
میتو گھر پر تھا۔ بشیراں صبح صبح صلح کے بہانے گئی اور  
حلیمہ کو ساتھ لے آتی۔

وہ دونوں ان کے قریب پہنچنے کو تھیں۔ جب رچی  
نے ناگوار "ہو نہ۔" کے ساتھ گرہ لگا کر پرانہ اپنی کر  
پر پٹا اور اندر جانے کے لیے کھڑی ہوئی۔

"بیٹھی رہ گھر جارہی ہے؟" اس کے اٹھنے سے  
چارپائی کا وزن کچھ ہلکا ہوا تو میتو نے آنکھوں پر سے  
ہاتھ اٹھا کر رچی کی کلائی پکڑی اور فوراً "چھوڑ بھی دی۔"  
اس کی نظروں اور حلیمہ پر پڑ گئی تھی۔

حلیمہ سلام کرتے ہوئے میتو کے ہاتھ تک گئی اور  
بشیراں مونہا تھپتھپ کر ان کے مقابل بیٹھ گئی۔ رچی  
کمرے کی طرف مڑی ہی تھی کہ بشیراں زور سے  
بولی۔

"نئی رچی۔ اندر کدے جلنی اے۔ جا جا کے چاء  
چاڑھ دیکھتی سنتیں، پروہی آئی اے۔"  
"زہر نہ چاڑھ وال۔" رچی منہ میں بیڑ پائی ہی تھی  
کہ حلیمہ فوراً "اٹھ کھڑی ہوئی۔"

"نہ چاہی نہ! میں کوئی پروہی سنتیں، اے میرے  
چاچے دا گھر اے نا آپے چاء چاڑھ لاس کی۔"

وہ جتا تے ہوئے چوہے کی جانب بڑھی۔ جہاں  
کی فریاں برداری پر بشیراں اس کی بلائیں لے رہی  
تھی، وہاں رچی حیرت سے منہ کھولے کچھ حلیمہ کی  
اوامیں دیکھتی بھی بشیراں کا منہ۔ وہ تعلقاتی ہوئی اور  
کمرے میں چلی گئی۔

اس کے لیے حلیمہ کا وجود قابل برداشت نہ تھا۔  
جب بھی وہ آتی تھی، بشیراں کی زبان اس کی تعریفوں  
کے بل باندھتی رہتی اور وہ میتو کے گرد منڈلائی رہتی۔  
"میتو! یہ کھانے کی پی پی لے، یہ میں نے بنایا۔" رچی  
کو میتو پر برا تعین تھا۔ وہ جتنی محبت میتو سے کرتی  
ہے وہ بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ واقعی ہر ممکن کوشش کرتا کہ رچی کا دل نہ  
ٹوٹے۔ غصے میں جب بھی بشیراں رچی کو "بھربے بھربے"  
تھیکر، "کتنی تو دھڑلے سے" "ہاں بس کر" کہہ دیتا۔

وہ ہمیشہ رب کی رضا کہہ کر یاں کو نالٹا آتا تھا مگر  
تک۔ اس کا پل اگلی نسل کی خواہش لیے مٹی میں  
مٹی بن گیا تھا۔ اب بشیراں اس کے آگے پیش کرتی

اسے رب کے واسطے دیتی، پھر خاص طور پر بے احترام  
حیتم حلیمہ کا حوالہ دیتی، "اٹو س پڑوس کے کتنے ہی جوان  
گنوا تی جن کے دوسری شادی کرنے پر ہی اولاد ہوتی

تھی اور جو دونوں بیویوں بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی  
رنگی بسر کر رہے تھے اب بھی وہ اسے کتنے دن سے  
قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میتو! میں کون سا رچی کو چھین دی مگل کرنی آتا۔  
تیری ماں ہوں۔ میڈی چاہ وہی تھا، فرض اے۔" میتو  
حلیمہ خوبصورت ہے۔ تیرے سگے چاچے کی دہی

اے۔  
میتو کبھی ماں کی دلیلوں میں پھنس جاتا تو کبھی رچی  
کے زانوؤں پر جو بشیراں کی فرمائش پر ہر دم جھکتے رہتے  
اور جب چلتی پھرتی حلیمہ نظر آتی تو وہ مزید الجھ کر  
جاتا۔

دھک چھپ کا، مکی دادا نے راجادی بیٹی آئی اے۔

آج اب۔  
کچھ محنت میں خاصی ہڑونگ مچی تھی۔ حلیمہ کے  
بچپن میں آٹھ بھائی کھیل رہے تھے۔ میتو چوکی پر  
بیٹھا تھا۔ ٹھنڈوں پر اوپر بازو رکھے بازوؤں پر ٹھونڈی  
کھانے مسلسل بچوں کو دھڑکتے بھاگتے حسرت سے دیکھ  
رہا تھا۔ بشیراں اپنا دل بہلانے یا پھر میتو کی بولی خواہش  
کو اچھارنے کے لیے اکثر حلیمہ کے بچپن میں جتنی بھی  
آتی تھی یا پھر کھلے کے چھوٹے بچوں کو بلاتی تھی۔ بچے تو  
کچھ دیر کھیل کود کر چلے جاتے تھے مگر ان کا آنا شور مچانا  
میتو کو قیقلے تک لے جانے میں خاصا مددگار ثابت ہوتا  
تھا۔

اس نے اپنی چوکی تھپت کر رچی کے قریب کی۔ وہ  
چوہے میں آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔  
"رچی! وہ بچوں کو محبت سے دیکھتے ہوئے کھوئے  
کھوئے سے لچھیں بولا۔

"ہوں۔" اس نے پتی پتی لکڑیوں پر کچھ کانڈ رکھ  
کر تلی پھینکی۔

"رچی! ایک بات کرنی ہے تیرے سے۔"

"تو کرنا۔" وہ لا پرواہی سے بولی اور ایک طرف رکھی  
دھونکی اٹھائی۔ "بچے بچا اچھے نہیں لگتے؟"  
"لگتے ہیں۔" وہ رک کر بولی۔

"بشیراں نہیں کرتا ہمارے ویڑے (مجن) میں  
شور ہو۔"

وہ اس کی بات سنی ان سنی کر کے لکڑیوں کو دھونکی  
سے سج کرتی رہی۔ دھواں اس کی آنکھوں میں گھسا  
جاریا تھا۔

"بول تار تار!"

"مطلب کیا ہے تیرا؟" اس کی بھونکیں سکڑ

گئیں۔  
"تو بے تار کی! وہ تو ہی رہے گی۔ تیری جگہ کوئی  
نہیں لے سکتا۔" وہ گردن اس کی طرف موڑے  
آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ وہ بشیراں کے منہ سے اکثر  
دوسری شادی کی باتیں سن چکی تھی اور کچھ کچھ میتو کی

بدلتی سوچ کو بھی سمجھ رہی تھی۔ مگر وہ اتنی جلدی  
دوسری شادی کے لیے راضی ہو جائے گا، یہ اندازہ  
نہیں تھا۔ اسی لیے پھونکنی زور سے بھٹتے ہوئے غصے  
سے کہا۔

"تو کہنا کیا چاہتا ہے۔" وہ دھونکیں سے بھری  
آنکھیں اس کے چہرے پر جما کر بولی۔ آج وہاں کوئی اور  
ہی میتو تھا۔ وہ میتو نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی۔ جس پر  
اسے مان تھا۔ بے اولاد کو جو "رب کی رضا" کہتا تھا۔  
جو اس کی ذرا سی تکلیف پر بللا اٹھتا تھا۔ جب بشیراں  
اس پر وائیوں کے ٹوٹنے آزماتی تو وہ اس کی تکلیف پر  
اپنی ماں سے لڑتا تھا۔ جب رچی کو کسی نے "ڈول  
کلنچ" کا بتایا جو حاصل پورا اور بھالوں پور کے درمیان  
تھا۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ ایک ڈول نائی  
بے اولاد ملکائی نے تعمیر کروایا ہے کیوں کہ اس کے ہاں  
ایک بدھا کی دعا سے لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ اب جو بھی  
وہاں جا کر دعا کرتا ہے تو اس کے ہاں اولاد ہو جاتی ہے۔  
رچی بھی چوری سے وہاں گئی تھی مگر جیسے ہی میتو کو پتا  
چلا تو کتنا لڑا تھا۔

"بے وی بی نہ بن، ورنہ رب کی رحمت سے دور  
ہو جائے گی۔" اور جب وہ کوٹری قیوں پر ٹنگے پاؤں سبز  
چادر صرف اس لیے چڑھانے گئی تھی تاکہ وہ بھی ہری  
ہو جائے تو میتو نے ہی کہا تھا۔

"رب صرف مندر دربار مسجد میں ہی نہیں ہوتا۔  
وہ ہر جگہ ہوتا ہے، ہر جگہ سنتا ہے، بس اس کے سننے کا  
انداز الگ ہوتا ہے، وہ اپنی رضا سے سنتا ہے، قبول کو  
پونے سے نہیں سنتا۔ اور تو اتنی جنونی بن جاتی ہے  
کہ بھی مذہب بھول جاتی ہے تو یہی اپنی جان۔"

وہ اپنی دھواں دھواں ہوئی آنکھیں مسلسل اس  
کے چہرے پر جمائے ہوئے تھی۔ ایک کوئلہ چخ کر اس  
کے پاؤں پر گر گیا۔ وہ اس کی جلد بھلسا لگا تھا مگر اس  
کی جھلن اتنی ٹھیک تھی جتنی میتو کی بدلی باتوں سے  
اسے محسوس ہوتی تھی۔ جیسے ہی میتو کی نظر کوئلے پر  
گئی اس نے ہاتھ سے فوراً اسے گرایا۔ اس کے  
قریب ہی ایک کپڑے کی دھجی پڑی تھی۔ اس نے وہ



اٹھائی اور جلا کر اس کی راکھ رچی کے پاؤں پر چھڑکی۔  
رچی نے اپنا پاؤں تاکواری سے دور سرکالیا تھا۔ ”رہن  
وے۔“

”کیوں۔ تیرا پاؤں جل گیا ہے نا۔“ میتو اس کے  
انکار پر لجاجت سے بولا۔ اور بازو بڑھا کر راکھ اس کے  
پاؤں پر چھڑکنے لگا تھا۔  
”دروکم ہو؟“

”وہ مسلسل چولہے میں بھڑکتے شعلے دیکھ رہی تھی۔  
اس کا دل کر رہا تھا یا تو خود ٹکڑیوں کے ساتھ جل  
جائے یا پھر حلیہ کو جلاوے۔“

”دیکھ رچی۔ حلیہ بہت اچھی ہے۔ وہ تیری پھولی  
بہن بن کر رہے گی اور اگر سچے ہوں گے تو تیرے  
آنکھن میں بھی رونق ہوگی۔ تو بھی ان کی کہاں ہوگی۔“  
وہ کج اسے منانے کی ٹھان کر آیا۔ گویا وہ اس کی  
اجازت سے ہی دوسری شادی کرنا چاہتا تھا مگر رچی اسے  
مگر بھی اجازت نہ دیتی۔

”میتو! میں سب برداشت کر لوں گی، پر تیری  
شرارت نہیں۔ وہ دو لوگ کتنی ہوئی وہاں سے اٹھ  
کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

”رچی! میری پوری بات تو سن۔۔۔ تجھنے کی کوشش  
تو کر۔“

”کیا سمجھوں۔ کیا سمجھوں میں۔ بتا کیا سمجھوں؟“  
وہ غرا کر عمو کی شیرنی کی طرح چلی۔ اس کا سونو چوہا سٹیک  
تجو رہا تھا۔ اس کی کھڑی پٹلی ناک نمی سے سرخ ہو رہی  
تھی۔

”میتو! وہ اس کے بالکل مقابل کھڑی تھی۔ ”میں ہر  
حد پار کر لوں گی۔ میں ہر چیز جلا کر راکھ کر دوں گی، اگر تو  
دوسری شادی۔“ اس کے باقی الفاظ منہ میں رہ گئے  
کیوں کہ سامنے حلیہ تل پر جھک کر منہ دھو رہی تھی۔  
وہ کسی درندے کی طرح اس پر چبھی۔

”واؤن! چیل! نا کن۔ تو کیوں اتنی میرے گھر میں  
تیرا خون پی جاؤں گی۔“ وہ اسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکے  
دیتے ہوئے کیفیت میں چلا رہی تھی۔

”ڈیل کمہنی! میرے آدمی برڈورے ڈال رہی

ہے۔“ وہ پانچوں کی طرح چیخ رہی تھی۔  
”رچی۔ کیا کر رہی ہے۔ چھوڑا ہے۔ چھوڑا ہے۔“

میتو بھاگ کر ان کے قریب گیا۔ شور سن کر بھڑک  
بھی سخن میں آجی۔ مگر رچی میں تو کوئی غیر مرئی طاقت  
آگئی تھی۔ وہ پھٹکارنی ہوئی اپنے ناخن اس کی گھٹائی  
میں اتارنے لگی۔ حلیہ اس اچانک حملے کے لیے  
بالکل تیار نہ تھی۔ وہ اس کے شعلے میں ڈولنے لگی۔  
بشیراں اور میتو مل کر اسے چھڑوانے کی کوشش  
کر رہے تھے۔ مگر وہ سب کو بدو عا میں، گاکیاں وہ  
رہی تھی۔

”کلی ہو گئی اے۔ چھڑوے ایسا۔ رچی! پھل  
وے۔ میں کیاں چھڑوے۔“

میتو اور بشیراں نے بہت کوشش کی اسے چھڑوانے  
کی مگر جب اس کا جنون بڑھنے لگا اور گلے پر داؤ بڑھنے  
کی وجہ سے حلیہ کی آنکھیں اپنے لگیں تو میتو کاٹو  
اس کے گلے پر نشان چھوڑ گیا۔ بعد میں وہ خود بھی  
حیرت سے اپنا ہاتھ دیکھنے لگا۔ مگر اس کے پاس کئی  
طریقہ ہی نہیں تھا رچی کو روکنے کا۔

حلیہ جھٹکے سے گری اور وہ اس کو گالیاں دیتی  
بشیراں کے کمرے میں بھاگ گئی۔ رچی وہیں چکر کی  
کھڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے گلے پر تھا اور وہ  
مسلسل میتو کو کٹنے جارہی تھی۔

دھواں اب اس کی آنکھوں کو جلانے لگا تھا۔ اس کی  
تپش سے اس کی سانولی جلد جلنے لگی۔ سوڑتے بھائے  
سچے سہم کر چارپائیوں پر ٹپک گئے۔

میتو نے ایک لمبی سی آہ بھری اور صاف جھٹکا ہوا  
تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔  
رچی جون کی توبہ بت بنی کھڑی تھی۔ اس کی نگاہ  
میتو کی پشت پر گڑی تھیں۔ اس کا سر چکرانے لگا۔  
”کیا یہ تھوڑی دیر پہلے والا میتو ہے جو میرے  
پردہ لٹی لگا رہا تھا۔ وہی ہے جسے میرے شگے پاؤں  
سے کانٹے کے جیسے کا ڈر ہوا تھا۔ جو میری پیٹھ  
لیے بے تاب ہوا تھا۔ جسے میرے دین کی فکر تھی۔  
میرے دو پر لڑنے والا۔ وہ کیسے بدل گیا۔“

میرا تھا کیا اب میرا نہیں رہا۔؟“  
وہ صرف ترازو میں اپنی محبت باقی تھی۔ وہ صرف  
اپنے جنون کا پلڑا زمین پر لگائے رہتی تھی۔ میر  
جولہ خدا کی سرشت میں نہیں تھا۔

وہ صرف یہ جانتی تھی میتو اس کا ہے۔ اس کی  
محبت اس کی سانس اس کی روح بھی۔ ایک پاگل بن  
کی کیفیت میں وہ اپنے پاؤں گھر سے نکل گئی۔ پاؤں ٹھٹھٹے  
ٹھٹھٹے اس کے قدم اپنی ماں کے گھر کے تھے۔

وہ دھاڑے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ جامن  
کے درخت کے نیچے پچھی چارپائی پر گر کر پٹکیوں سے  
رونے لگی۔

”رچی! رچی کی ہوا؟“ نذیراں نے بیٹی کو آتے ہی  
دھپ سے گرتے دیکھا تو فوراً اس کے قریب آئی۔  
پٹکیوں اور سسکیوں سے رچی کا سارا بدن مل رہا تھا۔  
نذیراں بار بار اس سے پوچھ رہی تھی۔

وہ ماں کو کیا بتانی کہ اس کے محبت بھرے آشیانے  
کے ٹکڑے ٹکڑے شروع ہو گئے ہیں۔ وہ کیا بتانی کہ اس نے  
جس کا ساتھ مانگا تھا جسے سوچا تھا، تقسیم ہونے لگا  
ہے۔ اس نے تو اپنے رب سے صرف میتو چاہا تھا۔  
پہاں تک کہ اس کے بعد رب سے کچھ نہیں مانگا۔  
بھی نہیں۔ حالانکہ اس کے ساتھ کوہ قرار رکھنے کے  
لیے اسے ہر دم رب سے کچھ مانگنے کی ضرورت پڑنی  
تھی مگر وہ میتو پر مہر لگی رہی تھی۔



رچی کو ماں کے گھر آئے تقریباً ”دس دن گزر گئے  
تھے۔ لیکن اسے نہ میتو لینے آیا نہ ہی بشیراں۔ نذیراں  
اسے پہلے بھی سمجھاتی تھی۔ اب بھی سمجھا رہی تھی۔  
”رچی! جلد کرنی اے۔ تو قسمت ٹال نہیں  
لے سکتی۔“

نذیراں اس کے بکھرے بال پیار سے سمیٹ کر  
نکھنسی کرنے لگی۔ وہ ممتا سے بھری تھی۔ وہ اسے  
ڈانٹنے کی بجائے سمجھا رہی تھی۔

”دیکھ رچی! جو رب کی تقسیم میں تیرا نام نہ ہو تو تو

لوگوں سے چھین لے گی؟ نہیں نا۔ اگر سو متا رب  
چاہے ہی نہ کہ تیرے لیے جس چیز آئے تو کوئی ہندو سے  
سکتا ہے؟ نہ رچی نہ میری بیٹی! تجھنے کی کوشش کر۔“  
”تو ماں! میرے پہلے کچھ کیوں نہ آیا، میں نے تو  
صرف میتو ہی مانگا تھا۔ وہ بھی میری جھولی میں رہنے  
نہیں دیا اتنے بڑے رب نے۔“ وہ مٹی کے فرش کو  
نظروں سے چھیدتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”کیسے نہیں کتے جلی! رب! رب نے میتو تیری جھولی ہی  
ڈالا ہے پر تو رب کا نظام نہیں سمجھتی۔ یہ دنیا سامنے  
کے لیے اس کی تقسیم الگ ہے کسی کو اتنا تو کسی کو  
یتنا۔“ وہ اپنے ہاتھ سے چھوٹے بڑے بیانے بنا رہی  
تھی۔ پھر ہاتھ نفی میں ہلاتے ہوئے اور کسی کو کچھ بھی  
نہیں۔ وہ رب ہے کسی کو وقت سے پہلے تو کسی کو  
وقت گزار کے دیتا ہے۔“

ماں کے کہنے پر اس کا ہاتھ تیوریوں سے بھر گیا۔ غرا  
کر بولی۔

”کیا مطلب ہے تیرا وقت گزار کے۔“

”دیکھ رچی! وہ مولا ہے پروردگار ہے۔ وہ بہتر جانتا  
ہے کہ کب کیا ضرورت ہے۔ وہ دیکھ سامنے والے  
خدا بخش کو۔ اس نے دوسری شادی کی ہی تھی ساتھ  
ہی پہلی سے بھی بچہ ہو گیا۔ یہ رب کی تقسیم ہے۔  
اسے وقت گزار کے ملا۔ تو یہ دیکھ وہ دونوں کے ساتھ  
خوش ہیں تو تو خوش نصیب ہے جو میتو تجھ سے  
اجازت مانگ رہا ہے۔ میری بیاری دمی! تو اسے خوش  
خوشی اجازت دے۔ پھر دیکھ تو کیسے اس کے سر پر بیٹھتی  
ہے، وہ ڈھیر تیرا خیال کرے گا۔ ساتھ رب سو متا بھی  
خوش ہو گا۔ ہو سکتا ہے تیری بھی گود ہری ہو جائے۔“  
نذیراں اس کے بال باندھ کر اس کی کمر سلاتے ہوئے  
سمجھا رہی تھی۔

”نہ ماں نہ! اس نے ماں کا ہاتھ غصے سے جھٹکا اور  
کھڑی ہو گئی۔ ”میتو کی تقسیم کے بعد ہری گود کا کیا کرنا  
ہے۔“

”کھیلے۔ تو کیوں نہیں سمجھتی اے۔“ نذیراں  
نے دوبارہ پیار سے اسے اپنے قریب بٹھایا۔



۲۴! میتو حرف میرا ہے، میری محبت، میری چاہ،  
میرا بار، میرا سب کچھ۔ ”وہ پھر غرائی تو نذر اس کو اس پر  
شدید غصہ آگیا۔ اپنی بیات دار آوازیں چلائی۔  
”وہ تیری محبت، تمہیں بے صبری اے۔ جہل پن  
اے، جنون اے تیرا۔ اور جنون، ہندے نوں گہری  
تھال، کھنڈج لے جانا اے۔ مجنون نہ بن۔۔۔ مجنون  
نہ رہ نوں پسند اے، نہ اوڈے ہندیاں نوں، جھیلے!  
اوپ پسندار ہے“

کے لیے چارپائی سے اتر بیٹھی۔ ابھی کھڑی ہی ہوئی تھی کہ اسے ہلکا سا چکرا اُٹھیا۔ چارپائی کی پٹی پکڑ کر وہ بے پرواہ ہو گئی اور چند لمحے بعد بے پرواہی پینے لگ پڑی۔ تب تک وہ بے پرواہ ہو گئی تھی۔ ابھی بھرے تھے کہ اس کا دل مڑ گیا۔ شاید بھوکا پیٹ ہوئے کی وجہ سے ایسا محسوس ہوا۔ کیا کہ اب وہ اکثر اترات کو بغیر کھائے پیے سو رہی تھی۔ دن میں نذرانے ڈانٹ ڈپٹ کر چند نوٹ لے کر ہاتھ دھو کر مگر مرآت کو تو اس نے نہ کھانے کی قسم اٹھا رکھی تھی۔

کر اندر لانے کے لیے زور دے رہی تھی مگر جی نے  
جھٹکنے اپنا ہاتھ جھڑایا۔  
”نہیں اے! میں نے ابھی جانا ہے۔“  
وہ کہتی ہی دروازہ کھول کر باہر نکلی آئی۔ نذیر اس  
پیلے اسے پھر اس کے باپ کو پکارنے لگی، جو ابھی تک  
بڑا سوہا ہوا تھا۔ ان کے برابر والا کھڑے نذیر اس کے دیوار کا  
تھا۔ صحن میں ایک چھوٹی سی مشترکہ چچی دیوار تھی۔ وہ  
دیوار پر چڑھ کر دیوار کے بنیے کو پکارنے لگی، جو کھڑا  
مسواک کر رہا تھا۔ اس نے اسے رچی کے پیچھے دوڑایا۔  
نذیر اس محل سے کچھ پریشان سی تھی۔ رچی اسی  
دہانہ نہ چلے۔ وہ اس کے حوزہ سے ڈرنے لگی تھی۔  
رچی ٹپکایا تیزی سے پار کرتی اپنے گھر تک پہنچ گئی  
اور وہ دونوں ہاتھوں سے دروازہ پینے لگی تیسری چوٹی  
دھتک کر میٹونے دروازہ کھولا۔ وہ اتنی صبح رچی کو دیکھ کر  
خاصا حیران ہوا۔ کچھ لمبے اسے ٹکرا کر۔ پھر ایک طرف  
ہٹ کر اسے اندر آنے کا رستہ دیا۔ وہ گھر میں داخل  
ہوئی تو کچھ اجنبیت کا احساس ہوا۔

پر غصہ بھی آیا مگر وہ چہرہ بھی اسے لینے کے لیے شام ہی کو جانا چاہتا تھا لیکن اس کی ماں نے کہا۔

”مجھے بیوی کی ضد اتنی پیاری ہے۔ بیوہ ماں کی خواہش کا کوئی احترام نہیں۔ اس ماں کی جس نے تجھ ذرا سے کوہاں کر بیوی کے قابل کیا۔ اب اس کی محبت اتنی غالب آئی کہ روٹی ماں نہیں دیکھتی۔“ بیٹی راز رو پڑی۔

”میں کوئی ناجائز بات نہیں کر رہی ہوں۔ اسے چھوڑنے کا نہیں کہتی۔ بس میں تو اپنی سسل دیکھنے کی خواہش کر رہی ہوں اور اتنا میرا حق ہے تجھ پر۔ میں ان دونوں میں فرق نہیں کر سکتی گی نہ تجھے کرنے دوں گی۔ خدا کے واسطے تو بان جا۔“

دھاڑتی ہوئی اس کے سینے کو پیٹنے لگی۔ اس نے اپنا سر بہت زور سے اس کے سینے پر مارا۔ میتو نے اپنا لرزنا ہاتھ اٹھایا اور اسے تسلی دینے کے لیے ابھی اس کے بالوں پر رکھا ہی تھا۔

”ہو نہ!“ وہ جھٹکے سے یک لخت برے ہوئی اور دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے دھکیلتی ہوئی زخمی ٹانگوں کی طرح چہنکار رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے سانس کھینچتے ہوئے سامنے پڑ کے نیچے بنے مٹی کے پارے کو دیکھنے لگی، جس کا کھڑا پیلے اور درآتی رہی تھی۔

وہ کسی وحشی کی طرح ایک جست میں وہاں پہنچی اور تیز دھاڑ دراتی اٹھ اٹھی۔ کیاس کی کٹائی قریب تھی کسی لیے درآتی تیر کو اکڑ گئی تھی۔

میتو نے جب اس کے ہاتھ میں درآتی دیکھی تو بھاگ کر اس کے قریب گیا۔

”نہ رچی نہ دیا کرتے تھی ہے۔“

”میتو۔ تو نے میرا دل جلا دیا ہے۔ میں تیرے سامنے اپنی سانس ختم کر لوں گی۔ میں تیرے سامنے خود کو مار لوں گی۔“ وہ ہر لفظ چبا کر سانس کھینچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ آنکھیں انگڑا رہی تھیں۔

بشیراں کو اس کی حالت پر ترس بھی آ رہا تھا اور وحشت بھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے اس کے قریب گئی۔

”نہ رچی۔ مڈی دم ی اکیوں چھلی ہوئی اے۔“

”رک جا چھو پھیلا رک جا۔“ وہ دھاڑ کر بولی۔ وہ درآتی ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے، بشیراں کو گھور رہی تھی۔

”میں تیری کچھ نہیں لگتی۔ میں کسی کی کچھ نہیں لگتی۔“ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے پہلے درآتی کو پھر بشیراں کو کھاجانے والی نظر سے دیکھا۔

”تو نے میری روح توڑ دی ہے، میرا دل توڑا۔ میں تیرے سامنے اپنی زندگی ختم کر لوں گی۔ میں کسی کی کچھ نہیں، کچھ نہیں۔“ اس نے اپنا ہاتھ اونچا لہرایا۔ میتو بھاگ کر اس کے سامنے کھڑا اسے پکڑنے کی بھرپور کوشش میں تھا۔

”رچی چھوڑ دے۔ دیکھ! میں کہہ رہا ہوں چھوڑ دے۔“

وہ نفی میں سر ہلانے ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہی تھی۔ میتو اسے کندھے سے پکڑ کر اس کا بازو دھکے دے کر رچی کی کوشش میں تھا۔ رچی کے چاچا کا بیٹا جو ابھی چند لمبے لمبے ہی گھر میں داخل ہوا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر ایک ہی جست میں اس تک پہنچ گیا۔ رچی کا ہاتھ پیچھے سے پکڑنا چاہتا تھا اور پکڑ بھی لیا تھا۔ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ آگے کیا تھا۔ فضا میں ایک جل خراش جھج بھری اور پھر کتنی ہی آوازیں بھینکتی چلی گئیں۔

رچی کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ وہ پورا دم کھولے نفی میں سر ہلانے لگی۔ اس کا وار میتو نے اپنے جگر پر روک لیا تھا۔ درآتی چھینا چھینا میں اس کے جسم میں پیوست ہو گئی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر سینے کے رچی کے چاچا کا بیٹا ہانپتے ہوئے آگے بڑھا اور درآتی نکال۔ درآتی نکلتے ہی میتو کی غراہٹ کے ساتھ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ رچی بے دم سی ہو کر دھپ سے اسی جاگری۔ وہ اس منظر کو جھٹلا رہی تھی۔

”نئیں۔ نئیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میتو۔ میتو!“

وہ تڑپتے میتو کے خون میں اپنے ہاتھ بھر کر اپنے چہرے اور جسم پر پھیرنے لگی۔ اس کے خون میں اپنے گہرے چہرے، گردن سب کچھ لپٹ کر رہی تھی۔ بشیراں چپٹی چلائی رچی کو کوسنی اپنے گھٹنے پیٹ رہی تھی اور حلیہ اپنے اجڑتے سناگ پر ماتم کنڈل بھی گالیاں دیتے ہوئے رچی کی کمر پر جھپٹ رہی تھی۔ لیکن رچی تو شاید دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کے جسم میں رہ گئی تھی۔

رچی کے چاچا کے بیٹے نے میتو کو جلد از جلد اپنے پہنچانے کی کوشش کی۔ مگر وہ گھر سے نکلتے ہی دم گیا۔ گھر میں جیج و پکار سے محلے والے اکٹھے ہو گئے۔ پولیس کو جانے کس نے خبر دی تھی۔ وہ رچی کو

قتل سمیت پکڑ چکے تھے۔  
 رچی "میتو نہیں" کرتی میت کو پکارتی پولیس  
 والوں کے ساتھ ہنسنے لگی جہاں بھی تھی۔  
 "میتو نہیں" میں مری ہوں۔ میتو نہیں مر سکتا۔  
 رچی مر سکتی ہے۔ "وہ گھلا گھلائی ہوئی گاڑی میں دھکیل  
 دی گئی۔"

چلتی گاڑی پر کئی فوٹو گرافر ٹوٹ پڑے تھے۔ اگلے  
 دن اخبار کے آخری صفحوں پر چھوٹی سی خبر تھی۔  
 "عبدالستین کو اس کی بیوی رضیہ نے اپنے آشنا  
 کے ساتھ مل کر قتل کر دیا۔"  
 تفصیل اس سے زیادہ شرمناک تھی۔ یہ تو رچی  
 جانتی تھی "چاچا کا بیٹا آشنا تھا یا مساجد بننے آیا تھا مگر وہ  
 علاقے میں خوب رسوا ہوئی تھی۔ لیکن ابھی اس کے  
 جنون نے اسے گڑھے سے کھائی میں لے کر جانا تھا۔

\*\*\*

آسمان پر سورج، چاند اپنی اپنی ڈوبیاں بدلتے  
 رہتے۔ رچی نیل کی سلاخوں سے سرچسپی "میتو میتو"  
 پکارتی خود کو لبو لبان کر لیتی تھی۔ ایک دو بار اس نے  
 سامھی قیدی عورتوں کو بھی زخمی کیا پھر اس کی بیک  
 بدل دی گئی۔ اب وہ اپنی بیک میں تنہا تھی۔ اکثر چکر  
 گر کر جاتی تھی۔ اس کا ذہنی توازن چیک کیا گیا۔ جو  
 تقریباً "درست ہی تھا۔ مگر اس میں ایک اور تبدیلی  
 آ رہی تھی۔ جو زیادہ عرصہ کسی سے چھپ نہیں سکی۔  
 اس تبدیلی کا پتا چلتے ہی رچی حیرت میں آ گئی تھی۔ وہ  
 یکسر بدل گئی۔

نولی صورت کی طرح ایک کونے میں پڑی رہتی۔  
 اسے مکمل چپ لگ گئی تھی۔ لیکن اس کی چپ دنیا کی  
 تیز دھار زبان نہ توڑا سکی۔ سلاخوں کے پار جیسے ہی خبر  
 پہنچی تو چہ گویاں ہونے لگیں۔

کوئی کتا وہ شروع سے خدی اور بدماغ تھی جو  
 اس کے داغ میں سامنے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔  
 یقیناً "وہ قید سے گھبرا گئی ہوگی تب ہی باہر نکلنے کے لیے  
 جیلر یا تھانیدار کو خوش کیا ہوگا۔ کوئی اس کی حالت کو

انپکڑے منسوب کرتا۔ چھوٹی چھوٹی جیل  
 روز اخبار کا پیٹ بھرتیں۔ بشیراں دور کر رہی تھی۔  
 "اس بد ذات باجھ کی صرف حرام کاری ظاہر کر  
 کے لیے اللہ نے اسے ہر ایک ایسے اللہ کیوں اس کی  
 کاری پر پردے ڈالتا، جس نے اپنے سر کا سامن  
 کر دیا۔ وہ ذلیل تو ہو۔"

اس نے چند مہینے بعد ہی حلیہ کی شادی اپنے رشتے  
 داروں میں طے کر دی۔ شاید اس لیے کہ جب میٹو  
 محبوبہ بیوی نفس پر قابو نہ رکھ سکی اور اس نے حرام  
 کاری شروع کر دی تو پھر اس معصوم کا صبر کیوں سہیل  
 وہ اتنے پیٹھے رچی کو بد دعا میں دیتی۔

رچی کے ماں باپ کہاں تک اتنی رسوائی برداشت  
 کرتے۔ وہ چند مہینوں میں ہی آگے پیچھے چلے گئے۔  
 حقیقت تو اللہ کے علاوہ رچی کو معلوم تھی کہ یہ حرام  
 کاری ہے یا اس روشن رات میں بائیں دعا کی تعبیر  
 جہاں اس پر تعبیروں کی حقیقت کھلی تھی وہاں اپنی دل  
 کی نصیحتیں اس کا سن کاٹیں۔ وہ اکثر کہتی تھی۔

"صبر کرنے والے کے ساتھ اللہ خود چلتا ہے  
 رچی! اس کی ماں کا ہر لفظ اس کے گلے کے پھول پر  
 چپک گیا تھا۔ وہ ہر وقت ان ہی کی بازگشت میں گھڑی  
 رہتی تھی۔

"کسے نوں وقت لڑگا سے ملنا ایسہ۔ رب دی  
 رخصتے راضی ہو جا رہی۔ رب برکت دے گا۔ ہو سکتا  
 اے رب تیروں دی ہر اک دے۔"

اس کی گود ہری سے بھری ہوئی تھی مگر اس کا  
 سکوت نہ ٹوٹا۔ وہ خاموشی سے بچی کو گود میں لیے بیٹھ  
 اپنے بائیں کے ایک ایک جنون پر پچھتاتی تھی۔

"کاش! میں بھی عام عورت کی طرح ہوئی۔ میری  
 محبت بھی عام ہوئی۔ سال کی بات ہی مان کر وہ زہر  
 گھونٹ بی ہی جاتی۔ کم از کم میتو میرے جنون کی  
 تونہ ہوتا۔"

وہ اپنی سوچوں میں اتنی ذوق کہ بچی کو اگر وہ  
 پلانے لگتی تو پانی ہی رہتی "اگر نہ پلاتا ہو تا توئی کی  
 اسے روئے بٹکتے دیکھتی رہتی مگر اس کا سکوت نہ ٹوٹتا۔

ایڈووکیٹ مدیحہ ایک بہت بڑی این جی لو کی  
 چیرمن تھی۔ خواتین کی جیل میں اس کا اثر آنا جانا  
 لگا رہتا تھا۔ وہ کافی عرصے سے یہاں رہی کو دیکھ رہی  
 تھی جو ہمیشہ خاموش ایک کونے میں ہی لی۔ اس نے  
 پرانی قانون میں اس کا کیس چیک کیا۔ پھر کچھ  
 معلومات علاقے سے لیں اور پھر مدیحہ کو کریدنا شروع کیا  
 تھا۔ رچی بہت مشکل سے بولی تھی۔ ایڈووکیٹ مدیحہ  
 نے رچی کی رہائی کے لیے سر توڑ کوشش کی تھی۔ مگر وہ  
 تمام شاید اللہ قتل اور اقبال قتل کے بعد اسے رہائی  
 نہیں دلا سکتی تھی۔ غلطی سے ہی قتل تو ہوا تھا۔ وہ رچی  
 کو نہ لے کر آتی تھی۔

آج بھی وہ ای سلسلے میں بیٹھی اسے قائل کر رہی  
 تھی مگر رچی احازت کا ایک لفظ بھی نہ بول پاتی تھی۔  
 بلکہ بچی کی پھٹی اپنی پھٹی کے ساتھ جوڑے جانے کیا  
 تلاش کر رہی۔ اس بچی کے ہاتھ ہی نہیں ہمس کا  
 ایک ایک نقش میتو کی اولاد ہونے کی کوای دیتا تھا۔  
 مدیحہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر دوبارہ بولی۔

"رضیہ! تمہیں متین سے بہت پیار تھا۔"  
 رچی نے چونک کر اس کی طرف خالی نظروں سے  
 دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "پیار نہیں۔ جنون۔"

مدیحہ نے فحش سی سانس بھری۔ "تمہاری محبت  
 نے جنون کا روپ دھار لیا تھا مگر اب۔ اب تم کون سا  
 بدل گئی ہو؟ شدت سے جب لگا رکھی ہے۔ اپنی بیٹی  
 کے فساد پر بھی تم نہیں ہنسن۔ تم جانتی ہو تمہاری  
 بیٹی بھی تمہارے جیسی جنونی بنے؟ جانتی ہو یہاں کا  
 ماحول۔ یہ سب اس کی بچاؤ نہ ذہنیت بنانے میں کس  
 قدر معاون ثابت ہوگا؟ کیا تمہیں نہیں پتا رضیہ! پلینز  
 اپنے بچہ کو اور تکلیف دہتم نے اس کے جسم کو  
 زخمی کر کے اس سے زندگی تو چھین لی ہی اب اس کی  
 بیٹی کا مستقبل داؤ پر لگا کر اس کی روح کو تکلیف مت  
 دینا۔ یہ اس کی آخری نشانی ہے۔ اسے ضائع مت  
 کر۔"

ایسی وہ بول رہی تھی۔ جب ہیڈ کانسٹیبل نے  
 نذر سے پکارا۔

"بیٹیو! ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔"  
 مدیحہ نے اس کی آواز پر ناگواری سے پیچھے دیکھا اور  
 پھر ناامیدی سے رضیہ کو جو آواز سننے ہی کھڑی ہو گئی  
 تھی۔ وہ دو قدم دوڑا کر اس کی جانب چل کر واپس مڑی  
 پھر یہاں نہیں کیا سوچا اور اپنی بیٹی مدیحہ کی گود میں ڈال  
 دی۔ پھر وہاں رکی نہیں۔ تیز تیز قدموں سے باہر نکل  
 گئی۔ مدیحہ برآمدے میں کھڑی بچی کے ہاتھ چوم رہی  
 تھی۔ وہ اسے کندھے سے لگائے مسلسل رضیہ کی  
 پشت تک رہی تھی جو تھکے ماندے قدموں سے اپنی  
 بیک کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کا میلا پچھلا دوپٹا  
 زمین پر گھس رہا تھا۔

"مگر نے ایسا کیوں کیا رضیہ! لانا شوہر کی تقسیم ہر  
 عورت کے لیے دنیا کا دشوار ترین امر ہے مگر ہر روز  
 بہت سی عورتیں یہ زہریلا گھونٹ پیتی ہیں۔ تمہیں  
 متین سے شدید محبت تھی نا! کچھ بھی کر گزرنے کی حد  
 تک۔ جہاں اتنی شدت پائی جائے وہاں آنا کس تو  
 آتی ہے۔ آہ۔ تمہیں رب نے بے اولاد رکھ کر  
 تمہاری محبت ناپی تھی کہ تم کہاں تک قربانی دے پاؤ  
 گی۔ اپنے دل کی زمین پر قدم رکھ بھی پاؤ گی یا نہیں۔  
 تمہارے ایک قدم پر اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے کتنا  
 بڑا انعام چھپا رکھا تھا لیکن تمہارے جنون نے اس  
 انعام کو تمہاری رسوائی اور تمہاری بیٹی کے لیے اس  
 کے "باب کی قاتلہاں" کا حوالہ بنا ڈالا۔" وہ بچی کے  
 ہاتھ چومتے ہوئے تمام کارروائی پوری کرتی جیل سے  
 باہر نکل آئی۔

بے اولاد ایڈووکیٹ مدیحہ کی کہانی رچی سے زیادہ  
 مختلف نہیں تھی۔ شاید یہی ممالکت اسے رضیہ کے  
 قریب لے آئی تھی۔ مگر اس نے اپنے دل کی گلی  
 زمین پر قدم مضبوطی سے رکھ کر فیصلہ کیا تھا اور آج  
 اس کا ہمیشہ محبوب شوہر اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ  
 ہنسی خوشی زندگی گزار رہا تھا اور اولاد رچی کی بیٹی کی  
 صورت آج انہیں مل گئی۔

مدیحہ نے اپنی گلی عینک کے شیشے صاف کیے اور  
 گاڑی گھر کے رستے پر ڈال دی۔



## محبتِ حرم

کام بڑھ جانے کی صورت میں انہیں کاریگر زیادہ رکھتے پڑے اور اوپر نیچے اس گھر کو انہوں نے ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی بنا دیا۔

خود ایک اچھی کالونی میں پندرہ مرلے کی کوٹھی میں کرائے دار بن کر آگئے۔ کارخانے میں میٹرل کی سپلائی کے لیے بیگ سے ایک سوزوکی فسطوں پر نکلوا لی۔ اس سوزوکی کا ڈرائیور جمال تھا۔ وہی کارخانے کے سب ہی اندر باہر کے کام دیکھتا تھا۔ کاریگروں کے مسئلے حل کرتا تھا۔ حساب کتاب دیکھتا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ پرائیویٹ میٹرک کے امتحان کی تیاری بھی کر رہا تھا۔

اسد نے ایف ایس سی میں کالج میں داخلہ لے لیا

## مکمل ناول



تھا۔ قدانی اسٹڈیم میں دو کامیں دوسرے کے بعد ہی مکمل ہیں۔ اس لیے اب ان دونوں کے پاس کافی وقت بڑھ گیا تھا۔

اتنی اور مسز گوہر کی ساری توجہ اب ڈیرا منگے پر آگئی تھی۔ اب انہیں کسی کامیابی نہیں ہونا پڑتا تھا کہ فلاں آرڈر نے فلاں طریقہ کا میٹل ہی بنانے کے لیے کہا ہے یا فلاں کپڑا اور ڈیرا بن ہی مانگا ہے۔ اب انہیں مکمل آزادی تھی۔ وہ اپنی مرضی کا ڈیرا بن کر بن گئی اور ”چتر“ میں ڈسپلے کریں گی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے ہر ڈیزائن کو پسند کیا جائے گا۔ اور پھر سے پرنا جائے گا۔ اب انہیں ریگولر میٹرل گئے تھے جو سیدھا ”چتر“ بن آتے۔ ویسے بھی انسانی خطہ ہے کہ وہ ایک بڑی پر



مارکیٹ سے گھسیٹا چڑھتی ہی بہت اطمینان کے ساتھ لے لے گا اور خبر سے سب کو بتائے گا۔ اونچی جگہ اور اونچے نام بہت سے نقائص پر پردوں کا کام کرتے ہیں۔

لاہور کے اتنے شان دار علاقے میں ایک شاندار دکان نے انہیں دونوں میں خاطر خواہ سے زیادہ منافع دینا شروع کر دیا۔ منافع سے زیادہ وہ بلبوسات کی پسندیدگی سے خوش تھیں۔ ان کی محنت رنگ لارہی تھی۔ وقت دو طرح سے بدل جاتا ہے۔ ایک قسمت سے۔ ایک ہاتھ سے۔ قسمت سے نہ بدلے تو ہاتھ سے بدلنے کی کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ قسمت ہار جاتی ہے۔ ہاتھ نہیں ہارتے۔ دنیا میں کتنی بھی انسانی ترقی ہوئی ہے۔ اسے ہاتھ سے ہی ممکن کہا گیا ہے۔ ورنہ ہاتھ باندھ کر بیٹھے رہنے والے لوگوں کے زین میں وہ بے ڈھانچے بھی نہیں ملتے اور مل جائیں تو کار آمد نہیں ہوتے۔

افنی کالے مسز کو ہر کالے اسد اور جمال کالے ان کا وقت بدل چکا تھا اور یہ وقت ہاتھ باندھے بیٹھے رہنے سے نہیں بدلتا تھا۔

اپنی سونو کی میں جمال افنی کو ڈراپ کر دیتا۔ وقت جوتا تو لے بھی آتا۔ ورنہ وہ خود ہی کتابی۔ انان نے گھر کے معاملات سنبھال رکھے تھے۔ وہ کام والی کی عمرانی کر لیتی تھیں۔ کچن کو دیکھ لیتیں۔ ان سب کے لیے دھپہ رکھا بناؤ کر کارخانے بھجوا دیتیں۔

کرتا۔ لیکن سات مسندوں کے درمیان میں ان سے اتنا دور ہو جانے سے اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

وہ اپنے ڈپارٹمنٹ اپنی یونیورسٹی کی خوب صورت ترن لو کی قرار دی جانے لگی۔ اسے رنگ رک کر مرکز دیکھا جا کہ۔ پہلے وہ بے چاری تھی۔ بسوں پر رکشوں میں دھکے کھانے والی، کاؤنٹر کے پیچھے فاسٹ فوڈ کی ٹرے دینے والی، دیکھنے والے اس پر سمجھ کر دیکھتے تھے۔ اب وہ لمبے کرتوں اور رنگ پاجاموں میں، ٹیک کو کندھے پر لٹکائے، فائل کو ہاتھ میں پکڑے دیکھنے والوں کو پہنچنے سے دور نظر آتی۔ اس کے ڈپارٹمنٹ کے لڑکے اس سے بہانے بہانے بات کرنا چاہتے تھے۔ اس کی ٹوہ میں گھر رہتے تھے۔ چند ایک لڑکیوں سے اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ ان سے بات چیت ہوتی ہی وہ انہیں بتا چکی تھی کہ مس نہیں سمجھتا۔ اس سے مسز کا ستے ہی لڑکیاں اس پر سوالی کی بوجھا کر دیتیں۔ انہیں بہت سے چینی ہوئی تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ اگر یہ ایسی لڑکی ہے تو وہ کیسا ہوگا۔

لڑکیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انہیں جھوٹ لگا۔ ایک نے اسے سفید جھوٹ کہا۔ وہ جانتے تھے کہ لڑکیاں لڑکیوں سے دور رہنے کے لیے مشہور روکتی ہیں کہ ان کا نکاح ہو چکا ہے یا منقح ہے۔ اگر یہ سفید جھوٹ بھی تھا تو افنی کا انداز ایسا تھا کہ لڑکا اس کے قریب جانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ فرزام سے شادی ہونے کے باوجود وہ لڑکیوں سے نفرت کرتی تھی۔ جہاں لڑکے اسے موبائل ہاتھ پکڑے یا باتیں کرتے نظر آتے تھے اس کا خون کھڑک جاتا۔ لڑکیوں کے گروپ میں ہنسی کے فوارے پھوٹ رہے ہوتے تو اس کے سینے ٹپکنے لگتے۔ اسے ہو جاتا کہ کسی لڑکی کا مذاق اڑایا جا رہا ہوگا۔ وہ

سے نفرت کرتی تھی یا ان سے خوف زدہ تھی۔ اس کا انداز اس نے اپنے چہرے پر کبھی نہیں آنے دیا تھا۔ ہاں اس کی ذات میں ایک واضح نشان ضرور بن کر ابھر آیا تھا۔

”دور رہو۔“ جب وہ اور مسز کو ہر کسی ہوٹل میں منعقد کسی ٹرانس میں جاتیں تو لوگ اسے کوئی بڑی ڈیڑا سنر سمجھتے۔ وہ دونوں دوسروں کے کام کا بغور مشاہدہ کرتی تھیں۔ اس سے انہیں اپنے کام میں جدت لانے کے لئے نئے آئیڈیاز ملتے تھے۔ فیشن سے متعلق ہونے والے ایونٹ میں وہ دونوں اکثر جایا کرتی تھیں۔ ان کا اپنا ارادہ بھی ایک ایونٹ کروانے کا تھا۔ لیکن ابھی نہیں۔

آج کل وہ کرائے پر ایک کارز یا دکان حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اب وہ ایک اور دکان کا کرایہ انورڈ کر سکتے تھے۔ ایڈوانس بھی ان کے پاس تھا۔ وہ سری طرف مسز کو ہر کا خیال تھا کہ اگر کوئی مناسب دکان نہیں ملتی تو کسی اچھی سوسائٹی یا ٹائون میں وہ لوگ ہوا ر قطر پر ایک اچھا گھر لے لیں۔

افنی اس کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ فی الحال بزنس کو ہی ترقی دی جائے۔ فرزام کا وٹ مسز کو ہر کے حق میں گیا اور اس نے گھر لینے کے لیے کہہ دیا۔ اس کا مشورہ یہ تھا کہ جو ادائی گھر کے کرائے کے سلسلے میں کی جاتی ہے وہی گھر کی قسط کی مد میں ادا کر دی جائے گی اور دکان کے ایڈوانس کے لیے وہ کچھ اور انتظار کر سکتے تھے۔

لاہور کے مرکز سے ذرا سادہ اور ایک اچھے ٹائون میں انہوں نے ایک چمکے کی ایڈوانس پے منٹ کر دی۔ بدلی رقم انہیں دو سال کے اندر راندر اوائی تھی۔ مسز کو ہر کی خوشی دیکھنے لاق تھی۔ جیسے انہیں ان کا بچا ہوا گھر دیکھ کر لگ گیا ہو۔ وہ بے حد خوش تھیں۔ جمال اور اسد کو الگ الگ کمرے مل گئے۔ افنی کو اپنے شوہر کا اپنا گھر مل گیا۔

سیاہ لالک کوٹ پہنے وہ ٹرائل کھینچی شیشے کے دروازے کے پار دیکھ رہی تھی۔ اس کی فلائٹ وقت پر آئی تھی۔ لیکن اس کا سامن کم ہو گیا تھا۔ اسے اپنے سامن کو ڈھونڈنے میں کافی وقت لگا۔ وہ لوگن انٹر نیٹشل ایر پورٹ پر موجود تھی۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ فرزام اس کا انتظار کر کے چلا گیا ہو۔ اس نے کل ہی کہا تھا کہ اگر فلائٹ کے ساتھ کچھ ہوا تو وہ ایر پورٹ پر سو جائے گا۔ وہاں سے جائے گا نہیں اور وہ ہٹنے لگی تھی۔

”اے شہر میں نیند آجائے گی؟“

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بیا بادل	آصفہ یاس	500/-
ذروم	راحت جمیل	750/-
دعائی اک روٹنی	رحمان گارہ بان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رشاد گارہ بان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازبہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازبہ چوہدری	250/-
دل ایک شہرچوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فاخرہ انصار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فاخرہ انصار	600/-
چھلان دے رنگ کالے	فاخرہ انصار	250/-
یہ گلیاں یہ چہ پارے	فاخرہ انصار	300/-
تین سے گورت	فرخ العزیز	200/-

ناول نگاران کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ 30/- روپے  
نگارنے کا پتہ:  
کتبہ محمدان ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی۔  
فون نمبر 32216361



وہ علامہ اقبال ایئر پورٹ نہیں ہے، جہاں آوے  
سے زیادہ لوگ چمک مٹانے آجاتے ہیں۔ امریکیوں کا  
ہوائی اڈہ سب ہزار کیا لاکھ بھی ہوں تو شور نہیں ہوتا۔  
”کتنے اچھے ہیں امریکی پاکستانیوں کو تو کچھ آتا ہی  
نہیں۔“

”ظہرت کرو۔ سلمان باندھ لو۔“

”وہ تو میں نے کب سے باندھ دیا۔“

”میرے لیے کیا لاری ہو؟“

”شکلور سوٹ۔“

”ہیں۔ اور؟“

”اور بس۔“

”جنا میں بس لانے دیں گے کیا؟“ ذہرت تک تھمے  
گو چتا رہا۔

امریکا میں پاکستانی کمیونٹی نے ایک نمائش کا اہتمام  
کیا تھا۔ فرزام نے ان کے لیے بھی ایک انشالہ ایک  
کروا دیا تھا۔ ان دونوں افق کے ایم اے پارٹنر کے  
امتحان چل رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں ہی  
آجائیں، لیکن صرف مسز گوہر کو ہی جانا پڑا۔ وہاں امریکا  
فرزام کے پاس رہ کر اور کالیباہ نمائش چٹا کر وہ واپس  
آگئیں۔ کارخانے میں ان میں سے کسی ایک کا ہونا  
بھی ضروری تھا۔

امتحانات کے باوجود افق نے کارخانہ سنبھالنے  
رکھا۔ اس بار کسی ہی ایک اور نمائش کے لیے افق  
جاری تھی۔ اس کا ایم اے ہو چکا تھا۔ رزلٹ آنے  
والا تھا۔ فرزام بھی ایم ایس سی کر چکا تھا۔ جاہ وہ پہلے  
ہی کر رہا تھا۔ آج کل ایک دو کورسز کر رہا تھا۔ امریکا  
میں اس نے چند جگہ ایلائی کیا ہوا تھا اور اسے امید تھی  
کہ اسے ایک آدھ کال تو ضرور آئے گی۔

افق کا ذہن وہ پہلے سے ہی بنا چکا تھا کہ ایم اے کے  
بعد وہ ڈریس ڈیزائننگ کا کورس امریکا سے کرے گی۔  
مسز گوہر اس کی ایسی باتیں سن لیں تو بہت خستیں۔  
”ہاں! ہاں! بھگ جاؤ، بھگ جاؤ، سب بھگ جاؤ،  
پہلے تم بھاگے، اب افق کو تیار کر رہے ہو۔“

”یہ میری ماں نے کیا افق کی سانس ہے؟“

”دونوں نے“ وہ کھکھلائی۔  
افق کافی دیر سے کھڑی تھی۔ فرزام نظر اتر کر  
وے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نکلتے ہی اسے سارے  
کھڑا لے گا۔ لیکن اسب ہاں لڑا دور سے آئے  
اسے نظر آیا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔  
ڈھائی سال دونوں نے ایک دوسرے کو آن لائن نہ کر  
تھا۔ ڈھائی سال لپٹاپ سے اپنے سامنے رہے  
تھے۔ اس نے اس کی ہر حرکت سنی تھی۔ بہت سے  
لطیفوں پر ہنسی تھی۔ اس کی خریدی گئی ہستی کی چھٹائی  
کو تپند کیا تھا۔ بخار اور زکام میں اس کی سرخ ناک کا  
ذائقہ اڑا رہا تھا۔ اور اسب وہاں کھڑے بھاگتے  
ہوئے ایک شخص کو اپنے قریب آتے دیکھتے افق کو  
عجیب لگ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس پر اس  
کی پہلی نظر پڑی اور اس کے دل نے چاہا کہ چلا آئے  
لگا کر باہر آجائے۔ اس پر اس کی نظری پڑی تو ہی نہیں چاہا  
کہ وہ نظرواپس لوٹ آئے۔

دونوں کی نظریں ملیں۔ فرزام خوش دلی سے  
مسکرایا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھول تھے۔ اس کے  
قریب آکر وہ بریک لگانے سے انداز میں رک۔

”او میری افق!“ پھول اس کے ہاتھ میں دے۔  
”ایک ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ایک گھنٹے سے سڑک  
جام تھی۔“

اس نے پھول پکڑ لیے۔ فرزام نے ٹرائی سنبھال لی۔  
”کسی نے تمہیں جنازے سے اتر جانے کے لیے تو  
نہیں کہا؟“

”ایک نے مشورہ دیا تھا کہ اتر جاؤ۔ کیوں پاگل  
کے ملک میں جاری ہو۔“

فرزام کا ذہن ایئر پورٹ کی عمارت میں بکھر گیا۔  
بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر لگ رہا تھا  
کہ وہ بہت دل لگا کر تیار ہوا ہے۔ اس کے بالوں کا  
اشاکل اس کا نیا نیا لائٹ نیا منظر تھی کھڑی خاص  
پرفیوم۔

اس نے ان میں سے ایک بھی چیز اسے آن لائن  
نہیں دکھائی تھی۔ وہ سب کا حال چال پوچھتا۔ اس

سلمان کلر میں کتنے لگے۔  
”سفر میں لوری ہوئی ہوگی ہے؟“  
”نہیں۔ میں یہ کتب پر سوتی رہی۔“ اس نے  
پھولے ہوئے بیک کی طرف اشارہ کیا۔ فرزام کا خیال  
تھا کہ کسی کہ وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ ان  
مگزے سالوں میں دونوں میں بہت اچھی دوستی ہو چکی  
تھی۔ فرزام جیسے لڑکے پر افق کو بہت تازہ تھا۔ افق جیسی  
بیوی فرزام کو بہت چاری ہو گئی تھی۔

فرزام کا چھوٹا اقلیت بہت پیارا تھا۔ شروع میں وہ  
ہاشل میں رہتا تھا۔ پھر چار لڑکوں کے ساتھ لارمنٹ  
شیر کیلہ جب اسے اچھی جاہل مل گئی تو اس نے اپنا  
اگلیٹ لے لیا۔ اس فلیٹ میں سلمان کی ہم تھا۔  
افق کے لیے اس نے ذرا اچھی طرح سے اسے  
ڈیکورٹ کر لیا تھا۔ وقت نکل نکل کر مار کھٹوں میں  
دھکے کھاتا رہا تھا۔ پروے ’صوفے‘ ٹیبل برتن آہستہ  
آہستہ اس نے بہت کچھ لے لیا تھا۔ فلیٹ دو بیڈ رومز  
لاؤنچ کچن اور ڈرائنگ ایریا پر مشتمل تھا۔

”یہ میں کے گھر چتا ہوا نہیں ہے۔ لان بھی نہیں  
ہے۔ الگ ڈرائنگ روم بھی نہیں ہے۔ یہ بڑے  
بڑے ہاتھ روم بھی نہیں ہیں، لیکن یہ چتا بھی ہے،  
سارے کا سارا تمہارا ہے۔“

افق فریٹ ہو گئی تو وہ اسے ڈنر کے لیے لے گیا۔  
”کیسا لگ رہا ہے یہاں آکر؟“

”اچھا ہے۔“ افق نے فرزام سے نظر بچا کر ہال پر  
ایک نظر دوڑائی۔

”اور میں؟“

اس نے جیسے سنائی نہیں۔ مسکراہٹ چھپا گئی۔

”گورنر؟“ اسے بار چلا کر پوچھا۔

”ٹھیک ہی ہیں۔“ وہ انتوں میں ہونٹ کا دائیں  
طرف کا گونبا کر کہا۔ ہنسی کا توارہ نکلتے کو تھا۔

”پورے سو ڈالر دینے کے بعد میں ٹھیک ہی ہوں  
بس۔“

افق نے سو ڈالر پر سوالیہ دیکھا۔

”جی ہاں۔ Men's Spa سے آ رہا

ہوں۔ سو ڈالر میں تیار ہو کر۔“  
انداز میں خفگی تھی۔ سو ڈالر ضائع جانے پر یا  
تعریف نہ کیے جانے پر۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی تو دیر  
تک ہنستی ہی رہی۔ وہ کوئی لیڈی ڈانسا تھی جس کے  
آنے پر وہ اس طرح سے بن گئی رہا تھا۔ افق نے  
آتے ہوئے لب گلوڑ لگایا تھا جو اتنی لمبی فلائٹ میں  
کب کا گم ہو چکا تھا۔ یہاں آتے ہوئے بھی اس نے  
صرف کپڑے ہی تبدیل کیے تھے۔ بلیک شیفون کا  
سوٹ جس کے تنگ بازوؤں پر سفید موتیوں کی ٹین  
لائن بنی تھیں اور ایسی ہی ٹین لائنیں دوپٹے کے  
چاروں طرف تھیں۔ سامنے سے بال اٹھا کر انہیں چند  
بل دے کر پیچھے پن لگائی تھی اور بالوں کی ڈھیل چلی بنا  
کر انہیں پیچھے سے لاکر بائیں کندھے پر رکھا تھا۔  
وہاں کندھے پر دو ہاتھ سے جمایا ہوا تھا۔  
”اب تمہیں بہت جی آیا کرے گی۔“

”کیوں؟“

”میں اب بہت الٹا پٹا سا چمک رہا ہوں۔“

اسی انداز میں وہ اور ہنسی۔

”دیکھا۔ مجھے معلوم تھا تمہیں بھی بتا دیا ہے۔“

ساتھ ساتھ وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے۔

”تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے ٹھوٹے پھرنے کے  
لیے۔“

”پھر؟“ وہ سمجھی کہ شاید ایک ہفتہ بعد وہ کہیں چلا  
جائے گا۔

”پھر تمہیں نہیں معلوم؟ ایونٹ پر نہیں جانا  
تمہیں نمائندگی کرنے؟“

”جی ہاں! اسے یاد آیا کہ یہاں وہ چنری آؤٹ لیٹ  
(Out let) لے کر آئی ہے اور کچھ پاکستانی  
یوتھ مالکان تھے جن سے ان کی بات چیت چل رہی  
تھی۔ اسے فرزام کے ساتھ مل کر یہاں مستقل ایک  
کارنڈومینٹا تھا۔ ان کے جو مستقل کسٹمرز سٹور میں  
رہتے تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا ہر طرح کی مدد کرنے  
کا۔ ایونٹ دس روزہ تھا اور اس کے بعد ہی کچھ ہو سکا  
تھا۔ ابھی تو ہی لائل فرزام کو شپ منٹا تھا۔“



پاکستانی اور انٹرن کیونٹی نے مل کر اس ایونٹ کا اہتمام کیا تھا۔ ان کے ایک کلائنٹ نے ہی انہیں اس کے بارے میں بتایا تھا۔ باقی معلومات فراہم کرنے والے بھی۔ بینک انہیں آسانی سے مل گئی تھی۔ وہ نوزد ایونٹ ٹھیک ٹھاک رہا۔ جب کے ساتھ ساتھ فراہم نے اس کی مدد بھی کی۔ اسی ایونٹ کے دوران ان سے ایک بڑی اور فعال این جی او کا نمائندہ ملا وہ انہیں این جی او کی طرف سے کرائے جانے والے دوسرے ایونٹ میں شامل ہونے کے لیے راضی کر رہے تھے۔ جس کا مقصد فنڈز اکٹھا کرنا تھا۔

این جی او ٹھوڈرولڈ میں بچوں کی عام ویلٹی بیماریوں کی ویکسین مفت سلائی کرنے کا کام کرتی تھی اور اس کی لیے وہ کیونٹیر کو اکٹھا کر رہی تھی۔ این جی او کے ساتھ کام کرنے والے مجموعی نتائج کا پچیس فیصد رکھ سکتے تھے۔ باقی کامناغ انہیں این جی او کو فنڈز دینا تھا۔

افق نے پاکستان میں مسز کو ہر سے بات کی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ مطلوبہ آرڈر تیار کروا کے امریکا بھجوا سکتی تھیں۔ افق نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ معاہدے کی رو سے اگر وہ ایک خاص شرح سے زیادہ فنڈز اکٹھا کر کے دیں گی تو اسے این جی او کا رکن جانا جائے گا اور وہ این جی او کو اپنی آراء اور مشوروں سے نواز سکتی ہے۔ ایونٹ کے باقاعدہ شروع ہونے میں ایک مہینہ تھا۔ ہفتہ اور اتوار دونوں انہیں شہر کے مختلف کیونٹی سینٹرز میں نمائش منعقد کرنی تھی۔ ہر ہفتے نئی جگہ ہوگی۔

این جی او نے اسے در رضا کار بھی دے دیے۔ کام کرنے اور کسی بھی مسئلے سے نمٹنے کے لیے۔ مقامی اور غیر ملکی پچاس سے زیادہ گروپس شرکت کر رہے تھے۔ پمفلٹ پر "ہینز" کو بھی نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ اخبارات میں اشتہارات دیے گئے۔ نی وی میں فنڈز ریزنگ کے لیے تشہیر کی گئی۔

اس سے آں لائن رابطے میں رہتی۔ دونوں آپس میں ڈسکس کرتی رہیں کہ کس ڈیزائن اور کس سٹائل کو لے کر کام کرنا ہے۔ رنگ کون سے اچھے رہیں گے اور کس کپڑے کو پوسٹن کے لوگ پسند کریں گے۔ پاکستانی مخصوص روایتی لباس ہی بنا رہے تھے۔ لیکن کیونکہ اس ایونٹ میں ہر ملک کے لوگ آنے والے تھے تو انہوں نے چیز پر پہننے کے لیے مختلف ڈیزائن کے کرتوں پر بھی کام کیا تھا اور چھوٹے کراس بیک پر ٹین اینچلو کریں کے اسٹائلز پر بھی۔

یہ ایونٹ تین مہینے تک جاری رہتا تھا۔ ان کے پاس کام کے لیے وقت تھا پہلا اسٹاک جلد ہی مل جاتا تھا۔ این جی او کی طرف سے انہیں بریفنگ دی جارہی تھی اور ٹریڈ کیا جا رہا تھا۔ انہیں بتایا جاتا کہ انہیں کیسے اپنی مصنوعات کو ڈسٹریبیو کرنا ہے۔ کم سے کم براڈ ٹیک کیا ہونے چاہئیں اور زیادہ سے زیادہ کیا۔ انہیں پہلے جمع کیے گئے فنڈز کے بارے میں بتایا گیا۔ انہیں اچھی طرح بریف کیا گیا کہ کس طرح وہ پہلے سے زیادہ فنڈز اکٹھا کر سکتے ہیں۔ این جی او کے ریکارڈ کو توڑ سکتے ہیں۔ ان سے سوالات کیے جاتے۔ مشورے مانگے جاتے۔ انہیں ٹھوڈرولڈ کے بیمار بچوں کی مختصر ڈاکومنٹری دکھائی جاتی تھی۔ یوں انہیں فنڈز ریزنگ کے لیے اچھی طرح تیار کر دیا گیا۔

ایک بار ملا نے کہا تھا کہ افق "خیر" ہے۔ تم تو زیادہ ہی "باعث خیر" بن گئی ہو۔ "بات اچھی تھی لیکن انداز اور افسردہ تھا۔ وہ ڈانٹنگ ٹیمیل کی کرسی پر بیٹھی اپنا کام کر رہی تھی۔ قریب ہی پاکستان سے بھیجا گیا پہلا اسٹاک بکرا رہا تھا۔ وہ انہیں جانچ رہی تھی اور الگ الگ کر رہی تھی ساتھ ساتھ پیڈر فوش لکھتی جارہی تھی۔ ایونٹ کے پہلے ہفتہ کے لیے وہ خاص انٹرس کلیکشن کا انتخاب کر رہی تھی۔

"کیا مطلب ہے؟" بین کو تیزی سے چلاتے اس

نے پوچھا۔ فرزام نے آگے بڑھ کر اس کا پین اچک لیا۔ "کو تو میں نہ جاؤں۔" قریب ہی کی کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔

"اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔" "کہیں؟" "کیونکہ وہ دونوں ہاتھوں کو اواسی سے گھوڑی کے پیچ کر رکھا۔

"آپ کے آفس والے بھیج رہے ہیں؟" "نہیں۔ آج پہلے میں نے وہاں کی ایک کمپنی کو درخواست دی تھی۔ ساتھ ہی اپنے کام کی تفصیل اور سی ڈی بھی بھیجی تھی۔ کمپیوٹر سے متعلق کچھ نئی اصطلاحات پر کام کیا ہے میں نے۔ چند سوفٹ ویئرز بھی میں سمجھتا ہوں کہ میں کامیابی سے بنا سکتا ہوں۔ وہ مجھے انٹرویو کے لیے بلارہے ہیں۔" باتیں وہ اچھی کر رہا تھا۔ لیکن نہ بگڑتا ہی جا رہا تھا۔

"تو جا میں نا۔" دراصل وہ سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ وہ اس کیوں ہو رہا ہے۔ "ہاں تو جا ہی رہا ہوں۔" وہی لالی باپ نہ ملنے کا انداز۔ افق کو حیرانی تھی کہ وہ خوش کیوں نہیں ہے۔ "تم پچھلے پندرہ نہیں کرتیں؟" اس نے اچانک پوچھا جیسے دراصل یہی پوچھنا چاہ رہا ہو۔ افق نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا اور یہ کیوں سمجھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی۔

"کیسے سوال ہے۔؟" وہ واقعی حیران تھی۔ تم مجھے روک ہی نہیں رہیں۔ تمہیں کتنا چاہیے تھا کہ نہ جا میں نا۔ تمہیں کہہ دیا کہ جا میں نا۔

افق پچن میں کام کر رہی ہوئی اور وہ اس کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا تو کچھ نہ کچھ ضرور افق کے ہاتھ سے گر جاتا اور وہ مسکراہٹ دیتا یا پچن سے چلا جاتا۔ اگر انہیں ایک ہی صوفے پر بیٹھنا ہو تا تو وہ ذرا فاصلہ رکھ کر بیٹھتے۔ ورنہ الگ الگ صوفوں پر ہی بیٹھتے۔ وہ روٹاس کے دور میں داخل ہو رہے تھے۔ لیکن روٹاس کرتے نہیں تھے۔ افق جب آگئی ہوئی، بس میں بیٹھے۔ ٹیوب میں۔ این جی او کی بریفنگ لیتے۔ سبزی اور گوشت کی خریداری کرتے۔ دھیر سارے پکڑ کو ہاتھ میں پکڑے۔ فٹ ہاتھ پر چلتے۔ سڑک کو پار کرتے۔ گٹ لیتے۔ گھر کا لاک کھولتے۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوئی۔ وہ دن رات اسے سوچتی۔ کام کے دوران بھی اسے کھوتی۔ پاکستان میں وہ اس کے ان لائن آنے کا انتظار کرتی تھی۔ یہاں وہ اسے بار بار دیکھنے کا انتظار کرتی تھی۔ پاکستان میں وہ انتظار کم تھا۔ یہاں بہت بڑھ گیا تھا۔ فرزام اس کا شوہر تھا۔ جس کے کھوجانے کا اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ جس کے چلے جانے کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ وہ اسے بہت بہت پسند کرتی تھی۔ بہت یاد کرتی رہی تھی۔

"نہ جانیں۔" اس نے اگتو سے کہہ دیا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ سمجھے کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی اور وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ جس کام کے لیے اس نے اتنی محنت کی ہے۔ وہ صرف اس کی وجہ سے اس محنت کا ثمر نہ کھائے۔ اگر وہ امریکا نہ آتی ہو تو وہ چلا ہی جاتا۔ اس طرح اس کے کہنے پر وہ بہت خوش نظر آنے لگا۔ جیسے جانا تو اسے بھی ہے۔ لیکن روکے جانے کی اسے بہت خواہش ہے۔

"میں تمہیں یہاں بلا کر خود یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں۔ انٹرویو تو ہمانہ ہے۔ میرا کام انہیں پسند آگیا ہے۔ وہ میرے آگے کانٹریکٹ رکھ دیں گے۔" ٹیمیل پر رکھے اس کے ہاتھ پر اس نے ہاتھ رکھ دیا۔

افق کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ اٹھالے اور یہ بھی کہ وہ اس کے ہاتھ پر رہی رہے۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ جانا بھی چاہ رہا ہے

”ایسے سنہری موٹے بار بار نہیں ملتے۔“  
اس بات پر وہ خاموشی میں سمٹ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ فیصلہ وہ خود کرے۔ اگر وہ اسے جانے کے لیے کہے تو شاید وہ بار بار ان جانے اور اگر روک لے تو اس کا خواب توڑ دے۔

دولن وہ ایسے ہی الجھ رہا۔  
”اس پر دیکھتے ہوئے کام کرنے سے مجھے اچھے خاصے پیسے ملیں گے۔ میں کافی امیر ہو جاؤں گا۔ بہت زیادہ لپٹے پیسوں والا۔ پھر تم میرے ساتھ پیرس چلو گی۔“  
یہ صرف ایک سوال تھا۔ لیکن سر ہلانے سے پہلے جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو جانتا کہ یہ صرف ایک عام سا سوال نہیں ہے یہ ان دونوں میں چھپی ہوئی ”محبت“ ہے۔ مدھم مدھم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں اور آنکھوں میں چمکی۔ فرزام کی نظریں اسی چمک پر جم چکی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ طے ہوا۔ ابھی تو ایسا ہے کہ زندگی افزا تقری کا شکار ہے۔ تم فنڈ ریزنگ کے لیے کام کر رہی ہو۔ یوسٹن میں تمہیں ایک کارنر بھی چاہیے۔ مال مجھے بار بار فون کر کر کے کہہ رہی ہیں کہ ان کے کارنر کا کیا بنا۔ ایک دو لوگوں سے بات چل رہی ہے۔ ساتھ چلنا۔ تم بھی مل لینا اور میرے آنے سے پہلے ہر کام سے فارغ ہو جانا۔ ٹھیک ہے۔ ساتھ سر بھی بلایا۔

”رہ جیٹ رہی کام کروں گا۔ کمپنی مجھے جاب بھی دے گی۔ لیکن مجھے کینیڈا میں نہیں رہنا۔ وہاں کاموسم نہیں پسند مجھے۔ اگر وہ مجھے برطانیہ میں اپنی کمپنی کی برانچ میں سیٹ کر دے تو ٹھیک ہے۔ میرے بھی کچھ خواب ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ میں برطانوی حکومت کو یہ پاسکوں کہ انہوں نے کس قدر لائق فائق لڑکے کو نکال باہر کیا۔ دیر داہینے سے انکار کر دیا۔ اس بار انہیں مجھے اعزاز سے دینا ہونا ہو گا۔“

لما کہتی تھیں کہ وہ پریشانی اور خوشی میں بولتا بہت ہے۔ اب ان کی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوشی

میں بول رہا ہے یا پریشانی میں۔ ان کے سوجھا کہ ایک بار پھر فرزام کو روکنا چاہیے۔ شاید وہ یہی چاہتا ہے۔  
”مگر دل نہیں چاہتا وہ جانیں۔“  
بولتے بولتے رگ کر رہا اسے دیکھنے لگا۔ ”مگر کر رہی ہو؟“

سر ملی میں بلایا۔ ”روک رہی ہوں۔“  
”اب میں تمہیں پیرس گھوما کر رہی ہوں گا۔ چر دونوں کی بات ہے عیس سیٹ ہو جاؤں گا۔“ آخری بات کہتے کہتے منہ کو زیادہ لٹکا یا۔

بہتے کے اندر اندر وہ چلا گیا۔ وہ اپنے کام میں بے حد مصروف تھی۔ لیکن اس بار یہ مصروفیت اسے اچھی نہیں لگی۔ یوسٹن آنے کے بعد وہ غمت و غم سے بھرے تھے۔ وہی ٹھیک تھا۔ وہ کام سے نہیں کھٹکتی تھی لیکن اب اسے اپنے آس پاس فرزام چاہیے تھا۔ جیسے وہ نیبل پر بیٹھی کام کر رہی ہو تو وہ اچانک سے اس کا پین آکر اچک لیتا۔ سندس کو ”بلانے بائے“ کہتا۔ چاکلیٹ دو دھو گاگلاس اس کے سامنے لا کر رکھتا اور ایم پی ٹھری کے ایر فون اس کے دونوں کانوں میں لگاتا۔

”پہلے گاگلاس ختم کرو۔ پھر کم سے کم تین گانے سنو۔ پھر کام شروع کرنا۔“ وہ گاگلاس پی جاتی۔ تین گانے سن لیتی اور پھر سے پین پکڑ لیتی۔ رات گئے سندس کے ساتھ ڈیو جیٹ پر جب وہ ڈسکشن کر رہی ہوتی تو قریب ہی صوفے پر آ کر آرتھ جھٹ لینے وہ اپنی جمائیاں روک رہا ہوتا۔ بظاہر وہ پی وی دیکھ رہا ہوتا۔ لیکن دراصل اسے الارم دے رہا ہوتا کہ اب بس کرو کام۔ اور دوسری تیسری بار جب وہ اس پر نظر ڈالتی تو وہ صوفے سے لڑھک کر نیچے کارپٹ پر سوتا ہوتا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ انیلا سا بیچ بن گیا ہے۔

اور افق جیسے اقوام متحدہ کی سفیر بن گئی تھی۔ کام اس کی طرف بھیجنے چلے آتے۔ گھر کے کام اور کھانا وہ پہلی فرصت میں ہی بناتی تھی۔ باقی کے اپنے کام سارا وقت کرتی۔

”ایسا تم روز کھانا بناتی ہو یا رات؟ ایک دن وہ آفس سے آکر بولنے لگا۔“

”بہن بھائی کر دوں؟“  
”بہن کسی ہی دیا کر کہو۔“ فرزام جی! مجھ سے نہیں ہوتے اتنے کام۔ یہ کھانا دانا میں نہیں بنا سکتی اب۔ جلیں! کہیں باہر چل کر کھاتے ہیں۔“ وہ اس کی آواز اور انداز کی بحال اور نعل اتار رہا تھا۔

”فرزام جی!“ اسی کی طرح ”فرزام جی!“ کو تان میں کھینچا۔ ”ہم یہ کھانا باہر چل کر کھالیں؟“  
”یہ کھانا باہر کہاں؟“  
”اس بلڈنگ کے گارڈن میں۔“ ہاتھ سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہارا خیال ہے کہ باہر کھانا کھانے سے میرا یہ مطلب ہے گھر میں بیٹا اور باہر جا کر کھالو۔ ہو گیا باہر جا کر کھانا۔ ایسا کرتے ہیں کسی ہونٹ کی پارکنگ میں اپنے پیچ پیٹیشن اور گاگلاس لے کر چلتے ہیں اور وہاں کھاتے ہیں کھانا۔ ایسے ہو جاتے گا ہوٹل میں کھانا کھانا۔“

وہ خوب ہنسی اور منٹوں میں تیار ہو کر آگئی ”چلیں۔“  
”کہاں؟“ فرزام کو معلوم تو تھا۔ لیکن اسے چڑا رہا تھا۔

”ہوٹل کی پارکنگ میں کھانا کھانے۔“  
دونوں جی جان لگا کر بٹھے۔



فرزاد رنگ کا سلا ایونٹ ٹھیک ٹھاک رہا۔ لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔ افق کا اسکور بھی اچھا رہا۔ غلہ آئندہ کے لیے وہ اوپر پر امید ہو گئی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی مصنوعات میں وہاں کے لوگوں کی پسند کا خاص مرکز کیا تھا اور کتنا زیادہ پسند کیا گیا اور کیا پسند کیا۔ لیکن ان کے ذہن میں ایسے تھے کہ لگتا تھا کہ ہاتھ سے بنائے گئے ہیں۔ مشینی کرکھائی میں

یورپین ممالک ہر ملک سے آگے ہیں۔ اس لیے وہاں کے لوگ ان چیزوں میں خاص دلچسپی لیتے ہیں جو کسی دوسری ثقافت کی نمائندہ ہو۔ ان کڑوں پر روایتی ٹانگوں کو مشین سے بنایا گیا تھا۔ کیونکہ ہر شخص وہ چیز لینا چاہتا ہے جو کسی دوسرے کی پاس نہ ہو تو ایسے میں دوسرے ملکوں کی روایتی چیزیں دھڑا دھڑ فروخت ہوتی ہیں۔ ہندوستانی اسٹالوں پر بھی کم و بیش ایسی ہی چیزیں تھیں۔ لیکن رنگوں اور ڈیزائن میں فرق ایک چیز کو دوسری سے الگ کر رہا تھا۔ وہاں ان کا مقصد منافع نہیں محض زینت اور سب ہی چاہتے تھے کہ وہ اچھے فنڈز اکٹھے کر لیں۔ افق کو اچھا لگ رہا تھا اس جی اوکے کے لیے کام کرنا۔ مختلف طبقہ ہائے زندگی اور شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے بے شمار امریکی معشوروں معروف قانون دان، کھلاڑی، صحافی، اساتذہ، ڈاکٹر، وکیل، سینئیر زور بے شمار دوسرے لوگ رضا کار بنے ہوئے اپنے اپنے طور پر کام کر رہے تھے۔ سالن کو اٹھانے اور صفائی کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ جو دو رضا کار اس کے ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک ساٹھ سالہ سرجن ڈاکٹر تھے۔ دوسرا رضا کار ایک نوجوان لڑکا تھا۔ جو ایک امیر باب کا بیٹا تھا۔ ایسی صورت حال میں افق کا جذبہ اور بلند ہو گیا۔

واپسی پر وہ فرزام کو ایک ایک بات بتاتی۔ پیر تک وہ مصروف رہی۔ اگلے دو دن اس کے پاس بہت وقت تھا۔ اس نے گھر کے لیے ضروری خریداری کی۔ فرزام کے دوست کی بیوی نعل اس کے ساتھ ہی تھی۔ اس نے زندگی میں کسی لڑکی کو لپ اسٹک کے لیے اتنا جنونی نہیں دیکھا تھا جتنی وہ تھی۔ وہ شاپنگ مال میں، ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے، ریستورنٹ میں آکس کریم کھاتے ہوئے اس پاس موجود خواتین پر نظریں گاڑے رکھتی۔ ان کے ہونٹوں پر۔۔۔ اگر خاتون دور ہو تو آنکھیں سکڑ لیتی۔ ورنہ ذرا آقا قریب چلی جاتی۔ وہ اس حساب کتاب میں رہتی کہ چمکتی آنکھوں والی سنہرے بالوں والی گھٹائی رنگت والی لڑکی نے جو پیرل سی ڈوراسی ہلی اور بے بی پنک سے ذرا سی گری لپ اسٹک یا لپ



گلوڑ لگا ہے۔ وہ اس کے پاس ہے نہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہتا جاتی۔  
”یہ جو نیلے اسکرٹ میں لڑکی گزری ہے ناہل۔ وہ وہ۔ اس نے جو لپ اسٹک لگائی ہے وہ میرے پاس ہے۔ اور وہ جو موٹی عورت نے لگائی تھی وہ نہیں ہے۔“ اکثر وہ ان کے پاس چلی جاتی۔ جن سے ہاتھ پر برائے اور لپ اسٹک کا نمبر لکھتی اور ”تھینک یو“ کہہ کر پلٹ آتی۔

اس کے وارڈروب میں اتنے کپڑے اور جوتے نہیں تھے جتنے لپ اسٹک اور لپ گلوڑ کے پاس تھے۔ اتنی میک اپ نام کی چیز سے واقف نہیں تھی۔ نہ ہی اسے شوق تھا۔ لیکن مکمل کے کہنے پر اس نے میک اپ کی کچھ چیزیں لے لیں۔ اس نے سوچا کہ وہ میک اپ کر کے فرزام کو حیران کر دے گی۔ اسے بھی معلوم ہو کہ وہ اس کے لیے کیا کچھ کر سکتی ہے۔

اسی دن شام کو وہ کلوچ پر دراز ایک پرانی فلم دیکھ رہی تھی۔ قریب ہی چائے کا بڑا مک رکھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک وہ مکمل کے ساتھ خرید ا ہوا میک اپ کا سامان لگا لگا کر دیکھ رہی تھی۔ اسے سب اچھا ہی لگا۔ ابھی اسے میک اپ کرنا نہیں آتا تھا۔ لیکن اگر وہ روز بیکار کر لیا کرے تو فرزام کے آنے تک سلیقے سے کرنا ہی جائے گا۔

چائے پیتے، فلم دیکھتے اس نے آج خرید کر لائے میگزینز میں سے ایک کو میز پر سے اٹھالیا۔ یہ مقامی سطح پر شائع ہونے والا اردو میگزین تھا۔ نہ اسے فلم میں دلچسپی تھی نہ ہی فی الحال میگزین میں۔ اسے فرزام کے فون کا انتظار تھا۔ اس نے فون کیا تو اس نے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ ”میں بھی کرتا ہوں۔“ اور پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اس کا بھی چل رہا تھا۔

میگزین کی ورق گردانی کرتے اس کا ہاتھ ایک صفحے پر آکر ساکت ہو گیا۔ فی دی اسکرین پر ہیروئن رو رہی تھی، چلا رہی تھی۔ لیکن اسے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اندھیرے کا ایک گہرا سیلاب اس کی آنکھوں میں سے ہو کر گزر رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک پل کے

لیے تڑپ کر مر گئی۔ حسی اور سانس اکٹھے کر کے کاش احساس ہوا۔ وہ واش روم کی طرف بھاگی اور دروازہ کھولنے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ منہ صاف کر کے دوبارہ لاؤنج کی طرف آئی تو اس میگزین کو کھولنے پر اس کے اس طرح اٹھ کر جانے پر کلوچ سے گھر گیا تھا۔

اس میگزین میں عدن تھا۔ اس شخص پر نظر پڑنے ہی نفرت سے ہی سہی اس کی سانسیں اکٹھے کر لیں۔ وہ پلٹ کر وہی اتنی بن گئی تھوڑی سی اے سے غلام غلام کے ہاتھوں سے اپنی عزت بچا کر نکلی تھی۔ سر کے ٹکڑے میں چادر جھول رہی تھی اور جو سر پر جاتا پناہ کے لیے بھاگی پھر رہی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ اس شخص سے آہستہ آکر سمجھ لی تو وہ اس پر غور کر دے گی۔ لیکن اب وہ کانپ رہی تھی۔ یہ اس کا وہاں تھا۔ جس پر وہ بہت پیشین تھی۔ تھوڑی دیر وہ ایسے کھڑی کانپتے ہوئے عدن کو دیکھتی رہی۔ پھر اسے بڑھ کر میگزین کو اٹھا لیا۔

”ایم بی بی ایس ڈاکٹر عدن غلام علی (پاکستان)“ اس تعارفی صفحے کے نیچے مختصراً ”اس کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ درج تھا۔ یہ ایک آرٹیکل تھا۔ جسے ایک مقامی مسلمان صحافی نے شائع کیا تھا۔ یہ ان لوگوں کے بارے میں تھا۔ جنہیں بے گناہ یا بے حد معمول الزامات لگا کر سالوں سے جیلوں میں قید کر رکھا تھا۔ ان پر دہشت گردی کا شبہ کیا گیا تھا اور سالوں سے وہ شہر تو تصدیق میں بدل رہا تھا اور نہ ہی مخالفت میں۔ آرٹیکل میں کل بیس ایسے لوگوں کا ذکر مکمل تعارف اور تفصیل کے ساتھ کیا گیا تھا۔ باقی اعداد و شمار الگ سے تھے۔ اتنی نے آرٹیکل کو ایک بار پڑھا اور عدن کے ساتھ ہونے والے واقعے کو غور کیا۔

جب وہ بار بار اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو پڑھ رہی تھی تو شاید اچانک نے وہ اس کے بچپن کے ہاتھوں ہوئی اپنی بے عزتی کا بدلہ لے رہی تھی۔

صرف ایسا ہی نہیں تھا۔ حیرت اور افسوس کی ایک تیز دھار اس کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ ایک دم ایک ایسی لوری تختی بن گئی۔ جس پر ”عدن“ یعنی ڈوب ڈوب کر رہا تھا۔

ڈور بیل بہت زور و شور سے بجنے لگی۔ اس بار وہ آواز پر چوکی۔  
”تم ٹھیک تو ہوا؟“ نمل نے چھوٹے ہی پوچھا تو وہ اور گہرا آہنی کہ اس نے یہی کیوں پوچھا۔

”فرزام کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ تم دونوں میں سے کوئی بھی فون نہیں اٹھا رہیں۔ وہ کب سے فون کر رہا ہے۔“  
”میں واش روم میں تھی۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

لاؤنج کی طرف واپس آتے وہ اور پریشان ہو گئی۔ اسے قریب ہی رکھے موبائل کے چھ بار بجنے پر بھی پتا ہی نہ چلا۔ آخر کیوں؟ کس لیے؟

فرزام کو فون کیا۔ واش روم کا بتایا۔ وہ بات اس سے کر رہی تھی۔ دیکھ میگزین کو رہی تھی۔  
”تھک گئی ہو اتنی؟“

”نہیں تو۔“ جواب کے درمیان ذرا سا وقفہ آیا۔  
”تم آرام کرو۔ پھر بات ہوگی۔“ وہ ناراض نہیں ہو تھا۔ اس کی عتاب دہانی پر خود ہی یقین کر لیا کہ وہ تھک گئی ہوگی۔

وہ اٹھی اور لپ ٹاپ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ عدن کی تفصیل میں اس کے وکیل کا ذکر بھی تھا اور بیان بھی۔ سرچ انجن سے اس نے بوٹرن کے وکیل عبدالعزیز کو ڈھونڈ لیا۔

اتنی کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے عدن سے متعلق اس آرٹیکل کو کیوں پڑھا۔ فرزام کی کلا کو کیسے مس کر دیا اور اب اس کے وکیل کو کیوں ڈھونڈا۔ افسوس کی بات تو اس کے اندر سے اٹھی تھی۔ سب اسی کے زیر اثر کیا۔ ایسا تو تھا ہی نہیں کہ وہ عدن کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسلام آبادی۔ ایم۔ ایچ کے بلغ میں جبکہ اس نے دعا کی تھی کہ زندگی میں یہ شخص ایک بار تو ضرور اسے ملے۔ بے شک اتنی کے ہاتھ میں

کشور ہو اور عدن کے ہاتھ میں خیرات۔  
وہ اس شخص سے ضرور پوچھے گی کہ عزت سے چھوڑ دینے کے لیے تو اس نے خود کہہ دیا تھا۔ اسے دھوکا دے کر بھاگنے کی ضرورت کیا تھی؟  
وکیل عبدالعزیز کا نمبر ملایا۔

”محبت مارہ سے کرنا تھا۔ شادی بھی اسی سے کی۔ دھوکے کے لیے اتنی ہی کیوں؟“ نمل جاری تھی۔  
”اگر وہ کبھی اتنی کی زندگی میں نہ آتا تو وہ اس کے گدھے باپ کے سامنے نہ جاتی۔“

”لائبر عبدالعزیز اسمبلی کنگ۔ سواٹ کین آئی۔“  
”ہیلو یو؟“  
”ڈاکٹر عدن غلام علی کے وکیل آپ ہیں؟“

”ہاں۔“  
”کیا وہ واقعی بے گناہ ہے؟“  
”پہلے اپنا تعارف کروائیں لڈی!۔“  
”کیا وہ دہشت گرد ہے؟“

”آپ کا نام لڈی؟“  
”کتی سزا ہوگی۔؟ رہا ہو گا بھی کہ نہیں۔؟ کیا وہ سچ دہشت گرد ہے؟“

”آر بوس اتنی۔؟“  
”مس اتنی۔ مس اتنی۔ مس اتنی۔“  
فرزام کے فلیٹ میں اس فقرے کی بازگشت گونجنے لگی۔ فون اتنی کے ہاتھ سے کرتے کرتے بچا۔ وہ اسے کیسے جانتا تھا۔ سات سمندر پار۔ ایک انجانا شخص۔ جس سے آج اس کی پہلی بار بات ہو رہی تھی۔ وہ اس کا نام لے رہا تھا۔

”اگر یو دیر مس اتنی۔؟“ وہ یقین ہی کر بیٹھا تھا کہ وہ اتنی ہی ہے۔  
خاموشی کا وقفہ جاری رہا۔  
”آر بوس کسے؟“

آخر کار اس نے مری مری آواز میں ”ہاں۔“ کہہ کر ”آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“

”تو آپ مس اتنی ہی ہیں۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ پچھلے چار سالوں سے میں نے ایک ہی نام لاکھوں





کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے گھر میں ہاتھ روم میں جا کر اس نے اپنی جینیں دہائی تھیں۔ رات گئے اس کی آنکھ لگی تو خواب میں وہ دھاڑیں مارتی رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ماں بیسنے میں نہ آئیں۔ انکی انکی سانس لینے لگیں۔ اٹنے سے باقی ماندہ چٹنوں کا دم کھٹ دیا۔ اس نے اپنی ماں کی حالت کو دیکھا اور لب سی لیے در نہ جس طرح اس کے باپ کے مرنے پر اس کی چھو بھی نے پن ڈالے تھے۔ ٹھیک اسی طرح وہ بھی بین ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کی انگلی سسکی اس کی ماں کی جان لے لے گی۔ اس دن کے بعد سے اٹن اپنے وجود میں قید ہو گئی۔ کیا اسے قید کی سزا نہیں ہوئی تھی تب؟

اس کا جرم محبت تھا اور سزا کے نام پر اسے بہت کچھ بھگتنا پڑا تھا۔ محبت کے نام پر اس نے بھیا نک سزا کائی۔

”کیا آپ ہماری مدد کریں گی؟“ اس سے پھر پوچھا جا رہا تھا۔ وہ خود سے پوچھنے لگی کہ اسے اس کی مدد کیوں کرنی چاہیے۔ وہ اسے چھوڑ گیا۔ اسے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس کی مدد اس پر فرض نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی لاکھوں انسان ایسی طرح ہیں۔ ہر شخص اپنے نصیب کے مطابق ہی دکھ اٹھاتا ہے۔ جیسے وہ اپنے نصیب کے میٹھے پھل اکیلے اکیلے کھاتا ہے۔ عدنان نام کا باب اس نے اپنی زندگی سے بھاڑ پیچھا ہے۔ اب وہ اس شخص کا نام بھی کہیں شامل کرنا نہیں چاہتی۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ مجھے کوئی جواب نہیں دے رہیں۔ جس شخص نے سالوں آپ کا انتظار کیا۔ اسے یہ جان کر بہت مایوسی ہوگی۔“

”آپ اسے میرے بارے میں نہیں بتائیں گے۔“

”ظاہر ہے۔ میں ایک مایوس شخص کو اور مایوس کیوں کروں گا؟“

اتنی دہان سے اٹھ آئی اور بے مقصد سڑکوں پر چل دی گئی رہی۔ دوسرے کھانے کے لیے گئی اور آرڈر

دے کر اٹھ گئی۔ وہ بیٹھنا چاہ رہی تھی، کمرے چلنا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ پھر وقت کر رہی تھی۔ بے مقصد گھومتے پھرتے رہی۔ آگنی۔ صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ دن میں صرف کھانے لے کر رہا تھا اور اب بھی کھانے کے بجائے وہ کھانا ڈھیر ہو گئی۔

دل غ میں آٹھ سالوں کے خالے کے پر زبے پر زبے کر اڑ رہے تھے۔ جھپک جھپک سب آج رہا تھا۔ لینڈ لائن فون بجنے لگا۔ وہ گھنٹے سے وہ گاؤں پر تھی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ گھر کے اندر اندر مڑا تھا۔ کوئی لائن بھی اس نے روشن نہیں کی تھی۔

”تمہارا فون کیوں بند ہے؟“  
”وہ اجازت نہیں کیا تھا۔“  
”تم ٹھیک ہو؟“  
”بالکل۔“  
”کہاں تھیں تم؟“  
”میں سو رہی تھی۔“

”سارا دن سوئی رہی ہو؟ اس سے پہلے کی تھیں؟“

”میں شائیک کرنے لگی تھی۔“  
”کیوں گئیں؟“ فرزام کو غصہ آ گیا۔  
”کیوں نہ جانی؟“ وہ حیران ہوئی۔  
”تمہیں میسج بھی کیا تھا اٹن! تم کیوں گئیں؟“

اس کی جھنجھلائی آواز بلند ہوئی اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ اب تو تم گھر میں ہی ہو۔“  
”بھابھی کے پاس چلی جانا۔ فارغ ہو کر ان ہی کے پاس چلی جایا کرو۔ پور نہیں ہوگی۔“

”میں تیار ہو کر چلی جاتی ہوں۔“ اس نے پوچھا۔  
”نہیں کہ وہ اسے باہر جانے سے کیوں روک رہا تھا۔ اٹن نے موبائل آن کیا۔ ویل کے آفس میں جانے سے پہلے اس نے خود ہی اسے بند کر دیا تھا۔ پاکستان سے یا فرزام کی کل نہ آجائے اور اس کے سے نکل جائے کہ وہ کہاں آئی ہے اور کس کے پاس اور کیوں ہے۔“

”رات میں غنیمت میں ڈر گیا۔ خواب تھا شاید۔“  
”نہیں۔ لیکن اس خواب اور ڈر کا تعلق خواب بھیہ یاد نہیں۔“  
”میں نے خود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ کہیں تم سے کوئی نقصان نہ پہنچے والا ہو۔ میری قسلی کے لیے خوراک احتیاط سے رہنا۔ گھر سے تو باہر جانا ہی نہ۔“

بچا ہی کے چلی جانا۔“  
فرزام کا میسج پڑھ کر کل سے اب تک اسے پہلی بار سکون کی سانس آئی۔ اپنے شوہر کے اتنے فکر مند ہونے پر اس کا دل بھر آیا۔ وہ اس میسج پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ دلوں میں سب سے پیارا دل فرزام کا تھا اور اس دل کی مالک وہ تھی۔ اس نے عدنان کے خوف سے بچنے کے لیے اس کے لیے جوگ لے لینے کے ڈر سے فرزام سے شادی کی تھی۔ اور کون تھا جو فرزام کو پسند نہیں کرتا تھا اور وہ اسے سب سے زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس نے اس کا نفسیاتی علاج کیا تھا۔ اسے پر اعتماد پایا تھا۔ اسی نے اسے سکھایا تھا کہ لوگوں سے ڈرنا بچو ڈرو اور نیوروشی میں اس نے کسی بھی لوگ سے ڈرنا بچوڑا دیا تھا۔ وہ ہلنے پر تھے اور وہ بڑے طریقے سے انہیں بانٹ کر لے آتے تھے اور وہ بڑے طریقے سے انہیں سیر حارستہ دکھا دیتی تھی۔

فرزام اس کی ذہنی تقریریں حصہ دار تھا۔ اس کے قریب ہونے چھوٹے گھر کی ہونے پر اسے کچھ جتنا نہیں تھا۔ اس نے بھی بھول کر بھی عدنان کا نام اس کے سامنے نہیں لیا تھا۔ دونوں کا بہت ہی خاص قریبی رشتہ تھا اور دونوں ہی اس خاص رشتے کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے بہت خاص تھے۔

تیار ہو کر وہ کل کے پاس آگنی ڈنر اس کے ساتھ لیا اور رات میں تین عدد دینڈ کی گولیاں کھا کر سو گئی۔ اتنی صبح عبدالعزیز کا میسج موجود تھا۔ وہ اسے دوبارہ ملنے کے لیے بلارہا تھا۔ اٹن نے میسج ڈیلیٹ کر دیا۔ آج اسے بہت سے کام تھے۔ اسے ابن جی او مانا تھا۔ انیس اگلے ایونٹ کے لیے ریفرنس دی جانا تھا۔

”اسے بہت کا ایونٹ بھی شاندار رہا۔ اور مجموعی

طور پر کافی منافع ہوا۔ اس کا اسکور اس بار بھی اچھا ہی تھا۔ سب کے لیے مشترکہ تہائیں بھولی گئیں۔ فردا“  
”فرما“ ان کی تعریف کی گئی۔ مسٹر جین اس کے پاس بھی آئے۔ وہ پچاس پچپن سالہ چھ فٹ کے سفید فام امریکن تھے۔ سب سے ایسے بائیں کرتے۔ جیسے وہ ان کے شاگرد اور سامنے والا ان کا استاد محترم ہے۔ اتنی عاجزی تھی کہ سارا وجود ہی جھکا ہوا تھا۔ ہاتھوں پیروں کی انگلیاں بھی۔

”کیا آپ کو امریکی جیلوں کے بارے میں معلوم ہے کہ وہاں کتنے بے گناہ لوگ قید ہیں؟“

وہ اس کی تعریف کر رہے تھے اور وہ اچانک سے ہی ان سے یہ سوال کر بیٹھی۔ مسٹر جین کی آنکھوں کا رنگ بدلا جیسے وہ جانتے تھے کہ یہ صرف ایک سوال نہیں ہو گا۔ مختلف ملکوں کے دوروں کے دوران ان سے ایسے سوال پوچھ ہی لیے جاتے تھے۔ خاص طور پر نوجوان تو ان کی جان کو آجاتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ خود ایک امریکی ہیں اور کسی بھی گورے کو دیکھ کر انہیں لگتا ہے کہ یہ بھی گوانتا ناموبے کے ظالموں میں سے ایک ہے۔ اگر نہیں ہے تو اس ڈھانچے کا حصہ تو ضرور ہی ہے اور اگر یہ بھی نہیں تو چلو وہ امریکی تو ہے نا جو اپنے علاوہ ہر مذہب اور قوم سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن وہ ایک ایسی ابن جی او کے فعل کار کن تھے جو تھوڑے دن لڑکے کے لیے کام کرتی ہے۔ وہ صرف انسانیت کے لیے کام کرتے تھے اور اس میں ان کا کوئی ذاتی فائدہ شامل نہیں تھا۔

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ وہ گڑبڑائے اور مزید بحث سے بچنا چاہا۔

”آپ کی ابن جی او کو اس کے لیے بھی کام کرنا چاہیے۔“

”بہت سے امریکن بھی ان حالات کا شکار ہیں اور ایسے ہی جیلوں میں قید ہیں۔“ وہ دراصل یہ ایک نکتہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ صرف مسلمان ہی اس سب کا عتاب نہیں بنتے۔

”پھر آپ کو ان سب کے لیے کام کرنا چاہیے۔“



”بہت سے دوسرے ادارے اس پر کام کر رہے ہیں۔ ہم ان مسائل پر کام نہیں کرتے ہماری این جی او کا یہ منشور نہیں ہے۔“

”میں آپ کے لیے اتنی محنت کر رہی ہوں مسٹر جین۔ آپ کو بھی ہمارے لیے کچھ کرنا چاہیے۔“ افتخ نے سنا ہی نہیں کہ مسٹر جین نے کیا وضاحت دی۔ دوسرے لوگوں کی طرح اس کا بھی یہی ماننا تھا کہ امریکی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ تباہی بھی اور آباد کاری بھی۔

”آپ کے لیے کیا؟“ اس بات پر وہ اور الجھ گئے۔

افتخ کا مسٹر جین کو روک کر یہ سب کہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن جب وہ اس کے پاس آئے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تھوڑا سا غصہ آگیا۔ اسے آرٹیکل میں موجود باقی لوگوں اور دوسرے اعداد و شمار کا خیال بھی آیا اسے ایک دم سے یہ لگا کہ اپنے کام کے لیے تو یہ امریکی اس سے کام لے رہے ہیں تو اس کے کام کے لیے کیا یہ آگے آئیں گے؟ یہ سب سوچتے وہ یہ بھول رہی تھی کہ تھوڑے روز میں پاکستان بھی شامل ہے اور پاکستان کے دیہی علاقوں میں ای این جی او کے کارکن ویکمیں کی سپلائی کے لیے پہنچتے ہیں۔ مختلف انجمنشن اور ڈرائیون انہی کی طرف سے جاتے ہیں۔

اس نے انہیں ڈاکٹر عدنان کے بارے میں بتادیا۔ وہ خاموشی سے سب سنتے رہے۔ دو دن بعد انہوں نے افتخ کو این جی او کے لیے اپنے رضا کار صحافی سے ملوایا۔ صحافی کا تعلق ایک بڑے میڈیا گروپ سے تھا اور وہ اس گروپ کے اخبار ”سیگیزن“ اور ٹی وی کے لیے کام کرتا تھا۔ صحافی کی ملاقات اس نے عبدالعزیز سے کروادی۔ وہ اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی اور اگر وہ اس معاملے میں تھوڑا بہت شامل ہوئی تھی تو آگے نہیں آتا چاہتی تھی۔ اس نے عبدالعزیز سے وعدہ لیا تھا کہ اس کا نام اور شناخت سامنے نہیں آئے گی۔ خاص طور پر عدنان کو اس بارے میں بالکل خبر نہیں ہونی چاہیے۔ عبدالعزیز کا خیال تھا کہ صحافی ان کی بہت مدد کر سکتا ہے اور وہ اس صحافی سے مل کر حقیقتاً ”بہت خوش“ ہوا تھا چند ہی ہفتوں بعد مسٹر جین

نے افتخ کو چند دوسری این جی او کی طرف بھیجا۔ انہیں افتخ کا کیا نظریہ بہت برا لگا تھا۔ وہ بار بار اس کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ وہ جو کچھ کر سکتے ہیں اس کو کریں گے۔ افتخ نے نہ چاہتے ہوئے بھی این جی او کے نمائندوں سے پھر بات چیت کی۔

مسٹر جین کے ساتھ کی گئی جاوٹالی بات چیت کا کارگر ثابت ہو رہی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے نہ تو ابھی افتخ اس سب میں اتنی شامل ہوئی۔ این جی او کے نمائندوں نے وکیل سے ملاقات کی۔ اس نے کیس ہسٹری لی۔

”آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے“ عبدالعزیز اسے مہسج آیا۔ اس کا منہ بن گیا پھر کہ اسے یہ تعریف اچھی نہیں لگی۔ کاش وہ بھی آئیں جی ہاں ہوتی اور نہیں تو اس نے وہ رسالہ ہی نہ خریدا ہو۔

عبدالعزیز کی براہ راست بات چیت این جی او سے ہونے لگی۔ اس نے عبدالعزیز سے صاف صاف کر دیا کہ اس نے جیتنے ریفرس دینے تھے وہ دسے تھے۔ اب اسے پریشان نہ کیا جائے۔

آئندہ آنے والے چند اور ہفتوں میں ایک اور صحافی اسکاٹ جو اس سارے معاملے کے لیے مولوا کٹھا کر رہا تھا۔ اس نے دو سینئر زور ایک ہفتوں دان کے سامنے ایک لائیو ٹاک شو کے دوران اس مسئلے کو اٹھایا۔ عبدالعزیز کی طرح ایسے ہی کھسپے پنڈل کرنے والے دوسرے وکلا اور متاثرین کے خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔ چند ڈاکٹرز چار گئیں۔ صرف شبہ پر قید مجرموں کی بات طرح طرح کے سوالات کیے گئے۔ ایسے شو وہاں آئے دن ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے نظروں سے ایسے واقعات چھپے ہوئے ہیں ان کو کم طرح ان کے کانوں تک یہ خبر ضرور پہنچ جاتی ہے۔ اسکاٹ نے اسی مسئلے پر ایک فیچر لکھا اور اس نے راست حکومتی اداروں پر تنقید کی۔ چند اخبارات نئے سرے سے عدنان اور اس جیسے کھسپے کے بارے میں خبروں کو نمایاں جگہ دی۔ سائوں سے قید

ہزاروں لوگوں کو بہت ترس آیا۔ یہ ان جیلوں میں بند کسی اور کے لیے وسیلہ بن رہا تھا یا صرف عدنان کے لیے یہ قدرت ہی بستر جاتی تھی۔ لیکن اس تھوڑی سی حرکت سے شاید کسی کو بہت فائدہ ہوئے والا تھا۔

این جی او کا ایک نمائندہ جاکر عدنان سے جیل میں ملا۔ اسی این جی او نے مختلف کمیونیٹس کے لوگوں کو اکٹھا کر کے واک کا اہتمام کیا۔ افتخ کو بھی بلایا گیا۔ لیکن افتخ نہیں گئی۔ اب تو اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اگر ایسے کھسپے حل ہو جائیں تو منظر عام پر آئے لایا جائے کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور نہیں تو کوئی صحافی اسی کے پاس نہ آجائے انٹرویو لینے۔ سوک پر چلے اگر کوئی اسے ایسے ہی دیکھ لیتا تو اسے یقین ہو گا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ ”اچھا! وہ تم ہو جو عدنان کے لیے اتنا سب کر رہی ہو؟ کون ہے عدنان تمہارا؟“

”نہیں! میں نے کچھ نہیں کیا۔ اگر کیا تو ترس کھا کر انسانیت کے ہاتھ۔“

پھر اسے جانے کیوں کھوکھلے قہقہے بلند ہوتے سنا بی۔ بہت دن گزرے اسے عبدالعزیز کا فون آیا۔ ”عدنان ٹھیک ہی کہتا تھا کہ افتخ ہی اسے آزاد کروا سکتی ہے۔“ وہ شاید اس کے تعاون کا اپنے الفاظ میں شکریہ ادا کر رہا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ تقریباً چلا اٹھی۔

”آئی ایم سوری۔ آپ ناراض مت ہوں۔“

عبدالعزیز گھر آیا۔ افتخ شرمندہ ہوئی۔

”میں ناراض نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔ میں نے صرف آپ کے کہنے پر چند این جی او کو اس مسئلے کے بارے میں بتایا تھا۔ جو کچھ کیا ہے وہ آپ نے اور ان لوگوں نے کیا ہے۔ آپ پلیز مجھے کریڈٹ نہ دیں۔ نہ ہی آپ میرا نام سامنے لائیں۔“

”اب آپ نے مجھے سے وعدہ کیا تھا کہ آپ میرا نام ظاہر نہیں کریں گے۔“

”میں اپنے وعدے پر قائم ہوں مس افتخ! آپ مجھے وعدہ خلاف نہیں پائیں گی۔ چند اخبارات میرا

انٹرویو لے چکے ہیں۔ عدنان کے فادر سے میں نے فٹزر منگوائے ہیں۔ یہی صحیح موقع ہے کہ ان این جی او کو فٹزر دے جاؤں۔ اس سے خاطر خواہ فائدہ ہو گا۔ چند پاکستانیوں نے رابطے کیے ہیں مجھ سے۔ وہ ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔“

”آپ مجھے دوبارہ فون نہیں کریں گے۔“ اس نے ساری تیز تہذیب ایک طرف رکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

عبدالعزیز نے اپنا وعدہ پورا کیا اور دوبارہ فون نہیں کیا۔ ویک اپ کال دی جا چکی تھی۔ عدنان جیسے پندرہ اور لوگوں کے کھسپے نکل آئے تھے۔ سوشل میڈیا ان کھسپے کے لیے زیادہ فعال تھا۔ باقاعدہ احتجاج کیے جا رہے تھے۔ آئے دن نئی نئی خبریں سامنے آتی تھیں۔ ان کے خاندان کے لوگوں کے بیانات سامنے آتے تھے۔ ستر رفاہی سے عدالت میں چلنے والے ان کھسپے نے کچھ رفاہ پکڑ لی۔

☆ ☆ ☆

این جی او سے کیا گیا فٹزر ریزنگ کا معاہدہ مکمل ہوا اور اسے بہترین کارکردگی اور این جی او کا رکن بننے پر سرٹیفیکٹ دیا گیا۔ جسے اس نے فریم کروا کر ریک پر سجایا۔

فرزام نے ہفتہ بھر پہلے کالج میں اس کا آن لائن ایڈمیشن کروا دیا تھا۔ اس نے چھ ماہ کے فٹز انٹنگ کورس کے لیے کالج جو آئن کر لیا تھا۔ فرزام کے آئے تک اسے فادر نہیں رہا تھا۔ صبح سے دوپہر تک وہ کالج ہی میں ہوتی۔ وہاں سے اکثر اسٹور چلی جاتی۔ ایک پاکستانی اسٹور پر انہیں ایک سائڈ کار نزل گیا تھا۔ ”چمر“ کا لبل اس کار پر لگا دیا گیا۔ اس نے کارز کی مینٹننس کر لی۔ دو دن بعد وہاں کا چکر لگاتی تھی۔ رات کو وہ اپنے کالج کے اسائنمنٹ پر کام کرتی۔ ہلکی چٹکی مصروف زندگی جاری تھی۔ سب ٹھیک ہی تھا۔

اس کے پاس عبدالعزیز کا مہسج آیا کہ وہ اسے ایک ضروری بات بتانا چاہتا ہے۔ افتخ کو یقین تھا کہ وہ





سے نکلتی ہی نمایاں تھی۔  
”مجھے لگا کہ خوشی سے تم مجھ سے لپٹ جاؤ گی۔ تم نے تو سب کو ہی چونکا دیا۔“ اس کا اشارہ راہ گیروں کی طرف تھا۔

”میں ڈر گئی تھی۔ میں حیران بھی ہوئی ہوں۔“ اس نے بات کو سنبھالا۔

”میرے حال میں بہت ناراض ہوں اب۔“ ہاتھ سینے پر باندھ کر فوجی مارچ کے سے انداز میں وہ آگے آگے چلنے لگا ”تیز تیز۔“

”میں متلوں گی۔“ وہ پیچھے پیچھے ساتھ ساتھ آنے لگی۔

وہ منہ پھلائے چلتی رہا۔ تیز سے تیز ہوتا گیا۔  
”پلیز نو۔“ ساتھ ساتھ تیز تیز چلتے وہ اپنے لگی۔  
وہ اور تیز ہو گیا۔ اب وہ تقریباً ”بھاگتی“ ہوئی اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”اٹنی ایم سو ری۔“ دونوں کان پکڑ کر بے چاری ی صورت بنا کر کہا۔

فرزام نے اس کی ناک پکڑ لی اور دائیں بائیں زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔

”آہ مجھے درد ہو رہا ہے مسٹر۔“  
”اس ہولناک جج سے میں بھی ڈر گیا تھا میڈم!“  
ناک بدستور دائیں بائیں ہلاتی جا رہی تھی۔ کان بدستور پکڑے ہوئے تھے۔ دونوں ایک فریم میں اچھی تصویر بن رہے تھے۔



فرزام جمعہ کو آیا تھا اور دونوں نہ کچلا گیا اس بار افق کا جی چاہا کہ اسے واقعی میں نہ جانے دے۔ اسے پکڑ کر گھر میں لاک کر دے اور خود بھی لاک ہو جائے۔ لیکن وہ صرف اس سے ملنے کے لیے آیا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ اب بھی ملنے کے لیے نہ آتا تو یقیناً ”اس کا دم نکل جاتا۔“

”چند مغزوں کا ہی کام نہ گیا ہے۔ میں کسی بھی وقت آسکتا ہوں۔ خیر ایسا سربراہ تو تمہیں اب نہیں دوں

گا۔ بس تم تار رتنا۔ ساری خریداری کر لیتا اپنی باہر مل کر کر لیں گے۔ بہت اچھے پیسے مل رہے ہیں مجھے۔ بہت کچھ لے کر دے سکتا ہوں تمہیں۔ چاہو تو فرسٹ کلاس ڈیوٹ ڈیوٹ کر جیس لکھتا۔ انکار نہیں کر دوں گا۔ دونوں باؤں کو پہلے سے ہی پیسے بھجوا دیے ہیں اور تمہارے برنس میں بھی پیسے انویسٹ کر دوں گا۔ جاب کا کنٹریکٹ سامنے کرتے ہی تمہیں امریکا میں جہاں تم کو کوئی ایک اسٹور لے دوں گا۔ وہی کیسا رہے گا؟ برطانیہ جانے کا خیال میں نے دل سے نکال دیا ہے اب میں برطانیہ کو سزا دینا چاہتا ہوں۔ اسے مجھ جیسا قابل لڑکا نہیں ملنا چاہیے۔ عارضی شہری کے طور پر بھی نہیں۔ کیا معلوم وہ مجھے، تمہارا ہی لے۔ مجھ سے کہے کہ شہریت لے لوں گی۔ لیکن میں انکار کر دوں گا۔ میرا خیال ہے، کمپنی مجھے ساؤتھ ایشیائی ہیجے گی۔ میں اؤکے ہوں۔ وہ مجھے جہاں بھی بھیج دیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

”میں بھی اؤکے ہوں۔“  
”مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے میری کوئی بات سنی ہی نہیں۔“

”یہاں سے سن کر میں سے نکال دی۔“ اس نے دائیں سے بائیں کان کی طرف اشارہ کیا۔  
”تم پریشان ہو افاق؟“ وہ سن رہی تھی۔ لیکن اسے لگا کہ وہ خود پر پردے ڈال رہی ہے۔  
”ایسا کیوں ہو گا جھلا؟“ جواب نہیں دیا۔ سوال کر لیا

الٹا کہ سوال کا جواب کیا دیتی۔ خوف نام کی ایک پتلی اس کے اندر پھولتی پھیلتی ہر شے سے لپٹی جا رہی تھی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ وہ پردے ڈال رہی ہے۔ مہنس اور مسکراہٹ کے۔ اگر وہ یہ پردے ہٹاتی تو فرزام اس سے کئی سوال کرتا۔ ہر سوال کا جواب نہیں تھا اس کے پاس اور اگر ہر سوال کا جواب دے بھی دیتی تو شاید فرزام کی تسلی نہ ہوتی اور ان دونوں میں کچھ نہ کچھ ضرور بگڑ جاتا۔ اس نے خود کو روکے رکھا اور اس سے کہا نہیں کہ کانٹریکٹ کو چرا کر پھاڑاؤ اور آؤ! بھاگ چلتے ہیں امریکا سے راتوں رات اور پاکستان چل کر آنا

زندگی گزارتے ہیں۔ آؤ! ہم دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں۔ لیکن وہ کہہ نہیں سکی اور فرزام اکیلا ہی واپس چلا گیا۔ لیکن واقعی صرف چند مزید ہفتوں کے لیے۔ وہ اپنے ایرپورٹ گئی۔ رات کو فرزام نے اس کا بازو پکڑ کر اپنے بازو میں دیا اور دونوں نیو بری (New Bury) آگئے۔

فرزام بہت خوش تھا۔ جیسے ہر کام سے فارغ ہو چکا ہو۔ جیسے طویل محنت کے بعد اسکول کے نئے امتحان سے فارغ ہوتے ہیں اور جیسے ایک بے انتظار کے بعد کوئی خاص دن آتا ہے۔ آخر اتنی جانا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ افق نے فرسٹ کلاس میں بیٹھی تھی۔ اچھا ہی کیا تھا کہ نہیں بیٹھی کیونکہ بنا فرسٹ کے ہی وہ اتنا سب کچھ لے رہا تھا۔ اس نے اس سے جس فرکوٹ کا وعدہ کیا تھا ایک بڑے اسٹور سے وہ فرکوٹ لے رہا تھا۔

”پیرس فرکوٹ کے بغیر نہیں جانا چاہیے۔“ ساتھ اسے بتایا۔

وہ بار بار اس کی پسند کے کوٹ پہن پہن کر دیکھتی رہی۔ خواہ اس پر اچھا لگا۔ وہ اس نے لے لیا۔ پھر اس کے دائیں بائیں ہاتھوں میں طرح طرح کے ہولڈنگ بیگ پکڑا پکڑا کر بھگو پسند کیے۔ بڑے بڑے شولڈر بیگ لگے۔ اس وقت اس کا خریداری کا تجربہ اچھے اچھوں کو مات دے سکتا تھا۔

”مگر پیرس میں مجھے کسی نے یہ کہہ دیا کہ میری بیوی کوئی اولڈ فیشن ہے تو میں اس کا بیڑا توڑ دوں گا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میری وہاں کسی سے ایسے لڑائی ہو؟“ وہ احتجاجی جھجکی سے سوال کر رہا تھا۔

”تم سے ایک روٹی کس کا وعدہ بھی کیا تھا میں نے۔“

سارے وعدے اس نے خود ہی کیے تھے اور سارے وعدے وہ یا دے خود ہی پورے کر رہا تھا۔ اس کے پاس واقعی بہت پیسے آگئے تھے۔ افق نے اسے اپنا کریڈٹ کارڈ دیا تھا۔ لیکن اس نے اس کا بیگ کھول کر اس میں سے چند ڈالر نکال لیے۔

”تمہاری طرف سے فی الحال آئس کریم کھا لیتے ہیں۔“

وہ وہیل ڈیک آئس کریم لے آیا۔ آئس کریم اتنی بڑی تھی کہ وہ دونوں پندرہ منٹ سے اسے کھا رہے تھے۔ شاپنگ بیگز ہاتھوں میں پکڑے نو بری کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔

”تم نہیں کھڑی رہنا۔ میں ابھی آیا۔ دیکھو! میرے پیچھے نہ آنا۔ اگر تم میرے پیچھے آئیں یا مجھے دیکھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں تو میں اتنے سارے لوگوں کے درمیان سڑک کے عین وسط میں جی جی زمین پر پھیل کر روئے لوں گا۔“

رش میں اسے ایک طرف کھڑا کر کے وہ کہہ کر اسے اپنی طرف سے الٹی طرف گھما کر اس کے پیچھے سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں افق فوراً ”پلیز۔“ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ایک بڑی چیلری شاپ میں جا رہا تھا۔ وہ مسکرا نے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے ایک عودا گموٹھی لینے جا رہا ہے۔ ایک ایسی اگموٹھی کا نہ اس نے وعدہ کیا تھا نہ ہی تذکرہ۔ وہ اسے پروپوز کرے گا۔ پروپوز کرنے کا بھی اس نے وعدہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کی اسے خواہش تو بہت ہو گی۔ پرانی انارکلی میں وہ اس سے شادی کا کہہ رہا تھا۔ اب وہ اس سے اپنی محبت کا کہہ گا۔ پہلے اس نے بتایا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ بتائے گا کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتا ہے۔

نو بری کی پر رونق سڑکوں کی رونق مزید بڑھ گئیں۔ رات کی چمکا چوند میں اضافہ ہو گیا۔ گماٹھی بڑھنے لگی دور دور تو یک بڑی بڑی دکانوں اور اسٹورز پر لگے بورڈز اور جگہ جگہ لگے۔ اپنی مام ڈیڈ کے ہاتھ پکڑے پارپ کارن، آئس کریم کھاتے مسکراتے بچے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر نہ خوان لڑکے لڑکیاں۔ یہ سب افق کو بہت اچھا لگا۔

”فرزام اس کے لیے اگموٹھی لینے گیا ہے۔“  
چند دنوں سے وہ چینی پریشان تھی۔ وہ پریشان جاتی رہی۔ وہ افق سے صرف مسز فرزام بن گئی۔ ایک



عرصے سے اس کی زندگی مستحکم تھی۔ لیکن اب وہ وقت تھا جب وہ بے حد خوش تھی۔ ایک عورت کو اپنی زندگی میں پہلے اس ایک لمحے کا انتظار ضرور ہوتا ہے جب کوئی مرد اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور وہ اس بات کا اقرار کرے کہ اس کے دل پر اس کا راج ہے اور وہ اس راج میں غلام بننے کے لیے بخوشی تیار ہے۔ اس گھٹنے ٹیکنے کے غلام پر خود کو لٹا دینے کو بھی چاہتا ہے۔ اسے اپنا سر وار اپنے سر کا تاج بنانے کو بھی چاہتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر راج کرتے ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کے غلام ہو جاتے ہیں۔

ان گئے سالوں میں وہ فرزام سے متاثر ہوئی تھی۔ اسے اچھا جانا تھا۔ وہ میرے کے دل والا تھا اور اس میرے کے دل میں اس نے اپنی تصویر دیکھ لی تھی۔ وہ دنیا میں سب سے پیارا تھا اور وہ اسے بھی سب سے زیادہ پیارا تھا۔

سڑک کے ایک طرف کنارے پر کھڑے افق یہ اعلان کرنے کے لیے تیار تھی کہ انسانوں میں ایک بے حد پیارے انسان "فرزام" سے وہ محبت کرتی ہے اور بے حد کرتی ہے۔ کرنی رہے گی اور کیے بنا رہے گی نہیں۔ اس اعلان کو کرتے وہ جھجکے گی نہیں۔ وہ وہاں سے گزرتے ہر شخص کو دوک روک کر یہ بتا رہا جاتی تھی کہ دیکھو! میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ تم سب کتنے بد نصیب ہو۔ فرزام صرف میرے پاس ہے اور تم سب اس جیسے کے بغیر ہو۔ وہ تمہیں نہیں لے گا۔ وہ صرف میرا ہے۔ اب وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ آئیں کریم والے کو بیک میں سے نکال کر بہت سارے ڈانرز پکڑا دے اور کہے کہ سب میں ساری آئیں کریم مفت بانٹ دے۔ سب کو آئیں کریم ملنی چاہیے سب کو مسکرانا چاہیے۔ آس پاس سے گزرتے لوگوں کو چاہیے کہ اسے "فرما" مبارک بادوں۔ سب آکھٹے ہو کر اسے چیئر کریں۔ مل کر تالیاں بجا میں اس کے لیے کوئی محبت بھرا لوگ گیت گائیں۔ ہر تہوار کی آمد کا جشن منایا جاتا ہے۔ محبت کی وقوع پذیری کا جشن بھی شتان سے منایا جانا چاہیے۔ اس

جشن میں باقی سب جشنوں کو مات دے دینی چاہیے۔ محبت کی دھنک ابھر کر جب سامنے آئی ہے تو اس کے ساتھ جھول کر ناپنے گانے کو ہی جی چاہتا ہے۔ خودی کے رقص ایسے ہی نہیں ہو جاتے۔ یہ واقعہ صرف محبت ہی واقعہ کرتی ہے۔ وہ عشق حقیقی ہونا مجازی جھوم جانے کو دونوں میں ہی جی چاہتا ہے۔ نشو سے ہونٹ صاف کر کے افق چند قدم چل کر اس شاپ کی طرف گئی۔ جس طرف فرزام کیا تھا۔ لیکن وہ اسے باہر نکلتا نظر آیا۔

"کیوں آ رہی تھیں میرے پیچھے؟" وہ غمازاً۔  
"میں کب تک آپ کی کھڑی رہتی آخر؟"  
"تھوڑی سی دیر تم آپ کی نہیں رہ سکتیں؟"

"نہ نہ۔" اس نے ساتھ تیزی سے بچوں کی طرح سر ہلایا۔ فرزام کے ہاتھ میں کوئی شاپنگ بیک نہیں تھا۔ جاتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بھی اسے ہی پکڑا گیا تھا۔ انگوٹھی پھر تینا "اس کے کوٹ کی جیب میں ہوگی۔ افق نے نظروں ہی نظروں میں اس کا جائزہ لیا اس نے انداز اس کی کمر میں حائل کیا اور اسے ساتھ لے کر چلنے لگا۔ وہ اس کی طرف سے دبو رہی تھی۔

"کیا تمہیں مجھ سے کچھ چاہے؟" یہ سوال ایسے تھا۔ جیسے کیا ایک اور آئیں کریم کھاتی ہے۔ وہ اسے انتظار کروانا چاہتا تھا ابھی یہ مرو گھٹنے ٹیکنے میں وقت لے گا۔

"ہاں! فوراً! کہا۔" جو اندر سے لائے ہو۔  
"کہاں اندر سے؟" اس نے ذرا سی گردن جھکا کر پیچھے کی طرف دیکھا۔

"میں نے تو کچھ نہیں لیا دیکھو! میرے ہاتھ خالی ہیں۔" دونوں ہاتھ آگے کیے۔

"کوٹ کی جیب میں ہوگا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ اس نے دائیں طرف کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ خالی باہر نکلا۔ پھر بائیں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ خالی ہاتھ آگے کیا۔

"کچھ ہی نہیں۔" مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"میرا دل جیب میں ہوگا۔" کوٹ کا دایاں کونا اٹھا کر اس نے کہہ۔  
فرزام کا ہاتھ اندر گیا۔ "آہ! چلو دیکھتے ہیں۔"

کچھ لمبی نہیں رہا۔  
وہ ہنس رہا تھا۔ پھر ہاتھ باہر آگیا اور وہ مٹھی کی مورتنہ تھا۔

"یہ کیا ہے اس میں کچھ۔" کھولے اسے۔  
"سوچ لو افق! یہ خالی بھی ہو سکتا ہے۔"

"اگر یہ خالی ہوا تو یہاں سب کے درمیان نیچے بیٹھ کر میں روؤں گی۔"  
"اچھا! پھر ذرا آنکھیں بند کرو۔"

وہ اس کا بازو تھام کر بھیڑ میں سے نکال کر ایک طرف کونے میں لے گیا۔ دونوں آٹنے سامنے کھڑے تھے۔ ذرا دور ایک بیچ پر ایک درمیانی عمر کا جوڑا بیٹھا بر کر کھارہا تھا۔ دونوں کا انداز اور مسکراہٹ ایسی تھی کہ وہ افق اور فرزام کی طرف ایسے ہی دیکھنے لگے۔ افق نے آنکھیں بند کر لیں اور زندگی ہی تھیں کہ توب کر کھول دیں اور جی کی سی تیزی سے پیچھے پلٹی۔ جبکہ فرزام تو سامنے کھڑا تھا۔ مٹھی اس نے کھول لی تھی انگوٹھے اور شادات کی انگلیوں میں انگوٹھی پکڑی تھی لیکن "افق" کی آواز سے وہ پیچھے دیکھنے لگی۔

اس کی بد قسمتی اس کی فاش غلطی پیچھے کھڑی تھی۔ "تم تنگی کیوں نہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ "شام پانچ بجے کا وقت ہے۔" رکھا تھا۔ اب دس بجے رہے ہیں۔

انگوٹھی کو مٹھی میں ہی بیٹھ کر فرزام کو قدم آگے بول اس کے برابر آکر کھڑا ہوا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک نظرائق کو دیکھا۔ وہ اس وقت چکر کر گرنے کے قریب تھی۔

وہ مسکرا رہا تھا۔ "تمہیں میں بعد میں پوچھتا ہوں۔"

یہ کون ہیں؟ ان سے تعارف کرواؤ۔ تمہارے کزن ہی ہوں گے۔ میں اپنا تعارف خودی کروا رہا ہوں۔ آئی ام! انکڑن غلام علی۔ آپ کہہ سکتے ہیں افق کا

ہاتھ اس نے آگے کیا۔ جسے تھاما نہیں گیا۔ فرزام

افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ افق عدن کے آس پاس پھیلے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی۔ جو اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ افق گونگی بن گئی اور فرزام بہرا ہونے کے قریب تھا۔

"افق کا امان" فقرے کی بازگشت بہت جان لیوا تھی اور یہ بازگشت تھم ہی نہیں رہی تھی۔ کینیڈا میں ترتیب دینے گئے سارے جیلے اس بازگشت کے مہمور میں جا چکے۔

"ایک ہفتہ پہلے مجھے ہی ملی تھیں۔ آج کے دن کا وعدہ کیا تھا" دوبارہ ملنے کا۔ یہیں قریب میں ہی ایک ہوٹل ہے۔ میں کلنی دیر سے وہاں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں تو یہ آئیں نہیں ٹیبل نظر آئیں۔ میرے رہا ہونے کو سیلبرٹ کرنا تھا۔ سب افق کی وجہ سے ہی ہوا۔ ورنہ میں ابھی تک جیل میں ہی ہوتا۔

افق نے فرزام کا بازو پھینچا۔ "چلیے! گھر چلتے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے افق؟" فرزام کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جو سن رہا تھا اس کے بعد لگتا تھا کہ اگلا کچھ شانی نہیں دے گا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" افق بمشکل کہہ سکی۔

سامنے کھڑا عدن مسکرایا۔ "یہ کریڈٹ لینا ہی نہیں چاہتی۔ میں نے نیل صرف دو لوگوں کے لیے ہی بیک کروائی ہے۔ ورنہ میں آپ کو بھی ضرور نوٹس کرتا۔ آپ سمجھ ہی سکتے ہوں گے۔" وہ فرزام کی طرف دیکھ کر بات کر رہا تھا۔ آخر میں گھٹیا انداز سے آنکھ ماری۔

شریف بیویوں کے شریف شوہر سر راہ ایسے الفاظ اور ایسے گھٹیا انداز پر گریبان پکڑ لیا کرتے ہیں۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" پھر سے یہی سوال حق سے کہا گیا۔

"چلیے گھر پلینز۔" افق اس کا کوٹ کھینچ رہی تھی۔

"یہ مجھے بلا دجے تنگ کر رہا ہے۔"

"میں تنگ کر رہا ہوں۔" وہ ہنسا۔ "تم ایسے کیوں بات کر رہی ہو؟ ابھی چند دن پہلے تو تم مجھ سے ملی



تھیں۔ ملی تھیں کہ نہیں؟ جب تو تم ٹھیک تھیں۔ اب ایسے بات کر رہی ہو۔ اپنے گزرنے سے ڈر رہی ہو؟ انہیں میرے بارے میں بتایا نہیں؟  
 اتنی نے فرزام کے بازو پر دباؤ ڈالا اور آگے چلنے لگی۔

”تمہارا یہ رویہ مجھے حیران کر رہا ہے اتنی!“ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے حیران آواز میں بولا ”تم نے مجھے جیل سے ضمانت پر آزاد کر دیا ہے۔ مجھے اپنا شکریہ تو ادا کرنے دو۔“

وائٹ گولڈ کی انگوٹھی فرزام کی مٹھی میں ہی خرمندہ ہو گئی۔ اس کا بازو گھسیٹتی تیز تیز چلتی اتنی اسی انگوٹھی میں لوٹ پھوٹ گئی۔ فرزام نے اپنا بازو اتنی کے ہاتھ سے آزاد کر دیا۔

”تم نے اسے جیل سے آزاد کر دیا؟“ خود رک کر اور اسے بھی روک کر وہ پوچھ رہا تھا۔ عدن دو قدم دور کھڑا تھا۔ اتنی نے فرزام کی طرف التجا سے دیکھا کہ یہاں سربراہ اس گناہ کے سامنے بخود قدم ہی پیچھے کھڑا ہے۔ یہ سب نہ پوچھے۔ اس پر شک ضرور کرے لیکن اس پر یقین بھی رکھے۔

اپنے پیچھے کھڑے شخص سے اسے نفرت تھی۔ اپنے سامنے کھڑے شخص میں اس کی جان بھی اور ان دونوں کے درمیان کھڑی وہ ڈوب مرنے کے قریب تھی۔ اس کی خوشی ملیامیٹ ہو گئی۔ اس بار سربراہ اس کی عزت پر غلام علی نے نہیں عدن غلام علی نے ہاتھ ڈالا تھا۔

کیا وہ یہ کہتی ہاں کیا۔ یا کہتی نہیں۔ دونوں ہی سچ تھے اور دونوں ہی جھوٹ تھے۔ اس سوال کا سیدھا جواب کوئی نہیں تھا۔ اس سوال کے سب اٹلے اور اٹھے ہوئے جواب تھے۔ جواب دینے میں یہ معمولی سا تامل فرزام کو بہت سے جواب ایسے ہی دے گیا۔ ایک دم ہی وہ اتنی سے بہت دور جا کھڑا ہوا۔ بہت دور۔

”تم اپنا وعدہ پورا کرو۔“ وہ آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ سے ہٹ کر لیے اور تیزی سے چلنے لگا۔  
 ”فرزام!“ اس نے بلند آواز میں چیخ ماری تھی۔

وہ رکائیں۔ وہ بھی تیز تیز چلتی اس کے پیچھے لگی۔ ”میری بات منیے! میں سب بتا دیتی ہوں۔ ایسے کریں۔“  
 ”بتانا ہو تو تو تم چھپاتیں کیوں؟“

اسی کی طرح تیز آواز میں اپنی آواز کی نمی چھپا کر بھاگنے کے قریب تیز ہو گیا۔ اگر وہ رکا تو وہ واقعی میں سڑک پر سب کے درمیان زمین پر پھیل کر اوچی آواز سے رونے لگے گا اور اس بار وہ بہت روئے گا۔

اتنی ”فرزام“ فرزام!“ ہی کرتی رہ گئی۔ وہ ٹیکسی لے کر چلا گیا۔ اتنی ہانپنے لگی۔ کوٹ کا کالر آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

فرزام کے لیے کیا گیا میک اپ بہہ رہا تھا۔ وہ پھر سے گھنٹوں میں سرورے کر رونے کے لیے تیار تھی اور وہ اونچی آواز سے رونے لگی۔ عدن اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔

”چلیں اتنی!“  
 ساری نفرت اور پوری قوت سے اس نے پلٹ کر زور وار پھینک مار کے وائس چال پر لگایا۔ اس بددعا پر جو نہ جانے اسے کون دے گیا تھا۔ وہ وقت ہی ہو گا۔

مدن نے عزیز کی بہت سنت ساجت کی کہ وہ اسے اتنی کے بارے میں بتائے۔ لیکن عزیز نے صاف لالعلی کا ہر کردی کہ وہ اس بارے میں نہیں جانتا۔ عدن کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

عزیز نے اس کے لیے رہائش کا انتظام کر دیا تھا۔ پاکستان میں وہ سب سے بات کر چکا تھا۔ اب اسے صرف بات کرنے کے لیے اتنی چاہیے تھی۔ وہ اس پر ہومن رہائش کے ادارے کے دفتر آیا۔ جس کا نامحدود اسے سیل میں آکر ملا تھا۔ بظاہر وہ ان کا شکریہ ادا کرتے گیا تھا۔ لیکن باتوں ہی باتوں میں وہ معلومات لیتا گیا کہ ان کے پاس عدن کا کیس لے کر کون آیا تھا۔

اسے مسٹر جین کے اور ان کی این جی او کے بارے میں بتایا گیا۔ اتنی کے بارے میں بھی بتایا گیا۔ مسٹر جین کی این جی او کی ویب سائٹ پر اسے چندہا پیلے ہونے فنڈز ریزنگ ایونٹ کی بہت ساری تصاویر ملیں۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اتنی نے ان کی این جی او کے لیے کام کیا ہے ان کے لیے فنڈز اکٹھے کیے ہیں۔ مختلف ویب سائٹس کا جائزہ لیتے اس کی نظر اس پیج پر بھی پڑی۔ جس میں فنڈز ریزنگ میں اچھے اسکور لینے والوں کے نام اور ان کے متعلقہ فنڈز کی نشاندہی کی گئی تھی۔ بہت سے ناموں میں ایک نام اتنی کا بھی تھا۔ ایک طرف اس کی پیش کی گئی برائے ”چیز“ کا نام درج تھا۔ بریکٹ میں ملک کا اور شر کا نام درج تھا۔

عدن نے سرچ انجن میں چیز کی ویب سائٹ نکال لی اور جہاں جہاں برائے چیز مل سکتی تھی وہ بتے بھی ان میں سے ایک پتا بوشن کے ایک اسٹور کا تھا جہاں سے اس برائے کو خریدا جاسکتا تھا۔

وہ بہت خوش تھا اس نے اسے ڈھونڈ لیا تھا۔ اب وہ اتنی کو سربراہ بنا چاہتا تھا۔ ایک بار اسٹور جا کر اس نے تصدیق کر لی تھی کہ وہی اتنی ہے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ دیا میں دن بعد وہاں کا چکر لگاتی ہے۔ رابطہ نمبر کے طور پر اسے پاکستان میں موجود آفس کا کارڈ ہی دیا جا رہا تھا۔

میں بیٹھ جاتا۔ جہاں سے وہ اسٹور پر نظر کر سکتا تھا۔ سارا دن ایسے ہی بیٹھا رہتا۔ سالوں بعد وہ اسے دیکھنے جا رہا تھا اس سے ملنے جا رہا تھا۔ اس نے اس کی زندگی بچائی۔ اسے باہر نکالا۔ اس پر اس کی زندگی کا سب سے بڑا احسان کیا۔ عین مرنے کے وقت اسے زندگی کی لوید دی۔ اس کا اسپتال ضبط کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹری کلائینکس منسوخ کر دیا گیا تھا۔ اس کی صحت ہمس کا مرادہ حسن و جہالت سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ رشتے اور رتبے کے نام پر اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ شروع کے صرف دو ڈھائی سالوں میں ہی اس کی بہت پست ہو چکی تھی۔ ماریہ جس طرح اسے چھوڑ گئی۔ اس نے اپنا سر دیواروں پر مارا۔

وہ اسے چھوڑ جاتی لیکن اس کی تھوڑی مدد تو کر دیتی۔ وہ امریکن تھی۔ وہاں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھی۔ لہذا اس نے طلاق لے لی اور اس کا سر جس کی گندی بیٹی کی وہ چوکیداری کرتا رہا تھا۔ ایک بار اگر اس سے ملتا کہ نہیں۔ وہ دونوں ان دونوں کو گالیاں دیتا رہا۔ وہ انہیں بدذات سمجھتا تھا۔ وہ عدن کے لیے ایسے بے غیرت تھے۔ جن میں نام کی بھی غیرت نہیں تھی۔ ٹائٹ کلب میں ڈانس کرنے والی ڈانسر تھی اس کے نزدیک ماریہ سے زیادہ شریف اور قابل عزت تھی۔

اسے احساس ہوا کہ وہ دراصل اپنے پیانے سے گر گیا تھا۔ اس کا پیانہ صرف اتنی تھی۔ جہاں اس نے کالج کی بہت سی جان چھڑکے والی امیرزادوں کو لفٹ نہیں کروائی تھی۔ وہاں اس نے بے لطف صرف اتنی کو کروائی تھی۔ اس نے فاش غلطی کی جو وہ ہمک گیا۔ جبکہ اس نے سوچ ہی لیا تھا کہ اسے صرف اتنی سے ہی شادی کرنی ہے۔ وہ اچھے خاصے منگے پرانیوٹ اسپتال میں فوری کر سکتا تھا۔ اپنا کلینک بنا سکتا تھا۔ بے حد پر آسائش نہ سہی آرامہ زندگی ضرور گزرتی۔ لیکن یہ آرامہ زندگی اسے امریکی چند لفظی سیل میں بیٹھ کر کھانی دی۔ جب وہ یہاں نہیں تھا تو اسے ڈبل اسٹوری اسپتال بنا بنایا بوشن میں نظر آ رہا تھا۔ اتنا کہ

اسنور کی چین نظر آرہی تھی۔ غلام علی غلام کو آغا کے ذاتی طیارے کے مالک ہونے کا غور توڑتا تھا انہیں اس شخص آغا سے شدید نفرت تھی۔ اس شخص نے جیش انہیں ہر میدان میں پیچھے چھوڑا تھا۔ کیمینہ عیاش انو بے غیرت۔ وہ اسے بہت سے ناموں سے یاد کرتے۔ لاس ویکاس میں وہ جاکر کیا کرتا ہے۔ ایک دن غلام علی نے بہت رازداری سے ازبک بیوی کے کان بھرنے چاہے وہ پہلے تو اپنے شوہر کی طرح سنتی رہی۔

”وہ ایک ماہر جواری ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ باقی کی معلومات مجھے کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ ہیں۔“ مطلب آئندہ اپنی ہوا اس بندہ پر رکھنا۔

تب اسے ماریہ جنت نظر نظر آئی تھی۔ جو حور بھی تھی اور ایک دنیاوی جنت کی مالک بھی۔ تب کیوں سب ٹھیک لگتا تھا؟ اب سب کیوں برا لگ رہا ہے؟ عدن یہ بات نہیں جان سکا۔ وہاں وہ دن رات ایک ہی کام کرتا۔ ”وہ اتنی کو یاد کرتا“ ان دنوں اس پر اتنی کی محبت کا بھوت بری طرح سے طاری ہو گیا۔ اسے اس کے نام کے دورے پڑتے۔

وہ بھی تانے بانے بنا رہا تھا کہ اگر وہ آج یہاں نہ ہوتا تو ایک گھر میں اتنی کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا۔ اس کے بچے ہوتے۔ بے حد محبت کرنے والی بیوی ہوتی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ زندگی میں ان دو چیزوں کے علاوہ کسی تیسری کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ ”سکون اور محبت“

اسے یاد آتا تھا کہ وہ اس سے کتنی بے لوث محبت کرتی تھی۔ ایسی محبت جو کچھ مانگتی نہیں پڑے سب دیتی ہے۔

”جتنی اچھی پلاننگ میں یہ سب کیسے ہو گیا۔“ وہ اپنے بال نوچتا۔ جب سب اتنی کے ساتھ سارے منصوبے بنا چکا تھا تو وہ سب کیوں نہ مضبوط رہا۔

اتنے سالوں میں غلام علی نے عیسائی کی طرح ہر پاپا تھا۔ آسٹریلیا میں پڑھنے والا اس کا چھوٹا بھائی حاوی نے کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی تباہ ہو چکی تھی۔

غلام علی کے پیسے کے کوئٹے خالی ہو رہے تھے۔ ان گزرے سالوں میں ان کی کمزوری چکی تھی۔ فیکٹریاں نقصان میں ہی جا رہی تھیں۔ قرضوں کی قسطوں کی ادائیگی نہ ہو سکی۔ سوڈر سوڈر بڑھ گیا۔ ٹھیک غلام علی کے ہاتھوں سے نکل گیا اور دونوں فیکٹریاں بینک نے ضبط کر لیں۔ جس فیکٹری میں آگ لگی تھی اس سمیت بینک نے فیکٹریاں غلام کو پس۔ غلام علی کے پاس ایک چھوٹی تین کینال کی فیکٹری ہی بچی تھی یہ ایسے ہی تھا جیسے وہ مر سبب چلائے چلائے سائیکل پر آگئے ہوں۔ لاہور ڈی ایچ اے کا بنگلہ بھی بک چکا تھا۔ سیالکوٹ کا گھر ہی بچا تھا۔ فارم ہاؤس پر بھی مزید قرضہ لے لیا گیا تھا۔

غلام علی چاہتے تھے کہ بس وہ جلد سے جلد واپس آجائے۔ اب بھی وہ اسے ایک چھوٹا سا اسپتال تو بنا کر دے ہی سکتے تھے۔ نا۔ اسپتال کے کاروبار میں اتنا منافع ہے کہ دنوں میں ہی ان کا نقصان پورا ہو ہی جائے گا۔ پھر وہ تو امریکن ڈاکٹر بھی ہے۔ کہنے میں کیا جاتا ہے کہ اتنے سال اس نے امریکا میں پریکٹس کی ہے۔ امریکیوں کا علاج کرنا رہا ہے پاکستان میں انہوں نے اس کے جیل جانے کی خبر کو سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ وہ فیکٹری بیچ کر اسے ایک بڑا اسپتال بنا دیں گے اور نہیں تو چھوٹے چھوٹے دتتین ہی بنائیں گے۔ غلام علی نے بہت اعلا منصوبے بنا رکھے تھے۔

”حالات یہی رہے تو ہم فٹ پاتھ پر آجائیں گے۔“ بارہ کینال کے گھر میں رہنے والے غلام علی کو فٹ پاتھ کے نام سے ہی نفرت تھی۔ جبکہ یہی فٹ پاتھ گاہے بگاہے انہیں خواب میں دکھائی دیتا تھا۔

”تم بھاگ نہیں سکتے وہاں سے؟ کوئی ایجنٹ ڈھونڈو عدن! کوئی تمہیں کینڈا کے رستے یا برازیل کے راستے نکال سکے۔ میں یہاں بھی ایسا ایجنٹ ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم بھی کو شش کرو۔ سنا ہے یہ سیاہ فام بہت ملٹی ہیں۔ بہت کاموں میں۔ بہت سوں کو امریکا کے آتے ہیں غیر قانونی۔“

اس نے سنتے ہی صاف صاف انکار کر دیا۔ ”میں

دوبارہ پچیس جاؤں گا اگر ایسے بھاگتے پکڑا گیا تو ان کا ٹک ٹکٹین میں بدل جائے گا۔ وہ مجھے وہ ہشت گرد ہی سمجھ لیں گے۔ میں مہاجروں کا نہیں مقدمہ بھگتے بھگتے لیکن دوبارہ جیل نہیں جاؤں گا۔“

”مردو عدن۔۔۔ زندگی میں خطرات مول لینے ہی پڑتے ہیں۔“

”میں سوئی چھپتا جتنا خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہتا۔“ صاف انکار۔

”تو زور پوک ہو تم۔“ نہیں غصہ آیا۔

”جیل میں رہا ہوں۔ پولیس والوں کی شکل دیکھتے ہی جان نکل جاتی ہے۔“

”امریکا کا پاپی بی ٹم کریم بزل بن گئے ہو۔“ وہ اسے انکار رہے تھے۔

”امریکا میں جیل کا پاپی بی کر۔“

”مردی جیلوں میں جاتے ہیں۔“

”پھر وہی مردی اور قابل نہیں رہے پاپا۔“

انہوں نے فون ہی بند کر دیا۔ ایک طرف اس کے آنے کی خوشی دوسری طرف اس کی بزدلی پر افسوس۔

اس کی ہائی فائی فیشن اسپیل ماں ڈپریشن کی مریضہ بن چکی تھی۔ وہ روٹی پہلے تھی۔ بات بعد میں کرنی تھی۔ اس کی بہن نے یونیورسٹی کے ایک لائبریرین

کلاس لڑکے سے خود ہی شادی کر لی تھی اور آج کل وہ دتتین میں تھی۔ غلام علی کو ایک عرصہ منانے کے بعد

اس نے اس لڑکے سے خود ہی نکاح کر لیا۔ اس کے باپ کے پاس دولت کے علاوہ کوئی دلیل نہیں تھی وہی

جاننے کے لیے اور اس کے پاس دولت کے علاوہ ہر دلیل تھی جس لڑکے کے حق میں دی جانے کے لیے

اسے اپنی بہن کے بارے میں معلوم ہوا تو اسے خود پر اور افسوس ہوا۔ کاش! وہ بھی اپنی بہن کی طرح کا ہی

ہوتا۔

دہائی کے تیسرے روز رات کے وقت اپنے قلبیت

میں اندھیرا کیسے وہ آخری بازی ہارا شخص بنا بیٹھا تھا۔

سوداڑوں کا حساب وہ جیل میں ہی لگا چکا تھا۔ ساریہ سے

لے کر اپنی ڈاکٹری تک۔ غلام علی سے آغا تک۔ اس

نے ہر چیز کی گنتی کر لی تھی۔ اسے سب پایا اور کھو کھلا نظر آیا۔ سب بے کار۔ اسے بہت احساس ہوا کہ زندگی کی اصل کامیابی اصل اور کھرے انسانوں کا حاصل کرنا ہے۔ انسانی تعلقات میں اول اتنا ضروری ہے۔ جذلوں اور سچائی میں اول۔ وہ جان گیا کہ برے وقت میں انسان کو صرف ایک ہی چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ ”اپنے انسان کی“

قید کے عرصے میں وہ ایسی کلن میں دبا رہا جہاں اسے

کونوں اور ہیروں کی پچان ملی۔ تاہم اس نے کونوں

سے ہی خود ہی کو سیاہ کیا تھا۔ ہیرے کو تو اس نے ٹھوکر

مارنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ اتنی کوسہ ملا کہ

اس کی بہن نفا کو گھسے۔ اپنے اسکول دوست طاہر

کی بہن نفا کو اپنے پیچھے پاگل کر دیا۔ آج وہی طاہر

اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے کا ہیڈ تھا۔ اس کی بہن

جس نے عدن کے لیے نیند کی گولیاں کھائی تھیں۔ ریڈ

کر اس کے لیے کام کرتی تھی اور وہ چار دوست جو اس

کے ساتھ ڈی ایچ اے کے بنگلے میں رہے تھے۔ وہی

ایک گروپ کے ممبر تھے۔ آج بڑے بڑے ڈاکٹر بن

چکے تھے۔ ایک تو امریکا میں ہی ہارٹ سرجن تھا۔ غلام

علی نے تعاون کے لیے جب رابطہ کیا تو اس نے صاف

انکار کرنے کی زحمت بھی نہیں کی اور آئندہ سے ان کا

فون سننا ہی بند کر دیا۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب

کتاب میں اس کے پاس اتنی ہی بچی تھی۔ ابن جی او

کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو

اسے یقین ہی نہیں آیا کہ نیلے گنبد میں رہنے والی

بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی اپنی جی او کو

حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے

پوچھا کہ ”کیا وہ ایک استثنائی مسلم لڑکی کی بات کر رہا

ہے۔“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں! یہی لڑکی ان کے دفتر

میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

اس رات عدن نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی

کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے اتنی اتنی فعل ہو گئی۔



باہر نکلتے ہی وہ اب اسے شادی کر لے گا۔ اس نے اور افق نے بہت انتظار کر لیا۔ بس۔ اسے اس کی ٹیٹھی آواز اور بھولی صورت یاد آئی۔ شرافت سے جھکا اس کا سر اور محبت سے بھرا اس کا دل۔ اب یہ دل کسی اور کا نہیں۔

\*\*\*

کالج سے سیدھا وہ اسٹور آگئی تھی۔  
”کوئی آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“ اسٹور کے دور کرنے لے آیا۔  
”کون تھا؟“  
”ہام نہیں بتایا۔ صرف پوچھ رہے تھے۔“  
”آؤ روٹنا تھا؟“

”میں نے آؤر کا پوچھا تو مسکرانے لگے۔ پوچھ رہے تھے کہ آپ کب تک آتی ہیں۔ میں نے کارڈ دے دیا تھا آپ کے ہیڈ آفس کا۔“ کچھ ہی دیر میں وہ اسٹور سے باہر آگئی۔ جب پیچھے سے کسی نے آکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔  
”فرزام؟“ ایسا صرف وہی کر سکتا تھا۔

”یہ فرزام کون ہے؟“ ہاتھوں کو فوراً ہٹا لیا گیا۔ آواز پر وہ ایسے پٹلی۔ جیسے سانپ نے کاٹ مار لیا ہو۔ جس پر اس کی نظر پڑی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ شاندار عمارت کا بد نما کھنڈر بنا عدن تھا۔ اس کی سرخ و سفید دودھیا رنگت، لمبے عرصے سے گردوں کے عیار نے میں جٹا مریض سی بد رنگی اور گد مٹی ہو چکی تھی۔ تھوڑا بہت جو گوشت جسم پر بچا تھا وہ دھلتی عمر کے پیاری زوہ مرو کی جھریوں بھری کھال جیسا تھا۔

اپنے وقت کا شاہکار عدن عرف امان، کھنڈرات بنا کھڑا تھا۔

”یہ فرزام کون ہے افق؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔ کون تھا جو اس طرح اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ سکتا تھا اور کون تھا جس کے ہاتھ رکھنے پر افق کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ صبح سے اس کا میاں آکر انتظار کر رہا تھا۔ ریٹورنٹ اسٹور کے سامنے تھا۔ لیکن

سڑک پار کر کے کئی بار وہ اسٹور کے قریب بھی چلا گیا تھا۔ ریٹورنٹ اوپن تھا اور دن کے شروع میں وہیں زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ اس کی نظر ایک طرف اسی اسے گمان ہوا کہ یہ افق ہی ہے لیکن اسے یقین نہیں آیا کہ کیا یہ افق ہو سکتی ہے۔ وہ کپ آفس کریم کھا رہی تھی۔ نیلے رنگ کی چٹل جینز پر اس نے مشرقی طرز کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ ہلکے خاکی کرتے پر اس نے کمرے سرخ رنگ کا اسکارف گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ بال کھلے ہوئے تھے اور بالوں میں سرخ سی ہیر بنیز لگا ہوا تھا۔ دونوں کانوں میں ایر فون فکس تھے اور کپ سے چچے سے آفس کریم نکال نکال کر کھاتے ہوئے وہ ہنس رہی تھی۔ وہ یقیناً ”کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔“

”میں تمہارے آس پاس ہی ہوں۔“ فرزام کہہ رہا تھا۔

”کوئی نہیں۔“ اس نے آس پاس دیکھا۔  
”گردن کھماؤ مت نا۔ اسے ذرا سا جھکاؤ۔“

وہ ہنسی۔ وہ سمجھ گئی۔ اس کے پاس چند منٹ ہی تھے بات کرنے کے لیے۔ عدن کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یقین کرے کہ سرخ اسکارف میں جو لڑکی شرارتی چال چلتی جا رہی ہے وہ افق ہی ہے۔

اتنے سالوں میں کیا اس نے صرف یہی ایک کام کیا کہ وہ اور سے اور خوب صورت ہوتی تھی۔ اس بار اس نے اپنے ساتھ کیا کیا کیا۔ کیا کہ وہ اتنی خوب صورت ہو گئی۔ اتنی براعت ہو۔ بوسٹن کی سڑک پر وہ ایسے چل رہی ہے۔ جیسے بوسٹن میں ہی پیدا ہوئی ہے۔ چادر کا کوٹمانہ میں دبا کر۔ سر کو جھکا کر پیدل چلنے والی۔ ہر لا پر گہرائی والی۔ ڈر جانے والی، کس اور اسے ہنس رہی ہے۔ اسے دیکھ کر لگ رہا ہے کہ اسے کوئی فکر کوئی غم نہیں ہے۔ عدن کا تصور ڈر اٹھتا تھا۔ اس میں ایک تصور خاص غالب تھا کہ وہ اور اس آنکھیں لیے ہر طرح سے بہت اور اس ہوگی۔ اپنے امان سے دود۔ اس کی جدائی میں گھلتی، اس کے پیار کے لیے تڑپتی، افق عبد القدوس۔

وہ چل کر اسٹور کے پاس ہی آکر کھڑا ہو گیا تھا۔  
”افق نے نفرت سے اسے دیکھا۔ عدن اس نظر پر حیران رہ گیا۔“  
”ہو آریو؟“ اس سوال پر بھی حیران رہ گیا۔  
”میں کون ہوں؟“ اس نے ہنسنے کی صرف کوشش کی۔

”تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی؟“  
اگلا سوال پہلے سے بھی برا تھا۔ انداز اس سے بھی بدتر تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے بیگ میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ موبائل ہاتھ میں نکال کر کپڑا۔  
عدن اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ”تم پولیس کو فون کر رہی ہو؟“ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب افق کر رہی ہے۔

”آئی۔ ایم سوری افق۔ ایسے تو نہ کرو۔“ فون کو ہاتھ میں پکڑے پکڑے ہی افق نے اسے دیکھا۔

”تم نے مجھے ہاتھ کیوں لگایا؟“ کتنا تو وہ یہ چاہتی تھی کہ تمباک پینے نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔

”میں پھر سے سوری کہتا ہوں۔ لیکن تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہو؟“ اس کے انداز اور کڑے تیوروں پر وہ بری طرح سے الجھ گیا۔ ساتھ ہی اس کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں میں نمی نظر آنی لگی۔ افق کو یاد آ کر اس نے۔

”دیکھا چاہتے ہو؟“ عدن کیوں آئے ہو یہاں؟“  
”تمہیں شکر یہ کہنے آیا تھا۔“ فی الحال وہ یہ کہہ ہی نہیں سکا کہ تم سے فوری شادی کرنے کے لیے آیا ہوں جو افق اب اس کے سامنے کھڑی تھی وہ چادر کا کوٹمانہ میں دبا کر ٹیٹھی افق نہیں تھی۔

”کیوں؟“ افق نے حیران ہونے کی کمال اداکاری کی۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم ہی مجھے آؤر کرواؤ گی؟“  
”میں نے؟ میں نے کیا کیا؟ تم جیل میں تھے کیا؟“

عدن اس پر الجھ گیا۔ ”تم ہی بڑی این جی او کا نمائندہ تھی؟“ تو سمجھا تھا میرے پاس۔ مارش ٹام تھا اس کا۔

”میں نے تمہارے پاس کوئی نمائندہ نہیں بھیجا تھا۔“  
”اس نے خود مجھے تمہارا نام بتایا تھا۔“  
”تو تم بھی جیل میں تھے؟ وہ تمہارے پاس بھی چلا گیا؟“ عدن اور الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں جی او جن لوگوں کے لیے کام کر رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان میں تم بھی ہو۔ ہم نے عرب۔ بنگلہ دیش اور چند دوسرے ملک کے لوگوں کے لیے تھوڑا سا کام کیا تھا اور بس۔“ افق نے کندھے اچکائے۔  
”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ عدن کو یقین ہی نہیں آیا۔  
”تم کیا سمجھ رہے ہو؟ مجھے اس سے مطلب نہیں ہے۔“

”تم ایسے کیوں کر رہی ہو افق؟“ وہ پھر سے رو دینے کے قریب ہو گیا۔

”کیسے؟“

”جیسی کیوں بن رہی ہو۔ اتنے سالوں بعد ملی ہو۔ کوئی حال احوال پوچھو۔ کوئی بات کرو۔ میں پاگل ہو رہا تھا تم سے ملنے اور تمہیں دیکھنے کے لیے۔“

”تم نے کہا تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا تھا۔ جب کچھ کیا ہی نہیں تو کیا شکریہ۔“ افق نے کٹائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ صاف جھوٹ۔ تم تو جھوٹ بولتی ہی نہیں افق! اب کیوں؟ میں جانتا ہوں! تم ناراض ہو مجھ سے۔“

اس سب پر افق کا جی چاہا کہ وہ دھکا دے کر اسے سڑک پر گرا دے۔ اب یہ شخص اس سے اور کیا چاہتا ہے۔ اس کی سب خوبیوں کو جانتے ہوئے بھی چھوڑ گیا تو اب اور کیا چاہتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھوں اس کی مدد ہو گئی تھی۔ اس مدد کو اس نے انسانیت کے خاتمے میں لکھ دیا تھا۔ عدن کے خاتمے میں نہیں۔

”تم نے اپنی محبت کا حق ادا کر دیا۔“ عدن کی آہلی



بات افق کو چلنے کی طرح گئی۔

”کون سی محبت؟“ افق کا سر گھوم گیا۔ اب ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔ شاید بہت غلط ہونے جا رہا ہے۔

”ہماری محبت۔“ اس نے بڑے دھڑلے اور جوش سے کہا۔

”ڈاکٹر عدنان۔ زبان سنبھال کر۔“ اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ ”میری محبت میرا شوہر ہے اور بس۔ اس چکر کو جس میں مجھے پھنسا یا تھا، اسے محبت کا نام مت دو۔“

قید سے پہلے ”تمہارے دوست گروہو۔“ اس پر آسانی بجلی بن کر گر آتی رہائی کے بعد ”میری محبت میرا شوہر“ وہی بجلی بن کر اس پر گرا۔ جی رانی، صدمہ، خوف، لا چاری، بے بسی، دکھ، سب آگے پیچھے اس پر وارو ہوئے۔ جب اسے مارش نے افق کے بارے میں بتایا تو وہ بھی سمجھا کہ قسمت افق پر مہمان ہو گئی ہے اور اس نے کسی نہ کسی طرح اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہ امریکا تک آ پہنچی ہے۔

”تم نے شادی بھی کر لی افق؟“ یہ بازی بھی ہاتھ سے گئی۔ عدنان کا یہ سوال ایسے تھا کہ تم نے تو مجھے موت کی ہی سزا سنائی۔ اس کا گد ملے گا یا نہ ملے گا۔ دو آنسو آنکھوں سے نکلے۔

ایک بار پھر سے افق کو اس پر ترس آیا۔ ”کیوں نہ کرتی؟“ اس نے بہت اعتماد سے پوچھا۔ عدنان کو تو شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس کا گریبان نہیں پکڑ رہی۔ کوئی سوال جنس کر رہی۔ اس نے بے مشکل سر کو ہلایا۔

”ہاں کرنی چاہیے تھی۔“ اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر وہ مخالف سمت میں چلنے لگا۔

”دوبارہ کبھی میرے راستے میں مت آنا۔“ افق کی آواز اس کے پیچھے آئی۔ اس نے تائید میں سر کو ہولے سے ہلا دیا۔ اب وہ ایک ایسے انسان کی طرح سڑک پر چل رہا تھا جو نہ کسی میدان کا کھلاڑی تھا نہ ہی تماشا خانہ۔ دنیا کے سب ہی کھیل تماشا خانے اس کے لیے

ختم ہو گئے۔ بے نام قدم ہی انھیں گے اب سب جو کچھ بھی رک جاتے ہیں اور کسی سمت بھی نہیں جاتے۔

ساری رات وہ سڑکوں پر گھٹ کر تارہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر روتا بھی رہا۔ دراصل اب ہی وہ صحیح معنوں میں خالی ہاتھ ہوا تھا۔ افق کے اب کبھی نہ ملنے پر اسے اصل دکھ ابھی ہوا۔ وہ اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے۔ اس پر زیادہ ہوا۔ ہاں صرف شوہر۔ اس نے اپنی تم آنکھیں دامن ہاتھ کی پھٹکی سے صاف کیں۔ وحشت زدہ پاگل آنکھیں جو صدمے اور دکھ میں جا رہی ہو جاتی ہیں اور تیزی سے پھر پھٹنے بھی لگتی ہیں۔ وہی نفسیاتی دورے کی کیفیت جو اسے قید کے دوران پڑنے تھے۔

انتارو کر ”انتا پچھتا کر بھی عدنان روز اسٹور کے قریب چلا جاتا۔ دو چار چھ دن، افق وہاں آ ہی نہیں رہی تھی۔ عدنان کو بھی آتی۔ وہ اس سے ڈر رہی تھی۔ ایک ہفتے بعد وہ تھوڑی سی دیر کے لیے آئی اور چلی گئی۔ فاصلہ رکھ کر عدنان اس کے پیچھے پیچھے اس کے گھر تک جا پہنچا۔ پھر وہ روز اس کے گھر تک جانے لگا۔ وہ اس کے شوہر کے انتظار میں تھا۔ افق اکیلی ہی گھر سے باہر نکلتی نظر آتی۔ وہ سمجھ گیا کہ افق نے اس سے جھوٹ بولا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ کیوں بولا ہے یہ پوچھنے کے لیے وہ اس کے ساتھ ساتھ کالج گیا۔ اس پر گھر پڑنے ہی افق کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا افق! تم مجھ سے اتنا کترا کیوں رہی ہو؟ میں وہی امان ہوں جو تمہاری جان ہے۔“

عدنان نے کالج کی طرف جاتی سڑک پر اسے جالیا تھا۔ افق نے سختی سے اپنے لب پیچھے اور ایسے ظاہر کیا کہ نہ اسے جانتی ہے نہ ہی اسے سن رہی ہے اور تیز چلنے لگی۔

”تم اتنا سخت ناراض ہو مجھ سے۔ میں نے تمہیں فون نہیں کیا اس لیے۔ میں حالات میں پھنس گیا

تھا۔ نہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ تم میری بات تو سنو۔ تم اس طرح نہ موڑ کر کیسے میرے بغیر رہ سکتی ہو۔“ افق کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ شخص کتنے مزے سے اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔

”دیکھ حالات؟“ اس نے پوچھا۔ ”میں امریکا نوکری کے لیے آیا تھا۔ مجھے اچانک آنا پڑا۔ جہاں اپلائی کیا تھا وہاں سے فوری کال آ گئی تھی۔ تیاری کرنے میں، میں اتنا مصروف ہو گیا کہ تمہیں ایک فون نہیں کر سکا۔ سوچا تھا امریکا آ کر لوں گا۔“ ”وہ اپنا ہاتھ اتارنا نہیں تھا، جہاں تم نوکری کرتے رہے ہو؟“

وہ سمجھ رہا تھا کہ افق کو کچھ نہیں معلوم اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ عزیز سے بھی مل چکی ہے اور آرٹیکل بھی پڑھ چکی ہے۔ وہ اسے وہی افق سمجھ رہا تھا جو فیکٹری جایا کرتی تھی۔ ایف اے میں ٹپل ہو گئی تھی۔ کچھ جاتی ہی نہیں تھی۔ ”وہ کسی آغا عباس حیدر کا تھا۔“

”اور وہ آغا عباس حیدر تمہارے سر نہیں تھے؟“

اب عدنان کا حلق خشک ہو گیا۔ ”ان کی بیٹی۔ تمہاری بیوی۔ ماریہ۔ تمہارے بچپن کی محبت۔“

عدنان کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ وہ نہ صرف اس کی شادی، بلکہ ماریہ تک کے بارے میں جانتی ہے۔ وہ اتنا سب کچھ کیسے جانتی ہے؟

”میں اسے چھوڑ چکا ہوں۔“ اسے یہی بات سوچھی۔

”مطلقاً اس نے فی تھی تم سے۔“ افق کی معلومات زیادہ جامع تھیں۔

”تم اس لیے ناراض ہو کہ میں نے ماریہ سے شادی کر لی؟“

”میری طرف سے تم دنیا میں موجود ہر ماریہ سے شادی کر لو۔“ افق نے مسخرا دیا۔

”روز میرے راستے میں ایسے مت آیا کرو۔ میں اپنے شوہر کو بتا دوں گی۔ میرا شوہر روایتی پاکستانی بھی

ہے اور امریکا کا لاء تو تم جانتے ہی ہو۔ دونوں باکر مل گئے تو۔“

عدنان جس کا شرمندگی سے حلق خشک ہو چکا تھا۔ افق کے اس دھمکی بھرے انداز سے آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اسے دو دو پیسے کے کام کرتے دیکھا تھا۔ ہمارے ملازم۔ جو تیاں اٹھانے والے۔ گندے برتن دھونے والے۔ آواز پر جی کھینے والے۔ ترقی کر کے کسی بھی آسمان پر جا نہیں۔ کسی کے لیے وہ تب بھی ملازم ہی رہتے ہیں۔

”شوہر کو؟“ وہ ہنس۔ ”کس شوہر کو جو سرے سے ہے ہی نہیں۔ کہاں ہے وہ۔ بلاؤ۔“

افق نے اسے نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اتنی بات کر کے بھی بے وقوفی ہی کی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے بغیر وہ آگے بڑھی اور عدنان نے اسے آگے بڑھتے دیکھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رو کر کتا چاہا۔

”میں ہر بار تمہاری یہ جرات معاف نہیں کروں گی۔“ وہ حلق کے بل چلائی۔

”تمہیں میری بات سننا ہی ہوگی۔“ وہ بھی چلایا۔

”ورنہ میں بار بار تمہارے راستے میں آؤں گا۔ تمہارے گھر آ جاؤں گا۔ تمہیں ایک بار مجھے موقع دینا ہی ہو گا۔“

افق اس سے ڈرتی نہیں تھی۔ لیکن اندر ہی اندر اب ڈر گئی۔ وہ کالج تک اس کے پیچھے آ گیا تھا۔ اب بار بار آئے گا۔ گھر بھی آ جائے گا۔ وہ نہ جانے کیوں ایسے پاگل ہو رہا ہے۔

اس کی بات آخری بار سننے کے لیے وہ قریب کی کالی شاپ میں آ گئی۔

”تم سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ گیا تھا۔ بتاؤ! کس کی قسم کھاؤں کہ تمہیں یقین آ جائے میں نے تمہارے لیے اپنے خاندان کو لایا کو بھی منایا۔ گھر چھوڑنے کی دھمکی دی۔ دونوں ہو مل میں رہا۔ ملائی ہو گئیں تو وہیں بیاہی طبیعت زیادہ بڑھتی۔ اپنے باپ کے لیے میں اتنا بھی نہ کر سکا کہ اس کی مرضی سے شادی کر لیتا؟ کس منہ سے تمہیں فون کرنا؟ سب بتاتا۔

مجھ پر الزام لگا کر جیل بھیج دیا گیا۔ ماریہ نے طلاق لے لی۔ اس سب میں میرا قصور کہاں ہے؟ میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔ اتنی بہت میں نے بیٹھ صرف تم سے محبت کی۔ تمہارا کتنا احترام کرتا رہا ہوں میں۔ اتنے سال میں تمہارے لیے روتا رہا ہوں اور تم ایسے دور جاری ہو۔ مجھ پر کچھ رحم کرو۔ اتنی بڑی سزا نہ دو۔ میرے پیالے نے زبردستی میری شادی کر دی۔“

اتنی صرف آخری بار اس کی بات سن رہی تھی۔ تاکہ وہ بار بار اتنی بات کہنے کے لیے اس کے روتے میں نہ آئے۔ اسے کوئی مطلب نہیں تھا کہ وہ جھوٹ اور کتنا بچ بول رہا ہے۔

”میں نے سب سن لیا ہے۔ ساری باتیں۔ تم اپنی زندگی میں خوش رہو۔ اور مجھے میری میں رہنے دو۔“

”تمہارے بغیر میں کیسے خوش رہوں؟“

اتنی نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔ ”میں اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوں کہ اس نے مجھے فرما دیا۔“

”مجھے اس کی قسمت پر رشک ہے۔“

”یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ مت جاؤ۔ تم تو کہتی تھیں کہ تم میرے بغیر رہ نہیں سکتیں؟“

”تب میں بے وقوف تھی۔“ اس نے بہت عتاب سے کہا۔

”تم اب بے وقوف بن رہی ہو اور مجھے بتا رہی ہو۔ تمہارے اندر آج بھی میں ہی ہوں۔ ورنہ تم میری مدد نہ کر سکتیں۔ تمہاری اماں نے زبردستی تمہاری شادی کروادی اور تمہاں لگیں۔“

”تمہارے باپ نے تمہاری زبردستی شادی کی اور تم مان گئے۔“ کرنے پر آئی تو کڑے طنز اتنی کے پاس بھی بہت تھے۔

”میں مجبور تھا۔ اتنی۔“

”میں مجبور نہیں تھی۔ میں چودہ جماعتیں پڑھی ایک عاملہ و بالغ لڑکی تھی اور پورے ہوش و حواس میں

فرزام کو اتنا کر کے لیے ”ہاں“ ہی تھی۔ اپنے منہ سے اس کے عین سامنے ہو کر۔“

”حالات کے پیش نظر“ ہاں“ کر دی ہوگی۔ محبت نہیں۔ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ محبت تم صرف مجھ سے کرتی ہو۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتیں۔“ اتنا جانتا تھا وہ اتنی کو۔ اسی لیے اتنا دور تھا اس سے۔

”ہاں! شاید صرف خالی خالی محبت نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ جذبہ تو اس سے بھی آگے کا ہے۔ میں فرزام کے لیے اپنی جان دے سکتی ہوں۔ ڈاکٹر عدنان اور کسی کی جان بے بھی سکتی ہوں۔“

اس نے ٹھہر ٹھہر کے عین اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اسے اندازہ ہونا چاہیے کہ اتنی کتنا بڑا بچ بول رہی ہے۔ خالی خالی دعوے نہیں۔

عدنان تڑپ اٹھا۔ اتنی کے منہ سے کسی اور کے لیے یہ سن کر اس کا پیاسا شخص کو باروینے کو چاہا۔

”بکواس بند کرو اپنی۔“ وہ چلایا۔ ”جھوٹ مت بولو۔“

اتنی نے پروا بھی نہ کی اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ”مجھے لگا۔“

”تم نے کہا تھا تم میرے بغیر سانس نہیں لیتیں۔ تمہارا دن رات ہوں میں۔ مجھے سوچ کر نہیں نیند آتی ہے اور میں تمہارے سب ہی خواب ہوں۔“

اتنی آگے آگے تھی۔ وہ پیچھے پیچھے تھا۔ جود کہہ رہا تھا۔ وہ اسے بال میں گرا تا جا رہا تھا۔ وہ اس شخص سے اب اور نفرت کرنے لگی۔

”تم مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟“ پلٹ کر وہ چلائی۔ وہ اس کے پیچھے ہی آتا جا رہا تھا۔

”فرزام کو پھوڑ دو۔ آؤ! ہم شادی کر لیں اتنی۔“

اتنی ہکا بکا رہ گئی۔ کس بہت اور بے نیازی سے اسے کہہ رہا تھا یہ سب۔ اسے چھوڑ جانے والا۔ صفائی سے جھوٹ بولنے والا یہ توقع بھی کیسے کر سکتا تھا۔

”تمہارے جیسے دو کوڑی کے انسان کے لیے اسے

چھوڑ دو؟ جس نے ایک امیر باپ کی بیٹی سے شادی کر کے مجھے چھوڑ دیا۔ اس شخص کے سینے کے ساتھ جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا۔“

اتنی یہ بات کسی کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی عزت کا پرہ تھا۔ اسے وہ چاک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اب عدنان کے منہ پر یہ بات مارنی ہی پڑی۔ آخری بات سن کر عدنان سانس میں رہ گیا۔

”تمہارا کینہ باپ۔“ سوچوں والا گدھ۔ جب اپنی ماں کے علاج کے لیے تم سے مدد لینے تمہیں چھوڑ دیتی میں وہاں نہ۔ تو اس نے میرے آگے پیچھے چھوڑ کر میری عزت پر ہاتھ ڈالا۔ تمہارے باپ نے میرے سامنے تمہیں فون کیا تھا۔ تم اور ماریہ جب ہنسی من رہتے اور تم چاہتے ہو کہ اب بھی میں تمہارے جیسے انسان کا احترام کروں؟ تم سے بات کروں؟“

”ہو نہ۔ سفید جھوٹ۔ سراسر الزام۔“ وہ الٹا بدک گیا۔ اگر حالات دوسرے ہوتے تو وہ گدھ کہنے اور ایسے الزام لگنے پر اس کی گردن دبا دیتا۔

”یہ تمہارے باپ سے جا کر پوچھو۔ ہاں! میری وجہ سے تم باہر کھڑے ہو اس وقت۔ شاید اللہ میرے ہی ذریعے تمہیں باہر لانا چاہتا تھا۔ جو تم سے مدد لینے کے لیے کئی کئی اسی کے ذریعے۔ جاؤ! جا کر بتاؤ اپنے باپ کو یہ اتنی ہے جس نے تمہاری مدد کی ہے۔ عزت بیکار بھاگ جانے والی کے ہاتھ سے مدد کا یہ پھینچ بہت دور وار ہے۔ یہ پھینچ تم دونوں کو بیک وقت لگا ہے۔ بہت باکس بنایا تم نے مجھے۔ بہت بہن نہیں ہوں۔ لیکن تم سے اب بیشہ دور رہی رہوں گی۔ اتنی سمجھ دار تو ضرور ہوں۔“

اتنی چلی گئی۔ عدنان بت بنا وہیں کھڑا رہا۔ ماں اور باپ صرف یہ دو ایسے رشتے ہیں کہ کتنے بھی گناہ گار ہو لیکن اگر کسی تیسرے کے منہ سے ان کے گناہ نہیں سن سکتے۔ اپنے باپ کو اتنی کے بارے میں بتا بھی چکا تھا۔ پھر بھی اپنے بیٹے کی پسند کے ساتھ۔ اتنی کے ساتھ۔ فون بولتے تھے اس نے فون کیا۔

”اتنی! آپ کے پاس آئی تھی کبھی؟“

”کون اتنی؟“ لمحہ بھر کے تال کے بعد کہا گیا۔

”جس کی عزت پر آپ نے ہاتھ ڈالا تھا۔ جو میرا پوچھنے ڈی ایچ ایچ والے بنگلے میں آئی تھی۔“ آخری حد پر تھا نکل کی۔

”کیا بکواس ہے یہ؟“

”ہاں! نہ میں جواب دے۔“ تن کر کہا۔

”بکواس بند کرو گدھ! اپنے باپ پر الزام لگا رہے ہو؟“

”ہی اتنی نے بوٹن میں مجھے اس سیل سے آزاد کر دیا ہے۔ جہاں زمین پر میں نے ایزیاں رکڑی ہیں اور دیواروں سے سر ٹکرایا ہے۔ اس۔“

”کیا بکواس ہے؟“ فون بند ہو گیا۔ عدنان جان گیا۔ اتنی سچ کہہ گئی ہے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کی سرگرمیوں سے واقف نہیں تھا۔ لیکن اسی لڑکی کے ساتھ جس کا ذکر وہ ان سے کر چکا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ سب کچھ۔ عزیز کے ہاتھوں جب وہ بار بار پیغام بھیجنا تھا کہ اتنی کے گھر جائیں۔ اسے عدنان کے بارے میں بتائیں تو اسے ایک ہی جواب ملا تھا کہ وہاں کوئی ایسا گھر نہیں ہے۔ نہ ہی وہاں کوئی اتنی رہتی ہے۔

وہاں کوئی گیا ہی نہیں تھا۔ اس کا باپ کس منہ سے وہاں جاتا۔ زندگی کے اس حصے میں باپ نام کا بھرم رکھے اس شخص کی عزت بھی اس کے اندر سے تھی۔ تو اب سب کچھ چلا گیا عدنان کے پاس سے۔ عدنان خالی ہاتھ رہ گیا۔ اس سے اچھا تو وہ امریکی سیل میں ہی تھا۔ سر ہی پھوڑا ہے تو آزادی میں ہی کیوں۔ بالکون کی طرح اس نے ایک ہی سڑک کے دس چکر لگائے۔

اب اس کے پاس کچھ نہیں بچا۔ جو بچا تھا اسے چھین لیا گیا۔ اب اسے زندہ رہنا ہے تو صرف اپنی مرضی کے ساتھ۔ اپنے من پسند لوگوں کے ساتھ۔

\*\*\*

چند دن وہ عزیز کے ساتھ مقدمے کی سماعت میں مصروف رہا۔ چند اخبار والوں نے اس کے تفصیلی

انٹرویو بھی لیے۔ عزیز اسے اپنے ساتھ چند دوسرے  
اداروں میں لے کر گیا جو مزید اس کی مدد کر سکتے تھے۔  
ہفتے سے کچھ زیادہ دن مصروف رہا۔ فارغ ہوتے ہی  
اس نے افق کی نگرانی شروع کر دی۔ اب وہ گھر سے کم  
ہی باہر نکلتی تھی۔ لیکن جب بھی نکلتی، فرزام ساتھ  
نہیں ہوتا تھا۔ اسے فرزام کے آنے کا انتظار تھا۔  
ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک دن افق بہت بن ٹھن کر اریہ  
پورٹ گئی۔ اسے وہ شخص دیکھا تھا جس کے لیے وہ  
جان لے بھی سکتی ہے تو اس کا خیال تھا کہ پھر یہ  
”جان“ لینا فرزام کی ہی سی۔ فرزام کی جان لے لی  
چاہیے۔

اسی دن شام کو وہ دونوں اکٹھے باہر نکلے۔ وہ ان کے  
پیچھے ہی تھا۔ بس ایک بار اس نے انہیں ایک سڑک  
سے گم کر دیا تھا۔ دو گھنٹے وہ انہیں نیویری میں ڈھونڈنا  
رہا۔ جب وہ اسے دوبارہ نظر آئے تو دونوں آمنے  
سامنے کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔  
فرزام کی جان نکلنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ وہ ان  
دونوں کے پاس چلا گیا تھا۔

پھینکار کر وہ اس کا گریبان جھنجھوڑ رہی تھی۔ ”تم  
نے میرے ساتھ یہ کیوں کیا؟ اتنا جھوٹ بولا؟ میں نے  
تمہاری مدد کی۔“ وہ ساتھ ساتھ رو رہی تھی۔  
”تم نے میری مدد نہیں کی۔ تم ہی نے کہا تھا کہ تم  
نے میرے باپ کے منہ پر پھینڈو مارا ہے۔ اس  
تھپڑ کے بارے میں میں نے انہیں بتا دیا ہے۔“ خود کو  
اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر اس نے اطمینان سے  
کہا۔

”تم نے ایک بار پھر میرے ساتھ برا ہی کیا نا۔  
تمہاری مدد کر کے میں خود اپنے ساتھ برا کیا۔“  
”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا افق! چھوڑ دو  
اسے۔ تم صرف مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں ہوں  
تمہارا ماں۔“

ایک اور تھپڑ سے اپنا ہاتھ روک کر افق اسے وہیں  
کھڑا چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف بھاگی۔  
فرزام کا فون بند جا رہا تھا۔ پہلے جب اس نے کیا تھا

تو ایک بیل گئی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھی وہ مسلسل  
فون کر رہی تھی۔ اب وہ اسے سب کچھ بتا دے گی۔  
اسے چھپانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ ناراض  
ہو گا۔ لیکن ماں ہی جانے گا۔ بٹ بٹ گئی تھی تو  
بھی جانے کی۔  
دروازہ کھول کر وہ اندر آئی تو ہر طرف اسے فرزام  
غصہ بکھرا نظر آیا۔ شاید کچھ اور کچھ کچھ  
پڑے تھے۔ جیسے ایک ایک کو اٹھا کر پھینکا گیا ہے  
سارے جوتے، پھینچو، کوٹ، کپڑے، شرٹس، پیر  
جیولری، اور اور کچھ پڑی تھی۔ گل دان کی  
ٹوٹا ہوا تھا۔

”فرزام!“ وہ لپک کر اس کے پاس آئی۔ وہ  
ڈانٹنگ ٹیبل پر سر رکھنے بیٹھا تھا اور ایسے بیٹھا تھا جیسے  
کسی سے بے عزت کر کے نکالا گیا ہو۔ اس نے  
اٹھا کر ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔

”مجھے وہاں اکٹھا چھوڑ آئے۔ مجھے سننے تو سنی۔“  
راستے بھر وہ روٹی نکلتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پھرت  
روٹے نکلتے۔

”لعل تم نے اس کی ٹیٹ؟ کیا بارڈر؟“  
”نکو اس کر رہا تھا۔“ وہ چلائی۔ ”جھوٹ بول رہا  
تھا۔ میں نے نہ بتا کر غلطی کی۔ اب نہیں کر سکتی۔“  
فرزام اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھا۔ جیسے اسے سن  
نہیں رہا۔

”پلیز میری بات سنو فرزام۔ میں نے ماں لپا کر  
میں نے غلطی کی۔ میرا یقین کرو۔ میں سب بتا دیتی  
ہوں۔“

”سن آیا ہوں۔ تم نے اس کی مدد  
کی۔“

”ویسے نہیں۔ جیسے آپ سمجھ رہے ہیں۔“  
”پھر کیسے؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ کہاں  
ہے؟“ وہ ایسے جرح کر رہا تھا جیسے مقدمے کا فیصلہ  
پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اب تو صرف وہ ایسے ہی سوال کر  
ہے۔ ”تم اسے بھولیں نہیں؟ تم نے اب اسے ڈھونڈنا

”کالا۔“  
اس نے صرف نفی میں سر ہی ہلایا۔ اتنے سے ہی  
سوالوں پر اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ بات اتنی بھی آسان  
نہیں رہتی۔ اب اس یقین پر جواب دے دینے پر بھی  
کال نہیں ہو گا۔ سر تیزی سے نفی میں ہل رہا۔  
”ابا نہیں ہے فرزام۔“ آواز اور ہلک گئی۔  
”پھر کہا ہے؟ کیسے ہوا یہ سب؟“

”میں نے میگزین میں اس کے بارے میں پڑھا  
تھا۔“ وہ جانتی تھی۔ اس سلسلے میں پوچھا گیا اگلا سوال  
تھوڑے سے بچے کچھ یقین اور اعتماد کی بھی موت  
کر دے گا۔

”پھر“ اس کے لیے پہلی بار فرزام کا انداز سخت  
تر ہو گیا۔ اس ”پھر“ کا جواب تو وہ خود نہیں جانتی تھی۔  
اس ”پھر“ کا جواب ہی اسے لے ڈوبے گا۔ یہ ”پھر“  
بہت اچھا ہوا تھا۔

”میں اس کے وکیل کے آفس گئی۔“ اس کی آواز  
ایک گئی۔ حلق خشک ہو گیا۔ الفاظ سارے غائب  
ہو گئے۔

”تمہیں اس کے وکیل کا کیسے معلوم ہوا؟“  
”میں نے سچ کیا تھا۔“ شرمندہ سے وہ اور  
شرمندہ ہوئی۔

”گو کہ۔“ یہ اس کے بہت جان لیوا تھا۔  
”تم آفس کیوں گئیں؟ وہ سوال کر رہا تھا۔ وہ اپنا اور  
اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔“

”اگل تھی جو گئی۔ خود نہیں جانتی  
تھی۔ اب بتاؤ اور سمجھا نہیں سکتی تھی۔“

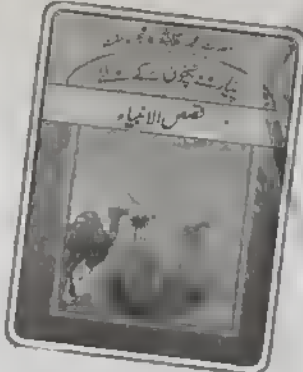
”میں پاگل تھی فرزام! جو چلی گئی۔ خدا جانتا ہے۔  
میں بتا کی وجہ سے گئی۔ وکیل نے میری بہت سنت  
بجٹ کی۔ مجھے اکسایا۔ انسانیت کے واسطے دیے۔  
مسلمان ہونے کا کہا۔“

”تم نے انسانیت کے نام پر یہ سب کیا؟“ وہ بظاہر  
بہت اطمینان سے یہ سب پوچھ رہا تھا۔  
”ہاں۔“ میرا یقین کرو۔ حالات ایسے۔“

”لوگوں لوگ جیلوں میں بند ہیں۔ پاکستانی مسلمان“

بیارے بچوں کے لئے

## قصص الانبیاء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشعل  
ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ  
اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ حضرت محمد ﷺ

قیمت -/300 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ -/50 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



انسان بھی۔“

”مجھے معاف کریں فرزام۔“ اس کے پاس فرزام کے ایسے سوالوں کے جواب نہیں تھے سوال کے نام پر اب اس کے پاس مانگنے کے لیے صرف معافی ہی تھی۔

”تم کس دن آفس گئیں؟“

”جس دن آپ کا میسج آیا تھا کہ گھر سے باہر نہ جانا۔“ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ جتنے بھی بول رہی تھی۔ وہ حیثیت میں دو کوڑی کے بھی نہیں تھے۔ ایک جج جو جج کے سامنے بول کر کسی کو پھانسی سے بچا لیتا ہے۔ اگر بروقت نہ بولا جائے تو بعد ازاں بے شک ساری دنیا کے سامنے بلند و بانگ بولا جائے۔ پھر وہ جج صرف ایک گونج ایک اعلان ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

”مجھے معاف کریں فرزام۔ میں نے اتنا کچھ چھپایا۔ میرے اور اس۔۔۔“

اسے درمیان میں ہی ٹوک کر وہ خود اٹھ کر ریڈروم میں چلا گیا۔ دروازہ لاک کر لیا۔ لحوں میں ہی اس نے اس دن سے اب تک کی ساری فلم آنکھوں میں چلائی۔ اس کے سارے جھوٹ فرزام کے کانوں کو سنائی دے گئے۔ اتنی لائنیں میں کھڑی رہ گئی۔ گھٹنے میٹھے والا مرد مقل ہو کر اکیلا ہی بیٹھ گیا۔ انکو بھی نہ جانے کہاں گئی۔ ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر۔ یا اس گھر کی۔ پہلی بار اتنی نے اپنی قسمت کو کوسا۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ روئے گئی۔ فرزام کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی کرتا۔ شاید اسے سر راہ ہی پھپھرا دیتا۔ گھر سے نکال دیتا۔ عدن نامی دبا ہے ہمیشہ ناکام کروادیتی تھی۔ آج وہ فرزام کے آگے بھی ٹپس ہو گئی۔

اگلے دن وہ صبح جوتے ہی چلا گیا۔ وہ گھر میں ہی اس کا انتظار کرتی رہی۔ ابھی وہ غصے میں ہے۔ اس سے بہت ناراض ہے۔ وہ مان ہی جانے لگا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔

رات گئے وہ آیا اور سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ اس

نے خوشی کی بات کرنے اور کرا کھلوانے کی۔ مگر اس نے بات کی نہ ہی کرا کھلا۔ آئے والے چند اور دن بھی ایسے ہی چلتا رہا۔ پیرس جانے والا جو ڈاکٹر خریدی گئی اتنی ساری چیزیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ وہ سارا وقت روٹی رہتی۔ دونوں کے درمیان وقت گزر حالات کی جو خلیج تھی اور جسے دونوں ہی جانتے تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ ختم کر رہے تھے۔ وہ خلیج ایک دم ہی پھیل کر انہیں بہت دور لے گئی۔ اب جب وہ اس کے قدموں میں بیٹھنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کچھ غلطیاں نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ کچھ غلطیاں لے دو جتنی ہیں اور کچھ چل کر ملیا میٹ کر دیتی ہیں۔ عدن یہ تینوں غلطیاں تھا اور یہ تینوں اتنی سے ہوئی تھیں۔

اس کے باب کو پچھان لینے پر بھی وہ اس کی خصلت کو نہیں جان سکی۔ آخر تو ایک ہی تھا۔ ناکار کرنا ناعدن نے اس پر ایسا وار کیا کہ اس کی جان ہی نکال لی۔ اگر انسانیت کے نام پر اسے یہ سب کرنا ہی تھا تو فرزام سے کیوں چھپایا یہ؟ غلطی اسے ملیا میٹ کر چکی تھی۔ اب اسے وقت کا ہی انتظار تھا کہ فرزام اس پر یقین کر لے۔

جس کمپنی کے ساتھ وہ کیڈز اکام کر کے آیا تھا۔ اسی کی ایک اشتراکی کمپنی میں وہ کام کرنے لگا۔ آفس کے پہلے دن جو اسے پھولوں کے بکے ملے۔ اس نے تیل پر پڑھا۔ سارے منصوبے خاک ہو گئے۔ وہاں لمبی چٹائی اور یورپ کی سیرو۔ صرف اس کی پیاری بیوی اتنی اور ساتھ صرف وہ۔

اتنی نے کاج جانا چھوڑ دیا۔ اسٹور جانا بھی چھوڑ دیا۔ وہ اس حالت میں ہی نہیں تھی کہ کہیں جاتی۔ سارا دن لفظ جوڑتی رہتی اور فرزام کی طرف نظر اٹھتی ہی اس کا دم نکل جاتا۔ وہ اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کی طرف دیکھتا نہیں تھا۔ ناشتا کر کے نہیں جاتا تھا۔ گھر اگر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ رات رات بھر اتنی رو رہ کر

جا نہیں کرتی رہتی۔ وہ فرزام کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن وہ فرزام کے ساتھ ایسے بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اسے وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتی ہے۔ دونوں ایک ہی راستے پر ایک ساتھ چلتے چلتے ایک دوسرے کی پشت پر آ گئے۔

ایک روز وہ حسب معمول رات گئے آیا تو اس نے آتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”خدا کے لیے میرے ساتھ ایسے نہ کرو فرزام! مجھے ارادہ برا بھلا کو۔ لیکن ایسے نہ کرو۔“

سارا دن بھی وہ روٹی رہی تھی۔ اس کے سامنے بھی روٹی تھی۔

اس نے جھگڑے سے اپنا ہاتھ اس سے آزاد کر دیا۔ ”اور تم نے میرے ساتھ کیا کیا اتنی! تم نے مجھ سے سب کچھ چھپایا۔ جھوٹ پر جھوٹ بولا۔ کئی بار میں نے تم سے پوچھا۔ تم ٹھیک ہو۔ تم یہی کہتی رہیں کہ تم ٹھیک ہو۔ آن دوں تم اس سے مل رہی تھیں نا؟ چھپ کر اتنا کچھ کر رہی تھیں۔“

”میں اس سے نہیں ملی تھی۔ وہ میرے راستے میں آتا تھا۔“

”کیوں اس شخص کے لیے تم اس وکیل کے آفس جا پونجی تھیں۔ مجھے یقین دلاؤ اتنی! تم ہمارے بچہ کے گھر میں۔ تم اس شخص عدن کے لیے نہیں گئیں۔ ابھی تک وہ تمہارے اندر ہے۔“

”میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ میرا یقین کرو۔“

بلن! مجھے یقین دلاؤ اتنی۔ میں یقین کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا ہی تو یقین کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن تم نے اس یقین کا بہت غلط استعمال کیا۔ تم نے میرا اعتماد تار تار کر دیا۔ اتنے سال سے میرے ساتھ ہو۔ مجھے جان نہیں سکیں۔ تم نے مجھ سے اتنے جھوٹ بولے۔ جس نے شادی سے پہلے ہر کون سے جگہ کوں کر بھی تھیں انہیں۔ اگر تھیں اس شخص سے نفرت ہوتی تو تم اس میگزین کو ہی پھاڑ کر پھینک دیتیں۔ یہ ہوتی تمہاری نفرت۔ اپنے قدم باہر

کی طرف بڑھانے سے پہلے تم میری طرف آئیں۔ سالوں پہلے میں نے ہزاروں بار یہ شکوہ کیا تھا کہ کس قوت نے مجھے برطانیہ سے نکال باہر کیا۔ تم سے شادی کرتے ہوئے مجھے اس قوت پر بہت بار آیا۔ میں نے لاکھوں بار شکر ادا کیا کہ مجھے اتنی کے لیے بروقت دیاں سے نکال دیا گیا۔ روی سے دور کر دیا گیا۔ آج مجھے یقین ہوا ہے اتنی! کہ مجھے تو تم سے میرے ناکرہ گناہوں کی سزا دینے کے لیے ملوایا گیا ہے۔ جس کے بعد میں کسی اور قاتل ہی نہ رہوں۔ بس تم ہی میرا ہی انجام ہو۔ ہر خواب کی اجڑی تعبیر۔ زندگی میں جس تباہی سے میں بچتا رہا اس تباہی کو خود اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ مجھے یقین دلاؤ اتنی! تم اس شخص سے نفرت کرتی ہو۔ اور یہ سب کچھ تم نے نفرت میں کیا؟ اب نہ جانے یہ وقت کتنا وقت لے گا۔ پھر سے محبت کے لیے۔“

فرزام چلا گیا۔ اتنی کھڑی رہ گئی۔ اب اکثر وہ اسے آن لائن روی سے بات کرتا نظر آتا۔ اتنی نے جب کبھی عدن سے بات کی تھی۔ وہ سامنے کرتا تھا۔ مسٹر فرزام کے گھر میں مسٹر فرزام اجنبی ہو گئیں۔ دنیا کے ہر کام سے اتنی کا دل اچٹ ہو گیا۔ ایک فرزام کے علاوہ اسے کسی کی فکر نہ رہی۔ ایک اسی کے علاوہ اسے کوئی دکھ نہ رہا۔ اس کی مہم سے بڑی خوشی اس کے لیے سب سے بڑا غم بن گیا۔ وہ آفس سے جلدی لگیا۔ اسے آواز دے کر سامنے صوفے پر بٹھایا۔ دونوں کے درمیان آواز دے کر کربلا نے اور ایسے موقع پر آئے سامنے بیٹھنے کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ وہ اس کی شکل کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی طرف دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ کانوں میں انگلیاں دے لے۔

”میں کاغذات بنوا رہا ہوں۔ اسلاک سینٹر گیا تھا۔“

”کیسے کاغذات؟“ اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”طلاق کے۔“ کتنے آرام سے اس نے کہہ دیا۔ نہیں اتنے آرام سے بھی نہیں کہا۔ قیامت دونوں طرف ہی آگئی ہو۔

# سکینہ

سکینہ جمیلہ مائی اور اللہ داتا کھار کی اکلوتی بیٹی ہے جو شادی کے سترہ سال بعد پیدا ہوئی اور چودہ برس کی عمر میں کمرے پر کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ پانچ سال لگا کر علاج کے بعد بیت المال والوں نے اسے سرکاری اسپتال میں پرائیویٹ کمرہ دلوا دیا۔ جہاں ڈاکٹر خاور اس کا مفت علاج کر رہے ہیں۔ عام سی شکل و صورت والی سکینہ ڈاکٹر خاور کو پسند کرنے لگتی ہے۔ سکینہ کی آواز مت خوب صورت ہے تاہم ڈاکٹر خاور اسے صرف اپنی مریدہ سمجھتے ہیں۔

ماہم منصور حسین ترین سائیکالوجسٹ ہے اور اپنا ذاتی کلینک چلاتی ہے۔ راس علی اس کا مریض ہے۔ ماہم بلا کی حسن پرست ہے۔ اس کی دوست عائشہ قدرے کم صورت ہے۔ عائشہ کا بھائی موجد رحیم ماہم کو پسند کرتا ہے مگر سوات آہریشن میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو جانے کے سبب ماہم اس سے کھینچ جاتی ہے۔ ماہم کی بڑی بہن شمن عائشہ کے کزن انصر کی بیوی ہے اور ڈیفنسٹ ہے۔

راس علی اپنے نفسیاتی عارضے کی وجہ سے خود کشی کی کوشش کرتا ہے لیکن بچ جاتا ہے۔ اس حادثے کے بعد راس اور ماہم ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔

سکینہ کی خوب صورت آواز کی وجہ سے ڈاکٹر خاور اسے ایک نعت کپیشن میں حصہ لینے کے لیے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر خاور کی ساتھی ڈاکٹر زہرا کو ان کا سکینہ پر مہمان ہونا ناگوار گزرتا ہے۔ سکینہ اور ڈاکٹر خاور کو ان کی تپندگی کا علم ہے۔ جمیلہ مائی وقتاً فوقتاً سکینہ کو سمجھاتی رہتی ہیں۔ نعت کپیشن میں سکینہ کی ملاقات موجد اور عائشہ سے ہوتی ہے۔ عائشہ کی پسینہ گز سے متاثر ہو کر علی اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ مگر ماہم کو یہ بات اچھی نہیں لگتی۔

ناؤلیٹ





مثلاً زہیر ایک مشہور مصنف ہے۔ وہ اپنے فرضی کردار سکندر شاہ سے محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں اس کی ملاقات ماہم سے ہوتی ہے۔ مثلاً اپنی ماں کا واحد سارا ہے۔ اس کا اکلوتا بھائی دوسرے ملک میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے اور انہیں تقریباً "بھول ہی گیا ہے۔" معمولی ایکسیڈنٹ کے واقعے میں اس کی ملاقات موجد سے ہوتی ہے۔ وہ سکندر شاہ سے بے حد محبت رکھتا ہے۔ مثلاً اور موجد کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مارننگ شو کی میزبانی کرنے سے منع کرنے پر موجد انصر سے خلع کا دعوا دائر کر دیتی ہے۔ ایک اسپتال میں عائشہ علی کو ایک لڑکی کے ساتھ گھسی دار میں دیکھ کر موجد ہو جاتی ہے۔ ماہم "راس" کی ٹائٹول پر برص کے نشان دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتی ہے اور تقریباً "اس سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔" راس دلبرداشتہ ہو کر عائشہ سے رابطہ کرتا ہے۔ عائشہ اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ڈاکٹر غادر کو دنیا سے بیکہ کے معاملے میں غما ہو جاتے ہیں اور انہیں واپس اپنے ملک جانے کا کہہ دیتے ہیں۔ عائشہ شاپنگ مال میں علی اور ماہم کو اکٹھے نہایت بے تکلفی سے بائیں کرتے دیکھ کر مزید متحیر ہو جاتی ہے۔

اجاڑی ماں سیکنہ سے اس کا رشتہ ختم کر کے اپنی بھانجی سے ملے کر دیتی ہے۔ سیکنہ خوش ہو جاتی ہے۔ گفتگو کے دوران مثلاً کو پتا چلتا ہے کہ موجد ماہم کو جانتا ہے۔ راس اپنی والدہ کو عائشہ کے گھر لے کر آتا ہے۔ راس اور موجد کی بچی دوستی ہو جاتی ہے۔ ماہم دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ انصر بھائی شمن آئی کو طلاق دے رہے ہیں۔ ماہم علی میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ علی اس کے فلیک پر جاتا ہے تو بہت خوش ہو جاتی ہے۔ محفل موسیقی میں علی کا عائشہ سے سامنا ہوتا ہے مگر دونوں کے درمیان ناراضی ہنوز برقرار رہتی ہے۔ مزید وہ لاہوری میں اس لڑکی کو دیکھ لیتی ہے جسے پہلے بھی عائشہ نے علی کے ساتھ دیکھا ہوتا ہے۔ وہ اپنا حالہ علی کی بیوی کے نام سے دے رہی ہوتی ہے۔

مثلاً کی غیر موجودگی میں باہر سے اس کا کرن ملنے آتا ہے۔ مگر اس کی ملاقات صرف تابہ سے ہی ہو جاتی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی نظر میں اپنے لیے پسینہ بک نظر آ جاتی ہے۔ ماہم عائشہ کے ساتھ راس کا نام لے کر علی کو بدگمان کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے اور علی واقعی عائشہ کے ساتھ راس کو دیکھ کر سخت برگشتہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ عائشہ حیران رہ جاتی ہے کہ راس اور علی بھائی ہیں۔ انصر کی والدہ انصر کے لیے عائشہ کی بات کرتی ہیں مگر مسز جیم منع کر دیتی ہیں لیکن بیات پھیل جاتی ہے۔ عائشہ کو سخت غصہ آتا ہے جبکہ ماہم اس پر خوب گرجتی ہے۔ راس کی والدہ بیمار ہوتی ہیں۔ وہ عائشہ کو ان سے ملوانے لے جاتا ہے۔ وہاں علی بھی موجود ہوتا ہے۔ علی اور عائشہ کے درمیان ساری غلط فہمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

## نویں قسط

"آپ عائشہ کو کیسے جانتے ہیں۔" راس کے چہرے پر دیکھا جہاں کی حیرانی تھی۔ وہ علی کے چہرے پر لطف لیتی مسکراہٹ کو دیکھ کر حیران ہوا۔ جبکہ عائشہ کا چہرہ فاصلہ جو اس سا دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ تو آپ عائشہ سے ہی پوچھیں۔"

اس کی بات نے عائشہ کو بالکل ہی بوکھلادیا۔ وہ ایک دم گڑبڑا کر بولی۔ "آپ خود کیوں نہیں بتا دیتے۔"

"بھئی! یہ آپ دونوں کو ہی پسلیاں بھجوا رہے ہیں سیدھے سیدھے بتا دیں۔" راس تھوڑی سی آگاہش کا شکار ہوا تو علی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"ان کو ان نہیں جانتا بہت اچھی سوشل ورکر اور

بھی سنائے میں آگئیں۔ ایک لمحے تو وہ بھی کچھ نہیں بول پائیں۔

"ہاں! یہ آپ اس بیل کستی زہیر کی ٹکی! اچھے خاصے سر سبز درخت کو کھا گئی۔ دیکھو ذرا! ایسے سوکھ گیا ہے۔ یہ

دونوں ہیں۔" سیکنہ کی بات پر ماہم نے چونک کر سیکنہ کی غم آنکھوں کو دیکھا۔

"پتلی! تو کیوں پریشان ہوتی ہے۔" جیلہ مائی کی آنکھوں میں سیکنہ کے لیے ایک خاموش دلاسا تھا۔

"ہاں! یہ دوسرا درخت ہے جو میرے یہاں ہوتے ہوئے بھری مہار میں ٹنڈنڈ سا ہو گیا ہے۔ اب چڑیاں

کہاں بیٹھیں گی۔" سیکنہ کے بچکانہ انداز پر جیلہ مائی زہرستی مسکرائیں۔

"چڑیا چڑیوں کی فکر نہ کرو! اپنا ٹھکانہ کہیں نہ کہیں کر لیں گی بھلا کسی کے مرنے یا اجڑنے پر بھی دنیا کا

کاروبار کا ہے۔" جیلہ مائی کے کبجے میں کوئی ان کہا سا دکھ بولا۔

"ہاں! اہ! تو ٹھیک کہتی ہے۔ بندوں کے مرنے پر کچھ نہیں ہوتا یہ تو ایک درخت تھا۔" سیکنہ او اس ہوئی۔

"میری وہی خوش خوش رہا کر۔" جیلہ مائی نے اسے فوراً نصیحت کی۔

"ہاں! خوشی انسان کے اپنے اختیار میں تو نہیں۔ یہ جو انسان کے اندر کسی سانپ کی طرح کٹنگی مار کر

بیٹھا وہ اعم ہو تا ہے تا یہ ہر موقع پر اپنا بچھن پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بندہ اس کے ڈر سے کھل کر خوش بھی نہیں ہو سکتا۔" سیکنہ نے کوئی گہرا فلسفہ ہی بولا تھا جو

جیلہ مائی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں! پتلی! یہ غم دکھ، فکریں اور پریشیاں بھی آپ اس بیل کی طرح ہوتی ہیں۔ بندے کو چمٹ جائیں تو اسے

اندر رہا رہے ایسے ہی کھوکھلا کر دیتی ہیں۔" جیلہ مائی نے کسی خیال میں ڈوب کر کہا تو سیکنہ ایک لمحے کو چپ کر گئی۔

"بھئی! سبھی تو مجھے لگتا ہے! میں بھی اسی

دردناکے کی کوشش کی۔

"علی نے مصنوعی حیرت سے راس کا دیکھنا بھرا چہرہ دکھا۔" مجھے یاد نہیں ہو سکتا ہے کہ

میں جلدی میں ہوں۔" راس نے لاہروائی سے کندھے

"لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے اسے

کلی کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

"جی جی بتائیں کہ آپ واقعی علی بھائی کو جانتی

ہیں۔" وہ اگلے ہی دن اس سے فون پر انھیں بھرنے

انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"کیوں پوچھیں نہیں لگا کیا؟" عائشہ نے انہاں اس

سے سوال کیا۔

"اصل میں بھائی کی بڑی لاف میں ان چیزوں کی

محاسبات نہیں نکلتی۔ اس لیے حیران ہوں۔" راس

نے سادگی سے بتایا تو وہ جواباً "نہیں بڑی۔"

"میں تمہارے بھائی کہاں کے منسٹر لگے ہوئے

ہیں۔" عائشہ نے شرارت سے اسے چھیڑا تو وہ تھوڑا

مبارک لہن کر چپ ہو گیا۔

"بھئی! اپنے غم سے دماغ پر اتنا زور نہ ڈالو۔ مجھے تو

بزاروں لوگ جانتے ہیں اور جہاں تک تمہارے بھائی

کی بات ہے تو انہوں نے مجھ سے کچھ بھینٹو خریدی

تھیں۔" عائشہ نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کچھ

فصیل سے بتایا وہ کچھ مطمئن ہوا۔

\*\*\*

"ہاں۔" سیکنہ نے سپارہ پر مٹی ماں کو بڑی

خوف زدہ سی آواز میں پکارا۔ ماں نے چونک کر سیکنہ

کی طرف دیکھا جو ہر اسل ٹکھوں سے گھڑی کے باہر

دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا سیکنہ؟"

"ہاں! ذرا دیکھو! اس درخت کو کیا ہو گیا۔" سیکنہ کی

کوڑھیں خوف ہی خوف تھیں۔ ماں نے اس کی نظروں

کے نوآب میں باہر بھانک کر دیکھا تو ایک لمحے کو وہ



درخت کی طرح ہوں اور میری بیلری بھی مجھے اسی آکاس بیل کی طرح کھا جائے گی۔" سیکینہ کی بات نے جیلہ کو دل کر رکھ دیا۔

"اللہ کو مان سیکینہ! ایسی باتیں کرتی ہے۔"

"اماں! بعض باتیں اور چیزیں انسان کے دل میں وحی کی طرح اترتی ہیں۔ ان کی تصدیق کے لیے انسان کو کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کی سچائی اور حقیقت خود بخود پانی کی طرح اپنا راستہ بنا لیتی ہے۔" سیکینہ ہنسی تو جیلہ مائی کو اس کی آواز میں ٹوٹے کا لچ کی جھنکار سنائی دی۔

"دیکھ سیکینہ! اللہ سے براگمان نہ رکھا کرے! اپنے بندے کے منہ سے نامیدی اور مایوسی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" جیلہ مائی عجیب عجیب خفا ہوئیں۔

"پھر اللہ انسان کو ایسی آزمائش میں ڈالتا ہی کیوں ہے؟" بہت دن کے بعد سیکینہ نے لٹکھو کیا تھا۔

"دیکھ! بندے کو یہ ذہب نہیں دیتا کہ وہ اپنے رب سے سوال جواب کرے۔ جس سے محبت ہو اس سے کیا کیوں اور کہنے والے سوال نہیں کیے جاتے۔ خود کو بس اس کی مرضی پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کی رحمت بندے کی آزمائش سے بہت زیادہ ہے۔ بس اللہ سے رحمت اور کرم مانگا کر۔" جیلہ مائی عصر کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

"اماں! تو بہت عجیب باتیں کرتی ہے۔" سیکینہ نے برا سامنہ بنا کر کتاب اٹھالی۔ اماں مسکراتے ہوئے واش روم کی جانب بڑھ گئیں۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھٹکا جاکر ڈاکٹر خاور اندر داخل ہوئے۔

"ڈاکٹر صاحب! ایسا لگتا ہے جیسے کوئی گشہ چیز آپ کو صحیح سلامت واپس مل گئی ہے۔" سیکینہ نے ان کے سلام کا جواب دے کر فوراً ہی کمد وہ چوٹے اپنی جگہ پر بیٹھے اور مسکرا دیے۔

"تمہیں کیسے پتا لگا سیکینہ؟" وہ اسٹول بچھنے کر سیکینہ کے بیٹے کے پاس بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھ میں سیکینہ کی فائل تھی۔

"بہت دن کے بعد میں نے آپ کے چہرے مسکراہٹ دیکھی ہے۔" سیکینہ کی بات پر وہ ہنسنے لگے۔

"مجھے لگتا ہے کہ تم نے اپنی آنکھوں میں ایک سرے مشین فٹ کر دی ہے یا خوردبین جو ان کے اندر کی باتیں بھی جاننے لگی ہو۔" انہوں نے ہنسنے انداز سے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ جو محبت ہوتی ہے اس کے خوردبین سے بھی زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ ہر بندے سے محبت ہو، اس کے اندر جھانکنے کے کسی ایک سرے مشین یا خوردبین کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ ایک نظری آپ کو وہ سب سمجھ جائے ہے جو دنیا کی کوئی جدید مشین نہیں بنا سکتی۔" سیکینہ نے کتاب بند کر کے ڈاکٹر خاور کو حیران کیا۔

"سیکینہ! فرض کرو، آپ کو کسی سے محبت ہو اسے آپ سے نہ ہو تو؟" ڈاکٹر خاور کے سوال پر بڑا گہرا تاریک سایہ سیکینہ کے چہرے پر پھیلا۔

"محبت کوئی لین دین کا سودا تو نہیں، جو کچھ دیا اور دو کی بنیاد پر کیا جائے یہ تو ایسا سودا ہے جو نقصان سے بے نیاز ہو کر کیا جاتا ہے۔" سیکینہ تھوڑا افسردہ ہوئی۔

"اور اگر دونوں طرف آگ برابر لگی ہو تو؟" ڈاکٹر خاور نے بال پوائنٹ اپنے وانتوں تلے رہائے ہوئے ایک اور سوال کیا۔

"اگر ایسا ہو تو اس سے بڑھ کر انسان کی کیا خواہش قسمی ہو سکتی ہے؟" سیکینہ زبردستی مسکرائی۔

"اچھا! سیکینہ اب آپ ان تمام فلسفوں کی سے نکل آئیں اور اپنے آریٹین کے بارے میں سوچیں جو اگلے مہینے ہو گا۔" ڈاکٹر خاور نے بات دم ہی دم بدلی۔ سیکینہ تھوڑی سی مایوس ہوئی۔

"ڈاکٹر صاحب! ایک بات پوچھوں۔" سیکینہ تھوڑا سا تذبذب کا شکار ہوئی۔

"ہاں! ہاں ضرور۔" ڈاکٹر خاور نے اس کی درخواست پر ان کی طرف آنکلی۔

"آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"ابنا مجھے جیسی لڑکی سے کسی کو محبت ہو سکتی ہے؟"

سیکینہ کے سوال نے ڈاکٹر خاور کو بری طرح چونکا دیا۔

"ہاں! بالکل ہو سکتی ہے۔" وہ بغیر کسی جھجک کے بولے۔

"اس دفعہ حیران ہونے کی باری سیکینہ کی تھی۔" ایک مہینہ جیسی لڑکی سے آپ جیسے مرد کو محبت ہو سکتی ہے؟ سیکینہ نے اس دفعہ کمرے میں بلاست کی کیا۔

"آف کورس۔" ڈاکٹر خاور نے ایک دفعہ پھر سیکینہ کو حیران کیا۔

"میری بیلری کے باوجود؟" اسے نہ جانے کیوں یقین نہیں آیا۔

"دیکھو! محبت کے پاس ظاہری بصارت نہیں ہوتی، وہ اپنے محبوب کو ہمیشہ باطن کی آنکھ سے دیکھتی ہے۔ وہ اسے وہاں ہی دیکھتی ہے، جیسا اس کا دل اسے دکھاتا ہے۔ چاہے ساری دنیا مل کر اسے آنکھیں کیوں نہ دے دے وہ اپنے محبوب کے معاملے میں اندر ہی رہتا ہی پسند کرتی ہے۔" ڈاکٹر خاور کا سحر انگیز لہجہ سیکینہ کو بالکل گھبرا گیا۔

"تو کوئی ایسا شخص میری قسمت میں بھی ہو گا۔" سیکینہ کے لہجے میں گشہء اعتماد لوٹ آیا جو ڈاکٹر خاور کو بہت اچھا لگا۔

"ہاں ضرور۔ ان شاء اللہ۔" وہ جیلہ مائی کو داش دہم سے لگنے دیکھ کر مسکرائے۔

"اماں! جی! سیکینہ کے لیے دعا کریں۔ اس کے آریٹین کی فٹ فائل ہو گئی ہے۔" ڈاکٹر خاور کی بات پر سیکینہ اور جیلہ مائی دونوں ہی زبردستی مسکرائیں۔

سیکینہ کی آنکھوں میں ایک ہلکا سا خوف در آیا۔

\*\*\*

مقامی الم سوری عائشہ! میں اس دن کچھ تلخ ہو گئی تھی۔

"اماں! اس دن اچانک ہی ان کی طرف آنکلی۔"

عائشہ پہلے تو اسے دیکھ کر حیران ہوئی لیکن اسے مامک تلخ لہجہ اور گفتگو یاد آتی تو اس کا دل ایک دم ہی اکابر کا شکار ہوا۔

"آؤ بیٹھو۔" اسے لان میں بیٹھ کر چائے پیتی عائشہ نے سیاٹ لہجے میں کہا تو مامک نے ایک لمحے میں اس کا اجنبی سا انداز محسوس کیا۔

"بیچو! نیلی یارا! اضر بھائی کے گھر والوں نے پورے خاندان میں یہ بات آپ کی طرح پھیلا دی تھی۔" مامک نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"میں اس ناپک پر تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔" عائشہ روکھے انداز میں بولی تو مامک کو دھچکا سا لگا۔

"پلیز بڑائی تو ایڈر اسٹینڈ۔" مجھے غصہ آ گیا تھا کہ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔" مامک نے ایک دفعہ پھر وضاحت کرنے کی کوشش کی تو عائشہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

"غصہ صرف تمہاری میراث نہیں ہے۔ کسی اور

ادارہ خاتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

## سحر خاں

نیت - 400 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37 اور بازار کراچی

کو بھی آسکتا ہے۔ مگر پھر تمہیں برداشت نہیں ہو گا سو پلے کوئی اور بات کرو۔" عائشہ کے لمحے میں اس قدر رکھائی اور اجنبیت تھی کہ ماہم کچھ لمحے تک بول ہی نہیں سکی۔

"تمہارا کلیٹک کیسا جا رہا ہے؟" عائشہ نے دانستہ موضوع بدلا۔

"ٹھیک۔" وہ ابھی تک سنبھل نہیں پائی۔ سخت حیرت سے اپنے سامنے بیٹھی عائشہ کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی شخصیت کا یہ عجیب سا پہلو اس کے سامنے آیا تھا۔

"اور ٹخن آپی ٹھیک ہیں؟" عائشہ نے آج فارمل گفتگو کرنے کے سارے رویکار توڑ دیے۔

"ہاں ٹھیک ہیں، بس احیان کو مس کرتی ہیں۔" ماہم کی بات پر ایک طوفانی مسکراہٹ نے عائشہ کے چہرے کا احاطہ کیا۔ لیکن اس نے دانستہ اس بات پر بھروسہ کرنے سے پرہیز کیا۔

"تمہارے لیے چائے بناؤں؟" عائشہ کی اس بات پر ماہم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے مزید بات کرنا نہیں چاہتی ہو۔" وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

"یہ تمہارا ذاتی خیال ہے اور ضروری نہیں کہ ٹھیک بھی ہو۔" عائشہ نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔ اسی وقت ملازمہ کا ردائیس اٹھائے لان میں نمودار ہوئی۔

"عائشہ بی بی! آپ کی کال ہے، رامس صاحب ہیں۔" ملازمہ کی بات پر ماہم کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ وہ جو جانے کے لیے پر تزلزل رہی تھی۔ دانستہ وہیں جم کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں، ابھی کیسے ہو رامس! ملا کسی ہیں؟ سواری میں آج نہیں آسکی۔" عائشہ کی بات پر ماہم کی آنکھوں میں حسد اور جلن کی کیفیت نمودار ہوئی۔

"زیادہ فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی مسئلہ ہے تو خود آکر لے جاؤ، میری گاڑی درکشاپ میں ہے۔" عائشہ نے دوسری جانب اس کی

کسی بات کے جواب میں بے تکلفی سے کہا تو تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

"تمہارے پاس تو انصر بھائی سے زیادہ محرم موجود ہے۔ سو رہی، مجھے اس کا خیال ہی نہیں۔"

اس نے پیسے ہی فون بند کیا، ماہم نے طوفان کا یہ عائشہ نے بمشکل خود کو مشتعل ہونے سے روکا۔

"میرے پاس رامس سے بھی کمتر آپشن ہے۔ تمہیں کمان نہیں ہوگا۔" عائشہ نے کھڑے ہونے سے روک دیا۔

بڑے اعتماد سے ماہم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو اس کے جھکے جھوٹ گئے۔

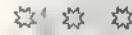
"وہی ان سے اڑنا، فضا میں بہت عقاب ہیں۔" کسی معصوم فاختہ کی طرح ہو۔ "ماہم اب براہ راست طنز پر اتر آئی۔

"دھیمت کا بہت شکریہ۔ میں اپنی ہی فضا میں اپنی ہی حدود کے اندر اڑتی ہوں۔ اس لیے مجھے عقابوں کا کوئی خوف نہیں، تم اپنی فکر کرو، کہیں پرل آسمانوں کی تلاش میں سورج کی پیش ہی برداشت کر سکو اور سارے پروں کو جلا بیٹھو۔" عائشہ کی بات نے ماہم کو سنا کر رکھ دیا۔

"اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔" ماہم کا لبہ

عائشہ کو چیلنج کرتا ہوا محسوس ہوا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ وہ وقت دور نہیں۔" عائشہ نے ایک دفعہ پھر اسے حیران کیا۔



وفا کے وعدے وہ سارے بھلا گیا چپ چاپ وہ میرے دل کی دیواریں ہلا گیا چپ چاپ

کمرے کی تاریکی اور خاموشی میں یہ غزل

بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آنکھیں بند کیے

دھیمل چیر بر بڑھا کسی اور ہی دنیا میں گم تھا۔ جب

وہ بے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس

ساتھ اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔

"بھائی! آنکھوں پر ہاتھ رکھنے سے حقیقت بدل نہیں جاتی۔" نے نہ کو فیس کرنا سیکھیں۔" عائشہ نے

بڑی سختی سے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر

کہا۔ "تو نہیں کیوں؟" روٹھناں میری آنکھوں کو اچھی

نہیں لگتیں۔" وہ شدید قسم کی قنوطیت کا شکار لگ رہا

تھا۔ "میرے آپ کے چہرے پر اواہی اور رنجیدگی

اچھی نہیں لگتی۔" عائشہ کے لہجے کی کھٹک پر وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔

"ہائو! بہت خوش لگ رہی ہو۔" مودہ نے

آنکھیں کھول کر اپنی پیاری بہن کا پرسکون چہرہ دیکھا

اور دل ہی دل میں نظریہ سے تجھے کی دعا کی۔

"خوشی کا تو پتا نہیں، لیکن بہت مطمئن ہوں

میں۔" وہ اس کے سامنے آن بیٹھی۔ اس کا چہرہ اندرونی

خوشی کے احساس سے جھلکا رہا تھا۔

"مطمئن ہونا خوش ہونے سے زیادہ قیمتی جذبہ ہوتا

ہے۔ سکون ایسی دولت ہے جو کسی بھی دل کو ہی

نصیب ہوتی ہے۔" مودہ نے اس کی چپکتی آنکھوں

سے بمشکل آنکھیں چرا لیں۔

مسکرایا۔ "بھئی کہ میرے دل پر بہت عرصہ اس نے

حکمرانی کی تھی۔"

"یہ جتنا ناکیا ضروری تھا؟" عائشہ ناراض ہوئی۔

"اس نے پوچھا تھا اور میں نے جھوٹ بولنا مناسب

نہیں سمجھا۔" اس کی سادگی پر عائشہ نے بے ساختہ

اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"بھائی! ہر حقیقت بتانے کے لیے نہیں ہوتی۔ کچھ

چیزوں پر جب اللہ پروردگار دال رہتا ہے تو بہت کچھ کو بھی پروردگار

دیکھتا ہے۔" عائشہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی

تو وہ اپنے مطلب پر اکتانے لگا۔

"پتا نہیں کیوں؟ لیکن میں اس سے جھوٹ نہیں

بول سکتا۔" مودہ نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

"چھ! آپ اس کا نام بتائیں اور مناسب سمجھیں

تو مجھے اس کا نمبر دیں۔" عائشہ کی فرمائش پر اسے جھٹکا

سارکا۔

"تم کیا کر رہی؟"

"خفا میں تلاش گمشدہ کا اشتہار دوں گی۔" وہ ہلکا سا جھنجھلائی۔ "بھئی، اس سے بات کروں گی اور کیا

”ہوں۔ بات تو آپ نے واقعی غلط کی اور بہت سی زیادہ غلط کی۔“ وہ رامس کو اپنا سارا دکھنا سنا کر چپ ہوئی تو فون کی دوسری جانب سے رامس نے فوراً ہی اسے مزید شرمندہ کیا۔

”آپ کیا کہیں؟“ اس کی معصومیت پر رامس کو ہنسی آگئی اور دوسری جانب موجود عائشہ کو اس کی ہنسی کی آواز نے بتایا۔

”میری جان پرینی ہوئی ہے اور تم ہنس رہے ہو۔“ وہ باقاعدہ جل کر گویا ہوئی۔

”آپ بات ہی سننے والی کر رہی ہیں۔ بھئی سیدھی سی بات ہے کہ جب کوئی غلطی ہو جائے تو اس پر لکھسکیو ڈکر لینا چاہیے۔“ رامس نے مسکراتے ہوئے اسے مشورہ دیا جو عائشہ کو بالکل بھی پسند نہیں آیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے سوری نہیں کیا ہوگا۔“ اس نے طنزاً پوچھا۔

”جی ضرور کیا ہوگا۔“ رامس مسکرایا۔ ”لیکن اس انداز سے کیا ہوگا کہ اگلا بندہ مزید دکھی ہو گیا ہوگا۔“ وہ رامس کے درست انداز سے پر حیران ہوئی۔

”مہیں کس نے بتایا۔“ اس کی حیرت پر وہ اب توجہ لگا کر نہا۔

”اچھا! اب ایسا کریں کہ جس مسئلے کی وجہ سے موجود بھائی پریشان ہیں۔ وہ حل کریں۔“ رامس نے اسے ایک نئی راہ دکھائی۔

”کیا مطلب۔“

”بھئی مطلب یہ کہ اس لڑکی کو فون کریں یا اس سے جا کر مل لیں۔“ رامس نے مشورہ دیا۔

”ماشاء اللہ بہت عقل مند واقعہ ہوتے ہیں آپ۔“ عائشہ کے لیے بھی میں طنز کی آمیزش شامل ہوئی۔ ”اس لڑکی کا فون نمبر مانگنے کی وجہ سے ہی تو ساری گڑبڑ ہوئی ہے۔“ عائشہ نے اسے یاد دلایا۔

”اوہ۔“ وہ چونکا کچھ سیکنڈ کے توقف کے بعد بولا۔

”فون نمبر تلاش کرنا تو کوئی مسئلہ نہیں۔“

”وہ کیسے۔“ عائشہ نے غلبت بھرے انداز میں پوچھا۔

”یہ جادو کہ موجود بھائی کے فون کا نمبر آتا ہے گھر پر یا آفس کے ایڈریس پر۔“ رامس کے سوال پر جی ران ہوئی۔

”گھر پر۔“ عائشہ نے مختصراً بتایا۔

”بس پھر تو سارا ہی مسئلہ حل ہو گیا۔ ان کے پچھلے مہینے کا نمبر چیک کرو جس نمبر پر سب سے زیادہ اور سب سے لمبی کالز ہوئی ہوں گی۔ وہ اسی لڑکی کا نمبر ہوگا۔“ رامس نے چنگی بجا کر اس ٹکسار ہی مسئلہ حل کر دیا۔

”وہ بائی گاڈ! تم کتنے چلاک ہو رامس! عائشہ ایک دم ہلکی پھلکی ہوئی۔

”تو کچھ لو، پھر بھی آپ کی دوست کے ہاتھوں دھوا کھا گیا۔“ اس نے استغنائیہ انداز سے اپنا مذاق اڑایا جو عائشہ کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

”اس کی تو تم بات ہی نہ کرو ہم سب مل کر بھی ماہم کے دماغ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ عائشہ نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”خیر اب ایسی بھی بات نہیں۔ اونٹ بھی نہ بھی وہ ہماڑ کے نیچے آئے گا نا۔“ رامس کا لہجہ خاصا معنی خیز تھا۔ عائشہ ہنسنے لگا۔

”چھوڑو، ہمیں کیا ضرورت ہے۔ بس اللہ سب کو ہدایت دے۔“ عائشہ کی بات پر وہ مسکرایا۔

”آپ بہت اچھی فطرت کی حامل ہیں۔ لیکن افسوس کہ آپ جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔“ رامس نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

”چاہت نہیں۔“ عائشہ نے لاروائی سے کہا۔ ”بس ہر چیز کے لیے اپنے اللہ کے اور اپنے ضمیر کے آگے جواب دہ ہوں۔ دوسرے کیا ہیں اور کیسے وہ میں ان باتوں پر اپنا وقت ضائع نہیں کرتی۔“

”بہت اچھا کرتی ہیں۔ ورنہ ہم میں سے اتنی فہم لوگ اپنی ذات کے بجائے دوسروں کی ٹوہ میں

رہتے ہیں۔ اسی سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔“ رامس سنجیدہ ہوا تو وہ سر ہلا کر کہہ گئی۔

”تمہارے بھائی کا کیا حال ہے۔“ عائشہ نے کچھ جھجک کر پوچھا۔

”بھائی بہت زیادہ بڑی ہیں۔ آج کل کم کم ہی بات ہوئی ہے۔“ رامس نے سادگی سے بتایا تو اس نے فوراً پوچھا۔

”کیا کرتے ہیں تمہارے بھائی؟“

”کیا مطلب؟“ رامس ٹھنکا۔ ”انہوں نے آپ کو نہیں بتایا؟“

”مہیں میں نے ان سے کبھی نہیں پوچھا۔“ عائشہ کی سادگی نے رامس کو کافی زیادہ حیران کیا۔

”بائی گاڈ! کیسی لڑکی ہیں آپ۔“ وہ خوش گوار انداز میں ہنسا تو دوسری جانب عائشہ چڑی ہو گئی۔

”بس ایسی ہی ہوں۔“ وہ اس کے جل کر ہونے پر بے اختیار ہنسا اور نستا ہی چلا گیا۔

\*\*\*

”سیکنڈ! آخر تو مجھے غلط کیوں سمجھتی ہے۔“ آنکھوں میں ڈھیروں سرمہ اور تیل سے چڑے ہوئے باہل کے ساتھ جاتی پچھلے ایک ٹھٹھے سے سیکنڈ کی پرواشت کا امتحان لے رہا تھا۔ اللہ و تا کہمار اور جیلہ مائی ڈاکٹر کے ساتھ سیکنڈ کے آپریشن کے سلسلے میں بات کرنے لگے تھے۔

”مجھے میری محبت کا اعتبار کیوں نہیں آتا؟“ جاتی کے سوال نے اسے سلا کر رکھ دیا۔

”میں نے تیری محبت کا کیا چار ڈالنا ہے۔“ وہ فوراً متعل ہوئی۔

”اچھا۔“ پھر کس کی محبت کا چار ڈالے گی۔“ جاتی نے بھی آج ڈھٹائی کے سارے ریکارڈ تو ڈوبیے۔ اس کے سوال پر سیکنڈ ایک دم ہکا بکا ہوئی۔

”مجھے کیا یہ میرا معاملہ ہے۔“ سیکنڈ نے امل کی نمبر موبائل کا بھر پور فائدہ اٹھایا۔ جاتی کا چہرہ ایک دم لڑکچہ سا ہو گیا۔

”تو کچھ سیکنڈ! محبت اپنے ماں کے لوگوں میں اچھی رہتی ہے۔ اپنے سے اونچا دیکھے کی تو گردن اڑ جائے گی۔“ جاتی کے ذمہ معنی انداز نے سیکنڈ کو ایک لمحے کو چپ کر دیا۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ اتنا بھی بے خبر نہیں جتنا وہ اسے سمجھتا تھا۔

”میری گردن اڑے یا تو لے، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔“ سیکنڈ نے نظریں چراتے ہوئے رخ لہجے میں کہا۔

”مجھے ہی تو سارا مسئلہ ہوگا۔“ جاتی کے لہجہ میں محبت کے ساتھ ساتھ افسردگی بھی تھی۔

”مجھے تیرے مشکلوں سے کوئی سروکار نہیں۔“ سیکنڈ نے بے رخی سے کہتے ہوئے اپنا رخ موڑ دیا۔ وہ اب لان میں پچھلی دھوپ کو دیکھ رہی تھی۔ چنگیلی دھوپ نے سارے پودوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

”تو کچھ سیکنڈ! تو جتنی بھی میرے ساتھ بے رخی برت لے، لیکن یاد رکھنا کہ زندگی میں جب بھی تو کوئی قدم اٹھائے گی۔ مجھے اپنے پیچھے پائے گی۔“ جاتی کا پراعتماد انداز سیکنڈ کو سخت برا لگ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جاتی کو کبھی ہٹا کر سامنے دو پار پر چکاوڑے۔

”یہ تو کچھ! جان! پھوڑ میری۔“ سیکنڈ نے باقاعدہ اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو جاتی کا چہرہ پیکا پڑ گیا۔ اندر داخل ہوتے ڈاکٹر خاور نے یہ آخری منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ استغابیہ نگاہوں سے دونوں کو دیکھنے لگے۔ جاتی تو گڑبڑا کر کھڑا ہوا اور کمرے سے نکل گیا۔ جبکہ سیکنڈ کا چہرہ زبردستی مسکرائے کی کوشش میں عجیب سا تاثر دینے لگا۔

”جو لوگ ہم سے محبت کرتے ہوں۔ ان کی قدر کرتے ہیں سیکنڈ! نہ جانے کیوں ڈاکٹر خاور کے منہ سے نکلنے والے یہ الفاظ سیکنڈ کے دل پر کسی اینٹ کی طرح لگے۔

”پھر آپ میری قدر کیوں نہیں کرتے؟“ اس نے بے باکی سے ڈاکٹر خاور کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ پر ساکت رہ گئے۔ انجمن بھری نگاہوں سے سیکنڈ کو



دیکھتے ہوئے انہوں نے خود کو بڑی جلدی سنبھالا۔  
 ”مگر میں نے بھی آپ سے اس لمحے میں بات کی“  
 جس لمحے میں آپ انجانے کرتی ہیں۔ ”ڈاکٹر خاور کی  
 بات پر سیکرٹریز گھڑول پائی پڑ گئیں۔ وہ خفت زدہ انداز سے  
 اپنے آپ کو چلنے لگی۔ وہ برے طریقے سے لا جواب  
 ہو چکی تھی۔  
 ”وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ اپنے ہاتھوں کو مسلتے  
 ہوئے اس نے پچھانے سے انداز میں کہا۔ کسی برس کے  
 ساتھ ڈاکٹر زویا اسی لمحے کمرے میں داخل ہوئیں۔  
 ”لیکن مجھے تو آپ اچھی لگتی ہیں۔“ ڈاکٹر خاور کا یہ  
 جملہ ڈاکٹر زویا کے تن بدن میں آگ سا لگا گیا۔ انہوں  
 نے دروازے کو ہلکا سا جا کر اپنی موجودگی سے باخبر کیا۔  
 دونوں بے اختیار چوہے۔  
 ”میرا خیال ہے میں نے خاصے غلط نام پر انٹری دی  
 ہے۔“ ڈاکٹر زویا کے لمحے میں ہی نہیں آنکھوں میں  
 سے بھی شعلے نکلے۔

”آپ انٹری غلط نام پر انٹری دیتی ہیں اور بد قسمتی  
 کی بات یہ ہے کہ آپ کو خود بھی کافی دیر کے بعد بتانا چلتا  
 ہے۔“ ڈاکٹر خاور اپنی بات کہہ کر رکتے نہیں اور  
 کمرے سے نکل گئے۔ ڈاکٹر زویا کو یوں لگا جیسے ان کی  
 قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی ہو۔



”تھنکس گاڈ! ای کی طبیعت ٹھیک ہوئی اور  
 ڈاکٹر نے ان کو گھر شفٹ کرنے کا کہہ دیا۔“ ثنا ملکہ نے  
 اپنے بیڈ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے نابیہ سے کہا۔  
 ”ہاں یار! ان کی بیماری نے تو واقعی ہاتھ پیر پھلا کر  
 رکھ دیے تھے۔“ نابیہ نے اپنے کندھوں کو دباتے  
 ہوئے جواب دیا۔

”تھینک یو نابیہ۔“ ثنا ملکہ بیڈ کی چادر درست  
 کر کے اس پر بیٹھ گئی۔  
 ”مگر مزید کوئی بکواس کی تو یہ بیگ سمجھا کر تمہارے  
 سر پر دے ماروں گی۔“ نابیہ نے کھانچانے والی نگاہوں  
 سے ثنا ملکہ کو دیکھا۔

”قسم سے تمہارا بہت آسرا ہے مجھے، کاش میں  
 مکینہ بھائی بے وفائی نہ کرتا۔“ ثنا ملکہ کے لمحے میں  
 حسرتوں کا ایک جہاں تابو تھا۔  
 ”تھینک گاڈ! تمہارے خود غرض اور لالچی  
 سے میری جان چھوٹ گئی۔ ورنہ تمہارا ہیٹر کم کم  
 کہے میری زندگی میں آتا۔“ نابیہ نے اپنی ٹانگیں بے  
 تکلفی سے میز پر رکھتے ہوئے ثنا ملکہ کو چھیڑا۔  
 ”ہاں، کہہ تو تم ٹھیک ہی ہو، لیکن تم اس کی  
 خود غرضی کی انتہا سمجھو کہ پورے ایک ہفتے میں صرف  
 ایک کال کی اور اس میں بھی اپنی غربت کے بدلے  
 شروع کر دیے اس نے۔“ ثنا ملکہ کو اپنا ایک اور دکھاوا  
 آیا۔

”مٹی ڈالو اس پر یہ بتاؤ کہ تمہارے ہیرو کا کوئی فن  
 آیا؟“ نابیہ نے موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے  
 پوچھا۔

”نہیں یار!“ ثنا ملکہ افسرہ ہوئی۔ ”وہ سمجھ رہا ہوا  
 کہ میں اس سے خفا ہوں۔“ ثنا ملکہ کو اپنی آخری گفتگو  
 تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد آئی۔  
 ”ویسے نابیہ! منوچنے کی بات ہے کہ ماہم منصور نے  
 آخر اس کے ساتھ ایسا کیا، کیا تھا وہ اتنا اس سے  
 بدظن ہو گیا۔“ ثنا ملکہ نے مزید کہا۔  
 ”ہو سکتا ہے کہ ماہم کا قصور اتنا نہ ہو۔“ نابیہ نے

ایک نکتہ نکالا۔

”یقیناً میں اسے جانتی ہوں، میں ماہم ہی نہیں سنی  
 کہ وہ کسی کے ساتھ کچھ برا کر سکتا ہے۔“ ثنا ملکہ کے  
 لمحے میں موحد کے لیے اندھا اختیار تھا۔  
 ”واہ جی واہ! صدقے جاؤں تمہارے اس انداز  
 پر۔“ نابیہ نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔  
 ”زیادہ فغول بولنے کی ضرورت نہیں۔ میرے  
 کزن کو کچھ غیرت دلاؤ کہ اس کی پچھو اتنی پیاروی  
 ہیں وہ اب تو انہیں دیکھنے آجائے۔“ ثنا ملکہ کو اچانک  
 یاد آیا۔

”اس کی اپنی والدہ ایک ہفتے سے اسپتال میں  
 ایڈمٹ ہیں۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ

میں تم پریشان نہ ہو جاؤ۔“ نابیہ کی بات پر وہ حیران  
 ہوئی۔  
 ”امانی جان بیمار ہیں۔“ ثنا ملکہ ایک دم فکر مند  
 ہوئی۔ ”ماہم پاکستان واپس آگئے؟“ اسے یاد آیا تو  
 ذرا سوچ لیا۔  
 ”نہیں۔“ نابیہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے نظریں  
 چرائیں تو ثنا ملکہ چونک گئی۔  
 ”اوسر دیکھو میری طرف نابیہ! تم مجھ سے کیا چھپا  
 رہی ہو۔“ ثنا ملکہ کی چھٹی حس نے اسے بروقت چوکنے  
 کیا۔

”مہرے پاس تمہارے لیے اس حوالے سے کوئی  
 اچھی خبر نہیں۔“ نابیہ کی بات پر اس کا دل بے ہنگم  
 طریقے سے دھڑکا۔  
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ثنا ملکہ نے بے تابی سے

پوچھا۔

”دراصل تمہارے ماموں کا دو سال پہلے انگلینڈ  
 میں انتقال ہو چکا ہے۔“ نابیہ نے اس کے سر پر ہی تو  
 پھوڑا تھا۔ وہ دکھ سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اسے یقین ہی  
 نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔



وہ آج پھر اپنے کیوسٹ اور رنگوں کے ساتھ پارک  
 میں موجود تھی۔ بہت عرصے کے بعد اس کا دل چاہا تھا  
 کہ وہ کوئی خاص چیز پیش کرے۔ آج وہ اپنے وقت  
 سے بہت پہلے ہی اپنی مقررہ جگہ پر آ پہنچی تھی۔ یہی  
 وہ جگہ تھی کہ جب تک وہ جو ٹک ٹریک پر گیا۔ عائنہ اپنا  
 اسی فیروزہ کام پہنا چکی تھی۔ ایک بہت خوب صورت  
 پینٹنگ اپنے آخری مراحل میں تھی۔ جب عائنہ کو  
 اپنا بہت پر دم لہری نظموں کا احصار محسوس ہوا۔ اس  
 سے بے اختیار مرکز گرد کیا۔ سامنے سنگ مرمر کے بیچ پر  
 وہ لاہروائی سے بیٹھا ہوا تھا اور اس کی توصیفی نگاہیں  
 نیوٹن پر جمی ہوئی تھیں۔ عائنہ کا دل ایک دم ہی  
 جاکرت پرتا گیا۔ وہ اسٹوک لگا بھول گئی۔  
 ”اگلے بول۔“ اس کے منہ سے نکلنے والی آواز پر

عائنہ کا ہاتھ کانپا۔ اس نے پیچھے مڑ کر اسے گھور کر  
 دیکھا۔

”غلط جگہ پر اسٹوک لگا رہی ہیں آپ۔“ وہ لاہروائی  
 سے کہتے ہوئے سامنے درخت پر بیٹھی کوئل کو دیکھنے  
 لگا، جس کی آواز صبح کے سنائے میں بہت دلفریب لگ  
 رہی تھی۔

”میری بیٹنگ ہے، میں جیسی بھی ہوں۔“ عائنہ  
 نے خود کو سنبھالتے ہوئے دانستہ ہلکا پھلکا لہجہ اختیار  
 کیا۔

”آپ عادتاً اپنی چیزوں کو خراب کرتی ہیں یا  
 فطرتاً؟“ اسی ہیں۔“ وہ اس کے بالکل قریب آ کر اپنے  
 دونوں بازو سینے پر باندھ کر بڑے گہرے لمحے میں گویا  
 ہوا۔ عائنہ کے لیے اپنی دھڑکنوں پر قابو پانا دشوار  
 ہو گیا۔

”میں خود سے ایسے نہیں کرتی، چیزیں خود بخود مجھ  
 سے خراب ہو جاتی ہیں۔“ اس کے ساتھ انداز پر علی  
 نے اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کو بمشکل  
 چھپایا۔

”پھر تو یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ کیا آپ اپنے  
 ریلیشنز کے معاملے میں بھی ایسی ہی لاہرو ہیں۔“ علی  
 کا جنہیت سے لبرز لہجہ عائنہ کی جان نکال رہا تھا۔

”آپ کتنا کیا چاہتے ہیں۔“ وہ جھٹکے سے مڑی تو  
 عین اس کے پیچھے کھڑے علی کے سفید ٹریک سوٹ  
 سے اس کا برش ٹکرا گیا۔ سفید شرٹ پر رنگوں کی ایک  
 لائن سی پٹی لگی۔ عائنہ ایک دم ہولنا کر اپنے دوپٹے  
 سے اس کی شرٹ کو صاف کرنے لگی تو علی نے فوراً

ہی اس کی ٹکائی پکڑ لی۔

”پہلے چیزیں خراب کرتی ہیں، اس کے بعد اپنا  
 نقصان کرتی ہیں۔“ علی نے تحرائی لمحے میں کہا۔  
 اس کی آنکھوں سے نکلنے والی محبت کی کرنیں عائنہ  
 کے سارے وجود کو منور کر رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا  
 جیسے ساری دنیا ایک ہی تال پر محو ہو۔ پلوں پر  
 ڈھیروں پوچھ آئے پڑا۔ اس کے لیے نظر اٹھا کر اپنے  
 سامنے کھڑے دشمن جاں کو دیکھنا محال ہو گیا تھا۔

”میرا ہاتھ تو چھوڑیں۔“ عائشہ کے ہاتھ سے برش چھوٹ کر زمین پر جا گرا۔

”یہ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا۔“ علی کا لہجہ عائشہ کے جھکے چھڑا ہاتھ اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں محبت اور شرارت کے بڑے انوکھے رنگ تھے۔

”میں آپ سے خفا تھا۔ آپ نے مجھے منایا کیوں نہیں۔“ اس نے بڑے استحقاق سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ عائشہ گزرا گئی۔

”پلیز، میرا ہاتھ تو چھوڑیں۔“ عائشہ کی آنکھیں نم ہوئیں تو علی نے فوراً اس کا ہاتھ نرمی سے چھوڑ دیا۔ وہ گھبرا کر اس سے چند قدم دور ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے رخساروں پر انار سے پھوٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

”جن لوگوں سے محبت ہو، ان کے ساتھ ایسے کرتے ہیں بھلا؟“ علی نے گنہگار لہجے میں کہا۔

”ہاں تو آپ نے کیوں ٹھیکہ اٹھا رکھا تھا سارے شر کی لڑکیوں کے ساتھ گھومنے کا۔“ وہ جل کر بولی تو علی کے لیے باک قفقہ فضاؤں میں پھیل گیا۔

”جھلس ہو رہی تھیں۔“ وہ ایک دم آگے بڑھ آیا۔

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جلنے کی۔“ وہ دانستہ سرخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”چھال۔ واقعی؟“ وہ اب دوسری جانب سے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ عائشہ سٹپٹا گئی۔

”میں۔۔ ہنڈ ریڈ پر عنٹ۔“ عائشہ نے لاپرواہی سے کہا۔

”چھال۔۔ چلو دیکھتے ہیں۔“ اس نے کندھے اچکا کے ”چھال“ یہ بتائیں آج کل آپ کے جوڑیوں ڈھیر پروپنل آئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی فاسٹل ہوا؟“ علی کی بات نے عائشہ کو چونکا دیا۔

”آپ سے یہ کس نے کہا؟“

”آپ کی ہیٹ فرینڈ ماہم نے۔“ عائشہ بے اختیار چوٹی۔

اس کا شوقی سے لبریا انداز عائشہ کو سٹکا گیا۔

”اور آپ نے ماہم کو روپوز کر دیا؟“ میں نے تو آپ سے کچھ نہیں کہا۔“ عائشہ کی جھٹکی پر وہ مسکرایا۔ ”میں اپنے ہوش و حواس میں تو آپ کی دوست کو روپوز نہیں کر سکتا۔ بے ہوشی کی کیفیت میں کچھ کہہ دیا ہوں مجھے یاد نہیں۔“ وہ سراسر عائشہ کا مذاق اڑا رہا تھا۔ مجھے محسوس کر کے اس کا منہ بن گیا۔

”آپ کی خاطر کئی گھنٹے آپ کی دوست کو برداشت کرنا پڑا۔ اور یہ وہ بر ملاقات میں آپ کے کسی نہ کسی پروپنل کی داستان بنا کر میرا دل زخمی کر دیتی تھی۔“ علی کی بات پر وہ زبردست انداز میں چونکی لیکن دانستہ خاموش رہی۔ ناراضی کے ہائل چھٹ چکے تھے۔ آج بہت عرصے کے بعد دونوں کو اس خوب صورت صبح میں دلکشی کے سارے رنگ دکھائی دیے تھے۔ کچھ ہی دیر کے بعد دونوں آپس میں اس طرح محو گفتگو تھے جیسے درمیان کا عرصہ ہیچ نہیں آیا ہی نہ ہو۔

\*\*\*

”ہمیں ڈاکٹر صاحب! جب میں ٹھیک ہو جاؤں گی تو بہت سا پیسہ کمائوں گی۔“ سیکینہ کی بات نے ڈاکٹر خاور کو حیران کیا۔ وہ آج سیکینہ کو دیکھ کر پھر لان کی طرف آگئے تھے۔ انہیں دیکھ کر سسٹر ماہم نے فوراً ہی اٹھ کر چلی گئیں۔ سیکینہ کو احساس ہوا کہ آج کل ڈاکٹر خاور اس کو زیادہ سے زیادہ ناگوار رہے ہیں۔

”ڈھیر سارا پیسہ لے کر کیا کریں گی؟“ ڈاکٹر خاور سامنے درختوں کے جھنڈ سے ایک سفید رنگ کا پھول توڑ کر لے آئے۔

”میں اس پیسے سے معذور بچوں کے لیے ایک ادارہ بناؤں گی۔ ان میں ایسے بچوں کو رکھوں گی۔ جن کے والدین کے پاس ان کے علاج کے لیے پیسہ نہیں ہوگا۔“ سیکینہ آج کل انہیں قدم قدم پر چونکا رہی تھی۔

”اور میں اس ادارے کے بچوں کا مفت علاج کروں گا۔“ ڈاکٹر خاور کے منہ سے نکلنے والی بے ساختہ بات نے سیکینہ کا ڈھیروں خون برسات دیا۔

”دعوت۔“ وہ بالکل بچوں کے سے انداز میں خوش ہوئی۔

”ہاں وعدہ۔“ ڈاکٹر خاور نے اس کی جانب پھول برساتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

”ہمیں ڈاکٹر صاحب! آج کل مجھے زندگی بہت خوب صورت لگنے لگی ہے۔“ سیکینہ نے مسکراتے ہوئے پھول پکڑا تو انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا دھڑکا بھی میرے دل کو گرا رہا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف در آیا۔

”دیکھو سیکینہ! اپنے آپ کو دونوں قسم کے حالات کے لیے تیار رکھو۔ اگر تمہارا آئرشن کامیاب ہو گیا تو قیامت! اس سے زیادہ اچھی بات کوئی نہیں ہو سکتی۔ لیکن آج مجھ سے یہ بھی وعدہ کرو کہ خدا خواستہ ایسا نہ ہوا تو تم اپنے والدین اور خود کو پریشان نہیں کرو گی۔“ ڈاکٹر خاور نے اسے ذہنی طور پر ہر قسم کے حالات کے لیے تیار کرنا چاہا۔

”مجھے معلوم ہے ڈاکٹر صاحب!“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”دیکھو سیکینہ! ایک مسیحا کی حیثیت سے میرے ہاتھ میں جو کچھ ہوا، میں کروں گا۔ مجھے اپنے اللہ پر یقین ہے۔“ وہ کوئی نہ کوئی اچھی راہ ضرور نکالے گا۔“ ڈاکٹر خاور کا مثبت رویہ سیکینہ کے دل میں امیدوں کے کئی چراغ روشن کر گیا۔

\*\*\*

”کیا مصیبت ہے جو یہ میرا فون اینڈ نہیں کر رہا۔“ ماہم کا کوفت کے مارے برا حال تھا۔ وہ غصے اور غمناک منہ سے اپنے کمرے کے کئی چکر کاٹ چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا جس پر وہ بار بار

ایک ہی نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

”سمجھتا کیا ہے خود کو ایسا کون سا نواب لگا ہوا ہے۔“ ماہم نے ہاتھ میں پکڑا سیل فون غصے سے بید پر پھینک دیا۔ اس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے نمٹا کر طرح طرح ہوا۔

”ایک عائشہ صاحبہ ہیں جن کے مزاج نہیں مل رہے۔ اگر اللہ نے ڈھنگ کی شکل دے دی ہوئی تو محترمہ آسمان پر کھنڈیں والی پھرتیں۔“ ماہم کا دل بگ بری طرح گھوما ہوا تھا۔ وہ کبھی علی کو اور کبھی عائشہ کو بلند آواز میں کوسنے لگتی۔ اسی لمحے سیل فون کی جھٹکی پر وہ متوجہ ہوئی۔ اس نے بڑی جلدت سے اسکرین پر آنے والے نمبر کو دیکھا۔ علی کا نمبر دیکھ کر اس کے غصے کا یل لپٹ کر بھڑک اٹھا۔

”آئی ایم سوری ماہم! میں کچھ بڑی ہوں۔“ آپ کو پھر کال کروں گا۔“ دوسری جانب وہ بھی خاصی جلدت میں تھا۔

”لیکن مجھے تو آپ سے تفصیلاً بات کرنی ہے۔“ وہ جھلی۔

”مجھے اس ہفتے میں تو ممکن نہیں ہاں اگلے ہفتے دیکھوں گا۔“ وہ جلدت بھرے انداز میں گویا ہوا۔

”آپ کو پتا ہے کہ عائشہ کی اینجمنٹ ہو رہی ہے راس علی کے ساتھ۔“

”ہوں۔“ وہ ہلکا سا چونکا۔ ”میری طرف سے مبارک باد دے دیجیے گا انہیں۔“ ہلکے جھکے لہجے میں کہہ کر وہ فون بند کر چکا تھا۔ ماہم کو اس کے انداز پر کرنٹ سا لگا۔

”گھو ٹو ہیل!“ اس نے سیل فون پوری طاقت سے زمین پر دے مارا۔ اس کا پچھلا حصہ ٹکڑا اور پشٹی نکل کر بیڈ کے نیچے جا گری۔ وہ اب دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔ دماغ میں سوچوں کا ایک طوفان تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب کب اس پریشانی کے عالم میں اندر داخل ہوئیں۔

”مہمیں پتا ہے ماہم! انصر نے اپنی ایک کولیگ کی بہن سے کورٹ میں جمن کرلی ہے۔“ مہم اپنی بات پر

وہ چونکی۔

”بھائی میں جائے انہرا آپ کو کیا راہم ہے اب وہ جس سے مرضی شادی کرے۔“ تاہم کاسارا غصہ شمن آپ پر نکل گیا۔

”تم کیوں لال چلی ہو رہی ہو۔“ شمن آپ کی بڑی جلدی اس کے خراب موڈ کا اندازہ ہوا۔  
”اس علی کے بچے نے دماغ خراب کر رکھا ہے۔“ وہ دوائی میں بچ بول گئی۔

”میں کروا سے۔ یاد رکھو ماس عورت کی کبھی قدر نہیں کرتا جو اسے آسانی سے مل جائے۔ خود کو ناقابل تخریب بنا کر پیش کرو، تمہارے پیچھے پاگل ہو جائے گا۔“ شمن آپ نے اپنے تجربے کی رو شمنی میں بتایا۔  
”رہنے دیں آپ! یہ بھی کر چکی ہوں۔“ تاہم نے بے زاری سے کہا۔ ”وہ مردوں کی اس قسم سے ہے جو ناپید ہو چکی ہے۔ بس کوئی ایک آدھ نادر عجوبہ باقی ہے۔“

”پھر دفع کرو اسے، تم نے کون سا کوئی میونیم کھولنا ہے جہاں ایسے نادر عجوبے رکھو گی۔“ شمن آپ کا انداز اکٹھا ہٹ لیے ہوئے تھا۔

”اس نے تاہم منصور کو انور کیا ہے اور کوئی مجھے نظر انداز کرے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ تاہم کالجہ خاصا عجیب تھا۔

”تو پھر کیا کرو گی؟“ شمن آپ نے یونی پوچھا۔  
”جب تک اسے اپنی زلفوں کا اس پر نہیں بننا ہو گی مجھے سکون نہیں آئے گا۔“ تاہم کی آنکھوں سے شعلے نکلے۔ شمن حیرانی سے اپنی بن کو دیکھتی رہ گئیں جس کا خوب صورت چہرہ اس وقت شدید تناؤ کا شکار ہو کر بہت بد صورت لگ رہا تھا۔

\*\*\*

”میں موحد کی بہن ہوں مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ ثناء ملکہ ایک دم پریشان سی ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر چوہا بند کر دیا۔  
”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“ عائشہ کی اگلی

فرمائش نے اسے مزید پریشان کیا۔

”آپ عائشہ بات کر رہی ہیں؟“ دوسری جانب سے جھجک کر پوچھا گیا تو عائشہ مسکرا دی۔

”آپ کو بھائی نے میرے بارے میں بتایا ہے کیا؟“ اس کا دوستانہ انداز ثناء ملکہ کو تھوڑا سا سکون کر گیا۔  
”جی، وہ اکثر ہی آپ کا ذکر کرتے تھے۔“ ثناء ملکہ نے دوبارہ چوہا بند کر دیا اور کچل دی۔  
”بڑی سادہ سی لڑکی تھی۔“

”آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں۔“  
”میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ آخر وہ کون سی لڑکی ہے جو میرے بھائی سے لڑتی رہتی ہے۔“ عائشہ کے شرارتی انداز پر ثناء ملکہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے بعد دونوں میں جو گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا وہ اگلے بیس منٹ تک جاری رہا۔ آخر کار طے پایا تھا کہ ثناء ملکہ اپنی دوست کے ساتھ عائشہ سے ملنے آئے گی۔

”یہ کس سے ہنس رہی ہیں؟“ ثناء ملکہ نے حیرت سے پوچھا۔  
”یہ طہیم کا پیالہ اٹھائے کچن میں آؤ دھکیلی۔ وہ چٹپٹے پانچ منٹ سے کچن کے دروازے میں کھڑی تھی لیکن ثناء ملکہ کو اپنی گفتگو کے دوران اس کی موجودگی کا ذکر بھی احساس نہیں ہوا۔

”موحد کی بہن تھی عائشہ۔“ ثناء ملکہ نے مختصراً بتایا جبکہ اس اطلاع پر ثناء ملکہ کا کھلا رہ گیا۔  
”توبہ! کتنی مبینہ تھی، ہو تم کہاں کہاں کنکشن ملا رکھے ہیں اور مجھے کالوں کا ان خبر نہیں۔“ ثناء ملکہ نے شرارت سے اس کے کندھے پر ہانکا۔ اس نے مزہ کر کے گھور کر دیکھا۔

”کتنی بد تمیز ہو تم ثناء ملکہ۔“  
”اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔“ اس نے ڈھٹائی سے سرخم کیا۔

”یہ پیالہ اٹھا کر کیا مانگے آئی ہو، خبر ہو گئی ہو گی کہ میں مریٹاؤ بننا رہی ہوں۔“ ثناء ملکہ نے اسے چھیڑا۔  
”محترمہ میں مانگے نہیں بلکہ ملنے آئی ہوں اور“ بھی اپنی امان کے ہاتھ کا پتا طہیم۔“ ثناء ملکہ نے ہنسنے ہوئے اطلاع دی۔ ثناء ملکہ نے ایک دفعہ پھر اسے گھور کر

دیکھا۔

”اچھا سو! وہ تمہارا اکڑن اپنے اہل و عیال کے ساتھ رات کو تشریف لا رہا ہے۔“ ثناء ملکہ کی بات پر اسے جھکا سا گیا۔

”کیا واقعی؟“ اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔  
”ہم سے ملنے آرہا ہے یا تمہارے رشتے کی بات کرنے؟“ ثناء ملکہ نے اس کے گلابی ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی تو حالات کا جائزہ لینے آرہا ہے۔“ ثناء ملکہ نے اپنی پیٹ میں بے تکلفی سے چاول نکالتے ہوئے بتایا۔

”صبر کرو سکون سے کھا لیتا، اپنا منہ جلاؤ گی کیا۔“ ثناء ملکہ نے اسے گرم گرم چاول کھاتے دیکھ کر ٹوکا۔

”جو مزہ گرم گرم چیز کھانے میں ہے وہ ٹھنڈے میں کہاں؟“ ثناء ملکہ نے غلٹ بھرے انداز سے کھاتے ہوئے اپنا نظریہ بتایا۔ اس سے پہلے کہ ثناء ملکہ اس کی بات کا کوئی جواب دیتی، داخلی دروازے کی بیل نے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”اس وقت کون آیا ہوا ہے۔“ تمہارا ذہن دگر کر کے آئی تھیں کیا؟“ ثناء ملکہ صحن میں نکل آئی۔ ثناء ملکہ نے بھی اس کی بیرونی کی۔

”کون ہے؟“ ثناء ملکہ نے دروازے کے پاس پہنچ کر ملکہ آواز میں پوچھا۔

”دروازہ کھولو، میں ہوں۔“ ایک انتہائی مانوس آواز نے ثناء ملکہ اور ثناء ملکہ دونوں کو سوواٹ کا جھٹکا دیا۔  
”ثناء ملکہ نے فوراً ہی بڑی بے تابی کے ساتھ دروازہ کھولا۔ سامنے کھڑے شیر کو دیکھ کر ثناء ملکہ ہکا بکا رہ گئی۔ جب کہ ثناء ملکہ کے ہاتھ سے چاولوں کی پلیٹ چھوٹ کر زمین پر جا گری۔ چاول اور مٹر کے دانے پکڑے صحن میں پھیل گئے۔ وہ دونوں خوشی اور بے ساختہ سامنے کھڑے شیر کو دیکھ رہی تھیں۔

\*\*\*

”میرے کے ابا کچھ دن سے دل کچھ پریشان سا

ہے۔“ جیلہ مائی کے منہ سے نکلنے والی اس غیر متوقع بات نے اللہ و ناکو حیران کیا۔ وہ دونوں اس وقت لان میں بیٹے بیٹے بیٹھے تھے۔

”کیا ہوا ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“ جیلہ مائی کو اپنے میاں کی حیرت نے حیران کیا۔

”اصل میں تیرے منہ سے ایسی باتیں بہت کم نکلتی ہیں تا تو تو اپنے سامنے دکھ سکھ اللہ سوچنے سے کرنے کی عادی ہے نا اس لیے حیران ہو گیا۔“ اللہ و تانے ان کی تسلی کے لیے تفصیل سے جواب دیا۔

”ہاں مگر کبھی دل چاہتا ہے تاکہ اللہ کے بندوں سے بھی دل کا حال احوال کہا جائے۔“ جیلہ مائی آوازی سے مسکرائیں۔

”اللہ کے بندے کہاں اس قابل کہ ان سے دل کی باتیں کی جائیں۔ ان کے دل بڑے چھوٹے ہوتے ہیں۔ آپ کے دکھ سکھ کے سامنے تو بن جاتے ہیں لیکن کسی نہ کسی دلیے جتا بھی دیتے ہیں کہ ہم نے تمہارا اوکھے دلیے میں گتسا ساتھ دیا۔ اس لیے اندر کی باتیں اللہ کے ساتھ ہی جتی ہیں۔“ اللہ و تانہ اچھے پتا نہیں کہاں سے بھڑالائے تھے اب بے تکلفی سے بیٹھے کش پے کش لگا رہے تھے۔

”اب بندہ کیا اپنے مجازی خدا کے ساتھ بھی دل کی باتیں نہ کرے۔“ جیلہ مائی کو اپنے میاں کی بات ابھی نہیں لگی۔ اس لیے ہلکی سی ناراضی ان کے کنبے میں در آئی۔

”یہ مجازی خدا تو زیادہ خطرناک ہوتا ہے اس لیے کہ جو عورت اس کے نکاح میں آجاتی ہے وہ اس پر اپنے رب سے زیادہ حق سمجھنے لگتا ہے اسے ”مجازی“ کا لفظ بھول جاتا ہے، صرف ”خدا“ یاد رہ جاتا ہے۔ اس لیے یاد رکھ یہ میاں بیوی کا رشتہ جتنا مضبوط ہوتا ہے اس سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ مرد کا جذبہ دماغ خراب ہوتا ہے تو وہ فوراً اس حق کو استعمال کرنے کی دھکی دیتا ہے جو اللہ کے نزدیک حلال ہونے کے باوجود سب سے ناپسندیدہ ہے۔“ اللہ و تانہ ہمارا آج بڑے ترنگ میں تھے۔ جیلہ مائی کے چہرے پر پھیلتے



ناگاری کے رنگ انہیں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ وہ جان بوجھ کر انہیں پھینک رہے تھے اور اس کو شخص میں کامیاب بھی ہو گئے۔

”اچھا یہ تاکہ لاڈلانی کیسی ہے؟ ڈاکٹرنی اس کو ورزش کروائی۔“ اللہ وانا کا اچھا کیا دیا۔

”ہاں کروائی ہے“ اب تھک کے سو گئی ہے۔“

جیلہ مائی کے لہجے میں بولی اواسی تھی۔

”پھر یہ تاکہ او اس کیوں ہے۔“ اللہ وانا نے اپنا حقہ ایک سائیڈ پر کر کے دونوں ٹانگیں اوپر کیں اور اُلتی باتی مار کر تیج پر بیٹھ گئے۔

”بہت عجیب سا خواب دیکھا میں نے دوپہر میں۔“ جیلہ مائی کی آنکھیں نم ہوئیں تو وہ چوٹک گئے۔

”میں نے دیکھا کہ ہم اپنے چنڈا واپس گئے ہیں لیکن ہمارے ساتھ سیکنہ نہیں ہے۔“ جیلہ مائی کے چہرے پر پریشانی واضح تھی۔

”پھر؟“ اللہ وانا کی رعیت بھی ایک لمحے کو متغیر ہوئی لیکن انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔

”اس کے بعد میں نے اپنے چنڈا لے کر میں بکے بچے بھلتے دیکھے، ایک بڑوس نے مجھ سے حیرانی سے پوچھا، ”جیلہ یہ بل (بچے) کس کے ہیں؟ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی، تو نے باہر نکل کر کہا، ہمارے پتر کی اولاد ہے تو ہمارے پوتے پوتیاں ہوئے نا۔“ جیلہ مائی نے ابھرن بھرے انداز سے اپنا خواب سنا۔ اللہ وانا کا خواب سن کر کچھ لمحے کو بالکل چپ ہو گئے۔

”فکر نہ کر، سیکنہ کی ماں! دن کے خواب کہاں سے ہوتے ہیں۔“ انہوں نے لاروائی سے کہہ کر حقہ اٹھایا۔ آگ سرد ہو چکی تھی لیکن وہ بے خیالی میں پھونکیں مارے جا رہے تھے۔

”ہوں۔“ جیلہ مائی نے بھی غائب دماغی سے سر ہلا دیا۔

”دیکھ سیکنہ کی ماں! یہ جو مومن کی دعا ہوتی ہے نا“ اس میں بڑا زور اور بڑی طاقت ہوتی ہے جب دل کی

گہرائیوں سے اللہ پاک پر پورا یقین رکھ کر کی جائے۔ یہی دعا تقدیر کے آگے آن گھڑی ہوتی ہے۔ سہرا سچا رہ اپنے بارے بندے کی اس اوپر فرماں بردار ہے۔ بس تو بھی دعا کی بجائے کو پڑ لے۔ سوچ کر سارے نالے اسی کنجی سے بھرتے ہیں۔ اللہ پاک کرے گا۔“

اللہ وانا کی بات سے جیلہ مائی کو تھوڑا سا اطمینان ہوا۔

\*\*\*

”عائشہ! سیکنہ کا سیرج آیا ہے، وہ ہم دونوں سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کا آپریشن ہے۔“ موصد نے اس دن عائشہ کو باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر روکا۔ وہ چوڑی ریزنگ کے سلسلے میں کسی میٹنگ میں جا رہی تھی۔ اس کی بات پر چوٹک گئی۔

”سیکنہ کا آپریشن؟ کب ہے؟“ اس نے اظہارِ پرجتن موصد کو دیکھا۔ جو خاصا کمزور کمزور سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے چند ہی دنوں میں سیاہ حلقے بن گئے تھے۔ عائشہ کو ڈھیروں ناسف نے گھیرا۔

”آپریشن پرسوں ہے۔“ موصد کی اطلاع پر چوٹک۔

”پھر کب جاتا ہے؟“ اس نے فوراً ہی سوال لگا ہوں سے دیکھا۔

”جب بھی تمہیں فراغت ہو۔“ موصد نے غیہ اس کے کورٹ میں بیٹھی۔

”میں تو ابھی بھی جلنے کو تیار ہوں۔“

”پھر ابھی جلے جلتے ہیں۔“ موصد کی بات پر اس نے فوراً ہی گاڑی کی چابی اٹھائی اور موصد کے خاص ملازم کو بلائے چلی گئی جو ایسے موقعوں پر اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

وہ دونوں جب اسپتال کی حدود میں داخل ہوئے، شام کا وقت تھا۔ سورج ڈوبنے کی تیاریوں میں تھا۔ کازرورنگ عجیب سے انداز میں آسمان پر گھلایا تھا۔

عائشہ موصد کی وہ چیل چیر کو دھکیلتی ہوئی اس پرائیویٹ وارڈ کی جانب آگئی تھی۔ سیکنہ کے دروازے کو اس نے ہلکا سا بجایا۔ دروازہ کھلا گیا۔ موصد کی گود میں پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ تھا جو دونوں میں بھائی بطور خاص سیکنہ کے لیے لائے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر اس کمرے کے کینوں کے چروں پر بیٹھنے والی حیرانی بہت دلچسپ تھی۔

”سیکنہ! امانا نے تمہارے لیے بہت سی دعائیں اور بار بھیجا ہے۔“ عائشہ نے بڑے خلوص اور محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تو سیکنہ بیچنپی سی گئی۔

اللہ وانا اور جانی ان کے لیے چائے لینے یاتین کی طرف بڑھ گئے۔

”میری دعا ہے سیکنہ! تم ایک دن ضرور زمین کو اپنے قدموں کے ساتھ محسوس کرو۔“ موصد کے سبجے میں چھپی حسرت جیلہ مائی کو بے چین کر گئی۔

”پتا! اللہ پاک ان شاء اللہ تجھے بھی وہیلا ضرور دکھائے گا۔ بس اللہ سوہنے سے اچھی امید رکھ۔“

”بس اتنی! آپ میرے بھائی کے لیے بھی دعا کیجئے گا۔“ عائشہ کی بات پر جیلہ مائی مسکرائیں۔

”پھر میں آپ کو اور سیکنہ کو اپنے بھائی کی شادی پر بھی بلاؤں گی۔“ عائشہ کی اپنائیت جیلہ مائی کو بہت اچھی لگی۔

”بھائی کی کہیں منتفی ششگنی کی ہے بیٹا!“ جیلہ نے اس سے سوال کیا۔

”جی! بس مجھیں کہہ ہوئی گئی ہے۔“ عائشہ کے کسی خیر انداز پر موصد کے چہرے پر بڑا تاریک سا سایہ پھیلا۔ وہ جھپکے سے انداز سے مسکرایا۔ وہ اور سیکنہ کے خاص ملازم تھے۔

”اللہ پاک قسمت اچھی کرے۔“ جیلہ مائی نے اس سے دعا کی۔

”آپ لوگ یہاں کب سے ہیں؟“ عائشہ نے پرائیویٹ روم کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہمارا ایسی ایسی اوقات کہاں یہ تو اللہ پاک نے

کرم کیا اور ڈاکٹر خاور کی مہربانی ہے جو رہنے کو چھت ملی ہوئی ہے اور میری سیکنہ کا مفت علاج ہو رہا ہے۔“ جیلہ مائی کی بات پر موصد چونکا۔

”یہ ڈاکٹر خاور علی دی ہیں نا جو اسپتال سرجن ہیں اور ایک کلینک میں بھی شام کو بیٹھتے ہیں۔“ موصد نے غلٹ بھرے انداز میں پوچھا تو جیلہ مائی سادگی سے بولیں۔

”پتر مجھے یہ تو نہیں پتا کہ انہوں نے کیا کیا ہے بس بڑے بڑے آپریشن کرتے ہیں اور غریب مریضوں کا مفت علاج کرتے ہیں۔“

”جی جی وہ! وہی اسپتال سرجن ہیں۔“ سیکنہ نے امان کو ہلکا سا گھورتے ہوئے جواب دیا۔ جب کہ امان ایک دفعہ پھر اپنی سابقہ لوجی کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہیں سیکنہ کی بیماری کی ساری داستان سنانا شروع ہو گئی تھیں۔ سیکنہ کی گھوریاں بے اثر تھیں۔

”ایسا ہے ڈاکٹر توبہ! سیکنہ کی ڈاٹھ سے ساری سولڈ چیزیں آج سے بند کر دوں۔“ کوئی بہت تیزی سے اندر آیا۔ اسے دیکھ کر عائشہ کو کرنٹ سا لگا جب کہ وہ اپنی روانی میں سیدھا اس اسپینڈ کی طرف بڑھا جہاں سیکنہ کی فائلیں اور رپورٹس پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے اندر موجود کینوں پر کوئی غور نہیں کیا۔ ویسے بھی سیکنہ کا بیڑ دیوار کی سائیڈ پر تھا اور دروازہ کھلتے ہی سامنے اسپینڈ رکھا ہوا نظر آتا تھا۔

”ڈاکٹر خاور! سیکنہ کی ساری رپورٹس آچکی ہیں۔ آپریشن کی تیاری مکمل ہے۔ بالی جو آپ کہیں۔“ ان کے عین چپچپے کمرے ڈاکٹر نے بھی بڑے مصروف انداز میں کہا۔

”ڈاکٹر خاور! السلام علیکم۔“ موصد کی پرجوش آواز پر انہوں نے فائل سے سر اٹھایا اور سامنے بیٹھے موصد کی طرف بڑے دوستانہ انداز میں دیکھا۔

”میکلو جنتلین۔“ وہ فائل ایک طرف رکھ کر اب بڑی گرم جوشی کے ساتھ موصد سے ہاتھ ملارہے تھے۔ عائشہ کا سارا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا۔ وہ سخت بے یقینی سے اپنے سامنے کمرے کے شخص کو دیکھ رہی

تھی۔

”ان سے ملیں یہ میری سسرہیں عاتشہ بہت اچھی مصورہ ہیں۔“ موحّد کی بات پر وہ مڑے۔ انہیں جھٹکا سا لگا۔ ان کی آنکھوں میں پھیلتی جراثی اس بات کی گواہ تھی کہ وہ اس بات سے پہلے سے باخبر نہیں تھے۔

”السلام علیکم! مجھے ڈاکٹر خاور علی کہتے ہیں۔ میرے بابا کو علی نام بہت پسند تھا۔ اس لیے وہ مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔“ انہوں نے سر کو ہٹا کر اسخام دے کر سلام کرتے ہوئے بڑے ذومعنی انداز سے حیا کیا۔

”عاتشہ! یہ ڈاکٹر خاور علی ہیں، جن کا میں اور ماں اکثر گھر میں ذکر کرتے ہیں۔“ موحّد کے لہجے کی خوشی اس بات کی گواہ تھی کہ اسے اس اچانک ملاقات سے خوشی ہوئی ہے۔

”بھائی! میں ڈاکٹر خاور کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ عاتشہ کے شرارت بھرے انداز پر ڈاکٹر خاور نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں شوخی کسی روشن ستارے کی طرح جگمگا رہی تھی۔ جب کہ ڈاکٹر خاور کے چہرے پر واضح گہرا ہٹ کے آثار تھے۔ ”وہ کیسے؟“ موحّد نے جراثی سے دریافت کیا۔ جب کہ عاتشہ اب کھل کر مسکرائی۔ سیکنے نے انہیں بھرے انداز سے پہلے عاتشہ اور پھر ڈاکٹر خاور کو دیکھا۔ وہ ایک دم ہی بے چین ہو گئی تھی۔ اس کا دل نہ جانے کیوں ایک نئی داستان اسے سناتے لگا تھا۔

\*\*\*

”کیا مصیبت ہے یہاں تک آگئی ہو تو اندر کیوں نہیں جا رہی ہو۔“ تابیبہ نے کینیاں مار مار کر نشانہ کی کر زخمی کر دی۔

”اب تم نے ایک دفعہ بھی اور مجھے کہنی ماری تو میں تمہاری بیٹی توڑ دوں گی۔“ موحّد کے آفس کی طرف جاتے ہوئے نشانہ نے منہ پر ہاتھ پھیر کر اسے دھمکی دی۔

”تم بھی یہ فلمی ہیروئینوں کی طرح لمبے لمبے سانس لینا بند کرو اور شرافت سے اپنے ہیرو کے کمرے میں

چلو، غضب خدا کا ایک تو نیا جو تاکٹ رہا ہے اور یہ تمہاری مصنوعی اور میں دماغ خراب کر رہی ہیں۔“ تابیبہ نے وہیں کا ریڈیو میں کھڑے کھڑے اس کی کانوں کی طرف بڑھ گئی۔

”اب کیا تمہارے قدموں کے نیچے اہلقلی لگ گئی ہے۔“ اسے دروازے کے پاس جم کر کھڑے دیکھ کر

”کاش اہلقلی اس وقت میرے پاس ہوتی تو میں کم از کم تمہارے ہونٹوں پر ضرور چپکا دیتی۔“ نشانہ فٹے سے کچھ اونچائی بول گئی۔

”نکم انکم۔“ اندر سے آنے والی رعب دار آواز نے دونوں کو ہی بوکھلایا۔

”السلام علیکم! میں تابیبہ ہوں، نشانہ کی بیسٹ فرینڈ۔“ تابیبہ نے دروازے سے جھانک کر شوخی سے کہا۔

”میں سکندر شاہ ہوں، نشانہ کی کمانی کا بیرو۔“

دوسری جانب سے بھی شرارت کا مظاہرہ ہوا۔ ”بھینٹنکس گاڈ! آپ تو اب مجھے خاصے شریف انسان ہیں۔“ نشانہ نے تو مجھے اچھا خاصا ڈرا دیا تھا۔“ تابیبہ کی بات پر نشانہ نے غصے سے اسے گھورا جبکہ موحّد کے چہرے پر پھینٹنے والے رنگ بہت خوب صورت تھے۔ ”انہوں نے کیا بتایا تھا میرے بارے میں۔“

موحّد نے کینیاں میز نکالتے ہوئے بڑی دلچسپی سے پوچھا اور ساتھ ہی دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”بیٹا دونوں نشانہ؟“ تابیبہ نے شرارتاً نشانہ کو دیکھا جس کا بوکھلایا ہوا چہرہ ان دونوں کو بہت لطف دے رہا تھا۔

”نکو مت۔“ نشانہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”دیکھ لیں بھئی! آپ بھی کچھ سوچ لیں، آپ کا حال بھی مستقبل میں میرے جیسا ہی ہوگا۔“ تابیبہ کی شرارتیں عروج پر تھیں۔ موحّد کو یہ ہلکی پھلکی چھڑ چھاڑ مزادے رہی تھی۔ اعصاب پر چھایا ہوا بوجھ

دھڑک رہے سرک رہا تھا۔

”اللہ مالک ہے میرا بھی۔“ موحّد کھل کر مسکرایا۔ ”تو یہ بتائیں چائے کیسے کیا کلاں؟“

”چائے نہ کلاں۔ ہم تو کھانا کھانے کے موڈ میں ہیں۔“ تاکم از کم پڑا ہٹ سے گر کر گرم فریش چیز والا پڑا ٹکڑا لیں، قسم بہت بھوک لگی ہے۔“ تابیبہ کی بے تکلفی موحّد کو اچھی لگ رہی تھی جب کہ نشانہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا باندھ پڑ کر کھینچتی ہوئی باہر نکل جائے۔

”جی ضرور۔“ موحّد نے اثر کلام اٹھا کر کسی کو رہا بات دیں۔

”تو رہنا میں جی ایسی گزر رہی ہے زندگی؟“ تابیبہ اب بے تکلفی سے اس کا انٹرویو اشارت کر چکی تھی۔ جب کہ موحّد اس سے گفتگو کرتے ہوئے کن آنکھوں سے نشانہ کو دیکھ رہا تھا جو دونوں کی گفتگو کے دوران خاموش تھی جب کہ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”ہیکسکویزی۔! میری ایک ضروری کل آرہی ہے۔ آپ لوگ بات کریں، میں ابھی آپ کو جان کر رہی ہوں۔“ تابیبہ بڑی بے تکلفی سے اپنے ایک سے سیل فون نکال کر کھڑی ہوئی اور بجلت بھرے انداز سے ان کے آفس سے نکل گئی۔

”آپ کی دوست تو خاصی سمجھ دار واقع ہوئی ہیں۔“ اس کے کمرے سے نکلتے ہی موحّد نے اسے پوچھا۔

”ابن خاصی سمجھ دار ہے، جب تک خاموش رہے۔“ نشانہ نے جل کر کہا تو موحّد کے حلق سے کھٹکالا آواز بھانجانے دار تھا۔

”تو اسنی ختم ہو گئی آپ کی؟“ موحّد نے اسے انگوٹھ کے حصار میں لپیٹے ہوئے کہا۔

”میں آپ سے ناراض تو نہیں تھی۔“ نشانہ نے کہا بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے جواب

”نہیں؟“ موحّد کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں

وہ فوراً گویا ہوئی۔

”میں ناراض نہیں، بلکہ حیران تھی کہ ایسی کون سی بات تھی جس نے آپ جیسے انسان کو اتنا ہانپ کر دیا۔“

نشانہ کی بات نے موحّد کو حیران کیا۔

”ہو سکتا ہے کہ میری کسی بات نے تمہاری فیورٹ سائیکالوجسٹ کو مجھ سے بدظن کر دیا ہو۔“ موحّد کی بات پر نشانہ نے تیزی سے اس کی بات کلاں۔

”تھپا نہیں ہو سکتا کہ آپ کی کسی بات پر ایسا ہوا ہو۔“ نشانہ کی بات میں چھپا یقین موحّد کو تعجب میں مبتلا کر گیا۔ وہ کئی لمحوں تک بول ہی نہیں سکا۔ بس نشانہ کو ہی دیکھا رہا جس نے آج اسے بہت معتبر کر دیا تھا۔

\*\*\*

”بابا! میں نے تجھے اور ماں کو بہت تنگ کیا ہے نا۔“ ”رے نہیں پڑا اولاد تو اپنے والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے اور ٹھنڈک تو دل کو سکون دیتی ہے۔“ جیلہ مائی نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے سیکنے کو محبت سے دیکھا۔

”نکین میں نے تو ہمیشہ آپ دونوں کا دل ہی جلایا ہے۔“ سیکنے شدید قسم کی قنوطیت کا شکار تھی۔ اس کے والدین نے چونک کر اس کا رنجیدہ چہرہ دیکھا۔

”ایسی بات نہیں کرتے میری جان۔“ جیلہ مائی نے بے اختیار اٹھ کر اپنی بیٹی کا ہاتھ چوما۔ سیکنے کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”دیکھ نالال! میں تم دونوں کی اکوں اک اولاد تھی، مگر میری وجہ سے ساری زندگی بس اسپتالوں کے ہی دھکے کھائے کوئی خوشی نہیں ملی میری طرف سے۔“ سیکنے کا لہجہ خود بخود بھٹکا جلا گیا۔

”اچھا یہ بتا دو گی رانی! اگر اللہ ہمیں تیری صورت میں بھی اولاد کی نعمت نہ دے تا تو ہم کیا کرتے۔“ اللہ ونا نے بڑے پرسکون انداز میں پوچھا۔

”پتا نہیں بابا! اس نے سادگی سے جواب دیا۔ ”ہم دونوں کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کوئی

مقصود نہ ہوتا۔ ہم دونوں ہی زندگی کے لگے بندھے  
اصول کے تحت بس وقت گزارے جاتے، ہے نا؟“  
اللہ و تمہارے سکینے کے مضطرب انداز کو غور سے  
دیکھا۔

”مجھے اللہ سے کوئی شکوہ نہیں۔ اس نے ہمیں  
محذور سہی لیکن اولاد تو دی۔ اس نے ہماری زندگیوں کو  
ایک محور توڑا اور مجھے کیا پتا پڑا تو نے ہماری زندگیوں  
میں کتنے خوب صورت رنگ بھرے ہیں۔ ہمیں ماں  
باپ بننے کی سعادت نصیب کی ہے۔ اس لیے ایسی  
باتیں نہ کیا کرتی ہوں کہ تکلیف دہتی ہے۔“ اللہ دنا  
کے لمحے میں محبت کی فروانی تھی۔

”چلو بھئی سکینہ! شام کی داک پر چلتے ہیں۔“ سسٹر  
ماریہ ایک دم ہی کمرے میں داخل ہوئی تو سب کی توجہ  
اس کی جانب مبذول ہو گئی۔

”پتا ہے مجھے ڈاکٹر خاور نے بھیجا ہے کہ سکینہ کو  
لے کر لائن میں آؤ۔“ سسٹر ماریہ کے رازدارانہ انداز پر  
سکینہ چونکی۔ وہ دونوں اس وقت کارڈ روم میں تھیں اور  
لان کی طرف بڑھتے ہوئے سسٹر ماریہ نے سکینہ کو  
بتایا۔ ڈاکٹر خاور سامنے بیچ پر بڑے اطمینان سے بیٹھے  
ان کے منتظر تھے۔

”سکینہ! او اس کیوں ہو؟“ ڈاکٹر خاور نے اس کا چہرہ  
غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ سسٹر ماریہ اسے چھوڑ کر  
اندر جا چکی تھی۔

”آپ کو کس نے کہا کہ میں او اس ہوں۔“ اس  
نے چونک کر انسا سوال کیا۔ وہ مسکرائے۔

”چہرہ شناسی کا دعو صرف آپ کو ہی تو نہیں ہے۔  
کوئی اور بھی اس ہنر میں مکمل رکھ سکتا ہے۔“ ڈاکٹر  
خاور کی بے تکلفی سکینہ کو حیران کر گئی۔

”بد صورت چہرہ کو کون دیکھتا ہے؟“ وہ تلخ ہوئی۔  
”بچہ بد صورت نہیں ہوتے، ان کو دیکھنے والی  
نگاہ خوب صورت یا بد صورت ہوتی ہے۔ جو سامنے  
والے منظر کو اپنے مطابق رنگ دیتی ہے۔“ ڈاکٹر خاور  
سننے پر ہاتھ باندھ کر اسے غور سے دیکھ کر بولے۔ ایک  
چمکی سی مسکراہٹ سکینہ کے چہرے پر پھیلی۔

”یہ بتائیں سکینہ! اس دن عائشہ کو دیکھ کر کب  
ٹینس کیوں ہوئی تھیں؟“ ڈاکٹر خاور نے کب کا کارڈ روم  
سوال اس سے پوچھ ہی لیا۔ جس مقصد کے لیے انہوں  
نے اسے یہاں بلایا تھا۔ سکینہ نے بغور ڈاکٹر خاور کو  
دیکھا۔

”یہ سوال آپ اپنے آپ سے پوچھیں۔“ اس کی  
بات نے ڈاکٹر خاور کو ایک لمحے کو ہلکا کر رکھ دیا۔  
”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ انہوں نے جاچنی  
نگاہوں سے اس کا چہرہ کوجھا۔

”عائشہ بہت اچھی ہیں۔“ سکینہ کچھ لمحے چپ  
رہنے کے بعد بولی تو وہ مسکرائے۔

”اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اچھی لگیں۔“  
”جو لوگ دل کے اچھے اور سچے ہوں وہ کس کو اچھے  
نہیں لگتے۔“

”بہت سے لوگ ہیں دنیا میں، جن کو دل کی اچھائی  
اور سچائی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ بس ظاہری  
خوب صورتی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔“ ڈاکٹر خاور نے  
سنجیدگی سے کہا۔

”لیکن آپ ایسے نہیں ہیں، مجھے پتا ہے۔“ سکینہ  
کے لمحے میں یقین کا ایک سمندر تھا۔

”تم بہت اچھی ہو سکینہ!“ ڈاکٹر خاور لب سامنے  
والے بیچ پر بڑی فرصت سے بیٹھ گئے۔ اپنی تعریف پر  
سکینہ کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ یہ بات ڈاکٹر خاور کے لیے  
اچھے سے کا باعث بنی۔

”کیا بات ہے سکینہ کوئی ناراضی ہے کیا؟“  
”مجھے ناراضی کا کوئی حق نہیں ہے ڈاکٹر صاحب!“  
اس کا لہجہ بڑا عجیب سا ہوا۔

”دیکھو سکینہ! آج تو یہ بات کر دی، لیکن آج کے  
بعد ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اُدکے۔“ انہوں نے  
ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے ہلکی سی برہمی سے کہا۔  
سکینہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ بالکل گہری  
کھڑی ڈاکٹر زینا نے یہ منظر بہت شغور سے دیکھا۔



”بھابھی! آپ ایک دفعہ مجھے بتائیں تو سہی!“

کر اپنے بھائی کو دیکھنے آجاتی۔“ ثنائہ کی والدہ کے  
انہو کی صورت نہیں ٹھہم رہے تھے، جب سے  
انہوں نے اپنے بھائی کے انتقال کی خبر سنی تھی۔ وہ اس  
دلت اپنے بیٹے راس کے ساتھ ثنائہ کے کمرے میں  
موجود تھیں۔

”ہیں کیا بتاتی، میرے اوپر تو خود غموں کا ایک طوفان  
لوٹ پڑا تھا۔ ایک تو پردیس اور اوپر سے اتنی محبت  
کرنے والے شریک حیات کی جدائی نے مجھے تو نیم  
بال سا کر دیا۔“ وہ بہت محبت سے اپنی نند کا ہاتھ پکڑ  
کر ساری تفصیل بتاتی گئیں۔

”پاکستان آنے کے بعد میں نے سوچا کہ آپ کے  
حصے کی رقم پہلی فرصت میں آپ تک پہنچا دوں۔ اس  
کے بعد خود بیمار ہو گئی۔ اس لیے وکیل صاحب کو بھجوا  
دیا۔“ ان کی بات پر بالکل چپ بیٹھے شیر نے بے چینی  
سے پہلو بدلا۔

”یہ تو اچھا خاصا ہینڈ سم بندہ ہے، لیکن پتا نہیں  
کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے اسے کہیں دیکھا  
ہے۔“ کچن میں ان لوگوں کے لیے کھانا تیار کرتی ثنائہ  
نے اپنی آنکھیں ثنائہ سے بیان کی۔ جو راس کی والدہ کی  
آدھ کاٹتی ہی فوراً ”تیر کی طرح آن بچتی تھی۔“

”دیکھو اب تم اپنے سکندر شاہ کی طرف ہی دھیان  
دلاؤ، ضرورت نہیں اس پر بری نظر ڈالنے کی۔“ ثنائہ  
نے علاوہ کے لیے کھیرے کاٹتے ہوئے اسے شرارت  
سے جواب دیا۔

”جب بھی بات کرنا کوئی نہ کوئی ہو گئی ہی مارتا۔“  
اس نے کہا ب تلتے ہوئے جل کر جواب دیا تو ثنائہ  
کھنکھلا کر رہی۔

”ایک گلاس پانی مل جائے گا۔“ شیر کے سیاہ  
انڈاز پر وہ دونوں چوٹیں۔ وہ نہ جانے کب کچن کے  
دراڑے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ ثنائہ نے فوراً ”فرخین  
سے لے لیں“ ان کی طرف بڑھائی۔ جسے لے کر وہ  
اندروں کی جانب بڑھ گیا۔

”یہ تمہارے بھائی کے منہ پر کیوں ساڑھے بارہ  
بیسے گئے ہیں۔ جب سے آیا ہے، ایسے ہی کھا جانے

والی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔“ ثنائہ نے ہلکے ہلکے  
انداز میں جتلیا تو ایک تدریک سا سلیہ ثنائہ کے چہرے  
پر پھیلایا۔

”ہاں! اسے سخت غصہ ہے کہ ہم نے ماموں سے  
رابطے کی بات اس سے کیوں چھپائی اور یہ کہ پیسے گھر کی  
مرمت پر کیوں ضائع کیے۔“ ثنائہ کی بات پر ثنائہ کو  
جھٹکا لگا۔

”دماغ ٹھیک ہے تمہارے بھائی کا، خود تو کویت جاکر  
بیٹھ گیا اور تم لوگوں کو اس کھنڈر جیسے گھر میں چھوڑ کر  
دوبارہ مڑ کر نہیں پوچھا۔“ ثنائہ سلا دیتا بھول گئی۔

”اسے غصہ ہے کہ اگر وہ پیسے اسے مل جاتے تو وہ  
پاکستان آکر کوئی بزنس کر لیتا۔“ ثنائہ نے ہاتھ دھوئے  
ہوئے طنز یہ لہجے میں بتایا۔

”ہو نہ! اب اس کی مطلبی اور خود غرض بیگم اسے  
چھوڑ کر چلی گئی تو اسے پاکستان کی یاد آگئی۔“ ثنائہ کا لہجہ  
زہر آلود ہوا۔

”خواتین! آج کی تاریخ میں کھانا مل جائے گا۔“  
راس کے خوشگوار انداز پر وہ دونوں چوٹیں۔ ثنائہ  
کے ہاتھ میں پکڑا کھیرا چھوٹ کر زمین پر جا کر۔ جب  
کہ لہجے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی ثنائہ مسکرا دی۔  
”بھئی! میں تو اپنے حصے کا کام بننا چکی ہوں، یہ  
دوسری باری ہی اتنی ست ہے تو کیا کیا جائے۔“ ثنائہ  
نے شرارت سے ثنائہ کی طرف اشارہ کیا جو اس حملے پر  
گڑبڑاسی گئی۔

”اوہو تو یہ مسئلہ ہے۔“ راس دونوں بازو اپنے  
سننے پر جھا کر اب بڑی گہری نگاہوں سے ثنائہ کو دیکھ رہا  
تھا۔ اس کی نگاہوں کی پیش سے ثنائہ کے رخسار سرخ  
ہوئے۔

”اس کا مطلب ہے کہ مجھے اپنے مستقبل کے  
بارے میں کچھ سوچنا چاہیے۔“ راس کا معنی خیز  
انداز ثنائہ کے ہاتھ پر پھلا گیا۔

”بائی! داوے راس صاحب! آپ اگر کسی  
انپیکشن ٹیم کے ہیڈ کی طرح ہمارے سروں پر سوار  
رہے تو آج کاؤز آپ کو کل ہی ملے گا۔“ ثنائہ نے



اسے مصنوعی خلقی سے گھورا تو وہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

”کتنی ظالم دنیا ہے۔ ان کا بس بھی ہم جیسے غریبوں پر ہی چلتا ہے۔“ اس نے فرضی دکھ کے زیر اثر ایک لمبی آہ بھری۔ ”حالانکہ بندہ پوچھے کہ میں نے کیا کیا ہے۔“ راس کی شوخی عروج پر تھی۔ وہ مسلسل تابیہ پر نظرس جمائے لے نہ سکا کہ رہا تھا۔

”بھئی! یہ جو آپ ظالم نظروں کے وار کر رہے ہیں تا عوام الناس پر، اس کی وجہ سے ہمارا سلام خاصا لٹ ہو رہا ہے۔“ ٹانگہ نے بڑی صفائی سے چھری تابیہ کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

”دھرو! کہیں زلیخا کی طرح انگلیاں نہ کاٹ بیٹھنا، آج کل تو ویسے بھی رشتوں کا برا مسئلہ ہے بغیر انگلیوں والی لڑکی کو کون اپنائے گا۔“ ٹانگہ نے ہنسنے ہوئے تابیہ کو چھیڑا۔

”کچھ لوگ بڑے دل جگر سے والے ہوتے ہیں۔ وہ گوئی، سری، اندھی کافی حتیٰ کہ خاصی زبان دراز لڑکیوں کو بھی اپنانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔“ راس کی بات پر ٹانگہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جبکہ تابیہ نے اسے گھور کر دیکھا جس کی زبان دانی کے جوہر آج کھل کر سامنے آ رہے تھے۔

\* \* \*

”مجھے تو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ آپ دو سروسے بدلہ لینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔“ ڈاکٹر خاور علی نے آج پھر اسے پارک میں پکڑ لیا تھا۔ وہ چوبیس تنگ بنانے کے لیے اپنا کیٹس سیٹ کر رہی تھی ان کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ ان کا اشارہ اس دن والی ملاقات کی طرف تھا جہاں عائشہ نے ان کے جھکے چھڑا دیے تھے۔

”بلیو می“ میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا، بس ایسے ہی زبان پھسل گئی۔ ”عائشہ نے مسکراتے ہوئے انہیں یقین دلایا۔ گھرے سبز رنگ میں وہ اس خوب صورت صبح کا ایک دلکش اور تقریباً سا رنگ لگ رہی

تھی۔

”آپ کی زبان نے تو حقیقتاً میرے جھکے اور دیے، مجھے تو موجد کا ڈر تھا کہ وہ کیا سوچے گا۔“ ڈاکٹر خاور نے خوشگوار انداز میں بتایا تو وہ ہنس دی۔

”میرا بھائی ماشاء اللہ بہت اچھا ہے وہ اپنی فضول باتوں پر دھیان نہیں دیتا۔“ عائشہ کے لہجے میں یقین تھا۔

”پھر بھی ایک دفعہ تو آپ نے میرے خواہش کی تم کر دیے۔“ وہ بے تکلفی سے بتاتے ہوئے سامنے رکھے بوتل سے پھر بیٹھ گئے۔

”آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ آپ ڈاکٹر ہیں؟“ اس نے گھر کیا۔

”آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔“ انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اپنے اتنے بڑی شیفول سے اتنا ٹائم نکال کر ایگنیشن وغیرہ میں کیے چلے آتے تھے۔“ عائشہ بھی ان کے مقابل ایک پھر پھر آن بیٹھی۔

”بھئی، جس چیز کا انسان کو شوق ہو وہ اس کے لیے ٹائم کیس نہ کیس سے نکال ہی لیتا ہے۔“ خاور علی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”ٹھیک کہتے ہیں۔“ عائشہ مسکرائی۔ ”یہ راس کہاں بڑی ہے آج کل۔“ اسے اچانک یاد آیا۔

”وہ آج کل لاما کا رائٹ ہینڈ بنا ہوا ہے۔ ان کے کاموں کو نبھاتا ہے۔“

”ڈاکٹر خاور کی بات بروہو کی۔“ کیسے کام۔“

”بھئی۔ میرے گئے کسی اچھی سی لڑکی کی تلاش میں ہیں دونوں۔“ خاور کی بات پر عائشہ کا دل بے چین اور اڑے دھڑکا۔ اس نے جھکے سے سر اٹھا کر خاور علی کو دیکھا۔

”کوئی اچھی لڑکی ہو نظریں تو ہٹائیے گا۔“ خاور نے چھیڑنے پر وہی طرح تی۔

”ہاں ہے۔“ اس نے بڑی سرعت سے کہا۔

”کون؟“ خاور نے اس کا تپا تپا سا چوہا پکڑ لیا۔

”آپ کی دوست ماہم۔“ وہ اب غصے سے اپنے ایک سے رنگ اور برش نکالنے لگی۔

”ماہم! ماہم بھی اچھی جوانس ہے۔“ ڈاکٹر خاور کی آنکھوں میں شرارت رقصاں تھی۔ جب کہ عائشہ کے چہرے پر ناراضی تھی۔

”ویسے بانی داوے! آپ کی ماہم سے کوئی ناراضی چل رہی ہے کیا؟“ انہوں نے ایک دم ہی پوچھا۔

”نہیں تو۔“ آپ کو کس نے کہا؟“ اس نے چونک کر خاور کا تنبیہ چہرہ دیکھا۔

”آپ! مجھے ایسا لگا۔ اللہ جانے کیوں۔“ وہ تھوڑا سا لہجے۔

”کیسا لگا تھا۔؟“ وہ ساری ناراضی بھول بھال کر ان کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ خاور علی اس کے اس انداز پر مسکرا دیے۔ وہ اب دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ عائشہ کو کس طرح ملانا ہے کہ اس کو برا بھی نہ لگے۔

\* \* \*

”لاما! ہائیٹ ویسکی سے آپ نے اس بندے کی“ میرے کندھوں تک بھی پھینک آئے گا۔“ ماہم نے بے زاری سے ہاتھ میں پکڑی تصویر صوفے پر اچھالی اور زبردستی وی کی طرف متوجہ ہوئی جہاں ٹمن اپنی کارخانہ نشہ کر رہا تھا۔

”برنس کی دنیا میں ایک ٹام ہے اس کامی اے کیا ہوا ہے۔ کوڑوں کی جائیداد کا خداداد ارٹ ہے۔“ مسز منصور نے اسے اس پروڈنل کی خصوصیات بتائیں جو ان کی نظریں میں خاصی پرکشش تھیں۔

”لاما! کیا فائدہ۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چہرے پر دنیا جہاں کی بے زاری اور کوفت تھی۔ ”جب ایک بندہ آپ کے ساتھ چلا ہوا ہی اچھا نہیں لگ رہا تو ایسی کوڑوں کی جائیداد کو چاہتا ہے کیا۔“ اسے غصہ ہی آیا۔

”پھر سرگیلانی کے بیٹے میں کیا برائی تھی؟ اچھا خاصا

چھ فٹ کا بندہ تھا۔“ ان کو اس کا ایک اور مستزکیا پروڈنل میں وقت پریا دیا۔

”رنگ دیکھا تھا آپ نے سرگیلانی کے بیٹے کا۔“ ماہم سلگ کر بولی۔ ”بلیک پینٹ کوٹ میں ہاتھی نہیں چل رہا تھا کہ کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور کہاں ختم۔“ اس کے کھل کر فانی ڈرائے پر مسز منصور نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”ماہم! کچھ خدا کا خوف کرو! اچھی خاصی گندی رنگت تھی اس کی، جیسے ستر فیصد ہمارے ملک کے مردوں کی ہوتی ہے۔“

”رہنے دیں لاما! آپ کو تو ہر راہ چلنا لڑکا پسند آ جاتا ہے اپنی بیٹیوں کے لیے۔“ ماہم نے طنزیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”پھر اس کا ایک ہی حل ہے میرے پاس۔“ وہ تپ کر کھڑی ہو گئی۔

”وہ کیا ہے؟“ بی وی اسکرین پر نظرس جمائے بیٹھی ماہم نے بے زاری سے لاما کو دیکھا جس پر آج کل ماہم کی شاہی کردار کا بھوت سوار تھا۔

”تم اللہ سے کہہ کر خاص طور پر ہی اپنے لیے کوئی لڑکا تیار کرو! ورنہ جیسی تمہاری ڈیمانڈ ہے۔ کوئی نہیں کئے والا۔“ لاما شعلہ برساتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں اور ماہم لاپرواہی سے اپنے کندھے جھٹک کر دوبارہ بی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”یہ ٹمن اپنی بھی اپنے شو میں کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ ہی اور ہو جاتی ہیں۔“ اس نے کوفت سے چہین بدلا جہاں کوئی فیشن شو آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے کی کوفت بھلائے دلچسپی سے بی وی دیکھنے لگی تھی۔ جب سیل فون کی متر غم کی ہنسی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ سامنے ”علی کانگ“ کے الفاظ بڑھ کر اسے اپنی ساری ناراضی یاد آئی۔ اس نے بہت غصے سے اس کی کال کاٹ دی اور صوفے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

اس کا سارا ذہنی سکون ایک لمحے میں عارت ہو گیا۔

\* \* \*

”بی! داغ ٹھیک ہے شیر کا۔ آخر وہ کس منہ سے

آپ سے تائبہ کے رشتے کے لیے کہہ رہا ہے۔ ”ثانکہ کا دل بھک کر کے اڑا۔ جب اس نے اپنی والدہ کے منہ سے ”مجھ سے محبت نہ تھی۔“

”وہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا!“ مسز زہیر نے دانستہ لگا ہنس چراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کی ضد ہے کہ میں اس کا رشتہ مانگنے جاؤں ورنہ وہ واپس کویت چلا جائے گا۔“ انہوں نے اپنی مجبوری بیان کی تو ثانکہ کو ٹھیک ٹھاک قسم کاغصہ آگیا۔

”جانا ہے تو ہزار دفعہ جائے ہمیں بیک میل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پہلے بھی وہ ہماری مرضی کے بغیر ہی گیا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا اپنی سٹیوں کی شاہیوں پر لگا دیا۔“ ثانکہ نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ میز پر پٹکا۔ ”خود ہی چائے چھلک کر سفید میز پوش پر داغ ڈال گئی۔“

”پھر مجھے بتاؤ نہیں کیا کروں۔“ ان کے بے بس انداز پر ثانکہ کا سارا غصہ بھک کر کے اڑا۔ وہ تھوڑا نرم انداز میں بولی۔

”دیکھیں ابی! ثانکہ کے گھر والوں سے ہمارے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ وہ ہمارے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ آپ خود سوچیں کہ وہ اپنی اچھی خاصی بیٹی کا رشتہ کیوں شیر کو دیں گے۔ جس کے بارے میں سب کو بتا ہے کہ وہ ایک شادی کر چکا ہے۔“

”لیکن بیٹا! بات کرنے میں تو کوئی ہرج نہیں۔ شیر مطمئن ہو جائے گا۔“ امی کی بات پر ایک عجیب مسکراہٹ ثانکہ کے لبوں پر ابھری۔

”ہو نہ! اپنے بیٹے کو مطمئن کرنے کے لیے آپ دوسروں کا سکون غارت کریں گی؟“ وہ خود کو بولنے سے روک نہ پائی۔

”کیا کروں! اپنے بیٹے کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“ وہ رنجیدگی سے بولیں۔

”تائبہ کے گھر کے علاوہ کوئی ایسا گھر نہیں جو مشکل وقت میں ہمارے کام آسکے۔ ایسا نہ ہو بیٹے کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ اپنے تعلقات خراب کر بیٹھیں۔“ ثانکہ نے ان کو تصویر کا دوسرا رخ دکھایا۔

جب کہ اس سے زیادہ سنا شیر کی برداشت سے ہوا تھا۔ وہ جو سمجھ رہی تھی کہ وہ کبھی فیملی میں سہا سہا پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب اس کے سبز رنگ آن کھڑا ہوا۔ مسز زہیر کا رنگ فق ہوا۔

”اپنی! آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ آپ کیوں ہاتھ منہ دھو کر میرے پیچھے بڑگئی ہیں؟“ وہ طنز لہجے میں بولتا ہوا اس کے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا۔

”اس لیے کیونکہ تم ہمارا ذہنی سکون برباد کرنے کی باتیں کر رہے ہو۔“ ثانکہ نے اس کے رعب میں آئے بغیر دوبارہ جواب دیا۔

”میں نے کون سا آپ کا سکون برباد کیا ہے؟“ وہ سلک کر بولا۔

”کبھی تمہیں لگتا ہے کہ ہم نے اس گھر پر بیر لگا کر ساری جمع پونجی داؤ پر لگا دی ہے اور کبھی تمہیں یہ خوش فہمی ہونے لگتی ہے کہ تائبہ کے لیے تمہارا پروپونل اب بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔“ ثانکہ نے طنز لہجے میں لگا ہوا اس کے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھا جس کی خود غرضی پر اب اسے کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔

”ہاں تو اس میں غلط کیا ہے۔“ شیر کی غلط فہمی عروج پر تھی۔

”تو ٹھیک ہے مجھ کو دیکھ لو اپنا پروپونل منہ کی کھاؤ گے۔“ ثانکہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

”یہ آپ کی بھول ہے۔“ وہ استہزائیہ انداز سے ہنسا۔ ”تائبہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔“

”صحیح کرو! وہ تم سے محبت کرتی تھی۔“ ثانکہ نے لفظ ”تھی“ پر زور دیتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مسز زہیر نے سر اسیمہ نگاہوں سے اپنے بچوں کو دیکھا۔ جو ایک دوسرے کو کچھ دیر پہلے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔



”تھینکس گاڈ بھائی! آپ کے چرے پر بھی مجھے مسکراہٹ نظر آئی۔“ عاتشہ نے ناشتے کی میز پر بلا دیا۔ مسکراتے ہوئے عاتشہ کو دیکھ کر چھیڑا۔ جب کہ ماما نے بھی

چہرے کر اپنے دونوں بچوں کے ترو تانہ چہرے دیکھے اور دل ہی دل میں دونوں پر آیت الکرسی پڑھ کر بھونکی۔

”میں نے سوچا آج کل تم ہر وقت مسکراہٹوں کے بھلے بھلے رہتی ہو تو میں کیوں پیچھے رہوں۔“ موصد نے ملا کر اس پر جیم لگاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

”ہوں۔“ مجھے تو آج کل زعفران کے کھیت نظر آ رہے ہیں۔ آپ کی طرف کیا مازا ہے۔“ اس نے اور بچوں کو گلاس بولوں سے لگایا۔

”بس یہ جھوٹے میری طرف بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔“ ایک مضمونی مسکراہٹ موصد کے چہرے پر ابھری۔

”یہ تم دونوں آپس میں کون سے کوڈز ڈنٹیں باتیں کر رہے ہو۔“ ماما نے جھنجھلا کر دونوں کو دیکھا۔

”یہ تو آپ بھائی سے ہی پوچھیں۔“ عاتشہ مسکرائی تو موصد گور کر رہ گیا۔

”میں سوچ رہا ہوں ماما! عاتشہ کی شادی راوی کا کچھ کریں۔“ لڑکیوں کی عمر لگنے کا پتا تھوڑی چلتا ہے۔ موصد نے موقع بری حساب برابر کیا۔ عاتشہ اس کی شرارت سمجھ کر مسکرائی۔

”میں تو خود اس سلسلے میں خاصی اپ سیٹ ہوں۔“ کل ہی مجھے مسز کامران نے ایک پروپونل کے بارے میں بتایا ہے۔“ ماما کی بات پر عاتشہ چو گئی۔

”وہ بتا رہی تھیں کہ لڑکے کی والدہ نے عاتشہ کو کسی فنکشن میں دیکھا ہے اور پسند بھی کر لیا ہے۔“ ماما کے پرشوش انداز پر عاتشہ کا رنگ اڑا۔

”جیسا! کیا کرتا ہے وہ۔؟“ موصد نے فوراً دلچسپی ظاہر کی۔

”آری میں مجبور ہے۔“ ماما کے جواب پر موصد کے چہرے پر ایک تاریک ساسیہ دوڑا۔ وہ آج بھی آری کا ہم کن کر جذباتی ہو جاتا تھا۔

”پھر تو آپ فوراً بلا لیں انہیں۔“ موصد کی دلچسپی ماما کے لیے مومل سپورٹ کا باعث بنی۔

”کون سی فون کرنی ہوں انہیں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے ماما! مجھے آری لا کف پسند

نہیں۔“ عاتشہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ شدید تناؤ کا شکار لگ رہا تھا۔ اس کی بات پر ماما نے ناگواری سے اسے دیکھا اور موصد کو نظروں ہی نظروں میں کوئی اشارہ کیا۔

”کیا بات ہے عاتشہ! ایسے ٹینس کیوں ہو رہی ہو۔“ موصد کی بات پر عاتشہ نے اسے شکوہ کنکلی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ مجھے آپ سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا آؤٹا نوٹس پلیٹ میں رکھا اور ڈائننگ روم سے ہی نکل گئی۔

”دیکھا۔“ دیکھا تم نے اس لڑکی نے مجھے کتنا رنج کر رکھا ہے۔“ ماما کو ایک دم ہی غصہ آیا۔

”ڈونٹ بی بی! ماما! میں بات کروں گا عاتشہ سے۔“ موصد نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی لیکن وہ بجائے مطمئن ہونے کے بھڑک اٹھیں۔

”دل بگ خراب ہو گیا ہے اس کا اور کچھ نہیں۔ تم صاف صاف پوچھو اس سے! اگر کوئی پسند ہے تو بتائے ورنہ اس دفعہ میں اس کی کچھ نہیں سننے والی۔“ ماما نے بھی دو ٹوک و صمکی دی اور کمرے سے نکل گئیں۔

موصد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سیل فون کی جھنپی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دوسری جانب ثانکہ تھی۔

”کیا ہوا موصد؟“ وہ اس کا لہجہ سنتے ہی پریشان ہوئی۔

”کچھ نہیں یا ر! ماما اور عاتشہ کے درمیان سینڈ وچ بنا ہوا ہوں۔“ اس نے اپنی انجھن اس کے ساتھ شیر کی۔

”کیا مطلب ہے؟“

”بھئی عاتشہ کے لیے کوئی پروپونل آیا ہے مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور ماما سخت غصے میں ہیں۔“ اس نے مختصراً بتایا۔

”جیسا! عاتشہ تو مجھے بہت سادہ اور دوستانہ مزاج کی لگی ہے۔“ ثانکہ کی بات پر وہ بری طرح چوٹا۔

”تمہیں کیسے پتا؟“

”اس نے مجھے کال کی تھی۔“ ثانکہ کی بات پر

”کب؟“ وہ بے تابی سے بولا۔

”کافی دن ہو گئے اب تو۔“ ثنائیہ کی بات پر اسے غصہ آیا۔ ”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

”سوری ذہن ہی سے نکل گیا تھا اور پھر میرا خیال تھا کہ اس نے آپ سے ہی خبر لیا ہوگا۔ اس لیے آپ کے علم میں ہوگا۔“ ثنائیہ نے گھبرا کر اسے وضاحت دی۔

”یہ کوئی اتنی عام سی بات تو نہیں تھی کہ تمہارے ذہن سے نکل جائے۔“ دوسری جانب مودع کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک بات آئی۔

”کیسا تم عاشق کے کہنے پر تو مجھ سے ملنے نہیں آئی تھیں؟“ اس کے لہجے میں چھپی بدگمانی ثنائیہ کا دل خراب کر گئی۔

”آپ کی بدگمانی کبھی کبھی میرے دل کو اتنے برے طریقے سے منکسیتی ہے کہ میں اسے لفظوں میں بیان نہیں سکتی۔“ ثنائیہ کا رخ بھر امداد مودع کو بے چین کر گیا۔ جب کہ دوسری جانب وہ ناراض ہو کر فون بند کر چکی تھی۔



”آپ مجھ سے ناراض ہیں نا؟“ وہ اس دن اچانک ہی ماہم کے کلینک میں چلا آیا۔ علی کو اپنے سامنے دیکھ کر بھی ماہم بدستور اپنے کام میں مگن رہی جو اس کی ناراضی کا بھرپور اظہار تھا۔ اس نے بس ایک نگاہ اٹھا کر ہی علی کو دیکھا تھا۔

”بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گی آپ؟“ علی نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر تھوڑا سا جھک کر اس ادا سے ماہم کی طرف دیکھا کہ اس کے لیے اپنے دل کی اصل پتھل کیفیت کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ علی کے لبوں پر ایک مہم سہی مسکراہٹ ابھری۔

”آئی ایم سوری! میں پچھلے دنوں اپنے اسپتال اور

پرائیویٹ کلینک میں بہت بڑی ربا اور آپ سے ملاؤں گوں جان سکتا ہے کہ ڈاکٹر زکی لائف کی بڑی برائی ہے۔“ علی کی بات پر ماہم نے جھٹکے سے سر اٹھا کر سامنے بیٹھے علی کو غور سے دیکھا۔

”آپ ڈاکٹر ہیں؟“ اس کے چہرے کے تاثرات بڑی سرعت سے تبدیل ہوئے۔ ”آپ نے کبھی ہی نہیں کہ آپ ڈاکٹر ہیں؟“ ماہم کی ساری ناراضی بھٹک کر کے اڑ گئی۔ وہ اب توصیفی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اسپیشلائزیشن کس میں ہے آپ کی؟“ ”اسپیشلسر سرجری میں ہو سکے۔“ علی نے بھی آج ماہم کو متاثر کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔

”اور کتنے ہسپتال ہیں آپ۔“ ”صرف دو بھائی ہیں۔ فادر کی ذمہ دہی ہے۔ صرف ماہم ہیں۔“ علی کے بتائے ہوئے سارے ہی کو لائف متاثر کن تھے۔

”کچھ نہیں۔ بس آج کل ماہم میری شادی کا بھوت سوار ہے۔ اس سلسلے میں چھانچ رہی ہوں کہ ماہم کی خود پسندی کو باہر نکلنے کے لیے کسی خاص موقع کی ضرورت نہیں ہوئی تھی اور آج تو اس کے ہاتھ میں اچھا خاصا موقع تھا۔

”ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ امیدواران کی لسٹ خاصی لمبی ہے۔“ علی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”جی ہاں۔“ ماہم نے اپنی راج ہنس جیسی خوب صورت گردن اٹھا کر دیکھا۔ ”مہم تو شارٹ لسٹ ہوئی ہے۔“ وہ بڑی ادا سے مسکرائی۔

”اف! میرے جیسے غریب لوگ تو مارے جائیں گے پھر۔“ علی کے شرارتی انداز پر وہ کھٹکھٹا کر ہنسی۔

”غریبوں پر ہم خصوصی نگاہ کرم کرتے ہیں۔“ ماہم کے فو معنی انداز پر علی نے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھوں میں ہاتھ پھیرا۔

”اب کی دوست کیا ایجنڈا ہو گئی؟“ علی کے ہاتھ موضوع تبدیل کرنے پر وہ جی بھر کبڑہ ہوئی۔ ”جی ہنسنے میں تو یہی آرہا ہے۔“ اس نے گول مول جواب دیا۔

”اسی راس کے ساتھ؟“ ”جی جی! وہی جو میرا ہسپتال تھا۔“ ماہم نے بڑی متانی سے جھوٹ بولا۔ علی نے اب اس کے چہرے کو غور دیکھا۔

”کی کوئی محبت و جوت کا چکر تھا۔“ ”جی لگتا تو بظاہر یہی ہے۔“ ماہم نے اپنے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”چلیں! اچھی بات ہے۔ اللہ ان دونوں کو خوش رکھے۔“ علی کی بات پر ماہم کے لبوں پر بڑی پرسکون سی مسکراہٹ ہوئی۔ وہ اب بڑی مطمئن سی نظر آ رہی تھی۔

”آپ کا فادر رنگ پرور گرام کہاں تک پہنچا؟“ علی کی بات پر ماہم نے ایک دفعہ پھر کوفت بھرے انداز سے ہلکا ہلکا بولا۔

”میں نے شمن آپلی سے بات کی تھی۔ ان کا آج کل بڑا بڑا شینڈل ہے۔ ٹھوڑی سی فراغت مل جائے تو ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔“ اس نے بڑی عمدگی سے خود کو سنبھالتے ہوئے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اس دفعہ علی کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ بڑی عجیب سی تھی۔



”مجھے بہت دکھ! افسوس اور حیرت ہو رہی ہے۔“ ثنائیہ نے ”ناہیہ نے بہت افسردگی سے ثنائیہ کو دیکھا۔ ”ناہیہ کے ساتھ رشتہ بن پر بے معنی سی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

”ناہیہ! ممکن بھی کر سکتی ہو کہ میں ایسا کچھ کر سکتی ہوں۔“ ثنائیہ کے رنجیدہ لہجے پر ناہیہ ایک لمحے میں ”جی! ایم سوری یار!“ وہ اب اس کے ساتھ ہی

باد پر پی خانے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ”میں بھی حیران تھی کہ تمہیں تو ہر بات کا پتا تھا۔ پھر تم نے شیر کے پروڈنل کے لیے خالد جان کو کیوں بھیجا۔“ ”میں نے اس بات کے خلاف اسٹینڈ لیا اور اسی وجہ سے میری شیر کے ساتھ پول چال بند ہے۔“

”ثنائیہ بڑے دھم سے انداز سے گویا ہوئی۔ ”شیر کی اتنی جرات کیسے ہوئی۔“ بیٹھے تو یہی سمجھ میں نہیں آرہا۔ ”ناہیہ! کافغہ کسی طور بھی کم نہیں ہوا رہا تھا۔“

”موصوف کو لگتا ہے کہ میرے دل میں ابھی بھی اس کے لیے کوئی سوف کارنر ہے۔“ ناہیہ بے یقین ہوئی۔

”اس کو لگتا نہیں! بلکہ بھرپور قسم کا یقین ہے۔“ ثنائیہ مسکراتی تو ناہیہ کی تیوری کے بل کمرے ہو گئے۔

”دفع کو اسے کب یہ بتاؤ کہ تمہارے ہیرو صاحب کا کیا حال ہے؟ کب بھیجیں گے وہ اپنے گھر والوں کو۔“ ناہیہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے موضوع تبدیل کیا۔ اس کی بات پر ثنائیہ کے لبوں پر ایک نئی مسکراہٹ ابھری۔

”یہاں تک آنے سے پہلے ہی بات بگڑ جاتی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں نمی اٹھائی۔

”مائی گاڈ! کیا پھر لڑائی ہو گئی؟“ ناہیہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”میں کیا کروں نہ چاہتے ہوئے بھی کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے۔“ ثنائیہ کا دل بھر آیا۔

”آپ خبردار! ایک بھی آنسو بہایا تو۔“ میں ٹھیک کرتی ہوں تمہارے ہیرو کو۔“ ناہیہ کو ایک دم ہی غصہ آیا۔ ”دیسے یار ہے تو وہ روڈ سائندہ یاد نہیں اس دن ہم لوگ آئے تو نہ تو اس نے اٹھ کر استقبال کیا اور نہ ہی دروازے تک چھوڑنے آیا۔ کم از کم اتنی اخلاقیات تو سکھا دو اس کو۔“

”ناہیہ کو فوراً اس دن والی ملاقات یاد آئی۔ اس کی بات پر ثنائیہ نے بے ساختہ نظریں چرا لیں۔ ”جی! ایم سوری ناہیہ! میں نے تمہیں ایک بات



نہیں بتائی۔ ”ثانکہ آہستہ سے بولی۔

”تم نے میرا وہ ٹائل پر دھاکا دیا جس میں سکندر شاہ ایک لیکسیکونڈ میں معذور ہو جاتا ہے۔“ اس کی بات پر ثانیہ کے چہرے پر ابھرنے کے تاثرات نمودار ہوئے۔

”ہاں یار! وہ بھی کوئی بھولنے والا ٹائل ہے۔“ اس نے فوراً ہی کہا۔

”بس سمجھو کہ میرے ساتھ بھی حقیقت میں ایسا ہی ہوا ہے۔“

ثانیہ نے سوالیہ نگاہوں سے اپنی دوست کی طرف دیکھا۔

”میری حقیقی زندگی کا سکندر شاہ بھی سولت آپریشن میں اپنی ٹائلیں کھو چکا ہے۔“ ثانکہ کی بات پر ثانیہ کو یوں لگا جیسے باورچی خانے کی چھت اس کے سر پر آگن گری ہو۔

”واٹ۔“ وہ بولی نہیں بلکہ باقاعدہ چیخی۔ اس کی آنکھوں میں فطری سی برہمی تھی۔ ”وہ موجد رحیم معذور ہے اور تم ایک معذور شخص کے پیچھے پاگل ہو ثانکہ؟“ وہ ایسے ثانکہ کو دیکھ رہی تھی جیسے اس کے سامنے دنیا کا آنکھوں عجوبہ بیٹھا ہو۔

”موجد رحیم معذور ہے لیکن میری محبت تو معذور نہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”شیر اور خالہ جان کیا اس کے پروپوزل کے لیے مان جائیں گے۔“ اس نے فوراً ہی اپنا خدشہ بیان کیا۔

”ان کو ماننا ہو گا ثانیہ! یہ میری زندگی سے اور میں بہتر طور پر جانتی ہوں کہ مجھے اسے کیسے بسر کرنا ہے۔“ ثانکہ نے ہنوز سابقہ لمحے میں کہا۔

”تم بہت عجیب ہو یار! ثانیہ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اتنا ہی بولی۔

”میں نہیں بلکہ محبت ہی ایک عجیب جذبہ ہے کہ اس کا سودا جس سر میں سا جلے وہ اپنے نفع نقصان اور زمانے کی مصلحتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔“ ثانکہ اتنے دھیمے سے بولی کہ ثانیہ نے بمشکل ہی اس کی

بات کو سنا۔

”بیٹا! شیر سے کہہ کر بازار سے کچھ چیزیں منگواؤ تمہاری مہمانی جان کا فون آیا ہے۔ وہ آرہی ہیں۔“ اس کی امی نے بچن میں جھانک ان دونوں سے چونک کر اسی کا خوشی سے جھگڑا چہرہ دکھا۔ وہ غامض پر خوش لگ رہی تھیں۔

”خیریت تو ہے امی!“ اسے حیرت ہوئی۔ کیونکہ ابھی دو دن پہلے تو مہمانی جان ان کے گھر سے ہو کر گئی تھیں۔

”مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے رشتے کے لیے آرہی ہیں۔“ امی جان کی بات پر دونوں سیلیول کو کرنٹ مارا لگا۔

”میرے رشتے کے لیے۔“ آپ سے کس نے کہا۔“ ثانکہ نے غلت بھرے انداز سے انہیں دیکھا۔

”بھئی! ڈائریکٹ تو نہیں کہا لیکن یہ کہہ رہی تھیں کہ آپ سے ایک خاص چیز مانگنے آرہی ہوں اپنے بیٹے رامس کے لیے۔“ انہوں نے اپنی طرف سے دھماکا ہی تو کیا۔

”میرا رشتہ رامس کے لیے۔“ ثانکہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے ثانیہ کو کسی گہری کھائی میں دھکا دیا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا وہ خوف زدہ نگاہوں سے ثانکہ اور اس کی مائی کو دیکھنے لگی۔

\*\*\*

”عائشہ! تم نے ثانکہ کا نمبر کہاں سے لیا؟“ وہ دو ڈیو لائن میں کسی ٹاک شو کو دیکھنے میں مگن تھی۔ موجد کے سنجیدہ سے لہجے پر حیران ہوئی۔

”کون ثانکہ؟“ عائشہ نے بدھیمانی میں پوچھا۔

”گلاب یہ بھی مجھے ہی بتانا ہو گا۔“ موجد نے بے چارگی سے چھلکتی چھلکی پر وہ مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہوئی جو چہرے کے تاثرات سے کچھ خفا خفا سا لگا رہا تھا۔

”جھال۔ اس کا نام ثانکہ ہے۔ میں نے پوچھا ہی

”عائشہ کی سلاہی پر وہ بری طرح جھنجھلایا۔“

”تم نے اس کا نمبر کہاں سے لیا۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”آپ کے فون کے بل سے۔“ عائشہ تھوڑا سا شرمندہ ہوئی۔

”عائشہ کو اس کے چہرے کی سنجیدگی سے شرمندہ ہوئی۔“

”کیا ہو گیا ہے بھائی آپ کو۔ کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں اور میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے اس سے جو آپ نے خفا دے رہے ہیں۔“ عائشہ کی گلہ آمیز نگاہوں سے موجد کو پیشہ انجھن ہوتی تھی۔

”یہی، تم نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی ناراضی ختم کر کے مجھ سے ملے آئے؟“ اس کے چہرے پر نظریں ڈالنے موجد نے بڑا عجیب سا سوال کیا۔

”میرا داغ خراب ہے جو میں ایسی کوئی بات کروں گی۔“ عائشہ کو ایک دم غصہ آگیا۔

”خیر تم نے اس سے کیا بات کی؟“ موجد تھوڑا سا اچھلا کر بولی۔

”میں تو اس سے فیملی بیک گراؤنڈ اور اس کی مائی کی بیماری کی تفصیلات ہی پوچھتی رہی اور تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ مجھے تو اتنا بھی دھیان نہیں رہا کہ اس کا نام پوچھ سکوں۔“ عائشہ نے خفا خفا سے لہجے میں سلاہی فیصل بتائی۔

”اوسے۔“ وہ ایک دم شرمندہ ہوا تو عائشہ چونک گئی۔

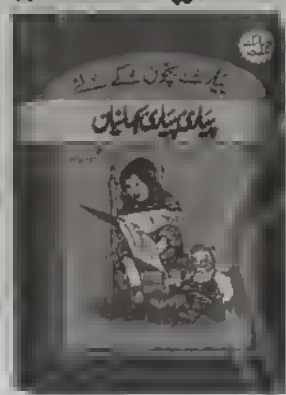
”کچھ نہیں میں سمجھا کہ شاید تم نے اس سے کہا تھا کہ مجھ سے ملنے آجائے۔“ وہ اب خفت زدہ انداز میں اس کی بات بتا کر لگا۔

”عجب کیا کر دیا ہے آپ نے۔“ عائشہ ہلکا سا جھنجھلائی۔

”میں اسے خفا کرنے کے علاوہ کچھ بھی کیا سکتا تھا۔“ عائشہ نے اس کی مائی کی مزاح کیوں ہو گیا ہوں۔“ وہ موجد پر کھٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے بہت آپ پر غصہ آ رہا ہو۔ عائشہ نے ایک تاسف

پیارے بچوں کے لئے

# پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

## محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 ماسک مفت

قیمت 300/- روپے  
ڈاک خرچ 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361

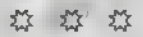
بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

”بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے بھائی! عائشہ اچانک کھڑی ہوئی۔ ”آپ لوگوں نے سوائے لڑنے جھگڑنے کے کچھ نہیں کرنا۔ میں مانا کو لے کر ان کے گھر جاتی ہوں۔ پھر ایک ہی گھر میں ایک ہی روم میں آنے سامنے بیٹھ کر جتنا مرضی لڑتے رہیں۔“ اس کے ہلکے پھلکے انداز پر موحہ زبردستی مسکرایا۔

”وہ لوگ ایک ادھورے شخص کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تھام دیں گے کیا؟“ موحہ کا دل اندیشوں سے لبرز تھا۔

”مگر آپ کا اور شائلہ کا ساتھ اللہ سات آسمانوں کے اوپر لکھ چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو ختم نہیں کر سکتی۔“ عائشہ کے پر اعتماد انداز نے موحہ کو کچھ مطمئن کیا۔

”پھر کب جاؤ گے تم لوگ۔“ اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا اگلے ہی لمحے وہ لگا جھینپنا اور عائشہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی چلی گئی۔



وہ ایک جس بھری سی شام تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہوا کا دم گھٹ کر رہ گیا ہو۔ فضاؤں میں عجیب سی اداسی تھی۔ سیکینے نے کھڑکی کھولی تو اسی لمحے بجلی کے ایک تار پر کرنٹ لگنے سے ایک معصوم فاختہ زمین پر گری اور اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ سیکینہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹی میں پکڑ کر مسل دیا ہو۔ اسی لمحے ڈاکٹر خاور اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

”کیا ہوا سیکینہ۔ طبیعت ٹھیک ہے۔“ انہوں نے اس کا سینے سے شرابور چہرہ دیکھا۔

”ڈاکٹر صاحب! وہ فاختہ مر گئی۔“ اس نے ہاتھ کی انگلی سے باہر کی جانب اشارہ کیا۔ ڈاکٹر خاور نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

”اوہ سو سرف۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر ہمدردی سے اس کے کندھے کو سہلایا۔ سیکینہ کی بے ربط

دھڑکنوں کو تھوڑا سا سکون میسر آیا۔

”نروس کیوں ہو سیکینہ! اللہ بہت مہربان ہے۔“ ڈاکٹر خاور آج خصوصی طور پر وقت نکال کر اس کے پاس آئے تھے تاکہ اس کا حوصلہ برسا سکیں۔ سات بجے اسے آپریشن ٹیبل پر لیٹا جاتا تھا۔ ”پتا نہیں۔“ اس کی اداس آنکھوں میں عجیب سی وحشت ابھری۔

انہوں نے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ سیکینہ کے دل کی دھڑکن ایک لمحے گورک سی گئی۔ ”مجھے معلوم ہے کہ یہ جسمانی بیماری میرا کچھ نہیں بگاڑے گی لیکن میری بد قسمتی کے جانے میں بھی میری محبت کسی مرنے کی طرح زیادہ دیر سانس نہیں لے سکے گی۔ جس کے موسم بھلا کب کسی کو اس آتے ہیں۔“ وہ پھر پھلکے سے انداز سے مسکرائی۔ ڈاکٹر خاور کو پہلی دفعہ اس کی آنکھوں سے پھٹکتے جڑوں سے خوف آیا۔

”پتا ہے ڈاکٹر خاور! مجھے آپ کی مسیحا سے کوئی گلہ نہیں۔ آپ نے میرا اس وقت ساتھ دیا۔ جب ساری دنیا مجھے دھتکار چکی تھی۔ آپ نے اس وقت مجھے عزت و احترام بخشا۔ جب سب کی آنکھوں میں میرے لیے تمسخر چھلکتا تھا۔ آپ نے اس وقت میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلائے۔ جب میری زندگی میں ہر طرف خزاں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ میں ٹھیک ہوتی ہوں یا نہیں مجھے ساری زندگی اس کوہان کے ساتھ رہنا ہو گا یا نہیں؟ میرا دل ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ مجھے بس اس چیز پر ہے کہ آپ نے مجھے بھی مایوسی کے سمندر میں نہ گھلانے کی کوشش نہیں کی۔ دوسرے مسیحاؤں کی طرح مجھے کبھی نہیں کہا کہ۔ سیکینہ تمہارا مرض لاعلاج ہے۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں اتار سکیں گی۔“ سیکینہ کی آنکھوں میں آنسو ایک لڑی کی صورت میں بہہ نکلا۔

”دیکھو سیکینہ! میری پروفیشنل زندگی کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر خاور کے لیے ہر مریض وہی ہے

لی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ میں اپنی ملازمت کو ہمیشہ غفلت سمجھ کر ادا کرتا ہوں۔ مجھے اپنے پروفیشن سے محبت نہیں، عشق ہے۔ میں آخری لمحے تک جدوجہد کرنے کا قائل ہوں۔ نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے لیکن آپ میرے لیے ہمیشہ اہم رہی ہیں۔“ اس نے انہیں عائشہ سے ملنا چاہتی ہوں دوبارہ۔“ اس نے کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بالکل عجیب سی فرمائش کی۔ ڈاکٹر خاور حیران ہوئے۔

”کیوں۔“ انہوں نے تجسس سے اسے دیکھا۔ ”میں ان کے خوب صورت چہرے کو دوبارہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ جسے آپ اس دن بہت پیار سے دیکھ رہے تھے۔“ سیکینہ کے منہ سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل ڈاکٹر خاور کو لگا کہ جیسے کسی نے انہیں اچانک زخمیں بردھ کاہے دیا ہو۔

”کیا یہ چہرہ تمہیں اچھا نہیں لگا سیکینہ!“ انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”ہاں، کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب! کہ جو چیز آپ کو اچھی لگے، وہ مجھے بری لگے۔“ سیکینہ نے نظراٹھا کر ڈاکٹر خاور کی طرف دیکھا۔ اس ایک نظر میں کچھ تھا کہ ڈاکٹر خاور کے دل کی دھڑکنیں پہلی دفعہ بے ربط ہو گئیں۔ انہیں لگا کہ اگر کچھ لمحے بھی یہاں ٹھہرے تو کوئی انہونی ہو جائے گی۔ وہ مضطرب ہو کر اٹھے اور سیکینہ کی طرف دیکھے بغیر بہت تیزی سے باہر نکل گئے۔ ”تم اپنے آپ کو مجھتی کیا ہو۔“ ڈاکٹر خاور کے کمرے سے نکلنے ہی ڈاکٹر زویا بڑی تیزی سے اندر داخل ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے نکل رہے تھے۔

”تم نے بھی آئینے میں اپنی بد صورت شکل دیکھی ہے۔ تمہیں پتا ہے، تمہیں دیکھ کر کراہیت کا احساس ہوتا ہے۔ تم نے بھی اپنی کمر پر اونٹ کی طرح کوہان لٹکا ہے۔ تم اس سے ساری زندگی چھٹکارا نہیں کر سکتی۔“ ڈاکٹر زویا ایک قدم اور آگے بڑھ کر بولیں۔ سیکینہ نے خوف زدہ نگاہوں سے ڈاکٹر زویا کی طرف دیکھا۔

”تم جو ڈاکٹر خاور کو پانے کے لیے اویٹے ہوئے

خواب دیکھ رہی ہو۔ اپنی اوقات دیکھی ہے تم نے۔“ ڈاکٹر زویا کے زہر آلود لہجے نے سیکینہ کو کسی اندھے کنوئیں میں گرایا۔

”اللہ جانے کون سے تعویذ گھول کر ڈاکٹر خاور کو پیلا دیے ہیں جو وہ اپنی بصارت سے محروم ہو گئے ہیں اور انہیں تمہارا اتنا بڑا کب نظر نہیں آتا اور وہ پاٹلوں کی طرح تمہارے کمرے کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ساری توانائیاں تمہارے آپریشن کی کامیابی کے لیے خرچ ہو رہی ہیں۔“ ڈاکٹر زویا نے انگلی کے اشارے سے اس کو دھکی دی۔ ”میرے اور ان کے درمیان آنے کی کوشش کرو گی تو میں تمہارا جینا حرام کر دوں گی۔ یاد رکھنا! ڈاکٹر خاور جیسے شخص سے محبت کرنے سے پہلے ایک دفعہ غور سے آئینہ دیکھ لیتیں تو ساری زندگی سراسیمہ کران کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تمہیں مگر۔“ ڈاکٹر زویا کا زہر آلود لہجہ سیکینہ کے دماغ پر کسی ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ وہ کسی وحشت زدہ رہنی کی طرح آنکھیں کھولے ڈاکٹر زویا کی طرف دیکھ رہی تھی جو اپنی ساری بھراس نکال رہی تھیں۔

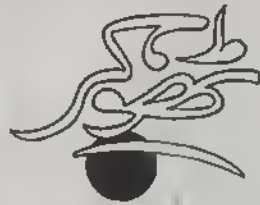
”ہر روز اس اسپتال میں بے شمار لوگ مرتے ہیں۔ لیکن تم اتنی بد صورت ہو کہ موت بھی تم سے گھبراتی ہے۔ تم جیسے لوگ ہمیشہ دوسروں کی قوت برداشت کا امتحان لے رہے ہیں۔“ ڈاکٹر زویا نے ایک نفرت انگیز نگاہ سیکینہ پر ڈالی اور جانے کے لیے مڑیں مگر سامنے کھڑی سسٹرنارہ کو دیکھ کر تھوڑا سا کڑواہٹیں اور اگلے ہی لمحے تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔

سسٹرنارہ نے سیکینہ کا سفید ہونا چہرہ دیکھا۔ وہ پر اسال نگاہوں سے اس دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے ڈاکٹر زویا باہر نکلی تھیں۔

سیکینہ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ اس نے سسٹرنارہ کے کمرے سے نکلنے ہی اپنا سر تکیے پر گرا لیا۔ اس کا دماغ باؤف ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر زویا کے زہریلے جیلے کمرے میں گونج رہے تھے۔ سیکینہ نے کھڑکی سے باہر گری فاختہ پر ایک نگاہ ڈالی اور اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبا چلا گیا۔

(آخری قسط آئندہ صفحہ 186)





میں زبیدہ خالہ کے گھر سے واپس آئی تو امی بازار  
گئی ہوئی تھیں۔ وہ کافی دیر بعد لوٹیں تو میرے چہرے پر  
آزردگی کی گہری چھایا پھرتی۔  
”کیا ہوا۔ مل آئیں سفینہ سے۔ آپا زبیدہ تو ٹھیک  
ہیں نا!“

وہ ٹھٹھک گئی تھیں اور میری مشکل یہ تھی کہ ان  
سے کچھ چھاننا پاتی۔

”سفینہ گوانہوں نے ایک بار پھر آپا تو تیش کے گھر  
چھوڑ دیا ہے۔ اپنے رشتے کی آس میں۔ خود گھرواری  
کے دھندے میں بھٹکانے میں لگا کر رہیں۔“

”ہتے۔ ہتے! کہاں آپا زبیدہ کی دھان پان جان اور  
کہاں گھرواری کے بکھیرے۔ میں تو کہوں ان کی عقل  
پر پتھر بڑ گئے ہیں۔ ایک بار ٹھوکر کھا کر بھی عقل نہ  
آئی۔ کیسی موہنی صورت ہے سفینہ کی۔ مگر آپا زبیدہ کی  
بلند پروازی اپنے ہاتھوں سے مقدر چھوڑے ہیں۔ پہلے  
کیا کم بھدا لڑی ہے۔ مگر۔“

انہوں نے افسوس سے سر ہلایا۔ خالہ زبیدہ اپنی  
ہٹ کی پکی تھیں۔ وہ شادی بیاہ کے معاملے میں اولاد کو  
کیش کروانے کی قائل تھیں۔ خصوصاً ”سفینہ کے  
لیے تو ان کا نظریہ تھا کہ بیٹی لاکھوں میں ایک ہے تو بیاہ  
کر اپنے بڑھیا گھرانے میں جائے معمولی رشتوں کو  
خاطر میں نہ لائیں۔ رشتے واری میں تو خیر مجبوری تھی  
ورنہ وہ متوسط طبقے کے لوگوں کو تو منہ لگانے کی بھی  
قائل نہ تھیں۔

”ن کا تو وہ معاملہ ہے کہ رتی جل مٹی مگر مل نہ

گئے۔ ہاتھ تلے کچھ نہیں اور مزاج آسمانوں کی سر  
کرتے ہیں۔ مرحوم میاں کی پیشین بر گھر چلتا ہے مگر  
باتیں بڑی بڑی۔ لڑکیوں کے معاملے میں مزاج اور  
معارفست ہی رکھنا چاہیے۔ بڑے بول نہیں بولنے  
چاہئیں۔“

”ہی! بڑے بول تو خیر کسی معاملے میں نہیں بولنے  
چاہئیں۔ یوں کہیں کہ بے چاری سفینہ پر ان کا بس چلتا  
ہے۔ لڑکے تو ہاتھ آئے نہیں۔“

”سچ کہتی ہو۔ لڑکے مزاجاً سرکش ہوتے ہیں یا آپا  
زبیدہ جیسی ماؤں کے سامنے بڑ جاتے ہیں۔ اور یہ وہ ہیں  
ان سے چار ہاتھ آگے۔ ان کی زبان کی تیزی سے اللہ  
بچائے کسی سے بقی بھی تو نہیں۔ خیر سے دو ہوویں  
ہیں مگر ان کی نکتہ چینی تیزی طراری۔ اللہ کی پناہ اور نہ  
کا ہے کہ اس بڑھاپے میں صفا بیوں دھلائیوں میں  
بلکان رہیں۔ چین سے چار پائی پر بیٹھ کر اپنا بڑھاپا  
کاٹتیں۔“

امی ٹھیک کہتی تھیں۔ انہیں صفائی کا خط تھا مگر  
ہوویں سے ان کی ایک پل نہ بقی۔ اب یہ کہاں ممکن  
تھا کہ چار لوگوں میں ہر چیز دو محل شخصي ٹھکانے پر نظر  
آئے۔ سو دونوں ہوویں سے خار کھائی تھیں۔ منٹوں  
میں انہیں بے عزت کر دیا کرتیں سفینہ کی طرح۔

دونوں بھائیوں کے لیے بھی آپا تو تیش نے بہتر ہے  
ہاتھ پیر مارے کہ کسی بڑے گھرانے میں ان کا رشتہ  
ہو جائے خیر ایسا ناممکن بھی نہ تھا۔ بیٹے قابل کماؤ  
تھے مگر بڑے بیٹے کو ان کی مال دار چھو بھی بولنے کا

ہی کچھ نہ آیا تھا۔  
دوسرے بیٹے کو اپنی کولیگ بھاگئی۔ وہ اس کے لیے  
ماں کے منہ کو آگیا۔ خالہ پھر ہار گئیں۔ پھر ان کے مزاج  
کے سامنے کوئی کہاں نکلتا تھا۔ بڑے بیٹے ہونے اپنی  
دنیا گھر کے اوپر پورشن میں بسا دیا۔ وہ پلٹ کر ساس کو نہ  
پوچھتی۔ وہ بھی بری تھی۔ جو۔ نہیں پوچھتی تھی وہ

ہمارے کر خالی خولی بیٹی خالہ زبیدہ کے سر تھوپ  
دی۔ لپٹے بیٹے کی باری آئی تو مگر گئیں کہ بیٹے کی پسند  
نہیں اور ہے۔  
خالہ زبیدہ تھلائی پھریں۔ وہ اس خیال میں تھیں  
کہ منہ لکھتی ہیں غلٹاؤنا خاک نہ بڑے گا۔ ان کی بیٹی  
آرام سے بڑے گھر کی ہوسن جائے گی۔ مگر ماں ہاتھ





لو کی ہئی بری۔ یہی کی پسند جو کی۔ دوسروں کو ان کی خامیوں سمیت سمجھنے کے لیے بڑا جگر درکار ہوتا ہے وہ خالہ زیدہ کے پاس کہاں تھا۔

”جہانے بھی دیکھتے۔ خالہ زیدہ جیسے لوگوں کا بدلنا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ جو سوچتی ہیں کھٹ سے کہہ بھی دیتی ہیں۔ اس بار بھی سفینہ کے لیے آپا توفیق کا سارا ہے کہ بری بہن پوش علاقے میں رہتی ہے۔

— باحیثیت لوگوں سے میل جول ہے کہیں کوئی بڑا ہی جائے گا۔ ماضی کے تجربے سے خاک نہ سبق سیکھا۔ اب بھی پرواز بلند ہے۔“ اسی توبہ تھلا کرنے لگیں۔ پھر چونکیں۔

”چوہے پر کچھ جل رہا ہے کیا؟“

”ہاں۔ ابھی قیصر دھوکے چڑھایا تھا۔“ مجھے اچانک یاد آیا۔

”ہائیں۔ وہ قیصر کیا آج پکانے کے لیے رکھا تھا؟ وہ دوپہر کی دال کیا ہوئی؟“

”ڈال کم تھی۔ تین افرو میں تو پوری ہونے سے رہی۔“

”اے تو پانی بڑھا کے پھر سے گھہار لگا دیتیں۔“ انہیں بیٹھے لگ گئے۔

”ذرا اس لڑکی کو پروا نہیں۔ پیسے درختوں پر اگتے ہیں کیا؟

باپ خسر لگا ہے یا جوان کڑل بھائی کما کما کے لارہے ہیں۔ ایک کمانی میں گھر کھسے چلائی ہوں کوئی مجھ سے پوچھے۔ ابھی تو تیرا من بھر کا بوجھ ڈھونڈ بھی بالی ہے۔“

ای بھی آخر خالہ زیدہ کی بہن تھیں۔ جن کی زبان کی تیزی سے زمانہ کانوں کو ہاتھ لگا تھا تھا۔ وہ دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔ میں کلن دبائے سستی رہی۔

\*\*\*

سفینہ کی زندگی برباد کرنے میں آپا توفیق کا بڑا ہاتھ تھا۔ خالہ زیدہ کی یہ بیٹی خیر سے مال دار آدمی سے بیانی تھی۔ میکے کو خوب بھرتی۔ کوئی پوچھنے کھنے والا تھا

میں۔ میں کاتھ کالو۔ بیوی کی خوبصورتی کا اس پر ہر معاملے میں ماں بہن کو ساتھ رکھتی۔ ہولڈنگ شاپنگ، تقریریں۔ خالہ زیدہ کی آنکھوں پر چلی تھی گئی۔ سفینہ کا جیون سا بھی ایسا ہی ہو۔ زندگی مڑے میں گزرے۔ وہ کی کی کن سفینہ کو بہن کے گھر چھوڑتیں۔ بیٹی چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ کوئی اونچا بڑ جڑ جائے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ آپا توفیق کے توسط سے سفینہ کا رشتہ ان کے بڑوں میں طے ہو گیا۔ خالہ زیدہ نے زمین و آسمان ایک کر دیے۔

”بڑا گھراٹا ہے۔ لاکھوں کے مالک ہیں۔ میری سفینہ عیش کرنے کی۔ سارا گھر جگر جگر چمک جائے گا۔ ان کی ایک بھی بسو سفینہ جیسی حسین صورت نہیں ہے۔ ڈیڑھ لاکھ مہرہنہ حویا ہے اور چھ تو لے سونا۔ پیسے والوں کے لیے کیا مشکل۔“

ایسے میں کوئی انہیں ان کی اوقات یاد دلانا تو چرک اٹھتیں۔

”اے لو۔ لاکھوں میں ایک حسین صورت مل رہی ہے یہ کیا کم ہے۔ ہم نے تو حیثیت دیکھی ہے۔ ورنہ وہ گرائیڈل کوئی سفینہ کے جوڑ کا ہے؟ ایسے ہی تھوڑی سفینہ کے رشتے کے لیے پاؤں پڑ گئے۔ ویسے خود مارا لانا ہے توفیق ہی کرے گی۔ اس کے پاس کوئی کم پیسہ ہے۔ میری بیٹی نے اس کی خدمت کم کی ہے۔“

میں جانتی تھی۔ وہ آپا توفیق کا سارا گھر سنبھالتی تھی۔ وہ بڑے بڑے حکم چلایا کرتیں۔ شروع سے آپا توفیق کے گھر میں اس کا بڑا دخل تھا۔

شادی ہو گئی۔ کچھ دن سکھ میں بھی گزرے پھر کیرے پڑ گئے۔ آپا توفیق سفینہ پر اپنا پورا حق تصور کرتیں۔ اس کی زندگی میں بے جا مداخلت بر سفینہ کے سرال والوں نے اس کی ملک توڑنے کو آپا توفیق کا بائیکاٹ کیا اور بیٹیس سے خرابی کا آغاز ہوا۔ آپا توفیق کی انا پر شدید ضرب بڑی۔ انہوں نے ماں کے کلن بھرے کہ سفینہ بر حکم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں۔ خالہ زیدہ بلبلہ انھیں اور سفینہ کو دو بچ کے لیے لا

پھر کوئی تو بول کا منہ کھل گیا۔ برابر کی گولہ باری کا نذر ہوا۔ سفینہ کی معصوم ذات پر کچھ اچھالی گئی۔

”اے بڑوں کے معاملے کا چشم دید گواہ تھا۔ بہن بیٹی کے ساتھ گھومنا، پھرنا، شاپنگ، تقریریں، خوب بھڑائی۔ معاملہ طلاق پر نمٹنا۔

جب اختلاف جنم لیتے ہیں تو خوبیاں بھی خامیاں بن جاتی ہیں۔ سفینہ کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔

میں نے نہ میں بڑے پھر اور آگے۔ بلا وجہ اسے ہنوں کی سختی کروا گیا۔ سفینہ کا پڑاؤ مینے میں میں دن بہن کے گھر چور کرنا تھا۔ اس میں خالہ زیدہ کی غرض تھی اور آپا توفیق کی بھی۔ مرکزیر عتاب اس کی معصوم زبان پر آئی۔

وہ مجھ سے بل کی ہر بات کہہ لیا کرتی تھی۔ مجھے لگا اس کے ساتھ حکم ہوا ہے۔ بہت سے اپنے دوست نما دشمن ہوتے ہیں۔ ان کے اپنے نظریات اپنے وضع کردہ اصول ہوتے ہیں جن پر وہ دوسروں کو بھی نچاتے ہیں۔ یعنی دوستی کی آڑ میں کھلی و دھنی بعض رشتوں میں انسان زیر ہو ہی جاتا ہے۔ مگر کچھ لوگ ٹھوکر کھا کر بھی نہیں سنبھلتے۔ خالہ زیدہ بھی ان لوگوں میں سے تھیں جن کے خسارے ان کے اپنے خریدے ہوئے ہوتے ہیں۔

\*\*\*

واقعی سفینہ کا رشتہ ایک بار پھر کسی بڑے گھر میں ہو گیا مگر اس بار رشتہ زیدہ خالہ کی کسی واقف کار کے توسط سے طے ہوا تھا جو کسی زمانے میں ان کے گھر کے اپنی پورٹن میں کرائے پر رہ چکی تھیں۔ خالہ زیدہ اس بار بھی بڑی بڑی باتیں کرتی نظر آئیں۔

”کڑے کا پانا کاروبار ہے ساؤتھ افریقہ میں۔ نکاح کر کے چلا جائے گا، کچھ عرصہ بعد سفینہ کو بھی وہیں لے جائے گا۔ میری سفینہ تو شہزادی ہے راج کرے گی۔ لاگڑ ڈول کا مالک ہے۔“

ای نے ٹوک دیا۔ ”آپا! ابھی پالو تو دروازے بھی کھٹے رکھنے پڑتے ہیں۔ لڑکیوں کو بیابانے کے لیے

صرف حیثیت ہی تو نہیں دیکھی جاتی۔“

”اے لو۔ تو کیا آٹھ دس ہزار ہینڈ کائے والے کے ہاتھ میں تمہارا دل۔ انسان کی زندگی میں سارے مسائل پیسے کی کمی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ غربت کی چکی میں پس کر اچھی اچھی رنگ روپ دالی بھی چڑ جاتی ہیں۔ اپنی توفیق کو دکھا ہے۔ بیٹی بیابانے کے قاتل ہو گئی۔ ابھی تک لڑکی سی نظر آتی ہے پیسے کی تنگی جو نہیں۔ اللہ ہونے والوں سے بچائے۔“

ای کے کلیجے پر ہاتھ بڑا۔ خالہ زیدہ سمجھیں کہ بہن اپنی محرومی کے سبب جل گئی ہے۔ ان کے جانے کے بعد بڑبڑاتی پھریں۔

”خاک بڑے ہونے والوں یہ۔ ہم اپنی بیٹی کے لیے بلند پرواز نہیں رکھتے۔ شریف، ٹینک، مقبول رشتے کی تلاش ہے۔ ان کی طرح سمجھتے نہیں کہ اور بھی اور بھی ہینکھوں ہیں اور دھڑام سے نیچے دیکھوں کی ہنس محل میں بیابا ہے سفینہ کو۔ پہلے بھی بونی بڑے بڑے بول بولے تھے۔ چار روز میں سارے کس بل نکل گئے۔ اونچے گھروں والے ایسے ہی ہم جینوں کی بیٹیاں بیابانے نہیں آجاتے ان کے لیے ان جیسے بہتر ہے۔“

مگر ایسی باتیں خالہ زیدہ کہاں سمجھتی تھیں۔ وہ معیار سے کم پر سمجھو تاکرے والوں میں سے نہ تھیں۔

اور شادی والے روز وہاں کو دیکھ کر میری تو طبیعت ہی مکدر ہو گئی۔ سفینہ سے ملتی عمر تھی۔ کنپٹیاں سفید۔ نظریں خونخوار۔ ہاں گھر مالدار تھا ایک بار پھر نکا لگ گیا تھا۔ امی نے خالہ زیدہ کی واقف کار امینہ کو چاہا۔ میرے لیے بھی کوئی اچھا رشتہ نظریں رکھنے کی تاکید کی۔ مگر ان کا کام رشتے کرنا نہیں تھا۔ صرف تعارف کروایا تھا۔ انو سفینہ کی قسمت زور کر رہی تھی۔ انہوں نے پھر بھی وعدہ کر لیا۔ پھر خالہ زیدہ کی شکایتوں کا پٹارہ کھول کے بیٹھ گئیں۔ انہوں نے چار روز کے لیے مکان کرا کر لے کر لیا۔ خالہ زیدہ نے ان کی زندگی اجیون کرو دی تھی۔ کٹے کٹے کا حساب رکھتیں۔ بات

بے بات جان کو آجاتیں۔ لحاظ عزت نام کو نہ تھی۔  
امینہ کے زخم آج بھی رستے تھے۔ مگر انہیں بھی سفینہ  
پر رحم آیا تھا۔ سفینہ نے ایک بار ان پر اپنی گزشتہ زندگی  
کے باب کھولے تھے۔ امینہ مجھے بھی گھیر کے بیٹھ  
گئیں۔ اپنے تئیس بڑھاپا مشوروں سے نوازا۔

”بال اسنے ہی ہیں یا تم بڑھاپی نہیں ہو۔ شادیوں  
میں سچ سنور کے جایا کرو تاکہ لوگوں کی نظروں میں  
آؤ۔ رنگ صاف کرنے کے لیے کوئی اچھی سی کریم  
استعمال کرو۔ یہ دیکھو۔“

ای لب سیسے سکتی رہیں۔ پھر امید باندھ کے بیٹھ  
گئیں۔ کم روز بیویوں کے والدین امید پر ہی توجہ دیتے  
ہیں۔

اگلے روز ولیمہ تھا۔ ولیمہ کیا تھا کہ اعلیٰ رستوران  
میں کچھ نشستیں بک کر دلی تھیں۔ گئے چنے لوگ  
تھے۔ ولیمہ بھگت کے بالائی بالا روانہ کر دیا گیا۔ امی بہت  
جھٹکائیں، انہیں وہ گھر دیکھنے کا چاہو تھا جہاں سفینہ بیاہ  
کے گئی تھی مگر خالہ زیدہ نے سب کو پرے پرے ہی  
رکھا۔

بعد میں بھی سفینہ سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ وہ آئی  
گئی مگر مجال ہے جو کبھی چھوٹے منہ بھی آنے کو کہا  
ہو۔ امی کہتیں۔

”مال دار گھر میں بیاہ کر سفینہ کی بھی آنکھوں پر چربی  
چڑھ گئی ہے۔“

مگر میں سمجھتی تھی۔ دودھ کا جلا چھانچھ میں بھی  
پھونک لیں مارتا ہے۔ سفینہ کا پہلا گھر اجاڑنے میں کلن  
بھرنے والوں کا بھی بڑا ہاتھ رہا تھا۔  
پھر سنا سفینہ ساؤتھ افریقہ چلی گئی۔

جائے کتنے دن گزر گئے۔ ایک روز خالہ زیدہ کے گھر  
جانا ہوا تو خالہ زیدہ بڑی خوش و شادیں تھیں۔ سفینہ  
کچھ دن پہلے لوٹی تھی۔ وہ ماں کے لیے جو سوغاتیں لائی  
تھیں۔ ان کی بھرپور نمائش کی گئی۔ ”لوکے“ کے  
والدین تو تھے ہی نہیں۔ ایک بیایا بہن کی فیملی کے  
ساتھ رہتا بسا ہے۔ نارتھ ناظم آباد میں بڑا شان دار

بنگلہ ہے۔ لاکھوں کی کمائی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔  
میں لوٹنے لگی تو صدر دروازے پر ان کی اوپر  
نے بیڑی چلا۔

”دیکھ آئیں افریقہ سے آئی سوغاتیں۔ ہزار  
بول کے ماں کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہے۔ ورنہ  
یہاں بھی نہ بیٹے دیتیں۔ جڑ سے اکھاڑ لاتیں گی۔  
مجھ سے پوچھو چار روز ساؤتھ افریقہ میں روکر لوں  
وہاں دوسری جو بیٹھی ہے۔ اب یہ بیٹھیں منہ کے کچے  
خدمت کرے گی اور روٹی کھائے گی۔ تم نے وہ مشل  
سٹی ہے نا ہاتھ تو آیا، منہ نہ تھا۔“

میرے دل کو دھکا سا لگا۔ اگر ایسا تھا بھی تو مجھ  
پھرنے کی کیا تک ہوتی ہے۔ مگر ان رشتوں میں ہونے  
کیونگی دکھا کر خار نکلی جاتی ہے۔ میں خوب جھنجھکی  
تھی۔

اگلی بار وہ مجھے پبلک ٹرانسپورٹ میں ملی۔ کورنگی  
سے نارتھ ناظم آباد جانے والی بس میں!۔  
مجھے حیرت ہوئی۔ خالہ زیدہ کبھی نہیں۔ سفینہ  
کے بنگلے میں چار گاڑیاں کھڑی ہیں۔ اور سفینہ نے کہا  
کہ اتنی دور سے ٹیکسی کا کرایہ لگ بھگ ہزار روپے  
ہے۔ میری حیرت کو زین مل گئی۔  
”کہاں کہیں وہ گاڑیاں بنگلے؟“

”وہ گئے چنے چنے پیسے سمیٹتے ہیں اور یہاں ہر چیز میں  
ساجھا ہے۔ بہن مختلف بہنوں سے۔ بڑی رقم لائے  
لیتی ہے۔ مکان کے کرائے میں ساجھا۔ نوکروں کی  
تخواریں ساجھا۔ بلوں میں ساجھا۔ بڑے گھوڑے  
میں زندگی اتنی آسان کہاں ہوتی ہے۔ بڑے گھوڑے  
میں رہنے والے کبھی چھوٹے دلوں کے بھی تو نقل  
آتے ہیں۔“

اس کا انداز پر سکون تھا۔ شاید یوں کہ اس نے  
زندگی کو جو ہے اور جیسی ہے، کی بنیاد پر جھیلنا سیکھ لیا  
تھا۔

پھر اس کا اسٹاپ آگیا۔ وہ اتر گئی۔

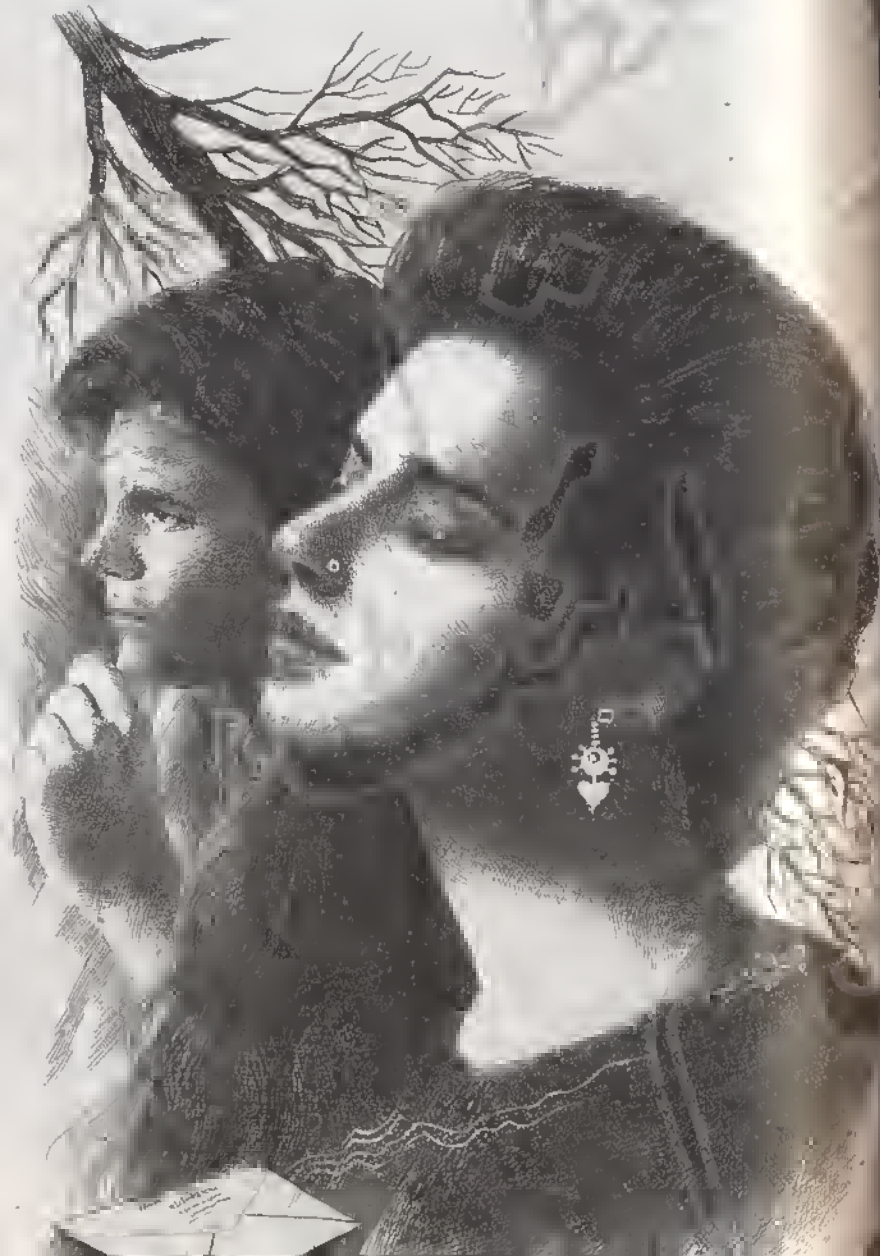


”پچھلی بار اس کے سامان نے حیران کیا تھا۔ اتنا کم اور اس بار اتنا زیادہ۔ اللہ جانے کیا کیا اٹھا کر لے آئی تھی۔ چھوٹے بڑے بیگ، خیمے، ٹارپن، وہ تانوں اور خالہ کی حیرت بھانپ گئی۔ کھانا کھا رہی تھی تو الہ لگا۔  
”میں وہ ایسی کے تمام راستے بند کر کے آگئی ہوں تانوں۔ یعنی تمام کشتیاں جلاؤ ایس۔ یعنی جینا مرنا سب ہمیں اس در پر۔“

جملہ بے حد متنی خیز اور ڈراتا ہوا تھا۔ مگر لہجہ کی مصنوعی بے بسی اور ناکامی اور آنکھوں میں ناچتی شرارت۔

”اللہ نہ کرے کیسی باتیں کرتی ہو بیٹا! تانوں ہوں ہی تو تھی تھیں مگر نوین نے شرارت بھانپ لی۔ اسے مزہ آیا سو پوچھنے لگی۔

”طارق بن زیاد نے تو کشتیاں جلا کر بار حیرت کا فیصلہ



کیا تھا۔ مر جائیں گے۔ یا مار دیں گے۔ تمہارے کیا ارادے ہیں؟“

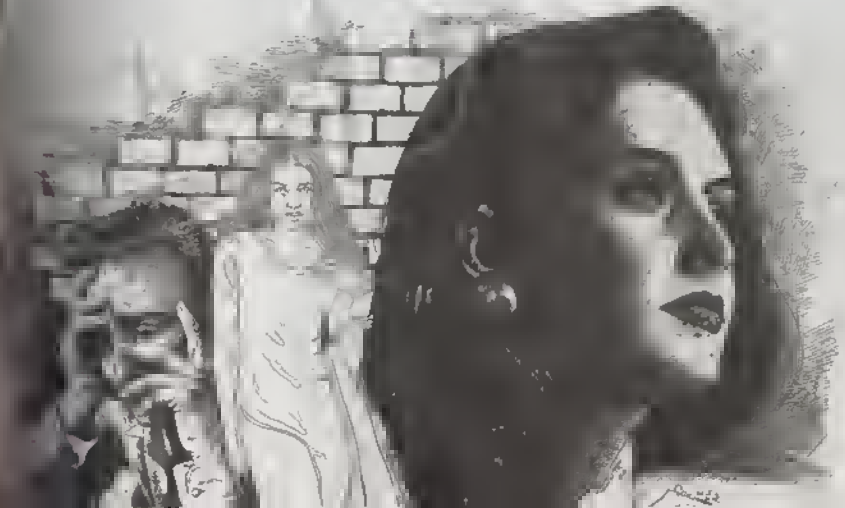
”نیک ہی ہیں۔“ آپ پریشان نہ ہوں نوال بھی کوئی غلط کام نہیں کرتی۔ کیونکہ۔“ اس نے قصداً جملہ اوصو را پھوڑا۔ وہ اگلا جملہ ان ہی کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

”کیونکہ نوال کا ضمیر ابھی زندہ ہے۔“ نوین نے شوخی سے اسی کا سالنڈاز اپنایا تھا۔

”اور یہ جملہ میں نے۔“ نوال نے انہیں مزید آگے کچھ کہنے پر اکسایا۔ نوین کو مزید مزہ آیا۔

”اور یہ جملہ تم نے اپنے باپ کے لیے کہا ہے۔“

”اوہو۔“ نوال ہاؤس ہوئی۔ ”ابھی بہت وقت لگے گا آپ کو نوال ضمیر کو سمجھنے میں۔ یہ والا جملہ میں نے اپنے آپ کے لیے کہا ہے ضمیر مطلب۔ میری





سوچ میرا راز، میرے خیال۔ آپ سے کس نے کہہ دیا خالہ کہ صحیح یا غلط کام کرنے کے لیے باپ سے یا باپ کے نام سے ڈرنا چاہیے یا پاس رکھنا چاہیے۔ اچھا! اور رانی اندر سے پھوٹی ہے۔

”میں نے زندگی میں کبھی کسی کو اپنے باپ کے نام کو ایسے مختلف طریقوں سے استعمال کرتے نہیں دیکھا۔“

نویں نے تائید طلب نگاہوں سے زینت بیگم کو دیکھا۔ جن کی آنکھیں جھلملا سی گئی تھیں۔

”اب آنکھوں میں یہ جھلملاہٹ سی کیوں؟“ نوال نے حیرت سے پوچھا۔ زینت بیگم نے جواب نہیں دیا۔ ساری کے پلو سے آنکھیں رگڑ لیں۔

”مجھے لگتا تم نہیں آؤ گی۔“

وہ جملہ اوجھڑا چھوڑ کر کمرے کی دیواریں اور پھٹ کر دیکھنے لگیں۔

”مجھے اپنا گھر قبرستان لگنے لگا تھا اور ہم جیسے دو بھنگی روہیں۔“

”مجھے آٹا ہی تھا نا تو۔۔۔ وہ تو بس شادی آگئی بیچ میں اور ابھی آپ رو رہی ہیں۔ فون تو ایک بار بھی نہ کیا کہ آجاکہ انتظار۔“

وہ سنجیدگی سے کہتی آخر میں گنگنائی۔ نویں کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”ہم نے فون اس لیے نہیں کیا کہ کہیں تمہیں یہ نہ لگے ہم تمہیں پریشاں کر رہے ہیں۔“

”واہ! آپ اور آپ کے ارفع خیالات۔۔۔ اللہ نے زبان اور کان کہنے سننے کو دیے ہیں۔ آپ بس اندر ہی اندر سوال جواب کھیتی رہا کریں۔ خواہ مخواہ۔“

نویں جواباً ”کچھ نہ بولی۔ اسے نوال کا جلدی جلدی نوالے بھرتا اور تیز تیز بولنا بولتے ہوئے سر کی جنبش سے ہلکی پوٹی سب بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

”اب اتنی میٹھی میٹھی نظروں سے مجھے گھورے کیوں جا رہی ہیں؟“

”گھور نہیں رہی بے وقوف! پیار سے دیکھ رہی ہوں۔“ نویں نے پرسکون سانس بھری۔ ”میا لگ رہا ہے۔ جیسے۔۔۔ جیسے دیرانے میں چپکے سے ہمار

آجائے۔“

”ہی ہی ہی۔۔۔ بہت خوب میری شاعرہ خالہ۔۔۔ مثال دی ہے۔ جی خوش ہوا۔“ نوال کو برا مزہ آیا۔

”اور جہاں تک دیرانے میں ہمارے چپکے۔۔۔ آنے کا تذکرہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے آجائے تھا اپنے اس جیتے کے ہمراہ۔۔۔ خود سے گاڑی ٹکا خانہ آپ کے لیے ممکن نہیں۔ میں نے سوچا کہ اچانک جا کر اس کے سر پر ہتھوڑے کی طرح برسوں اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھوں۔۔۔ وہ انخس انعام کو جان ہی چکی تھی۔

”اسے کیسے لے کر آئی۔ بایک کے ایکسڈنٹ میں بازو فریکچر ہو گیا اور ٹانگ پر الگ ہاسٹریجٹھا ہے۔“ نویں کا لہجہ اور زینت بیگم کا چہرہ دکھ کی تصویر بن گیا۔

”ارے وہ کیسے؟ جب خیریت ہی ناں زیادہ گہری چوٹیں تو نہیں آئیں؟“

نوال کا نوالہ چپا نا منہ رک گیا۔ اس نے بے حد تشویش سے دریافت کیا۔

☆ ☆ ☆

بے خود خان کو اسکول سے واپسی پر نوال کی آمد کی خبر ہوئی۔ اوچی آواز میں ڈیک چل رہا تھا۔

”بد تمیز دل بد تمیز دل جانے ناں۔۔۔“

اس گھر میں کوئی ایسا تھا ہی نہیں جو دل کی کیفیت بیان کرے اور وہ بھی ایسی اطلاع کہ دل بد تمیز ہے اور بے حد نا فرمان بھی۔۔۔ توبہ۔

”نوال بائی۔۔۔! خوشی سے آواز پھٹ جانے کو تھی۔“ مجھے لگا آپ جھوٹا وعدہ کر کے گئی۔ اور نہیں آئے گی؟“ وہ بے خود تھا۔

”مجھے آٹا ہی تھا بے خود!“ نوال کی آنکھیں بھی جذبوں سے بھر گئی تھیں تو بیا۔

”جاؤ جا کر پوٹی فارم پیچ کر۔۔۔ نوال اب یہیں ہے۔ کھانا وغیرہ کھاؤ تو پھر آنا۔ یہ خالی بھگن اور کارنڈ اسٹور میں رکھنے ہوں گے۔“ نویں نے نوال۔

”یہ سارا آپ کا سلمان ہے نا۔“ بے خود نے اس دھیرے اس کے قیام کی مدت کا اندازہ لگایا۔ چہرہ چمکنے لگا تھا۔

”بی بی نے مجھے آپ سے فون پر بات بھی نہیں کروایا۔ بولتی تھی کہ ام کسی کو مجبور نہیں کر سکتے اور میں آنے کا تو بالکل نہیں کہہ سکتے۔ اور۔۔۔“

”جاؤ بے خود۔۔۔! نویں نے ذرا سختی سے اسے نواک۔

”کیوں خالہ؟“ نوال نے اس کے جانے کے بعد نویں کو کسی قدر افسوس سے دیکھا۔

”دلی جذبات بھی پوچھانے میں آپ اتنی روک کر قتی ہیں۔ اب دل اچانک چاہنے لگا کہ آپ نے ایک بار ہی کال کر کے کہا تو ہوتا۔“ نوال اب تک آئیں کیوں نہیں آیا کہ اب تک آ رہی ہو؟“ نویں کا سر جھک گیا۔

”تاہم بعض باتیں کہہ دینے سے سننے والے کو تو خوشی ملتی ہے ہی۔ مگر کہہ دینے سے کہنے والے کو جو سکون ملتا ہے وہ۔۔۔ کبھی کہیں گی تو پتا لگے گا۔ سمجھیں!“

”کوئی پھل نہیں ہے فرق میں۔ یہ سڑے ہوئے تین کیلے نکلے ہیں بس۔“ نوال نے جھنجھلاہٹ سے کیلوں کو غور دیکھا اور پھر ناؤ اور نویں کہنے۔

”مخفش کے ایکسڈنٹ کے دن پریشانی میں گزرے۔ مارکیٹ تک جانا ہی نہیں ہوا۔“

زینت بیگم اور نویں کے چہرے پر تاسف سا پھیل گیا۔

”چھوڑیں ناؤ! آپ لوگ نہیں سدھر سکتیں۔“

نوال نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایکسڈنٹ اس انخس کا ہوا ہے اور مفلوج زندگی اب آپ لوگوں نے گزاری ہے۔ مجھے تو لگتا ہے آپ دونوں دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے وقت اپنے لیے خیر و تندرستی نہیں مانگتی ہوں کی بلکہ درد کرتی ہوں۔ اللہ انخس کو زندگی صحت اسے دے ہاں!“

افوا میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ ایک ایمر جنسی سی نافذ

ہو گئی تھی گھر میں ابھی بے زار لالا اور بے خود کو لست ہنا کر دیتی ہوں تو سب آجائے۔“

”نہیں! ہم خود ہی چلیں گے سپر اسٹور تک۔۔۔“

نوال نے کہا۔

نویں نے زینت بیگم کو دیکھا اور ہتھیار ڈال دیے۔ ”لو کے چلیں گے۔۔۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم انخس کی خیریت معلوم کرنے چلی جاتیں۔ بہت سیریس ایکسڈنٹ ہوا کہ۔۔۔“ نویں موزوں جملہ سوچنے لگی۔ نوال کا موزا اور خراب ہو گیا۔

”خیر اب اتنا سیریس نہ ہوا ہو گا جتنا دہشت ناک منہ آپ بتا رہی ہیں۔“

نویں جھنجھکی بسی ہنس دی۔ واقعی ایکسڈنٹ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آواز سرسبز۔۔۔ آنکھیں حلقوں سے ابلتی اور چہرہ سستی سے بھر جاتا تھا۔ دوسری طرف زینت بیگم تاسف آمیز سراپسنگی سے نویں کو دیکھتیں اور رواں رواں ہاں ہاں میں ہاں ملاتا۔

”نوال کھڑی ہو گئی۔“ جارہی ہوں آپ کے جیتے کی خیریت کی طلبی کے لیے۔

”بے خود۔ بے خود!“ اس نے بلند آواز سے پکارا تو وہ جیسے کہیں پاس ہی کھڑا تھا۔ جھٹ حاضر۔ ”آؤ ذرا خیریت معلوم کر کے آتے ہیں۔“

”کوئی مزہ نہیں آئے گا تھوڑا ہی لگی ہے۔ زیادہ وہ بچ گیا ہے۔“ پٹھان خون تھا۔ دشمن ہے تو رعایت کیسی۔

”تو یہی تو دیکھنے جائیں گے اور کہاں کہاں لازمی چوٹیں لگتی چاہیے تھیں۔“ اس نے تسلی کروائی۔

☆ ☆ ☆

اشتیاق احمد نے بے حد اپنے بھائی کے عالم میں اسے دیکھا۔ پھر بے حد زار چہرے والے بے خود خان کو جو سلام جھاڑ کر یوں کھڑا تھا جیسے جانتا ہی نہیں۔ ٹھنکھریالے بال پوٹی میں سر کے عین اوپر جکڑے ہوئے تھے۔ دھلا دھلا گلابی چہرہ سنہری آنکھیں دھلا پتلا سر ہاں۔۔۔ بلیک جینز پر اوچی گول دامن والی پیلی

شرٹ مولویوں کی طرح شانوں پر ٹکڑا اس کا رف و چرا  
تھا آگے لاکر گانڈھ دی گئی تھی با اکتاد مسکراتا بے فکر  
ساجرہ۔

اشتیاق صاحب نے کسی کے بتائے بنا پچان کا  
مرحلہ خود سے ہی طے کیا اور مارے اشتیاق کے  
پاچیس چر گئیں۔

”ہیلو نوال۔“

”اوپا۔۔۔ ہیلو!“ نوال کا مسکراتا چہرہ حیرت کی  
تصویر بن گیا۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر بے خود کو  
دیکھا جو بے فکر سا کھڑا تھا۔ ہاں ایک لاپرواہ سی خشکی  
نمایاں تھی۔ بے خود کی طرف سے کوئی تعارفی جملہ یا  
اشارہ نہ پا کر نوال بے حد خوش میزبان کی جانب متوجہ  
ہوئی۔

سامنے موجود شخصیت کی پہلی قابل دید چیز تھی  
موٹاپا۔ موٹاپا اور بے حد موٹاپا۔ گھرے اور جگر کا  
ٹریک سوٹ اس پر گلابی رنگ بے حد گلابی لٹکا کہ آتش  
گلابی ہی لگنے لگے۔ آڈی ٹانگ ٹیکل کر سر میں بل  
جمائے گئے تھے۔ سب سے حیران کن چیز جو نوال نے  
اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تھا آنکھوں کا  
سرمہ۔ اتنا آآ سرمہ۔ اتنا سرمہ تو قبائلی عورتیں  
نورائیدہ بچے کی پلکیں اور بھونیں بنانے پر بھی خرچ نہ  
کرتی ہوں گی۔

اس نے جائزہ پورا ہونے پر اشتیاق احمد کو پسندیدگی  
کی سند عطا کی اور دل سے مسکرائی۔

”نہ واوا جان ہیں۔“ اخفش بھائی کے۔ ”بے خود نے  
جیسے سنا ہے ہوئے کہا۔“

نوال کو بے ساختہ یاد آیا۔ نوین نے کہا تھا، ”اخفش  
کے دادا ایک بالکل ہی الگ انسان ہیں۔ ان سے مل کر  
مزہ آجاتا ہے۔“

نوال کو یقین آیا۔ ابھی تو صرف دیکھا تھا اور واقعی  
مزہ آگیا تھا۔

”میں تو کب سے تمہارا منتظر تھا۔ تم نے اتنے دن  
لگا دیئے نوال!“ وہ بچپن کے پھڑپھڑے دوستوں کی طرح  
شکوہ کنال لہجے میں بولے۔

”نذر چلو تیں اوھر ہی کیوں کھڑی ہو۔“ موہن  
تمہیں یاد کر رہی تھی۔“

”اب یہ صوفیہ کون؟“ نوال نے بے خود کو دیکھا  
”واوی جان کا نام ہے؟“ بے خود نے دبی زبان سے  
کہا۔

بے حد خوب صورت سب سے بنے صاف ستھرے  
کاسن میں ایک دبی تلی خاتون دھیل چیر بربرانہ  
دی دیکھ رہی تھیں۔ بہت ہلکے یسٹن ٹکر کے موٹ میں  
وہ بے حد باوقار اور حسین تھیں۔

آہٹ پر چونکیں۔ نگاہ اٹھا کر نوال کو دیکھا اور پھر  
اپنے مجازی خدا کو جو نوال کی کلائی یوں دوپے کھڑے  
تھے جیسے وہ بھاگ جانے والی ہو۔ یا وہ اسے بھاگنے  
سے پکڑ لائے ہوں اور اب اپنے کارنامے کی داد چاہتے  
ہوں (کو بیگم کیسا؟)

”نوال۔۔۔“ وہ جوشیلی آواز میں بولی تھیں ساتھ  
ہی بائیں وا کر دیں۔ ”او اھر میرے پاس۔“

اشتیاق احمد نے بھی دوپے کلائی چھوڑتے ہوئے اسے  
کھلی بانوں میں سما جانے کے لیے کھلی چھوٹ دے  
دی۔

وہ آگے بڑھ کر رسی سامنے لگی تھی۔ مگر صوفیہ بیگم  
نے مگر جوش سے اسے خود میں بھیج لیا۔ پھر چہرہ انھوں  
کے کمرے میں بھر کے بیچ پیشانی جو ملے۔ ”شاء اللہ“

نوال ایسے والہانہ استقبال پر حق دق تھی۔ وہ تو  
اخفش ہی جیسے بے حد سڑے پورنگ اور اکڑے  
لوگوں اور ماحول کا سوچ کر آئی تھی۔ مگر یہاں تو۔۔۔

”بھئی پردین کو آواز دے۔ اس سے کوہ مہمان  
آئے ہیں بلکہ مہمان کیا۔ کوہ ہمارے گھر لڑکی آئی  
ہے ذرا مزے داری ٹیبل تو سجا دے۔“

اشتیاق احمد نے بیگم سے کہا مگر آواز اتنی بلند تھی  
کہ پردین تک سارا ایم پونچا۔ وہ کہیں دور سے چلائی  
”جی اجھا!“

”ہاں تو بیٹا۔۔۔ کیسی ہو۔ اور تمہارا باپ کیسا ہے؟  
وہ کسلی سے نرم صوفے میں پڑھتے ہوئے بولے۔

”ذیڑ اچھے۔۔۔ میں بھی اچھی۔“ چونکہ میل

استقبال بالکل ہی سوچ سے الگ ہوا تھا تو نوال کچھ انکلی  
تھی۔

”اور بیٹا! تمہاری امی۔۔۔ کیا حال ہیں ان کے؟“

صوفیہ بیگم کو دھیان آیا۔ ”مشعل کیسی ہیں؟“

”اب جاتی ہیں امی کو؟“

”ارے! انہیں کیسے نہ جانوں گی۔ ابھی منیر بھائی  
کے انتقال پر تو طے تھے سال ہو چکا مگر ابھی کل ہی کی  
بات لگتی ہے۔“

”اوہ! امی! نوال کو سب سمجھ میں آگیا۔  
”کل تو تھکاوٹ اور سامان کھولنے میں ٹائم لگا۔۔۔  
آج میں نے سوچا ذرا اخفش کی خیریت معلوم کر آؤں تو  
دیکھ لے کہ کس ہے وہ؟“

”اوہ! اس پور آدمی کا ذکر لے بیٹھی ہو۔۔۔ بلکہ  
لوہی شیطان کا نام لیا اور موصوف حاضر۔“ تینوں  
نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو سامنے سے  
وہی آ رہا تھا۔ بائیں ٹانگ پر پلاسٹک چڑھا تھا اور دایاں بازو  
بیلٹ کے سہارے گردن میں لٹکا تھا۔ وہ لنگڑا کر بہت  
دیر سے دھیرے قدم اٹھا آ رہا تھا۔

اس کے چہرے سے کمزوری اور بے زاری مترشح تھی  
جس میں اب شدید ترین بے یقینی کا رنگ غالب  
آگیا۔

”السلام علیکم کیسے ہو؟ میں تمہاری ہی طبیعت  
معلوم کرنے آئی تھی۔ کیا بہت زیادہ لگ گئی؟“ نوال  
نے عیادت کے اصولوں کے عین مطابق لہجہ اور چہرہ  
بست در بست لہانہ اور متحرک نہ بنا کر پوچھا۔

اخفش کی حیرت کے کیا کہنے وہ کوئی بھی جملہ کہنے  
سے گویا قاصر تھا۔ قوت گویائی سلب ہو گئی تھی شاید  
”تم۔۔۔“ اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔ ”تم پھر آ  
گئیں؟“ اب سچی بات ہے کہ یہ جملہ کہنے پڑھنے اور  
سننے میں انتہائی بے مروت اور انہلشنگ تھا اور اس پر  
چہرے کے کسی قدر متوحش تاثرات ناگواری دلائے

اشتیاق صاحب کا سر پیٹ لینے کو دل چاہا جبکہ  
صوفیہ بیگم ارے۔ ارے ہی کرتی رہ گئیں۔

”مجھے تو آنا ہی تھا۔ میں نے کب کہا تھا کہ میں  
وقت ہوں ہاتھ سے پھسل گیا تو پھسل گیا۔ رست کی  
طرح۔۔۔“

”اتنی ڈاکن ٹوارتھ ہو گئی ہو کہ خود کو رست مٹی  
کسے لگیں۔ چلتی مٹی کو جو چپک ہی جاتی ہے۔  
اتارے نہیں اترتی۔“

اس نے دودھ جواب دیا۔

”چلتی مٹی کی جگہ مجھے خوشبو بھی کہہ سکتے تھے۔  
انمول! ایک دماغی احساس۔۔۔ مگر جملے سوچ کے اور  
سوچ شخصیت کی آئینہ دار ہوئی ہے اور تم۔۔۔“ اس  
نے قصداً ”جملہ ادھر اوچھوڑا مگر تاک تاک کر پوائنٹ  
مارنے کے بعد۔۔۔“

”بڑی خوش قسمی ہے“ وہ اب باقاعدہ گھور رہا تھا۔  
”نہیں۔۔۔ خود کشاں کیسے۔“

”اونہ۔۔۔! ذرا سی کراہ کے ساتھ وہ صوفے پر  
براز ہوا ہو گیا۔ بے خود کو جملوں کی گہرائی، کٹ اور  
معنی تو بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ مگر نوال کے چہرے کی  
مسکان اور اخفش کے بولنے والی جگہ اونہ نے اسے  
بتایا جیت ان ہی کے جھکے گئی ہے۔ وہ کسی قدر شائے  
اکڑا کر بیٹھا تھا۔

دوسری جانب صوفیہ بیگم باہمی ذل نظر آتی نوال  
کے جملے سن کر ششدر تھیں۔ بس ایک اشتیاق احمد  
تھے جن کی آنکھیں دھک رہی تھیں چہرہ چمک رہا تھا۔  
”میں بھی اتنی دیر سے سوچ رہا تھا۔ تو لڑکی غلط ہے  
یا پھیلانی ہوئی بائیں غلط۔۔۔ مگر اب یقین آگیا دونوں  
چیزیں درست ہیں۔“ اشتیاق احمد نے اپنی بیگم کو  
مخاطب کرتے ہوئے نوال کو سنایا۔ تو وہ کسی قدر نا سنجی  
سے دونوں کو دیکھنے لگی۔ اخفش نے ایک اور ”ہونہ۔۔۔“  
کہہ منہ موڑا تھا۔

”وہ اصل بیٹی! تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا  
تھا۔ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم جب سے آئی تھیں  
خاموش نا تلا بول رہی تھیں۔ مجھے بھی لگا کہ وہ سب  
جھوٹ تھا لیکن اب یقین آگیا۔ تمہارے بارے میں  
بتائی گئی باتیں درست ہی تھیں۔“

نوال چوکی۔  
 ”کون سی باتیں۔۔۔ اور کس نے کیس باتیں۔۔۔؟“  
 اس نے تینوں کو گھورا۔

حرف بہ حرف قائل ہوا ہے  
 ”تو تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ W.W.F. میں جاؤ  
 اور غور توں کی ریسنگ میں حصہ لو۔“  
 ”ہائیں!“

فان نوال جیسے گرو و پیش کو بھول گئی۔ خوب صورتی  
 زبان بھول دیتی ہے۔ چاہتے نہ چاہتے منہ سے واہ واہ  
 یا اللہ نکل جاتا ہے۔

مشہور و مزاح نگار اور شاعر  
انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

450/-	سفرنامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سفرنامہ	دنیا گول ہے
450/-	سفرنامہ	ابن بطوطہ کے نقاب میں
275/-	سفرنامہ	چلتے ہو تو چین کو چلیے
225/-	سفرنامہ	گھری گھری پھر اسافر
225/-	طہر و حراح	نثار گندم
225/-	طہر و حراح	ازد کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس بستی کے کوسچے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاندگر
225/-	مجموعہ کلام	دل و دشت
200/-	ایک گرائین پو اذین انشاء	احد اکتواں
120/-	ادبیری اذین انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	طہر و حراح	ہائیں انشاء کی
400/-	طہر و حراح	آپ سے کیا رود

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی



”کہاں لے کر چلیں گے؟“  
 ”کیس بھی۔ سی سائڈ پر جاہاں تم کہو۔“  
 ”ہمارے پوچھ لوں۔“ ”خوش ہے پہلو بدلا۔“  
 ”بڑی آئی قریاں ہر وار۔“  
 ”خالہ کو بھی لے لیں گے ہاں۔“  
 ”اخطب نے گہری سانس لی۔“ ”پھر تو تم گھوم آئیں۔ وہ بھی نہیں جانتی گی۔“  
 ”خالہ میری کوئی بات نہیں مانتی ہیں۔“ اس نے پکڑنا یقین سے کہا۔  
 ”اخطب کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آ گئی۔“  
 ”تم ابھی اپنی خالہ کو جانتی نہیں ہوئے۔“ ”ان کے لیے میں دکھ تھا۔ تکلیف اور ناکامی سی۔“  
 ”نوال ڈھیلے پن سے کھڑی تھی۔ چونک کر کسی فوجی کی طرح سیدھی ہوئی اور تن کر کھڑی ہو گئی۔“  
 ”اور آپ ابھی مجھے نہیں جانتے۔ میں اپنی بات منوانے کے لیے۔“ فرخ پر پتھل پونچھ پیر پھیلا کر بیٹھ جایا کرتی ہوں اور یہاں یہاں کر کے روتی ہوں۔ منہ سر پیٹ لیتی ہوں۔ بلکہ بالوں میں خاک ڈال لیتی ہوں اور۔“  
 ”آپ واقعی اپنی خالہ کو نہیں جانتیں۔“ اخطب نے قہقہہ لگایا اور تائید کے لیے ساتھ سو بے منہ والے نتیجے کو دیکھا جو گانگڑے آنکھیں چھپائے یوں بیٹھا تھا جسے خالہ کی شکل کی سیٹ پر براجمان ہوئے۔ تن تھا۔ اور گونگا تو وہی سماعت بھی چلی گئی ہو۔  
 ”خوش نے گانگڑا تھے پر چڑھا کر اسے دیکھا اور چاچو سے مخاطب ہوا۔  
 ”یہ بڑے بڑے دعوے کر کے گئی تھیں اور بڑے بڑے ارادوں سے آئی ہیں۔ اب تو بس یہ دیکھنا ہے نتیجہ کیا نکلے گا۔“ نوال ساتھ سے جلوں کے اندر چھپے بھید تک پہنچی۔  
 ”میں کبھی غلط بات نہیں کہتی اور عنقریب تم کو یہ لو گے۔“  
 ”اب تم گاڑی میں آ رہی ہو یا ابھی مزید انجوائے

کرؤ گی۔“ ”اخطب بولے۔  
 ”اسی نے دیکھ لیا تو تمہیں لگ پتا جائے گا۔“  
 ”پھر تو میں ضرور بیٹھوں گی۔“ وہ صدی لہجے بولی تھی۔  
 ”باہر گھٹائیں غائب ہو گئی تھیں اور سورج یوں ہلکا رہا تھا جیسے کہیں گہرائی نہیں۔“  
 ”ایک تو میں کراچی کے اس موسم سے بہت پریشان ہوں۔ ٹھنڈی نہیں۔“ وہ کینہ توڑ نگاہوں سے دھوپ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی تھی۔  
 ”ابھی آپ نے کراچی میں اور بھی بہت کچھ نہیں دیکھا۔“ اخطب بولے۔  
 ”اور دعوے آسمانوں تک۔“ ”خوش نے ٹکڑا لگایا۔  
 ”نوال نے جواب نہ دیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب رہی تھی۔  
 \* \* \*  
 ”نوبین اور نالو کی زندگی کو بدل دینا نئے رخ پر ڈال دینے کا پلان اتنا مشکل قطعی نہیں تھا۔ لیکن جب وہ دونوں ایسا جہاں بھی تال تو تھے۔ جو جیسا کی بنیاد پر صبح سے شام۔ کوئی ارادہ نہیں۔ خواب نہیں۔ خواہشوں سے دستبردار۔  
 ہٹ دھرمی ناکامی ہے بسی کو قناعت کا نام دے کر خود کو سٹاکس سے نوازنا اپنے لیے خودی میڈلرچن لینا۔  
 جبکہ میڈل تو وہ ہوتا ہے جو دوسرے دیتے ہیں۔  
 اور نوال کے حساب سے ایوارڈ تو دوسرے۔ وہ کسی ایوارڈ شو میں شرکت کے قاتل بھی نہیں تھیں خصوصاً ”نوبین منیر خان۔“  
 وہ دونوں نوال کے چائے ہنگامے میں خوش رہتی تھیں۔ اس کی حرکتیں اور باتوں پر ہنستی تھیں۔ مگر ہل بھر کے لیے۔ نوال کی غیر موجودگی۔  
 ”نوال نے اکثر خاموشی سے انہیں دیکھا تھا۔ نہ

خان ٹی دی جاتی تھیں۔ مگر فقط نوبین جیتل۔ وہ ہی آواز بند کر کے نیچے چلتی پٹیاں پر ہستی رہتیں، کبھی کوئی پرانی فلم لگا لیتیں۔ کوئی گانا تو۔۔۔ خصوصاً ”کھٹکھٹا“ کے پرانے گانے۔۔۔ وہ محض ایک جھٹک کچھ کر گانا بتا دیتی تھیں۔ بے ساختہ آواز بڑھا بھی لیتیں۔ مگر ایک مصرع پورا ہونے سے پہلے ہی آواز بند کر دیتیں شاید منیر خان مرجانے کے بعد بھی ان کے اعصاب پر سوار تھے۔  
 ”ٹی دی بند ہو تا تو یونہی درازیں کھول کر چیزیں دیکھ لیتیں کبھی یونہی الماریاں درست کرنے لگ جاتیں۔ خاموش خالی دیر ان۔  
 اچھا چلو۔ وہ تو عمر کے اس دور میں تھیں۔ جب یونہی بوٹیاں کھول کے دیکھنا کا ٹھنیں لگانا اور پرانی چیزوں کو ہاتھ میں پکڑ کر ان سے وابستہ یادوں کو تازہ کرنا وقت کا بہترین مصروف ہو جاتا ہے۔  
 مگر نوبین کے ساتھ کیا مسئلہ تھا۔ وہ جو سنہ برس کی نہیں تھی۔ وہ بیس تیس برس کی بیک لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں شوخ و شنگ تھیں۔ زندگی کے جام سے قطرہ قطرہ رس بھرنے والی۔  
 زور سے ہنسنے والی بازاروں میں من پسند چیزوں کی خریداری میں جھگڑت دکھانے والی، ریموٹ ہاتھ میں لے کر جینٹل بڈل کر لطف اٹھاتی تھیں۔  
 جن کی موجودگی درود پوار سے جھلکتی تھی۔ جانتی 400 واٹ کے بلب کی طرح روشن لڑکیاں۔  
 اور نوبین۔۔۔ نوبین منیر خان۔۔۔  
 خاموش۔۔۔ گرد و پیش سے انجان بھی ہوئی موم جی جی لڑکی۔  
 ”وہ تو لرزہ براندہم۔ وجود تو پھٹتا ہوا۔ سون بدن گھٹا ہوا ڈھیلے ڈھالے لباس میں۔۔۔ سیدھی جونی گوندھے بے آواز قدموں سے اندر باہر گھومتی لڑکی۔  
 نہ کوئی رنگ نہ ترنگ لڑکیاں کوئی ایسی ہوتی ہیں۔ دفع۔۔۔ نوال نے سوچا۔  
 اس نے نوبین کے معمولات کو ٹوٹ کیا تھا۔

نوال کے جی ’ز سرے کی چھوٹی پٹی نہیں تھی مگر دونوں ماں بیٹی صبح اہتمام سے اٹھ جاتیں جیسے نوال کو تیار کروائے بھیجنا ان کا اولین فرض ہو۔  
 نوبین اس کا بیک چیک کرتی اور فائل کو سامنے رکھتی۔  
 نانو کا دل چاہتا وہ اندر اٹھا اپنے ہاتھوں سے اس کے منہ میں ڈالیں۔ (بلکہ اگر ہو سکے تو بچہ بکس بھی بنا دیں) پونیاں کس دیں۔  
 وہ نماز کے بعد اہتمام سے بکین میں جا کھڑی ہوتیں۔  
 دیر ان زندگی میں نوال نام کی پہلچل نے رنگ ہی رنگ بھر دیے تھے۔  
 نوال بظاہر ایک لالہابی لڑکی دکھائی دیتی تھی خود میں مگن اپنے دل کی کہتی۔ جبکہ درحقیقت وہ بے حد حیاں ’ز م دل لڑکی بھی مگر اس کی اضافی خدا داد خوبی یہ تھی کہ وہ دکھوں پر ٹیکوں میں منہ دے کر روتی نہیں تھی۔ ہار تسلیم نہیں کرتی تھی۔  
 آج چھٹی تھی۔ نہ منت بیگم نے نہاری بنائی تو ایک ڈونگا اٹھش کے لیے بھی بھرا۔ وہ بے خود کو بیچ رہی تھیں کہ آج چھٹی ہے۔ اخطب بھی گھر میں ہو گا اور چھٹی کے دن دیر سے اٹھنے کے باعث یہ ان کے ناشتے کا وقت ہو گا۔  
 ”اب نہیں بیس بلا لیں نانو۔ سب مل کر کر لیں گے۔“ نوال صوفے پر اوٹھ بیٹھی تھی۔  
 ”نہیں۔ بس بیچ رہے ہیں۔ ہم مل کر کریں گے۔“ نوبین نے قطعیت سے کہا۔  
 ”نوال کی سوال یہ تھی کہ نانو پر نکلیں۔  
 ”وہ دراصل تمہارے تانا کے انتقال کے بعد بھائی صاحب اور اخطب نے بھی ادھر اندر آنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ بہت مجبوری ہو تو۔۔۔“ نہ منت بیگم نے ذرا اٹک کر کہا۔  
 ”وہ اٹھش تو ہر وقت گھسا رہتا ہے۔“ نوال کو آگ لگی۔  
 ”بیٹا! وہ بچہ ہے تو اسوں پونوں کی عمر کا ہے گھر کا فرد

ہی لگتا ہے جبکہ۔۔۔ زینت بیگم نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

”جبکہ۔۔۔؟“ نوال نے سوالیہ نگاہیں ماں بیٹی پر جمادیں جو ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموش تھیں۔

”بیٹا۔۔۔ زینت بیگم نے حلق تر کیا۔“ اشتیاق بھائی میرے ہم عمر ہیں۔ سالوں کا ناتا ہے مگر دنیا۔۔۔ وہ تھوڑا سارا لیں۔

”مگر ناتا! بندے کا دل صاف ہونا چاہیے نا۔۔۔ میں اپنے اعمال کی خود ذمہ دار ہوں۔ میں دنیا سے کبھی نہیں ڈرتی نا تو۔۔۔ کیا نعمان بھائی آپ کی اس مشکل سے واقف ہیں؟“ سے وہیمان آیا۔

”جب کوئی دور ہو جاتا ہے وہ واقفیت رہ جاتی ہے نہ مشکل کشائی۔“ توین کا جملہ سرگوشی تھا۔

”اور اخطب اس لیے نہیں آتے ہیں کہ وہ نوین خالہ کے ہم عمر ہیں۔“ نوال نے جیسے سراپکڑ لیا (سو طے ہوا کہ ہماری اسے ہی وہاں لے کر جانا ہوگی)

”نہیں۔۔۔ زینت بیگم کے منہ سے کراہ آئیز اختلاف ابھرا۔“ اسے نوین نے آنے سے منع کر دیا۔

”مگر کیوں؟“ اس نے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔ مگر زینت بیگم جیسے اب کچھ اور بولنا نہیں چاہتی تھیں۔ یہ فاتو کا جملہ بھی بس یوں ہی منہ سے نکل گیا تھا جیسے۔ نوین کڑے تیروں سے ماں کو گھور رہی تھی۔ اس نے پچھلی بار وقت رخصت اخفش انعام کے ایک انکشاف پر اپنی ازلی دعویدار فطرت کے پیش نظر کچھ دعوے کیے تھے۔

”ارے سنو! اتنا ہنڈم بندہ اور ابھی تک شادی نہیں کی۔ کمال ہے کیوں نہیں کی؟“ اس نے اخطب اشتیاق کی سحر انگیز تصویر دیکھ کر بڑے دھڑلے سے پوچھا تھا۔

اور جواب میں اخفش انعام نے کتنے دل جلے انداز میں انسا سوال جڑوا تھا۔

”تمہاری خالہ بھی تو اتنی خوب صورت اُسمارت ہیں۔ انہوں نے اب تک شادی کیوں نہ کی؟“

اور اس نے کہا تھا کہ، ”کیا ان دونوں باتوں کا آپس

میں کچھ تعلق ہے؟“

تو اخفش نے سر زور سے اثبات میں ہلایا تھا۔ ”میں اصل بات معلوم کر سکتی ہوں اخفش۔“ وہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مگر کیا تم انجام بخیر پہنچا سکو گی؟“

اور نوال ضمیر نے سر زور سے ہاں میں ہلایا تھا۔ اور اسے یاد تھا کہ اس نے یہ کام کرنا ہے۔ باقاعدہ پلان نہیں تھا۔ کب کیسے اور کیوں؟ لیکن۔

”اب وہ وقت آچکا ہے نوال!“ اس نے خود کو مخاطب کیا۔

وہ جن حالات و واقعات سے اس نے آگاہی حاصل کی تھی وہ بے حد روایتی اور عام سے پھٹ چر تھے۔ مگر ناتو کا یہ جملہ۔

کہ اخطب اشتیاق کو خود نوین نے اپنے گھر آنے سے منع کر دیا۔ اپنے اندر بہت اسرار معنی کہانی لیے ہوئے تھا۔

”تو چلو نوال ضمیر۔۔۔ آج سے یہ کام شروع کیا جائے!“ اس نے ہماری کا ڈونگا اٹھاتے ہوئے خود کھائی کی۔

بخیر انجام کی طرف پہلا قدم۔



بڑی اوپرین کے عالم میں اس نے اخفش کے گھر میں قدم رکھا تھا۔

اسے مسلسل یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ دیر کر چکی ہے۔ اپنے دعووں کی تکمیل کے لیے۔ لیکن خیر اتنی دیر بھی نہیں۔ جس وقت جو کام شروع کر دیا جائے وہی اس کا اصل وقت ہوتا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے سب سے باخبر شخص اور کام کا بندہ

اخفش انعام ہے اور ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیتا ہوتا ہے۔ خود کو عقل دیتے ہوئے اس نے

سانے گدھے کو بھی دیکھا جو معذور ہاتھ کے باعث اٹنے ہاتھ سے ساس بین میں پانی بھر رہا تھا چائے بنانے کی کوشش۔

صوفیہ اشتیاق اخبار دیکھ رہی تھیں اور اخطب اشتیاق صوفیہ پر بند آنکھوں کے ساتھ

بیٹھے تھے۔ چائے ملتی تو آنکھ کھلتی ناں۔ اور ٹڑے ہاتھ کی جائے۔ (ہ)

”اخفش سے دوستانہ تعلقات وقت کی اہم ضرورت ہیں نوال۔!“ اس نے سوچا۔ ابھی وہ آگے بڑھے گی اور اس کے ہاتھ سے برتن لے کر

چائے بنا دے گی۔ ایک احسان اس پر اور ایک ان پر جو اونگھ رہے ہیں وہ دسب قدموں اخفش کے سین سر پر

پہنچنے والی تھی۔ چونکا نے کے لیے مگر۔ ہائے۔ خود بری طرح چونکی بلکہ ڈونگا کرنے سے بڑی

مشکل سے بچلائی۔

”تم تو ملتی ہی نہیں۔“ بسورے لہجے کا زبردست شکوہ اشتیاق احمد اس کے سر پر کھڑے تھے اور اس کی

چٹنماہارے پر تینوں افراد ہی متوجہ ہو گئے۔ صوفیہ بیگم نے اخبار رکھ کے بھرپور خیر مقدی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

اخطب کی فینڈا اڑ گئی۔ اب وہ بیدار تھے۔ اخفش نے ساس بین واپس رکھ دیا۔ اس کی کوئی

بھی جی جھوٹی کمزوری نوال کے سامنے کیوں عیاں ہو۔ خواہ مخواہ۔

”یہ۔۔۔ یہ؟“ نوال نے ڈونگا ان کی جانب بڑھا دیا۔ ”آپ کے لیے۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ انہوں نے ڈھکن اٹھا کر ایک لباس اس کیچھا۔ ”نوین نے بنائی ہے۔“

وہ خوشبوئی سے بنائے والی کوپچان گئے۔ سب کو مطلع کیا۔

”اتنے دنوں سے آئیں کیوں نہیں۔؟“ اب وہ ڈھٹ کر پوچھ رہے تھے۔

”سنو! مصوفیت۔“ نوال جیج گڑوا گئی۔

”آپ پر یہ رنگ بہت سوٹ کر رہا ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

تیز پیلے رنگ کا ٹراؤزر شرٹ۔ سرے والی کالی کھچیں۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں۔“ ڈونگا کچن کاؤنٹر پر بھا کر وہ

اور اسے بھی بیٹھے کا اشارہ کیا۔

”تم نے بھی مجھے۔۔۔ بے بی پنک کلر کے ٹریک سوٹ میں نہیں دیکھا۔ اس میں تو میری اسکن ایسے

شان کر رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔۔۔ پتا نہیں لگتا۔ اسکن کون سی ہے اور ڈریس کہاں ہے۔ کل آتا میں وہی

پہنوں گا۔“

نوال کی آنکھیں پھیلیں۔ اس نے تینوں کو دیکھا جو ہمہ تن گوش تھے۔

”آپ روز جاگنگ پر جاتے ہیں جب ہی آپ کی فٹنس بہت خوب ہے۔“ گڑوا نوال نے ٹاپک بدلنے کی غرض سے کہا۔

”فٹنس۔۔۔ حق ہا۔“ ایک لفظ کہہ کر وہ صدمائی مرا تے نہیں چلے گئے۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ تم کبھی بیس سال پہلے مجھ سے ملتے۔ پھر فٹنس میری فٹنس کا عالم۔“

”بیس سال۔۔۔ پہلے۔۔۔ میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انکل!“

”کیا۔۔۔؟ تم نے مجھے انکل کہا۔!“ وہ شدید صدمے میں آگئے جیسے۔

”جی۔۔۔ اس نے نا سمجھی میں اقرار کیا۔ ”سب کچھ کہنا مگر۔۔۔ انہوں نے شعوری و تقدیر

”مجھے انکل مت کہنا۔“ وہ بالکل خفا ہو گئے تھے۔

”تت۔۔۔ تت تو پھر میں آپ کو کیا پکاروں گی؟“ اس نے انہیں دیکھا اور پھر سب کو۔

”آپ‘ یہ‘ میں‘ وہ‘ یہ‘ سب کیا ہے تم میرا نام کیوں نہیں لیتیں؟“

اشتیاق احمد نے بڑے شکوہ کنل انداز میں پوچھا آخری لفظ تک پہنچتے انداز ڈپٹے جیسا ہو گیا۔ بہت دیر سے خاموش مدہم مسکراہٹ چہرے پر سجائے بیٹھی

صوفیہ بیگم نے ہلکی بارود عمل ظاہر کیا۔

آسمان کی طرف مد طلب نگاہوں سے دیکھا اور سر ہاتھوں پر گر لیا۔

گئے۔

”مذاق کر رہا تھا یا رہا۔ تم انکل شکل کا ٹنٹا پٹاؤ۔ سیدھے سیدھے ادا جان کھڑا شخص کی طرح یا پھر تاناہی!“

سرے سے لدی شرر آنکھیں۔ شرر انداز۔ نوال کھکھلا کر نہ دی۔

”یہ آپ اتنا سرمہ کیوں لگاتے ہیں؟ یہاں کراپی میں بسوں میں آواز لگا کر سرمہ بیچنے والے بھی اس سے کم ہی لگاتے ہوں گے۔“ اس نے جوالی حبلہ کیا۔

”یہ سرمہ۔۔۔ ہلایا یہ تو کچھ بھی نہیں۔ تم کبھی مجھے جوالی میں ملتیں جب میں کالج میں تھا۔ پنجاہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں میرے فیلو مجھے آکاسری کہتے تھے۔ اب تو وہ آنکھ ہی نہ رہی۔ جس کی حاشیہ آرائی تھی۔ آہ۔۔۔!“

ان کے پر لال انداز اور غم زدہ چہرے نے تو اس بار نوال کا منہ کھول دیا تھا۔ حاضریں اشتیاق صاحب کے جملے سے زیادہ نوال کے چہرے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

\*\*\*

نانو کے کمرے سے تیز اور اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اوپنی اور تیز آواز نوین کی تھی اور چونکہ نوال نے کبھی اسے اس طرح بولتے سنا نہیں تھا۔ سو ذرا متعجب ہو کر وہ آواز کے تعاقب میں نانو کے کمرے تک پہنچی تھی۔

نہنت بیگم کی نگاہوں میں بے چارگی، دل گرفتگی، حیرانگی اور افسوس تھا۔ وہ خاموشی نوین کو تک رہی تھیں پھر نگاہیں جھکا لیں۔

دوسری جانب نوین کا چہرہ تھمرا ہوا تھا۔ خفا، بے زار، جارحیت کا ایک رنگ بھی محسوس نہ تھا۔ وہ ملاوچی سیٹ کمرے کو دوبارہ سے سیٹ کر رہی تھی۔ نیچے چھاؤٹی، بیڈ شیٹ کو ہلاتی۔ وہ کچھ بول بھی رہی تھی۔

”جب میں ایسا کچھ جانتی ہی نہیں ہوں تو پھر کیوں ہر مہینے پر اہتمام کر کے بیٹھ جاتی ہیں۔“

”زندگی اکیلے نہیں گزرتی۔“

”گزار تو رہے ہیں تال۔ اور اکیلے کب نہیں اور آپ ہیں اور اب تو نوال بھی ہے اور۔“

”تم ہو یہی سب سے بڑی فکر ہے۔ نوال ہے۔ دو چار سال تک کا تعلق اور میں۔۔۔ مجھے تو اپنی عمر کا باقیہاں بھی نہیں کہ رات دیکھوں گی بھی کہ نہیں۔“

نہنت بیگم نے حقیقت بیانی کی حد کر دی۔ نوین کے تیزی سے چلتے ہاتھ ٹھٹھکے تھے۔ مگر عرصے اس نے آنے والے کسی محسوس خیال کو تیزی سے جھٹکا اور ساتھ ہی نیچے پر بھی نذر کا ہاتھ جمایا۔

”شادی کرنی ہی پڑتی ہے نوین۔!“ نہنت بیگم کا لہجہ شکست خورہ ہو گیا۔

”اور۔۔۔ کئی لوگوں کی شادی ہوئی ہی نہیں۔“ وہ ترنت ہوئی تھی۔

”میں نہیں چاہتی کہ تم ان کی لوگوں میں شامل ہو۔ خدا خواستہ۔“ نہنت بیگم دل ہی گئیں۔

”ہمارے چاہنے نہ چاہنے کی جیسے بڑی اہمیت ہے تال۔ تو نوین کا لہجہ زخمی سا تھا۔

”ہے نا اہمیت۔“ نہنت بیگم ایک نئے دلوں سے اٹھی تھیں۔

”مگر تم تو وہ بھی نہیں مانتیں۔“ وہ دھیمی ہو گئیں۔ ناکام۔

”وہ باب ختم ہو چکا اسی۔!“

”مگر یہ وہ اب بھی زندگی کی کتاب کا ایک حصہ۔“ نہنت بیگم نے برجستگی سے کہا تھا۔

نوین کو جب لگی۔ وہ اسی کی ماں تھیں خاموش، بوڑھی، بے بس کمسن۔

”اکثر کتابوں میں کچھ باب غیر ضروری ہوتے ہیں۔ انہیں روٹی و بے روہیانی میں اگر پڑھ بھی لیا جائے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ امتحان میں آنے ہی نہیں ہوتے تو پھر مزید وقت کا ضیاع کیوں؟“

”کتاب کا حق ہے کہ اس کے ہر باب کو عزت دی جائے۔“

بلکہ غیر ضروری اوراق کو پھاڑ کر الگ تو نہیں کرتے، ہمیشہ جڑے رہتے ہیں۔“

”میں نے کب کہا کہ میں پھاڑ چکی ہوں یا پھاڑ دوں گی۔ بس میں ان صفحات سے بہت آگے نکل آئی امی۔ لکھا پڑھا سب بھول گئی۔ مجھے اب کوئی امتحان پاس نہیں کرنا۔ کوئی میڈل نہیں جیتنا۔ مجھے بس زندگی کے دن جیتنے ہیں آپ۔“

”میں کون کونج بیٹھا ہے نوین؟“ نہنت بیگم کی آواز بھرا گئی۔ شکست خوردگی نے چہرے کو تاریک کر دیا تھا۔ جو آج بھی جلوں پر داوے لگے ہیں جملے بازی میں تم سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تم زیادہ بڑھی لکھی اور قابل ہو۔ میرا تو بس ایک سوال ہے۔ ضد چھوڑ کر اپنا گھر سلاؤ۔ مجھے سکون کی نیند سونا ہے۔ بس ایک انکار کے علاوہ کچھ بولیں نہیں نہ وجہ۔ نہ اعتراض۔ کچھ تو کہہ دو۔“ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں تو۔۔۔

نوین بھی ہاری ہاری سی بیڑ پر لگ گئی۔ خاموشی سے سب سختی نوال کے لیے قدم اٹھانا دو بھر ہو گیا۔ کیا وہ واپس پلٹ جائے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ نہیں نوال ضمیر پلٹنے کا نام نہیں۔

”آج صبح میں کچھ خاص اہتمام ہونا چاہیے۔ بلڈولت بڑے دنوں بعد گھر میں ہوں گے۔“ وہ شاہانہ لہجے میں کہتی کمرے میں یوں داخل ہوئی کہ جیسے چھت سے ٹپکی ہو۔۔۔ دونوں بڑی طرح چونکیں۔

نہنت بیگم کے چہرے پر ملجی سی مسکراہٹ لہرائی۔ جبکہ نوین نے تیزی سے چہرے پر ”سب اچھا ہے“ کا والیو پیچر اپنا پیش نظر آنے کی بھونچائی کو پیش۔

”واؤ۔ پچھڑا۔!“ نعرے کے ساتھ ہی اس نے درمیانی پائی پر بڑی چند تصاویر اٹھائیں۔

”اچھا آ آ۔“ اس نے تصویر چلی تو پیچھے درج باؤڈیا سامنے آ گیا۔

”تو یہ وہ تصاویر ہیں جو رشتے کرانے والی آئینوں کے پرے میں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ یہاں ہمارے گھر میں لگا کر رہی ہیں؟“ اس نے خود ہی بولتے بولتے آخر پوچھ لی۔ پھر دوبارہ جواب کا انتظار کیے بغیر شروع کر دیا۔

”اب یقیناً“ چوائس کا مشکل مرحلہ ہو گا۔ تصویریں ماشاء اللہ ہیں لیکن اتنی اچھی۔“ اس نے تصویر کو الگ کیا اور ٹیبل پر سجایا۔

”دیکھئے۔ ان تینوں کے یہ جو فاسٹ البیل ہیں ان کے ان چٹیل میدانوں پر اعتراض کرنا بے وقوفی ہے جب حورم سلطان سب سے سکیمان پر اور خیر نہ سمجھیں، سبجے ابراہیم پر دل و جان سے فدا ہو سکتی ہیں کہ مرے مارنے پر آج میں تو آپ اور میں کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے۔“ میرا سلطان“ سبجوں کے لیے امید صبح ہے ایک نئی زندگی۔ لڑکیوں، بھول گئی ہیں بابر علی، دھتک روشن، رنویر سنگھ کے بالوں کو۔ سبجے فیشن میں ان ہیں۔“

نہنت بیگم اس کی فرمائے سے چلتی زبان سن کر گنگ تھیں جبکہ طرز بیان نے نوین کے چہرے پر مسکان بکھیر دی تھی۔

اس کے انداز سے اس کا فطری لا باہلی پن، جھلک رہا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ بڑی گہری نگاہ سے ہر چیز کو دیکھ رہی تھی۔

سب سے پہلا لفظ ذات تھا جو سب کی وہی تھی جو تانا جان کی تھی۔ کئی عموں کے حروے خزانہ۔۔۔ تھری ہیں پسین کر جا کر بنائے گئے ہل فوٹو اسٹوڈیو کے بیک گراؤنڈ والی پچھڑا۔ جن پر پہلی نگاہ ڈالنا ہی دل گردے کا کام تھا۔

ایک صاحب نے تو حد کر دی۔ رینڈے تھے اور ایسی تصویر بھیجی تھی جس میں مسکین ہو جانے والے دو بچے بھی ہمراہ کھڑے تھے صاحب حیثیت تھے اور سچائی کے علمبردار بھی۔ جلی حروف میں درج تھا۔

”کوئی ڈیمانڈ نہیں۔ بس ایک نیک ڈراؤنڈ، عمر 35 سے زیادہ نہ ہو، اعلیٰ تعلیم یافتہ، گھریلو سلیقہ، شعار، صوم، صلوة کی پابند، کوٹاری، دو شیزہ کار شیزہ درکار ہے جو بچوں کو مال کا شوق پیدا کر سکے۔ (شادی، بچوں کے لیے ہی کی جارہی ہے)“

”میرے خیال میں آپ کو اتنی ہی قانع رشتے کی



ضرورت تھی۔ اس نے چاہا کہ دونوں کو دیکھا۔  
”پھر کون سا فاسل کرنے کا ارادہ ہے؟“  
”یہ باتی ہی نہیں۔“ زینت بیگم نے مجھے لمحے میں کہا۔

”واحد صحیح کام جو یہ کر رہی ہیں۔“ وہ تاسف آمیز لمحے میں کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ”ان کے علاوہ اور کوئی پروپوزل نہیں ہے؟“  
”ہیں تو بکر۔۔۔ کاسٹ (ڈاٹ) الگ ہے اور تمہارے نانا جان کی پہلی شرط کاسٹ ہوتی ہے۔“  
”نانا جان؟“ وہ لگا سا چلائی۔ ”وہ یہاں کہاں سے آئے۔۔۔ وہ فوت ہو چکے ہیں نا؟“

اس نے ان کی بے خبری پر سر پٹا تھا۔ وہ دونوں کو باری باری گھور رہی تھی۔ جنہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر نظرس چرائی تھیں۔

”اور کیا اب اس قسم کے رشتے فاسل کیے جائیں گے۔ خالہ کیا ایسے پائزہ فروزہ کرتی ہیں اور دوسرے؟“  
اس نے زار رک کر دونوں کو گھورا۔ ”جتنا میں نانا جان کو جان چکی ہوں اس حساب سے تو خالہ کی شادی کم از کم چند برس پیش کر دی جانی چاہیے تھی۔ پھر اتنی دیر کس لیے۔ پہلے کیا سب سو رہے تھے؟“

نویں کے چہرے پر عجیب سا مٹاؤ آرکا۔ نوال منہ پھٹا تو تھی۔ ”مگر وہ اتنا خیر مار کہ سوال بھی کر سکتی تھی کہ۔“

دونوں کی خاموشی نے نوال کے غصے کو بھڑکایا۔

”اب جواب کیوں نہیں دیتیں؟“  
”پہلے تو یہ بہت چھوٹی لگتی تھی۔ اس طرف دھیان نہ گیا۔ پھر تمہارے نانا ذات براہوی کو بہت اہمیت دیتے تھے تو۔“

”اوہ شٹ!“ نوال نے بھنا کر اپنا ہاتھ سربراہا تھا۔

”پہلے تو خاندان ہی سے باہر نکلنے کو تیار نہیں تھے۔ پھر کئی سالوں میں اس بات پر قائل ہوئے کہ چلو باہر ہی کرتے ہیں لیکن ذلت براہوی میں سوہ تھے تو دیکھ

بھی احساس نہ ہوا اور اب لوگ کہتے ہیں۔ کچھ بھائی نہیں۔ سارے رشتے ایسے ہی آتے ہیں۔ ایک تو رشتوں کا ویسے ہی کال پڑا ہے اور پھر اگر اس پر شرارت باندھ دی جائیں تو سمجھو۔“ جس کے ڈھیر سے سنی ڈونڈو۔“

زینت بیگم کا لہجہ اتنا مدھم تھا جیسے وہ تنہا بیٹی خود کلائی کر رہی ہوں۔ یادداشت نفل رہی ہوں۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے نا۔ خالہ میں کس چیز کی کمی ہے؟“ وہ تحیر کے باعث انک انک کر لول رہی تھی۔ ”زیادتی ہی زیادتی کہہیے۔۔۔ شکل صورت رنگ روپ، تعلیم، خاندان، شرافت، نجابت۔“

نویں کی نظرس سامنے دیوار پر لگی تھیں اور چہرہ یوں بے باک تھا جیسے کچھ سنائی نہ دے رہا ہو۔

”رہتے تو۔۔۔ اور ہیں بھی مگر وہی ذلت براہوی اور تمہارے نانا کی شرائط۔۔۔“

”نانا اب نہیں رہے نا۔“ نوال نے سر پٹ لیا۔

”تو؟“ نویں نے یکدم سراٹھا کر سوال جڑ دیا اور اس کے ”تو“ کے اندر بہت کچھ تھا جتنا ”پوچھتا“ جتنا دھمکا۔

”تو یہ کہ آپ اپنے حساب سے چیزوں کو فاسل کریں جو آپ کو مناسب لگے۔“ نوال کے آگے ہمتی سلبنے لگی تھی۔

نویں نے نگاہیں اس کے چہرے پر نکا دیں۔ ”تمہاری ہونوال!“ زور اڑا کر فستے ہوئی۔

نوال نے سینے پر ہاتھ لیٹے۔ وہ عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”اور آپ بے وقوف ہیں خالہ!“ اس نے اسی کے لمحے میں مگر جابجا نہ انداز میں جواب دیا۔

”مجھے اپنی بے وقوفی پر عزم ہے۔ تم اس معاملے میں مت آؤ۔“ وہ روشنی سے کہتی باہر نکلی تھی۔

”ہائیں!“ نوال نے ہلے پورے کو دیکھا اور پھر آہستہ پوچھتی نانو کو۔

رات گرم اور بو جھل تھی بوئی ایس سے چلنا پھینکا دم توڑنے کو تھا۔ نوال کو گری لگی۔ چٹاں لگی اور پھر جھوک۔ وہ ذوقی جھجھکتی پکٹ تک آئی۔ خرتج سے انگری کی پلٹ اٹھا کر ڈائٹنگ ٹیبل پر آگئی۔

کاسن کی کھلی کھڑکی سے ہوا آ رہی تھی۔ چپ چاپ بیٹے شری رات۔ اس نے رات کو نام دیا۔ جین تھیں، کیس بہت ہلکے سر بن کر رہے تھے۔ اس کا سوا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا۔ واقعی بڑی ہی مدھم آواز گونج رہی تھی۔

”لو آگئی۔۔۔ ان کی یاد وہ نہیں آئے۔“  
وہ آواز کے تعاقب میں گئی نوالان میں لگی۔ آواز نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔

”ہیں!“ وہ چونک کر پوری طرح بیدار ہو گئی۔ کین کی کرسی پر نویں براجمان تھی۔ رات کے اس پر وہ ہی دل، ہمارا رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور سینے پر ایک ڈائری دھری تھی۔ وہ دبے قدموں نویں کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ نوال نے دیکھا وہ سوچتی تھی۔

چاندنی رات میں اتنی روشنی تھی کہ وہ قیاس کر سکتی۔ نویں کچھ لکھ رہی تھی۔ کیونکہ ایک غزل کے مصرعے کا دھور اپن نمایاں تھا۔

”واؤ۔ چاندنی رات۔۔۔ اولڈ غمگین سا رنگ۔۔۔ اور غزل کتنی ایک لڑکی وہ کیا سین ہے۔“

اس نے احتیاط سے ڈائری اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکالی۔

اعصاب کو شل کر دینے والی موسیقی کا گانا گھونٹا اور مایا گل ناچ کھلے دھڑکے پڑائی اور پھر ہمتی چلی گئی۔

ہائے، اتنی آواز۔۔۔ خشک، مرنے کے بعد بھی بندہ کم از کم اس سے زیادہ زندہ غزل کہے۔ اف اس نے دل کر سچا۔

ڈائری کے ورق پھر پھڑکے دیکھے تو اکثر میں کچھ نہ کچھ لکھا نظر آیا۔ نوال نے ایک اور نظم جتنی۔

ایسی نظم جو سی این جی پمپ بر ساری رات کھڑے رہنے کے بعد باری آنے پر پتا لگے جی کیس ختم ہو گئی۔ پھر بھی اس نظم سے اچھا ہی سوچے۔

گوانتا موبے میں خالہ کی غزلیں سنوا کر قبول جرم کروایا جاسکتا ہے۔  
چودہ سالہ قید کے بجائے۔ یہ نظمیں ہی صبح شام پڑھنے کو وی جائیں تو۔۔۔

”وہنا!“ اسے ایک سایہ سا محسوس ہوا۔ اخفش کی گیلری سے نظر آتا ایک دو بیسہ نوال جہاں کھڑی تھی وہاں سے وہ گیلری میں کھڑے شخص کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔ مگر کین کی کرسی پر بیٹھا شخص اس سائے کو بغور دیکھ سکتا تھا۔

یہ کمرہ اخفش کا تھا۔ مگر سایہ اخفش کا نہیں تھا۔ رنگ بر دونوں ہاتھ جہا کر سکت ہو جاتا۔ پھر سگریٹ کے عیش لیتا ہوا یہ اخطاب کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

تنبذب کا شکار نوال بری طرح چونکی۔ مردہ خانے میں رکھی جانے والی وہ نظم جسے نوال نے ابھی پڑھا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔ ”سلیہ“  
یعنی مائی گاؤ اس نے خالہ کو گھورا تھا۔



”میں سوچ رہی ہوں خالہ۔ یہ لوگ! اپنی کتابوں کا اقتساب کس سوچ کے تحت۔۔۔ لوگوں کے نام کرتے ہیں؟“ نوال بڑے اچھے موڈ میں نویں کے بیڈ پر اونٹھی لیٹی کتابوں کے اقتساب پڑھ رہی تھی۔  
”کوئی بھی سوچ جو ان کے دماغ میں اس وقت آتی ہو۔ یا جو حق دار ہوں۔“

”حق دار۔۔۔ حق دار سے تو یوں لگتا ہے جیسے چندے کی تقسیم ہو۔ لیکن پھر بھی۔ اب دیکھیں یہ ایک امریکن عورت نے کتاب لکھی اور اقتساب کر دیا اپنے کتے کے نام۔“

”ارے!“ نویں حیرت زدہ رہ گئی۔ ”ان خاتونوں سے ملنا پڑے گا۔“

”الٹی باتیں ہیں آپ کی۔“ نوال کا موڈ آف ہوا۔  
”اس کتے سے ملنا پڑے گا خالہ!“ نویں زور سے ہنس دی۔

”اچھا اگر آپ کبھی کوئی کتاب لکھیں تو انتساب کس کے نام کریں گی؟“ وہ گھبر گھار کے نوین کو مطلب پر لائی۔

”میں۔۔۔ میں نے کبھی سوچا نہیں۔“  
”یہ خالہ بھی ناں آسانی سے ہاتھ نہیں آتیں۔“

نوال نے دانت پیسے  
”اچھا اگر تم کبھی کتاب لکھو تو کس کے نام کرو گی؟“

”تو جی یہ کوئی سوال ہے اگر کیوں؟ میں عنقریب ایک کتاب لکھنے والی ہوں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”کس موضوع پر۔۔۔؟“ نوین نے دلچسپی سے پوچھا۔

”نوال ضمیر کے لیے موضوعات کی کیا کمی۔ میں ہر موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کر سکتی ہوں مگر خیر آپ کی معلومات کے لیے۔“

فی الوقت پیش نظر دو موضوعات ہیں بس یہ ڈن کرنا باقی ہے کہ پہلے کون سا چنوں۔۔۔“ اس نے اویانہ توقف کیا۔

”گھبریلو آلات کی مرمت خواتین خود کریں۔“ توین کے چہرے پر ستائش ابھری نوال سے اچھی کتاب اس موضوع پر اور کوئی نہیں لکھ سکتا تھا۔

”اور دوسری کتاب تخریب نوعیت کی ہے مگر۔۔۔ خیر مردوں پر گھبریلو تشدد کے طریقے بہت متاثر ہو کر سختی نوین بھونچکی رہ گئی۔

”یہ کیسی کتاب ہو گی؟“ توین کی آواز میں ہکا بھٹ آئی۔

”اس میں یہ ہو گا کہ کسے خواتین ذرا سی بھی حکم عدولی پر مردوں سے باز پرس کر سکتی ہیں۔ انہیں دھمکا سکتی ہیں اور سدھار سکتی ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ توین کا تعلق شک ہونے لگا۔

”دیکھیے! پہلا اصول تو نوینور سل ہے کہ پہلے پیار سے اور بعد میں مارے لیکن مرد ذات آغاز پر نہیں انجام پرتیں رکھتی ہے لہذا۔“ وہ تھری۔

”عورتیں مارنے کے لیے کچھ بھی استعمال کر سکتی ہیں جو انہیں میسر ہو۔ لیکن کب اور کہاں مارنا ہے؟“ کتاب سے پتا لگے گا۔ دو باتیں پیش لفظ میں لکھوں گی۔

”جرم کر کے جائے وقوعہ سے ترنت عائب ہوئے۔“ اور دوسرے جرم کا نشان نہ چھوڑنا، یونو سیف سائیڈ۔“ نوال خاموش ہوئی۔

”اور ان کتابوں کا انتساب کس کے نام ہو گا؟“

”پہلی دہائی کا تو ظاہر ہے اپنے ڈیڈ ضمیر خان کے نام اور دوسری کا میں اپنے ہی نام کروں گی۔“

”بہت اچھا کرو گی۔ اور تمہاری ہی ہمت ہے جو اپنے نام کر لو گی جبکہ ایسی کتاب بے نام ہو تو زیادہ اچھا ہے۔“

انفخشی کی جلی سٹی آواز پر دونوں چونکیں۔ نوین کی آنکھوں میں پانی تھا اور جڑے دکھ رہے تھے۔

”نہیں۔ میں اتنی بھی سیلغش نہیں۔۔۔ اگر تم کہو تو تمہارے نام بھی کر سکتی ہوں۔ کیونکہ؟“ نوال بڑے محبوبانہ انداز میں مسکرائی۔

”ایک انسپہاریشن تو تم بھی ہوتی۔“

”مجھے تو تم معاف رکھو۔“ انفخشی نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”اور تم چُھب کر ہماری باتیں سن رہے تھے۔“ نوال کو دھیان آیا ”چھنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم آکر بیٹھ بھی سکتے تھے۔ میں کوئی منع کرتی۔ یونو علم بانٹنے سے بڑھتا ہے۔“

”رہنے دو لی جیو ہاندو را ہی بھلا۔“ انفخشی نے جل کر دونوں ہاتھ جوڑنے کی سعی کی (پلستر جو بند تھا)

نوال نے فلک شکاف ترقہ لگایا۔ نوین بھی سمجھ کر ہنس دی انفخشی نے بے خیالی میں خود کو چوہا کہہ دیا تھا۔

”جست پر کبیل والا کھڑا ہے۔ آپ دیکھیں۔ اب چینلز صاف آرہے ہیں یا نہیں؟“ انفخشی نے اپنی آمد کا مقصد بھی بتایا۔

”ارے ہاں۔۔۔!“ نوین اچھل کرٹی دی کی ست بڑھی۔

”تو خالہ! آپ نے بتایا نہیں کہ آپ اپنی کتاب کا حساب کس کے نام کریں گی؟“ اخفش ریموٹ کے ساتھ لگا تھا تو اسے اس ساری کن ترانی کے اندر چھپا اصل مقصد یاد آیا۔

نویں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اتنے دنوں بعد وہ دل سے ہنسی تھی۔ اسے بھانجی پر ٹوٹ کر ہار گیا۔

”تمہارے نام کر دوں گی۔“ نویں نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا اس کا چہرہ سچائی بیان کر رہا تھا۔  
”واہی۔!“ نوال کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔



”واقعی بعض لوگ اُلٹے ہاتھ سے بھی ہانڈی میں ڈوٹی گھما دیں تو ڈال لیتے آجاتے۔“  
نوال کی شوخ جناتی سرراشتی آواز پر اخفش بدک کر چولہے سے دور ہوا سیدھا ہاتھ تو پلا ستر کے باعث گردن میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ ڈھیروں سامان سلیب پر پھیلائے اُلٹے ہاتھ سے ڈوٹی گھما رہا تھا۔  
صوفیہ بیگم اپنی پھل چیر سمیت کچن میں تھیں اور گوشت شیت چھڑا کر نمائز رکھ رہی تھیں۔ نوال کے سلام کا جواب اشارے سے دیا۔

”خوشبو خوشن دار ہے کیا بن رہا ہے؟“  
”برائی۔۔۔ اخطوبہ کے دو تین دوست آرہے ہیں ذریعہ۔“ صوفیہ بیگم نے بتایا۔  
”تو وہ آپ کی پروین۔۔۔ فرین، شرمین کہاں ہے؟“ اس نے اوپر اٹھ کر دیکھا۔

”وہ آج نہیں آئی ہے جب ہی تو۔۔۔ فون بھی کیا تو۔۔۔ فون بند جا رہا ہے۔“  
”تو بازار سے منگوا لیتیں ناں سب کچھ۔۔۔ اب دعوت کا اہتمام کیسے ہو گا؟“

”ہاں اور دادول کر کر لیں گے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اخفش ہلکی بار بولا۔  
”تو تمہاری فکر کروں رہا ہے۔ لیکن میں اس طرح کے تجرباتی کھانے نہیں کھا سکتی۔“

”تو تمہیں تکلیف کرنے کو کہہ کون رہا ہے۔۔۔ اسے غصہ ہی آیا۔  
”تو واو!“ وہ معصوم و مظلوم چہرے کر صوفیہ کی سمت گھومی ”کیا میں چلی جاؤں۔“

”ارے کیوں کیوں۔۔۔ تم بیٹھو بیٹا!“ ساتھ ہی اخفش کو گھور اور تمہارا ہاتھ کیوں رک گیا ہے۔ نمائز ڈال دو اندر۔“ اخفش متذبذب تھا۔ سر پر نمائی پلا جواری پر گھوم رہی تھی مسخر خاسخ نمائز کھارہی تھی۔

اخفش نے اسے گھور کر دیکھا اور چولہے کی سمت گھوم گیا۔ نوال کا بظاہر وہ بیان اوپر اٹھ رہا تھا اس نے دیکھا۔ اخفش کام تو کر رہا تھا مگر کافی سستی اور تکلیف سے۔ وہ یقیناً اچھا لگتا ہو گا اس کے ہاتھ کے کٹے، تنہا بونی تو وہ کھاتی چکی تھی

جب پوچھ پوچھ کر ہی پکاتا ہے تو۔۔۔ یہ کام تو وہ بھی کر سکتی ہے۔

”ہٹ جاؤ تم۔ میں کرتی ہوں۔“ اس نے یکدم ڈوٹی ہی اچھلی۔  
”خراب کرو گی تم سب کچھ۔“ وہ چلایا اور مدد طلب لگا ہوں سے واوی کو دیکھا۔

”کچھ خراب نہیں ہو گا۔ جو کام تم کر رہے ہو وہی میں بھی کر لوں گی۔ واو سے پوچھ پوچھ کر ہی تو کرنا ہے ناں، کیوں واو؟“ صوفیہ مسکرائیں۔ وہ اخفش کی تکلیف دیکھ ہی رہی تھیں۔

”ہیلے بھی بتائی ہے برائی تم نے؟“ وہ حواس باختہ ہی ہو گیا۔

”تو کیا ہوا۔۔۔ کھاتی تو ہے ناں۔“ وہ لاپرواہی سے بولی اور ساتھ ہی ڈوٹی گھمائی اور مدایت بموجب آج دھیمی کر کے ڈھکن رکھ دیا۔ اب گوشت دھونا تھا اور بھیکے چاول ابلانے تھے۔ صوفیہ کی بدایات کے ساتھ ساتھ اخفش کی سستی اور کبھی چلائی ہدایت بھی کانوں پر تھی۔

”اب چاولوں کی گلدی نہ بناؤ نا۔۔۔ کھلے کھلے ڈال الگ الگ ہو۔“ اخفش نے سب سے مشکل مرحلے

سے آغاز میں کہا۔  
”ارے واہ!“ اس نے ہاتھ نہچایا۔ ”تم کیا جانتے نہیں آج چاول بھی نوال خیر خان کے ہاتھوں میں آئی خوش قسمتی پر نازاں ہیں۔ وہ تو پیلے سے پیلے ہی کھل کر گلاب ہو چکے ہیں کہ کہاں ہم اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ“

”صوفیہ بیگم کا منہ اور اخفش کی آنکھیں کھلی کی کھلی ہو گئیں۔  
ایک سیدھی سادھی تنبیہ کا اتنا پرلودار جواب

”بھئی! بیگم! تمہارے صاحبزادے فرماتے ہیں کونوں میں ابلے ہوئے انڈے بھی ڈال لیتا۔“  
اشتیاق احمد کے کان سے فون لگا تھا۔ وہ بولتے بولتے اندر داخل ہوئے۔

”لیکن ہم تو کوفتے بنائی نہیں رہے۔“ صوفیہ بیگم اور اخفش ہم آواز ہو کر بولے۔

”وہ جو پرسوں پروین نے بنا کر فریز کیے تھے وہ ختم ہو گئے کیا۔“

”ختم تو نہیں ہوئے مگر کوفوں کو ہینڈل کرنا بہت مشکل ہے۔“ صوفیہ نے کہا۔

”اور وہ مجھے بھی نہیں آتا۔“ اخفش کی گھبرائی آواز لڑھری۔

”اور مجھے تو انہیں کھانا بھی نہیں آتا۔ پھل پھل جاتے ہیں نوال کے نیچے رکھے ہی نہیں۔“ نوال کا اپنی ہی طرز کا جواب تھا۔

”نویں کو کال کرتا ہوں وہ بنا دے گی۔“ اشتیاق احمد نے بلائے لگے۔

”وہ کبھی نہیں آئے گی۔“ صوفیہ نے ہولے سے کہا۔

”کہہ دیجئے گا۔ اخطوبہ نہیں ہے گھر میں، شام کو آئے گا۔ دوڑی چلی آئیں گی۔“ اخفش نے جلتے بھنے لیسجے اصل بات اور اصل ترکیب بتائی۔

نوال کے کان کھڑے ہو گئے۔  
یہ اخفش اور واوا جان اور واو یہاں تک سے تو

واقف ہیں کہ وہ اخطوبہ کی موجودگی میں نہیں آئیں گی۔ تو پھر یہ۔۔۔ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ کیوں نہیں آئیں گی۔ یہ خود ساختہ ہندی ہے یا؟  
جب تک اس بات کا پتا نہ لگے تب تک کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

تو سب سے صحیح بندہ کون ہو گا۔ اندر کی باتیں اگھوانے میں۔ واوا جان۔۔۔ جن سے نوال کی زبردست دوستی ہو گئی تھی۔

ابھی برسوں ہی تو اسے لے کر گلف سینٹر گئے تھے۔ دو فرزند شپ بینڈو دو فرزند شپ کارڈ مانگے۔ نوال کے استغفار پر بتایا۔

”ایک میری طرف سے تمہارے لیے۔ اور ایک تمہاری طرف سے میرے لیے۔“

”اس نئی دوستی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے نوال۔۔۔ وہ کہے گی دوستی میں راز نہیں رکھے جاتے فقط شیرنگ۔ بس۔“

وہ ایک نتیجہ پر پہنچ کر بے فکری سے مسکرائی۔ وہ اب اشتیاق احمد کو سن رہی تھی۔

”کتنے دن ہو گئے مزے کے کھانے کھائے ہوئے۔ آج اس گدھے نے اپنے دوستوں کی دعوت کی تو سوچا ہمارے نصیب بھی کھلیں گے۔ مگر پروین غائب ہے۔ آج آج۔۔۔ وہ سب تو رات گئے آئیں گے۔ تب تک ہم کچھ انجوائے ہی کر لیں گے۔ برائی کا مسالہ اور چاول بواں تو نوال نے کر لیے ہیں کس تو مہمان آنے کے بعد ہی کے جاس گے۔ ہاں ہاں نوال نے۔ اب تم خود سوچو ہمیں کس قسم کے کھانے کھانے پڑیں گے۔ ہاں وہ سب تو شام کو اخطوبہ کے ساتھ ہی آئیں گے۔ تو پھر تم آرہی ہو ناں؟“

وہاں سے جواب اثبات میں تھا۔ جس کا گمان پاکر صوفیہ بیگم اخفش اور اشتیاق صاحب کا چہرہ کھل گیا۔  
”تجئے عرصے بعد آج نویں اوپر آئے گی؟“ وہ بیگم سے پوچھ رہے تھے۔

”شاید چھ ماہ بعد ورج کی خوشی میں دی جانے والی دعوت میں بھی نہیں آئی تھی اگلے روز صبح آئی



تھی جب اخطب آفس جا چکا تھا۔ "صوفیہ کی آواز حسب معمول مدھم تھی۔ انھیں کے چہرے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ وہ غیر محسوس انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ سب کی نگاہیں دواڑے پر تھیں۔

\*\*\*

"کل ایک تاریخ ساز فیصلہ کن دن تھا۔" نوال صوفیہ پر ہیرا اوپر رکھ کے بیٹھی تھی اور بریانی کے نوالے ہاتھوں سے بنا کر کھا رہی تھی۔ نوین اور نہشت بیگم اس کے بولنے کی منتظر تھیں۔

"پہلا تو یہ کہ میں نے باقاعدہ کوکنگ کا آغاز کر دیا اور بے حد لذیذ بریانی بنائی۔"

نوین نے سر جھکا کر مسکراہٹ چھپائی۔ اس نے جس طرح اس سالے اور چالوں کو سنبھالنا تھا وہی جانتی تھی۔

"یعنی میرے ہاتھ میں قدرتی ذائقہ ہے۔" اس نے چٹکارا بھرا۔

"دوم میں نے یہ سیکھا کہ میرے لیے ضروری ہے کہ میں بچن کے کاموں میں بھی مہارت حاصل کر لوں۔ ویسے تو اپنی بات پر قائم ہوں کہ بیٹ بھرنے کے لیے ایک نوڈلز کا ایک اور چند پھل کافی ہوتے ہیں لیکن اگر مہمان رات کی طرح پیڑے ہوں تو۔۔۔ لہذا اب نوال صوفیہ کو کوکنگ سیکھیں گی۔"

نوین نے مسکرا کر سر ہلایا جبکہ نہشت بیگم بہت ہی خوش ہوئیں۔ وہ لڑکیوں کے شہروں میں اول درجہ بچن کے امور میں طاق ہونے کو دیتی تھیں۔

"اب یہ تو ہوا میرے حوالے سے فیصلہ۔ کل ہی ایک اور فیصلہ ہوا لیکن اس کی جب تاریخ طے ہوئی تب اسے تاریخ ساز کہا جائے گا۔ ابھی میں نے یہاں کراچی میں یہی دو گھر ذرا تفصیل سے دیکھے ہیں اور انہی دو گھروں میں صحیح طلب کام ہیں۔ لیکن آغاز ہمیشہ گھر سے کرنا چاہیے۔ خالہ اور نانوی زندگی بدل دینے کا پلان تو میں ترتیب دے چکی ہوں لیکن ادھر اس موٹے آٹو کے گھر میں بھی سب پاگل ہیں۔" اس نے

تسک سے سر ہلایا۔ "داوا جان بوڑھے،" آنٹی راجاں سے وہیل چیر کر نہیں تو بیٹے کی مسکرائی ہوئی بارات چڑھا دینی چاہیے تھی مگر ان جی وہ انھیں ٹھنڈے ہاتھوں سے ہانڈی بھرتا ہے۔ صاف کہہ دیا میں نے۔ اس ٹھنڈے آٹو کو تو لڑکی ملنی مشکل ہے۔ آپ اپنے گھر میں بھولائیں، پہلے ہی دیر کر دی۔ آنٹی جی نے ہاں میں سر ہلایا کہ وہ تو خود ہی چاہتی ہیں مگر عزیز اخطب نہیں مانتے۔۔۔ کہتے ہیں کہ کتنی ہی نہیں۔ شاید کسی کے عشق میں گرفتار ہیں۔ اچھا خاصا اعلیٰ باغ آوی ہے۔ بالکل نہیں اچھا لگا اس کے حوالے سے یہ جملہ سن کر۔"

اس نے تائید طلب نظروں سے سامعین کو دیکھا۔ جو فی چہرے سے ترتر زبان کو سن رہی تھیں۔

"بس جی یہ اہم گفتگو چل رہی تھی کہ جناب خود تشریف لے آئے وامن چھڑا کر جانا چاہتے تھے۔ مگر آگے کون تھا میں۔ بقلم خود تھبٹ لیا ساتھ ساتھ چار باتیں کہ آج کل کے زمانے میں کون ذی ہوش مردہ عشق میں مبتلا ہوتا ہے پھر اس پر دنیا تیاگ دینے کا عزم۔۔۔ بوڑھے والدین پر ترس نہیں آتا۔ خالی یہاں بھال کر نا گھر۔ ایک صوفیہ وادی ہیں مجھے گھنے کی نشست میں تین جملے بولیں جی اور چھ سو باری اساتل۔۔۔ انکل اپنا دل خود ہی بھلائے رکھتے ہیں اور وہ گھر کا سب سے اسارت گئے۔"

"آ۔۔۔ آگے کیا ہوا فف۔۔۔ فیصلہ کیا ہوا؟" نوین کی دہلی آواز نکلی۔

"آپ اتنی جلدی آگئیں فیصلے تک۔ ابھی تو میرے سنہری الفاظ کا محض پیش لفظ آپ نے سنا ہے۔" پھر میں نے ایک تنقیدی مکالمہ ان محترمہ کے لیے بیان کیا۔ جس میں ان کی کم عقلی اور بد نصیبی کو موضوع بنایا۔ جو اتنے شہن دار آوی کو ٹھکرا رہی ہے اور۔۔۔"

"کیا کیا۔ لڑکی کا نام بھی بتایا؟" نوین کی ہتھیلیوں سے پینہ پھوٹا۔ نوال کا کیا بھروسہ۔ وہ جبراً نکاح پر دھاوے والے کسی فیڈل لارڈ کی طرح رکھتی تھی۔

"نہیں بتایا۔ نہ ہی میں سننے میں انٹرسٹ تھی۔" نوین کوئی احمق بنے وقف پاگل ہو نہ۔۔۔ "اس نے غصے سے کہا۔

"میرا ٹارگٹ اخطب اور ان کا لڑا بڑا گھر تھا۔ لڑکی پھر میں نے ہاں کر دیا کہ دم لیا۔"

"مطلب۔۔۔؟" نہشت بیگم کے اڑے چہرے پر ہلکا سا اضطراب آن رہا۔

"مطلب یہ کہ میں جس کام میں ہاتھ ڈالوں اور وہ پانچویں تک نہ پہنچے۔ ایسا بھی ہوا تو نہیں۔"

وہ داوطلب نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ جو دھک دھک کرتے دل اور فنی چروں کے ساتھ جیسے ہوش کوئے والی تھیں۔

"منو اکرم لیا۔" "نکون نام۔ کیا؟" نوین کی آواز میں شرارت سا آیا

جیسے اس نے سب کچھ سننے کے لیے خود کو تیار کر لیا ہو اور اسے بتا ہو کہ وہ اشتیاق احمد اور صوفیہ کی کا نام لے گی۔

"کے ماننا تھا؟" نوال نے لاپرواہی سے انگلیاں چاٹیں۔ "داوا جان اور دادو جی تو میرے جلوں کا وارنہ رہ گئے ڈھے گئے۔ یہاں تھوڑی محنت اخطب صاحب پر کرنی پڑی مگر نتیجے کے لیے محنت ضروری ہے۔ نوال یا ڈش اٹ۔"

وہ برتن رکھنے کے لیے بچن کی جانب بڑھنے لگی۔

نوال اب بھی تل رہی تھی۔ پھر بچن میں آکر لیے لیے ماس لیے۔ اللہ سے توبہ کی۔ اتنا بڑا جھوٹ کڑی در کڑی ہوئی باز بولا تھا۔

کسی بھی قسم کی عملی کارروائی کے لیے سیاق و سباق سے انکھی ضروری تھی اور کل کا ٹارگٹ بھی تھا۔ لیکن تب وجہ جو بھی رہی ہو۔ پہلا تیر ہف پر جا کر لگا

\*\*\*

"نکس۔۔۔ ہلو۔۔۔ داوا جان! نوال کب سے اپنے نیم کمر سے باہر جھانک رہی تھی۔ جیسے ہی اشتیاق احمد

کو باہر نکلتے دیکھا سرعت سے باہر نکل کر عین ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"اوپلو ہائے! وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ یہ آپ کے لیے۔۔۔" نوال کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ دایاں ہاتھ آگے کیا اور سر گلاب ان کی جانب بڑھایا۔

"اوہ ڈیرے۔" وہ گلاب تھامتے تھامتے خوشی وبے یقینی سے دھیرے ہو گئے۔ گلاب کو لیے سانس سے سو گھٹا "میری، ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ کوئی لڑکی مجھے اس طرح سے سر راہ روک کر پھول دے۔"

انہوں نے لہجہ حسرت ناک بتایا۔

"تو یہ ایک اور بیجے۔" نوال نے ایک اور پھول بڑھایا۔

"اتنے عرصے سے یہاں آئی ہوئی ہوں۔ گھریا یونی ورسٹی۔ بس بہت شور مچا لوں تو میٹر ولے جاتی ہیں یا کبھی یا زائرس۔ وہ بھی تیری طرح مطلوبہ دکان میں ہستی ہیں۔ نہ ادھر دیکھتی ہیں نہ ادھر۔ اور اگر جو میں ذرا ہاتھ پیر چلانا چاہوں تو بوج کر کھینچتی ہوں ہانک کر گھر لے آتی ہیں۔ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے؟ اس کا لہجہ دکھ سے چور چور ہو گیا۔

"تو تم کیا چاہتی ہو؟" سامع کا چہرہ بھی دکھ کا ترجمان بن گیا۔

"تمہیں گھومنے چلیں؟" اس نے لپکتا ہوئے انداز میں ڈیلے گھمائے۔

"سی سائیڈ پر یا کسی پارک میں یا پڑا کھانے۔"

یا۔۔۔ "لوڈارنگ! میری، ہمیشہ کی خواہش تھی کہ میں کسی اچھی سی لڑکی کے ساتھ سی سائیڈ پر جاؤں اور بعد میں زبردست کھانا۔"

"تو پھر چلیں۔" نوال چکی۔

"کب؟"

"آج۔۔۔ بلکہ ابھی۔۔۔" وہ پوری تیاری سے ہی تو آئی تھی۔

"بس۔۔۔ صوفیہ جیسی خاتون کے ساتھ رہ رہ کر میں

نے تو اپنے جذبات پہ پھر ہٹا رکھا ہے۔ وہ مصنوعی حسرت سے شروع ہوئے۔ نوال نے سر ہلا کر تائید کی۔  
 ”ایک بوتل میں دو اسٹرا ڈال کر۔۔۔“ انہوں نے قصداً ”جملہ ادھورا چھوڑا نوال کی پھیلی آنکھیں دیکھ لی تھیں۔“ بلبلے بنائے کا جو مزہ ہے۔ وہ کسی اور میں کہاں؟  
 نوال کی ہنسی دور تک پھیل گئی جس میں اشتیاق احمد کا مشتق قہقہہ بھی شامل ہو گیا۔

”تم بہت اچھی بیٹی ہو۔“ اشتیاق احمد نے اپنا ہاتھ دھیرے سے اس کے سر پر رکھا۔ ”کسی بیٹی جو رحمت لفظ کی عملی تصویر ہو۔“ ضمیر بہت خوش قسمت ہے۔  
 ان کا لہجہ جذبات سے بھر پور تھا۔ نوال کا چہرہ کھل گیا۔  
 ”حادثاتی معذوری کے بعد ضمیر خان خود کو دنیا کا بد قسمت انسان کہتے تھے۔ کتنی مشقوں سے وہ اس ٹرانا سے نکلے تھے۔ اس میں سب کا ہاتھ تھا مگر کامی کامی حال آئی کا گھال کا۔ لیکن سب سے آگے نوال تھی۔ اس کی محبت توجہ یقین نے ٹوٹے شکست خوردہ روئے خود کو بد نصیب کہتے ضمیر خان کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ ایک روز بے ساختہ کہہ اٹھے وہ دنیا کے خوش قسمت انسان ہیں۔ ظاہری معذوری کوئی معنی نہیں رکھتی۔  
 نوال جیسے کھو گئی۔ سوچ چہرے سے جھٹکنے لگی تھی۔  
 اشتیاق احمد چہرہ پر ہنر رہے تھے۔

”لیکن میں سوچ رہا ہوں۔ میں اپنے بڑے سے اہل خانہ کے ساتھ رہتے رہتے بچہ جاؤں گا۔ اور نعمان وں بے رنگ عورتوں کے ساتھ رہ رہ کر اگر خدا نخواستہ ان جیسی ہو گئیں تو؟“ انہوں نے جیسے جھرجھری لی۔

”ارے واہ خواجوا۔“ نوال اپنی جون میں واپس لوٹی۔

”ہم تو وہ ہیں جو بانیوں کا رخ بدل دیں۔ لال جوڑا پہن لیں تو ہر طرف سرخی چھا جائے۔ سفید لہا ہوں تو ہر جگہ نور برے اور آپ کہتے ہیں۔ بی بی پرو داوا جان۔ ہم ان بڑھی روحوں جیسے نہیں ہوں گے۔ بلکہ وہ ہم جیسی ہوں گی۔ بدلنا ہمیں نہیں انہیں ہے۔ اور وہ بھی

عقرب۔۔۔“  
 اس کے جملے میں آثار چڑھاؤ میں یقین قطعیت تھی۔  
 اشتیاق احمد نے اس کا شانہ چھتپا ہا تھا۔

”بالکل الگ فطرت کے تھے ہم دونوں۔ میں ویسا ہی جیسا تمہیں آج نظر آتا ہوں اور وہ ویسا ہی جیسا تم بن چکی ہو یا سمجھ چکی ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا الٹ تھے۔ مگر کلاس فیلو ہونے کے بعد جب روم میں بھی بن گئے تو لاکھ مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے جڑ گئے جیسے صبح اور شام ایک دوسرے کا الٹ ہوتے ہیں مگر آگے پیچھے چلتے ہیں جدا نہیں ہوتے۔ ایک دوسرے کی سوچ کا احترام کرنے لگے۔ میں نے اسے اس کی تنگ ذہنی پر نہیں ٹوکا اور اس نے مجھے میری عادات سمیت قبول کر لیا۔ یہ تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی حد تک بھی نہیں آئے۔

میری حرکتیں شرارت کے ذمے میں آتی تھیں اور اس کی عادات پرورش کا نتیجہ تھیں۔ وہ سخت بدخون خاندان کی روایتوں میں پلا بڑھا تھا۔ اس کے دماغ میں ہر شے طے شدہ تھی اور ترمیم کی خواہش نہشت۔ اور دوستی کے رشتے میں ایک دوسرے کو بدلا نہیں جاتا قبول کیا جاتا ہے۔“

ساحل کی سمت ہواؤں سے لطف اندوز ہوتے اشتیاق احمد اور نوال ہاتھوں سے ریت میں چھپی سیپاں چن رہے تھے اور ساتھ ہی ماضی کے خوش کن لمحے بھی۔

”یونیورسٹی ختم ہوئی تو سب نے حسب روایت ایک دوسرے سے کبھی بھی تعلقی نہ توڑنے کے عہد کے خط و کتابت کے لیے تے ایچ بیجے ہوئے۔ مگر اور محلے بھی ڈانری میں۔ نوٹ کیے گئے مگر کوئی کسی سے ملتا ہے۔ سب روم روزگار میں غرق ہو جائیں تو یاد آتی بھی باقی نہیں رہتی۔

میرے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ لیکن جب میں

پوچھا ”انصر کراچی شہت ہوا تو میرا بیوی منیر خان تھا۔“  
 ”عجب حسن اتفاق تھا۔ ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔“  
 غم اس نے۔ واضح کر دیا کہ وہ اپنی سوچ اور عاداتوں میں ویسا کاویا ہی ہے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں رہا۔ جلد ہی صوفیہ اور بھابی بیگم میں دوستی کا انوث رشتہ تشکیل پا گیا۔ جو اور خوشی کی بات تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے گھٹنوں باتیں کرتیں اور یہاں وہاں ملتی جاتیں۔ میری جانب سے صوفیہ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ منیر بھی میرے گھر کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ جہاں دل چاہے بیٹھ سکتا تھا۔ مگر میرے لیے اس کے گھر میں مہمان خانہ تھا۔ جہاں مجھے دستک دے کر باقاعدہ آواز لگا کر جانا ہوتا اور مجھے کبھی برا نہیں لگانا۔ صوفیہ کو۔ پھر بتائیں کیسے ایک دن خود ہی بھابی بیگم کو الگ دسترخوان چننے کے بجائے مشترکہ ہی کہہ دیا۔ اتنا عرصہ لگایا اس نے مجھ پر اعتماد کرنے میں یا۔ بہر حال اس کی سوچ تھی۔ مگر اور خواتین کے حوالے سے اس کی مخصوص سوچ تھی۔ جس میں وہ ذرا ترمیم کرنے کو تیار نہیں تھا اور ضرورت بھی نہیں سمجھتی کہ بھابی بیگم جو ایک لبل فوجی بیگم گراؤنڈ والے گھر سے آئی تھیں۔ ایک ماڈرن پڑھا لکھا میکا۔ وہ بھی شوہر کی خوشنودی کے لیے بلا چوں و چراں اس کے رنگ میں رنگ لگیں۔ میرے لیے دسترخوان ایک ہوا تھا۔ کامن روم کا دروازہ کھلا تھا لیکن میں نے پھر بھی ہمیشہ ایک آن دوپھی صحنہ کی پالیس کیا۔

ہاں نوین کے معاملے میں، میں نے اس کی کسی روایت کا پاس نہیں کیا۔ انعام اور اخطب کی دفعہ مجھے بی بی کی خواہش تھی۔ یہ آگے پیچھے پیدا ہوئے تھے۔ مجھے لگتا میری بیٹی اللہ نے منیر خان کو دے دی ہے۔ اس کا نام بھی میں نے ہی رکھا۔ وہ مجھے اتنی پیاری تھی اتنی پیاری کہ رات کو اگر اس کے رونے کی آواز سنائی دے جاتی تو میں بلا جھجک آواز لگا کر پوچھ لیتا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔

میری بے لوث شدید محبت کے آگے وہ بارہا مان گیا۔ میرے اور نوین کے بیچ سے نکل گیا۔ میں تینوں

کے سامنے ہستا صوفیہ اور بھابی بیگم اور نوین کے آگے۔“ اچھا ہے۔ صبح وقت پر عقل کے ساتھ باز آ گیا اور نہ ایک دن اسے درمیان سے ہٹا ہی تھا۔“

اور وہ دن میرے خیالوں میں آباد تھا۔ جب میں اسے اپنے گھر لے آیا ہمیشہ کے لیے انکس کی ماں کی حادثاتی موت اور۔ انعام کا امریکہ جا کر نیا جہاں بنا لیتا۔ انعام کی نئی دنیا میں ہمارا کوئی حصہ تھا ہی نہیں۔ میں اور منیر خان جگہی دوست تھے۔ اپنی سوچ و عادات سے قطع نظر ہماری بہت سی عادات ایک جیسی تھیں۔ پسند ناپسند۔ اثر ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ایک جیسے گھٹ اٹھلاتے۔ رنگ تو رنگ کمپنی بھی ایک۔“

دونوں چلتے ہوئے بہت دور نکل آئے تھے۔ اشتیاق احمد ماضی میں کھوئے ہوئے تھے۔ چہرہ کبھی مسکراہٹ دیتا۔ کبھی اداسی کبھی خوشی بعض اوقات لگتا وہ خود کلاہی کر رہے ہیں۔ کھو جاتے۔ قصے میں بے ربطی آجاتی۔

”بچوں کے معاملے میں سخت مزاج تھا قطعی۔ اور روایتی مرد تھا سو زیادہ توجہ اور دلچسپی نعمان خان کی جانب تھی۔ وہ کئی سال لاڈلا اکلوتا رہا تھا۔ وہ خود پسند بھی ہو گیا تھا۔ اسکول، گھر پڑھائی۔ ماں بہن کے ساتھ گھٹنے ملنے والی فطرت نہیں تھی اس کی۔ اور ری نوین۔ بھولی بھالی سیدھی سادی بنی۔ گھر میں منیر کا رعب و دبہہ تھا۔ نعمان کی ضدی طبیعت اور ان کے پیچھے ہٹنا ہوتی بھابی بیگم۔

نوین جیسے دب گئی تھی۔ وہ گھر میں ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح اسے دائرے میں گھومتی لڑکی۔ بے ضرر دیوار پر ٹنگ تصویر نگین وہ تھی تو نہیں۔ ایک چیتا جگتا زنی شعور انسان جس کی اپنی شخصیت تھی اپنی دلچسپیاں اپنی دنیا۔ وہ اچھا پڑھتی۔ اچھا لکھتی، نظمیں کہتی۔ ہر نظم پر انعام لاتی۔

منیر کے سامنے ٹیچر نے مدح سرائی کی تو نوک لہجے میں بولا۔



”میں اسے اسکول لکھنے پڑھنے، علم حاصل کرنے بھیجتا ہوں۔ آپ اسے کس راستے پر لے جا رہی ہیں۔“ بچی وہیں کی وہیں دب گئی۔ کہاں تو پھر اس کی تعلیم پچھوانے لگی تھیں۔ ”نظمیں اور شعر وغیرہ تو وہ اب بھی کہتی ہیں۔ چھپا کر کہتی ہیں۔ مگر میں اب انہیں چھپوا کر رہوں گی۔“ خاموشی سے سنتی نوال نے تیزی سے کہا تھا۔

”جیسے تو بڑا دے ہی دے گی۔“ وہ نوین کو جانتے تھے۔

”تو ان سے مانگ کون رہا ہے۔“ اس نے بے فکری سے ایک پتھر پاؤں سے اڑایا۔ ”جو چیز مانگے سے نہ ملے اسے ہم چھین لیا کرتے ہیں۔“ اس نے رعب دار سا ہوجہ اپنایا۔

”اشتیاق احمد نے اس کی بے فکری اور یقین کو دلچسپی سے دیکھا۔ یہ خود اعتمادی کہاں سے آئی ہوگی۔ وہ ذرا سا سوچنے لگے۔ جواب نہ ملا تو پچھ ہی لیا۔ نوال نے اچھی سے ان کی صورت دیکھی۔

”آسمان ہی بات ہے واداجان! گھر کے مرد یعنی باپ بھائیوں نے اعتبار کیا ہو۔ اعتماد دیا ہو اور کبھی کسی دوسرے کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالا ہو تو نتیجہ نوال ضمیر جیسی بیٹی کی صورت نکلتا ہے۔“

”یعنی اعتبار ضروری ہے؟“

”زندگی کے ہر معاملے میں اعتبار پہلی شرط ہے۔ باقی صفحے تو پونہ منی کالے کیے جاتے ہیں و فری اندراج کے لیے۔“ وہ ہنس دی۔

”آپ وہ رشتے والی بات بتائیے۔ مجھے صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ تاجاجان نے صاف انکار کر دیا تھا لفظی انکار بکس میں مخفائش نام کو نہیں تھی۔ وہ دندناتے ہوئے گھر کے اندر گھوم رہے تھے اور کبھی پشتوں میں اور کبھی اردو میں تیز لہجے میں کچھ کہتے تھے۔ جس کا ایک حرف کسی کے لیے نہیں پڑا تھا۔“

”وہ۔“ اشتیاق احمد نے لبسا سانس لیا۔ تمہیں بتا رہا ہوں۔ یعنی تم وہ ٹھوڑے زمین ہوگی جو اس اندر کی بات کو جانے لگی۔ اب پتا نہیں صبح کروں گایا غلط۔“

”آپ تھوڑا برا بھلا کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ جب سب اپنا اپنا ڈاک سنا کر دعوے دار ہو جاتے ہیں کہ میں سچا۔ اور تو جھوٹا۔ تب تھوڑے سا کاغذ یا حرف آخر ہوتا ہے۔ آپ بس بتاتے جائیے۔“ نوال مسکرائی۔ ”خطیب ان لوگوں میں سے تھا جو ہمیں ہوتے ہیں وہاں چھا جاتے ہیں۔ نوین نے یونیورسٹی ختم کر لی تھی اور اب وہ گھر میں رہتی تھی۔ خطیب بھی فراغت کے بعد اب غم روزگار کی تلاش میں۔ خطیب کے باہر جانے کا معاملہ اٹھا تو مجھے خیال آیا۔ رشتہ دے کر اس کی موجودگی میں ہی یہ کام ہو جائے۔ میں اتنا با اعتماد اور بے فکر تھا کہ جیسے بس تاریخ نامی ہو اور میرج لان ڈیپانڈ کرنا ہو۔ باقی کسی بھی شرط یا فارمولہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میرے دل میں ہم گھر کے افراد میں بغیر کسی سے ملے تھا کہ نوین ہی کو ادھر آتا ہے۔“

”تمہیں اس ظالم جادوگر کی قید سے چھڑانے کے لیے شہزادے کا والد آج آئی کیا؟“ میں نے گھر میں داخل ہو کر سلام کے جواب میں کہا تھا۔ وہ پہلے کچھ سمجھی نہیں پھر شرابی مکان نبول پر کھڑی تھی۔ ”شیر کی پکھار میں شہزادے خود منہ دیا کرتے ہیں۔ والد کو تو میں نے آج تک جلتے نہیں سنا۔“ اس کے مزاج میں شوخی اور جسکی تھی۔ جو باحوال کے باعث دلی ہولی سی رہتی۔

”شہزادہ روایتوں کا پاس دار ہے لڑکی۔ وہ تو تنگی تم کو اڑا لے آ رہا تھا۔ میں نے ہی اپنے ارانوں کا واسطہ دیا۔ تمہارے ساتھ مل کر ہی تو آج آج آئے والی ساری کہانیاں اس نے پڑھی تھیں۔ کیا بھول گئیں۔“

اور وہ ہنستے ہوئے کچھ شرماتے ہوئے چلی گئی۔ مگر کمرے کی کسی کھڑکی سے لگی کھڑی تھی۔ مجھے معلوم تھا۔ اور منیر نے۔ وہ خوشگوار موڈ میں تھا اور مجھے دوستوں کے ایک پرانے گروپ کے بارے میں بتا رہا تھا اور پھر ان کے خوالے سے یادوں پر قبضے لگا رہا تھا جب بعد عائن کر۔“ اشتیاق احمد رک سے گئے۔

”میں بھونچکا رہ گیا تھا نوال۔ وہ یوں کھڑا ہوا جیسے اسے بچپن سے ڈک مار دیا ہو۔ اس کی سانس بھڑک اٹھی۔ تنہے بھولنے پھینکنے لگے۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ وہ پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا میں سن کم رہا تھا اور دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہ کر رہا تھا۔ وہ مجھے نقب زن کہہ رہا تھا اور یہ کہ میں نے سوچ بھی کیسے لیا کہ ایک غیرت مند بختون کی بیٹی ایک سراسر غیر برادری میں دی جائے گی۔ غیر زبان غیر لوگ اور میں جو اسے بیشہ سے جانتا ہوں میں نے اس کا مذاق اڑانے کے لیے یہ شوش پچھوڑا اور اس نے گھر میں گھسا کر بہت غلطی کی۔“

”ہم سب کی خوبی ہے منیر! دھک مت مار۔“ ٹھنڈے دل سے سوچ تجھے ہو کیا کیا ہے۔ دوست ہے جس لیے دوستی کے نام پر اطلاع دینا چاہتا تھا۔ تیری بھابی پورے چاؤ چونکے عزت احترام کے ساتھ آئے گی جیسے کسی کی بیٹی کا ہاتھ مانگا چلا ہے اس طور طریقے سے جھولی پھینکا کر گرا سکتے۔“

”روک کر رکھ اپنی بیوی کو۔“ دوستی کے نام پر میرے منہ پر طمانچہ مارا۔ ایک بختون کے لیے بیٹی بہت بڑی جگہ ہے کہ اس کی بیٹی کے لیے غیر جگہ سے رشتہ ہی کیوں آیا۔ اگر جو کوئی سنے تو تھو کے میرے منہ پر۔ اور یہ میں ہی ہوں جس نے صرف گریبان پکڑا ہے۔ یہی اگر میرے دواور دادا ہوتے تو وہ غلی اب تک دیوار پر نہ لٹکی ہوتی، سمجھے! ہم بیٹیاں گھر میں بٹھا کر رکھ لیتے ہیں مگر کبھی بیویوں کو نہیں دیتے۔“

بہت لمبی کسلی ہے بچے۔ وہ کتنا تھا اور میں حق دلی سنتا تھا۔

وہ وہی تھا روایتی قبائلی بختون علم اور ڈگری اور شہری بود و باش نے صرف اس کے ظاہر کو بدلا تھا۔“

اشتیاق احمد کا لہجہ ہم اور دکھ سے بوجھل ہو گیا۔ ”پھر اس نے نوین کے لیے دھواڑھ رشتے دیکھنے شروع کئے۔ مگر ناکامی ہوئی۔ میں نے گریبان پکڑنے سے لے کر لغت ملامت کے صفحے تک حذف کئے باقی اہمات خطیب اور صوفیہ کو بتا دلیں اور کہا کہ

”تھوڑے کے کو بہت جانیں۔ یہ بھی ایک لمبی مصیبت رہی۔ حقیقت بتائے بنا انہیں باز رکھنے کی کوشش۔ کہ بس یہ قصہ ختم۔ خطیب نے ناکام ہو کر اعلان کر دیا۔“ اسے شاوی نوین ہی سے کرتا ہے۔ وہ نہیں تو کسی اور کا نام نہ لیا جائے۔“ اور وہ اپنے عہد پر قائم ہے۔

”لیکن اب تو تاجاجان نہیں رہے۔ راستہ صاف ہے۔“ نوال کی آواز کسی کنویں سے برآمد ہوئی۔ وہ ششدر تھی۔

”ہاں اب وہ نہیں رہا۔“ اشتیاق احمد۔ زہر خند نہی ہنس دیے۔ ”مگر نوین ہے ناں؟“

”اسی کی بیٹی ہے ناں۔“ کہتی ہے جب ایک چیز کو میرے باپ نے پسند نہ کیا تو میں اب ان کے نہ ہونے پر اسے گیسے اپنا سکتی ہوں اور دنیا کی کوئی مثال۔ کوئی عقل۔ کوئی راہ اسے ضد کی اس راہ سے پلٹا نہیں سکتی۔ اسے شاوی ہی نہیں کرنی۔ باپ کی روح کو شرمندہ نہیں کر سکتی۔ ادھر خطیب بیٹھا ہے اس کی ضد اور انکار کے پیر کو تادور دیکھنے کے لیے۔“

”پھر کیا تاجاجان آپ سے کبھی نہیں ملے؟“

”نہیں وہ میرے گھر نہیں آیا اور نوین اور بھابی بیگم نے بھی اتنا چھوڑ دیا اور خطیب نے بھی۔ صوفیہ آتی جاتی تھی مگر منیر اس کا سامنا بھی نہ کرتا۔ سلام بھی نہ کرتا۔ نگاہ مالے بغیر جواب دیتا تھا۔ ہم سات سال ایک دوسرے سے نہیں ملے۔“

”سات سال۔“ نوال نے دہرایا۔ ”لیکن وہ افسوس تو آتا جاتا رہا ناں؟“

”ہاں وہ بچہ تھا اور منیر کا لاڈلا بھی۔“

”پتا ہے نعمان تک نے خالص امر کی انگش میں نوین اور منیر خان کے فیصلے کو رد کر دیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے بعد اعلیٰ خاندان کی لکھی ہی لڑکیاں۔ اعلیٰ تعلیم کے بعد اعلیٰ عدول پر فائز ہیں اور اپنے من پسند پانتر کے ساتھ کامیاب زندگیاں گزار رہی ہیں۔ مگر نوین کے لیے کوئی مثال قابل تقلید نہیں۔ وہ ضد میں باپ سے بھی آگے



اشتیاق احمد اور نوال چلتے چلتے گاڑی تک آ گئے تھے۔ نوال قہقہے کی تفصیل سن کر گنگ تھی۔ وہ سو دلائل دے سکتی تھی۔ معرکے کر سکتی تھی مگر ابھی نہیں ”تمہیں ایک ہی بات بتاؤں نوال!“

گاڑی گھر کے گیٹ پر روکتے ہوئے کھوئے سے لہجے میں اسے پکارا۔

”جس رات میری موت و حیات کی کشمکش میں تھا۔ اس نے مجھے ہلا کر رکھا تھا۔“

”یہ میری زندگی کی آخری شام ہے اشتیاق! اتم نے معافی نہیں مانگوں گا، کیونکہ جانتا ہوں تم عذاب لائے والے شخص ہو ہی نہیں۔ تمہیں لوگوں کو روٹیوں کو نوچتے کو ایڈر اسٹینڈ کرنا آتا ہے۔ بس۔ میرے بعد۔ نوین کا دھیان رکھنا۔ تم سے اچھی اور کوئی اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ میں نے کوشش تو کی مگر وہ مجھ سے پوری نہ ہو سکی۔ تم سمجھ رہے ہو ناں۔ وہ۔ واقعی تمہاری بیٹی ہی تھی۔ میرے گھر غلطی سے آگئی تم اپنی بیٹی واپس لے لو۔“

نوال کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”نت۔۔۔ تو یہ تو واضح بیغام تھا اقرار کا۔۔۔ تو پھر آپ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟“ وہ چلائی۔ ”جائے اور ہاتھ پکڑ کر خالہ کو باہر لے آئیں۔“

نوال کے تو جسم میں چونچیاں رینگنے لگیں کوئی گھڑی جانی کہ وہ خود یہ کام کر لڑتی۔ اشتیاق احمد کے لبوں پر زخمی مسکان آکر دم توڑ گئی۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”یہ اقرار اس نے صرف میرے سامنے کیا تھا۔ نوین وہاں موجود نہیں تھی۔ اسے صرف انکار یاد ہے اور وہ ہر شے بھلا چکا ہے؟“



”آئی ایم ان لو۔ خالہ۔“ بہت جھجکے، مدہم لہجے میں نگاہیں چرا کو یہ نوال ضمیر خان کا سا انداز تو نہیں تھا۔

وہ پڑھائی میں بے حد مصروف رہتی تھی۔ سب شوخیوں شرارتوں کے ساتھ۔

سنجیدہ ہو یا لا پرواہ مگر اس کی موجودگی گھر کے ہر کونے پر چھاپ چھوڑتی تھی۔ وہ گھر میں نہ ہوتی تو صدمہ بنا چل جاتا۔ گھر میں اگر کمرہ بند کر کے سوچ بھی رہی ہو تو ایک خوش کن احساس ہمراہ رہتا کہ یہیں نہیں ہیں۔ نوال ضمیر خان۔

مگر پچھلے کچھ دنوں سے بظاہر وہ سب کے درمیان تھی۔ وہی اس کے روزمرہ کے اعمال بھر پور بھی ایک عجیب سا احساس کہ نوال نہیں ہے گم ہے، نونین کو مجبور کر دیا کہ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے نوال۔۔۔ تم میں کچھ تبدیلی سی محسوس کر رہی ہوں۔ بہت چپ چپ ہو کھوئی ہو تم۔۔۔ یہاں ہوتے ہوئے یہاں نہیں ہوتی۔“

”آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ نہیں خالہ! وہم ہے آپ کا۔ وہ چونکی تھکی اور کمر گئی۔

”اول ہوں۔۔۔ نہ نظر کم ہے نہ عقل۔۔۔ صاف دکھ رہا ہے۔ لونچور سٹی میں کوئی پرائیم ہے۔ گھریا آ رہا ہے؟ کسی نے کچھ کہا؟“

نوال نے ہونٹ بھیج کر نفی میں زور زور سے سر ہلا دیا۔

”جانا نہیں چاہتیں۔ لیکن شاید کہہ دینے سے مسئلہ حل ہو جاتا۔“

نوال نے چونک کر سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے رہنے کے بعد ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

”منہ سے بول دو نوال۔۔۔ کسی نے کچھ کہہ دیا ہے۔ ہماری کوئی بات بری لگی۔ افسوس نے کچھ کہا۔ لیکن تم افسوس کے کہنے سننے کو کب خاطر میں لاتی ہو۔ بلکہ موقع ڈھونڈتی ہو۔ وہ کچھ کہے اور تم بچے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاؤ۔ سچی بات ہے کہ وہ تم سے بچا کر چلا ہے۔“ نوین کے جیسے کا اختتام مسکراہٹ پر ہوا۔

نوال نے مزید حد کر دی۔ جواب کے بجائے چہرے پر زخمی مسکان بکھیر دی کہ مقابلہ کا دل اٹھل چھل ہو

جائے۔ نوین کا بھی یہی حال ہوا تھا بھر پور محسوس کئے۔

”آپ نے کسی سے بھی پیار کیا خالہ۔۔۔ میرا مطلب آپ کو کوئی اچھا لگا بھی؟“ اس نے ہونٹ مزید ہٹا کر جواب کے بجائے سوال جڑ دیا۔ اور نوین کے اڑتے رنگ سے نگاہیں چرا کر کہہ دیا۔

”آئی ایم ان۔۔۔ نوال خالہ۔“

نوین کے دیوتا کو ج کر گئے۔ اسے اپنی ساعتوں پر ٹپک بول۔

”کک۔۔۔ کک کون ہے۔ وہ وہاں۔۔۔ یونی در سٹی میں۔“ اس کا فوری دھیان ممکنہ جگہ پر گیا۔ ”کلاس فیلو؟“

”لو خوا خواہ۔۔۔“ اس دل گرفتہ تھکی نوال بھڑکی۔ ”چک کر بولی“ وہاں ہے ہی، کون۔۔۔ میرے کلاس فیلو۔۔۔ ہنہ ملت لڑکے ٹوٹل۔۔۔ جو صرف نام کو لڑکے ہیں۔ ایک انگل ہیں جو ڈگری کے کرسروس بک میں لگا میں گے تو تیلری بڑھے گی۔“

اسے آگ ہی لگ گئی۔

”ایک ویل صاحب کو جو نلزم میں اس کو پ نظر آ رہا ہے۔ ایک اور انگل ہیں جو کراچی کے خراب حالات کے باعث بڑھاپے کی انگوٹی اولاد کو اکیلے یونی در سٹی بھیجنے سے گھبراتے ہیں۔ سوانہوں نے ساتھ ہی ایڈیشن لے لیا۔ اور جنہیں لینے اکثر آتی آتی ہیں۔ باقی رہ گئے دو رنڈے۔۔۔ ایک لڑکا ہے، وہ اپنی بہن کے ساتھ آتا ہے تو سب کو بہن ہی سمجھتا ہے۔“ اس نے سب کے نیچے ادھیڑ دی۔

”نت۔۔۔ تو پھر کون؟“ نوین ہٹکائی۔

”کون ہو گا۔“ نوال نے پچی بھری۔ ”اخطب چاچا۔۔۔ اوہ۔“ وہ گڑ بڑاتی ”میرا مطلب ہے اس پورے محلے بلکہ اس شہر میں ان کے علاوہ اور کوئی ہے جس کے لیے لڑکی اپنے منہ سے کہہ دے کہ میں۔“

اس نے قہقہہ ”جملہ اوصو راجھو راجھو“ ان کہتے ہوئے لہجے میں محاسن بھی گھل گئی تھی اور آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے دواقتاً بابلی ڈول ہی لگی تھی۔

نوین کا دل رکاوٹ پھراتی زور سے دھڑکا کہ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

”نت۔۔۔ تو اب؟“ وہ بہت دیر بعد لب کھول سکی۔ ”تو کیا۔۔۔“ نوال کہہ دینے کے بعد گویا ب شامت تھی۔

اپنے فطری جارحانہ انداز میں شلے انکائے ”وہ مجھے پہلی نظر میں اچھے لگے۔ پھر بہت اچھے لگنے لگے اور اب دنیا کی ہر شے زہر لگنے لگی ہے ماسوائے ان کے۔“ صبح دوسرے شام ہر جگہ وہ ہی نظر آتے ہیں اور سچ فلموں میں جو کچھ ہو نا ہے ناں۔۔۔ وہ حقیقت میں بھی ہو جاتا ہے اگر آپ کو سچا پار ہو۔“ میں نے اس محبت کے کارن۔۔۔“ اس نے پچی کی اور پلکیں زور زور سے جھپکیں۔ ”ٹھٹھک سار جٹ کو محبت پاتس نظروں سے دیکھا کیونکہ وہ بھی سفید پینٹ میں تھا اور اس دن اخطب نے بھی سفید پینٹ پہنی تھی۔“

مجھے زندگی میں پہلی بار جیتندر اچھا لگنے لگا۔ سفید وردی پناہ دے۔۔۔ آہ۔۔۔“ اسے جیسے خود پر افسوس تھا ”مگر محبت کی مجبوریاں۔۔۔ محبت کی دی گئی ذلالت۔۔۔ آہ۔“

میں نے پروفیسر غائب داغ کا پونے دو گھنٹے کا لیکچر پلکیں جھپکائے بناسن لیا۔ جو ”جینٹلز کی بھرا اور“ اواکاروں کا فقدان جیسے اہم ٹاپک کو ڈسکس کرتے کرتے ویٹا ملک کی جامہ زیبی و خوش زوئی۔ و سیم اکریم کی شادی اور مارٹنک ہوسٹ میں طلاوتوں کی بڑھتی شرح کی وجوہات پر سیر حاصل گفتگو کر رہے تھے اور آپ کو بتا رہے تھے پچھلے ویٹے ہیں۔ جیسے خود دکھائی کر رہے ہوں مگر میں نے انہیں سنا ہے صرف اس لیے کہ ان کے پاس گاڑی کا وہی میک ہے ”بوان“ کے پاس ہے یہ سب محبت نہیں ہے تو اور کیا ہے خالہ۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے نوین کے شانے جھنجھوڑ دیے جو سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ اس نے آئی ایم ان لو اور اخطب لفظ کے علاوہ جیسے اور کچھ سنا ہی نہیں تھا۔

”نت۔۔۔ تو اب تم کیا کر رہی؟“

”کرنا کیا ہے۔ ایسی ہی دو چار علامتیں اور ظاہر ہو

نہیں تو صاف صاف جا کر کہہ دوں گی کہ۔۔۔ اب وہ زندگی میں پہلی بار شرمیلی۔ زبان جو اب سلی تھی۔ خود ہی۔ کہہ دوں گی؟ تو میں نہیں جانتی تھی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں جھجک چل رہے تھے۔

”ہاں تو خود ہی کہتا ہوتا ہے خالص۔ خط کا زمانہ نہیں۔ اور فون پر کہوں تو ان کا چہرہ کیسے دیکھوں۔۔۔ آپ نے تو دیکھا ہے ہاں خالص۔۔۔ وہ کہتے خوب صورت ہیں۔ زندگی کا 75 حصہ انہیں دیکھتے ہوئے گزارا جا سکتا ہے۔ میں تو پہلی نظر میں۔۔۔ مجھیں۔۔۔ اس نے دونوں آنکھیں بند کیں اور بڑ پر کر سی گئی۔

”وہ۔۔۔ تم سے بہت بڑے نہیں ہیں؟“

”بالکل نہیں ہیں۔۔۔“ وہ اچھل کر سیدھی ہوئی۔

”اور اگر ہوں بھی تو۔۔۔ محبت جمع نفرین سے الگ چیز ہوتی ہے۔“

”وہ وہاں جائیں گے؟“

”مجھے منوانا آتا ہے خالص۔۔۔ بھلا کوئی محبت کو بھی انکار کرتا ہے۔“ اس نے جیسے اس کی کم عقلی پر حفظ اٹھایا تھا۔

”اور۔۔۔ اور ضمیر بھائی۔۔۔ اور باقی؟“ نوال کے اظہار نے نوین کو زمین پر گاڑ دیا تھا۔ اس کے کسم پورے جیسے جملے ہر بار بھی بھر کے مٹی تھے۔ جن میں نوین کا وجود چھپتا ہی جا رہا تھا۔

ایسے بھی ہوتا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنے انکار کے قطع پر ہر روز ضد کی نئی دیوار کھڑی کرتے ہوئے ہاتھ کپکپاتے نہیں تھے ہاں کا منتظر ایک شخص گردن اٹھائے ہر آن بلند ہوتی دیوار کو صبر سے دیکھتا تھا۔

وہ دشمن جان تھا مگر اس کی ”نظر“ ہمت تھی کہ وہ ہے اور دیکھ رہا ہے۔

یہ تو بھی سوچائی نہیں کہ وہ اتنی بلندی سے جب ایک میچ بیچے جھانکے گی تو وہاں کوئی منتظر ہو گا ہی نہیں۔

ایسا خیال تو کبھی آیا ہی نہیں ایک روز وہ شخص

نہیں ہو گیا ہو گا تو الوداعی ہاتھ ہلاتے ہوئے یا نہ جتانے ہوئے یا سب سے دل چر دینے والا خیال۔

”کسی اور کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر جاتے ہوئے۔“

آفس۔

”ضمیر اپنے ضمیر کے خلاف کبھی نہیں جاتا۔ اور نوال ضمیر کبھی وہ کام کرتی نہیں جس کی ضمیر اجازت نہ دے سکے۔“

کہہ دینے سے نوال اب بالکی پھلکی دکھائی دیتی تھی۔ بڑے دنوں کی او اس کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں بشارت سے جواب دیا تھا۔ اس کی سنہری آنکھوں کی شفاف۔۔۔ چمک غور کر سکتی تھی۔ اس نے پوئی کو کسا اور جست بھر کے باہر نکل۔

نوین نے بیڑے پہنچنے لپے۔۔۔ وہ اتنی بری طرح کپکپاتے گئی تھی کہ گلتا تھار ف کی سل پر کھڑی ہو اور پھل آنکھیں رہی ہوں۔ مکمل ہے۔

نوال نے گزرے اس دشمن جان کو رو رو دیکھے۔ اپنے اوپر کڑا پہرہ لگا لیا۔ خود سے نظر اٹھا کر دیکھنا چھوڑ دیا اور ساتھ ہی اس رستے کو بھی چھوڑ دیا جہاں سے گمان بھی گزرے کہ وہ اسے دیکھ لے گا۔

نوین سات سال سے خود ساختہ نظر بندی کے ساتھ جی رہی تھی۔ تو اوپر بھی پاس امیری۔ احترام امیری کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔

رو تم لاکھ پر دوں گی اوٹ میں۔۔۔

کس نے کہا محبت کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا متنازعہ ہے۔

اور محبوب کا رو رو ہونا شرط ہے۔

محبت جی بندھی آنکھوں کے ساتھ اونچے نیچے رات دن گھاسٹوں کاغٹوں کا سفر ہے۔

نہ سمجھتے نہ کرتے ہیں نہ راہدہ لے رہے۔

نشان خطر ہونے ہو۔ راہ نما کا ساتھ ملے نہ ملے۔

منزل کبھی ٹھوٹی نہیں ہوتی

اور یہاں تو بس یہ ہوا تھا کہ نوین منیر خان چھپ کر بیٹھی تھی۔ مگر وہاں موجود تو تھی۔

محبت کے لیے یہ احساس کافی تھا کہ محبت دیوار کے اس پار ہے۔

خطبہ کی طمانیت کی حد کوئی نہ۔

لیکن۔۔۔ نوین منیر خان کا چہرہ رخصت ہوا۔ قرار ختم۔

وہ وہیں ہے اور کہیں نہیں جانے والی۔ یہ خطبہ اشتیاق کی بے فکری تھی۔

وہ بھی وہیں ہے۔ لیکن اب شاید وہاں نہ رہے۔

نوین منیر خان کا غم۔

ہاں نوین منیر خان۔۔۔ تم نے قسم کھائی تھی۔ وہ نہیں ملا تو کسی اور کو بھی قبول نہیں کرو گی۔ تم نے اسے تو ایسے کسی بیان میں نہیں باندھا۔ وہ تو آزاد ہے۔

نوال نے گزرے اس سے مکالمہ کے ہوئے اور جب بات ہوتی تھی تو کیا؟ آتے جاتے، جلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے بس ایک دوسرے کو دیکھتے ہی تو تھے۔

وہ کن آنکھوں سے دیکھ لیتا تھا۔ یہ جان جاتی۔

کبھی اپنے مراد نہ زعم میں آنکھوں میں جھانک لیتا تو جھیل جاتی یا پلکیں مگر اگر کاسیس جھیل کرتی۔ بس اتنی سی جھلک پیمان کی کمانی۔

اور اس اتنی سی آشتی نے زندگی کو اتنا مشکل بنا دیا۔

اگر خود وہ بیان کیے ہوتے تب؟

”ہاں تو پھر ٹھیک ہے۔“ رات کے سنانے میں خود شامی کے مراحل سے گزرتے ہوئے نوین نے اپنے نہ سمجھنے والے آنسوؤں کو گڑا۔ ”جب ایسا کچھ تھا ہی نہیں۔ تو حق ہے تمہیں اپنے لیے نئے راتے تلاش لو اور خوش رہو۔ میں خود پر جبر کر رہی ہوں۔ تمہیں کون کہتا ہے کہ تم صبر سے میری حد کا انتظار کرو۔ اچھی ہے بہت اچھی ہے نوال۔“

وہ با آواز خود سے ہکلام تھی۔ بولتے بولتے آنسو رگڑتے بیٹے تو گلے میں آنسوؤں کا پھندا بن جاتا، چٹکی

پر چٹکی۔۔۔ وہ کبھی سختی سے آنکھیاں گلاب پر گرتی۔۔۔ کبھی پھیلی کی پشت۔۔۔ کبھی ٹخنوں میں سروے کر جیسے ہار جاتی۔

خطبہ اور نوال کے چہرے گڈل ہوئے۔

نوال کے رنگ ڈھنگ۔

نوال نے اپنے سارے مخصوص لباس جیسے کیس پیمینک دیے تھے۔ جاگڑ، بد شکل بوٹ، بوٹ پٹانگ شریں۔ ٹائٹس اور جینز۔

چوڑی دار پا جاموں کے ساتھ کرتے اور لمبی قمیص۔۔۔ بولے دوئے، بے دوئے۔

زینت بیگم کی خوشی کی حد نہ رہی۔ اس نے ان سے کہا۔

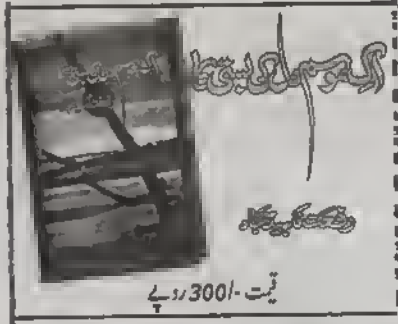
”آپ ہی تو کہتی تھیں۔ ایسے رہا کروں۔“

البتہ نوین کے سوالیہ استغاب پر۔۔۔ مینا کاری کو مات دیتے ہوئے وہ شرمیلی۔۔۔ دوپٹے کا پلو دانتوں میں دوبا (بعد میں دیکھا تو وہ جگہ جگہ سے چپا ہوا تھا۔ دراصل وہ جانتی نہیں تھی۔ شرماتے ہوئے صرف دانت میں دابے کو شوکرنا ہوتا ہے دانتوں سے اس کاٹس نہیں مارتے)

”انہیں شرمی جیل کی لڑکیاں پسند ہیں خالص! تو میں نے سوچا کہ۔۔۔ مجھے ایسے ہی رہنا ہے۔“

نوال بھار منہ کھول کر ہنسنے کے بجائے نظریں جھکا کر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کے مسکرائی۔

”یہ تم سے اس نے کہا؟“ نوین نے لہجہ سرسری



بنایا۔

”نہیں۔ وہ منہ سے کب کچھ کہتے ہیں مگر میرا تو فرض ہے نال کہ میں ویسی بخوں جیسی وہ پسند کرتے ہیں۔“

”تمہارے کیریر کا کیا ہو گا نوال!“

”لو تو وہ کوئی مجھے پڑھنے سے روکیں گے تھوڑی۔۔۔ اب تو وہ مجھے یونیورسٹی بھی چھوڑنے کا کہہ رہے ہیں کہ میں صبح کہاں خوار ہوتی ہوں وہ جاتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔“

بڑے ہانوں سے اخطب چاچا کی باقاعدہ منت کی تھی۔ اگر آپ مجھے دو تین ہفتے چھوڑ دیں۔ دراصل مجھے تھوڑے دن میں جانا ہو گا اور ٹرنک کا تار ش ہو جاتا ہے بس میں ٹکنے کی جگہ بھی نہیں ملتی۔

چنگ پی بھی خالی نہیں ملے۔۔۔ چنگ پی والا کہنے لگا ”میرے موٹر سائیکل پر پیچھے میری طرح ہی بیٹھ کر چلی چلو۔“ اس نے از حد معصومیت سے پلکیں پٹپٹائیں۔

اخطب سارا قصہ بھول گئے۔ ہواڑ لگائی۔

”تھا کون وہ چنگ پی والا۔۔۔؟“

\*\*\*

نوال اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ پڑھائی اور پھر ڈراما۔ جس کی کرتا دھرتا وہ خود بھی۔ سارے گروار ہی اسے خوب پاتے تھے۔ ایکٹر۔ ڈانسر۔ رائٹر۔

اسے کسی اور چیز کی ہوش ہی نہ تھی۔

بے خود کو اس سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ موبائل لے کر دینے والا وعدہ پورا نہ کیا۔۔۔ اور سب سے بدھ کر قمر عید سر پر آئی۔ مگر نوال کی جانب سے کوئی گرم جوش ہی نہیں۔

”اشقیان دادا جان لے کر آجائیں گے جانور۔“ لیکن ہم خود کیوں نہیں لائیں گے۔۔۔ جیسے پچھلی بار لائے تھے۔“ بے خود کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ تھا وہ۔

”بھئی۔ اس وقت تو اس انخفش سے انتقام لینا تھا ناں۔۔۔ اور پھر چائیں لگ گیا تھا۔ اب اس بار تو دادا جان ہیں ناں۔۔۔ میں ان سے کہوں گی۔ تمہیں لازماً ساتھ لے کر جائیں۔“

”تو آپ بھی تو ساتھ چلنا ناں۔۔۔ وہ بھند ہوا۔

”میں مصروف ہوں بے خود۔! میں بہت بڑے بڑے کام کر رہی ہوں غم سوچ بھی نہیں سکتے۔“ اس کے چہرے کے قریب منہ کر کے اس نے پراسراریت سے کہا۔

بے خود کی آنکھیں بھیلیں۔ ”تو مجھے کیوں نہیں ملایا؟“ وہ دھاڑیں مار کر رونے والا ہو گیا۔

”ابھی تمہاری باری نہیں آئی۔ تم بس دعا کرو میں کامیاب ہو جاؤں۔ پھر تمہارا نمبر آئے گا کامیابی کام۔“ دو دن بعد وہ پھر حاضر تھا۔ ”انخفش بھائی جان کے جانور آگئے ہیں۔“

”تو ہمارے کیوں نہیں آئے؟“ نوال چونکی۔

”وہ تو صرف دو بکرے ہوں گے ناں دادا جان بولتے ہیں۔۔۔ تین روز پہلے ہی لائیں گے۔“

”تو وہاں کیا آیا ہے؟“

”دو بیلوں کی جوڑی ہے۔ ابھی باہر سینٹ لگے گئے۔ پھر انخفش بھائی اس کی سجاوٹ کرے گا۔۔۔ دو دن بعد پھر سب کو بلا کر جانور دکھائے گا۔ ابھی تو کہیں رکھو اگر آئے ہیں۔“ بے خود بہت اداس تھا اور جانوروں کے لیے بے چین بھی۔

”پچھلی بار تو ایسے نہیں کیا تھا۔“ وہ سوچنے لگی۔ ”تو وہ سب گھر والے ج ج پر گئے تھے پیچھے اکیلا انخفش بھائی تھا تو اس لیے۔“

”اور۔۔۔“ نوال نے آنکھیں گھمائیں۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم رونے والی صورت مت بناؤ۔۔۔ آج نہیں تو کل ہم جانور دیکھ ہی لیں گے۔“ اس نے پکارا۔

وہ بھی سر ہلانے لگا۔ دل البتہ بچھا بچھا سا ہی تھا۔

\*\*\*

”حملہ کرنے کے اصول ہوتے ہیں اور اگر ارادہ

بیت کا ہو۔ تو پھر چاروں جانب سے گھات لگا کر باقاعدہ منصوبہ بندی سے ہر قدم اٹھانا ہوتا ہے۔ پھر جو کتنا سے چوکنامہ بھی دام میں آجاتا ہے اور ان کی بے خبری تو آج کل عروج پر ہے۔“ رات میں نوال گلاب سے اسکا پیر گھٹا کر رہی تھی۔

”وہ آواں اور ان صورت خیالی آنکھیں بے یقینی کی تصور۔ اتنی غم زدہ ہیں کہ غم غلط کرنے کو نہ تو اولاد گانے سنتی ہیں اور نہ وہ کچھ شق کر دینے والی شاعری کر رہی ہیں۔“ بھنگی روح بن کر گھومتی ہیں۔ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔ مجھے تو ج بعض اوقات ترس آ جاتا ہے۔

منہ سے کچھ نہیں کہتیں۔۔۔ اور ان ہی کو کیا دوش۔۔۔ وہ جو دوسرے ہیں جناب اخطب چاچا، میرے جیسی حسین۔۔۔ لڑکی کے ہمراہ بیٹھ کر بھی ناک کی سیدھ میں چلتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا ہم نہیں پتا ہے کہ میری آنکھیں سنہری ہیں یا بھنگی۔ ہونہ۔۔۔“ اس نے گلاب کو آنکھیں بھینگی کر کے دکھائیں۔

گلاب بھر بھری لے کر ہنس دی۔ اتنی مضحکہ خیز صورت۔

”اتنی پاکیزہ محبت تو 1616ء میں بھی نہیں کی جاتی ہو گی۔ اللہ توبہ۔“ اس نے منہ بنایا۔

”اخطب صاحب کو نہیں پتا کہ تم ان کی ناک کے نیچے کیا کھیل رہی ہو۔“

”نوج۔۔۔ ناک کے نیچے کی کیا بات۔۔۔ میں ان کے سامنے دینا ملک کی طرح ڈانٹنگ ٹیبل پر چڑھ کر رقص بھی شروع کر دوں تو انہیں پتا نہ چلے۔۔۔ میں نے کہا ناں۔۔۔ وہ عشق کی اس منزل پر ہیں جہاں سے بس ایک صدا آتی ہے۔

مجھے دکھا ہے۔ اب بھلے تیشہ لے کر آنکھیں پھوڑوے۔

نوال نے جل کر کہا۔

”تم لوگ پہنچ جاؤ گے ناں۔۔۔؟“

”ہاں کل سیٹیں کنفرم ہوں گی۔۔۔ ناں کو تو ہماری آمد کا سبب پتا ہے ناں؟“

”مٹو کو پتا ہے مگر اتنا اور ویسا ہی جیسا میں ضروری

سمجھوں گی۔ ہاں خالہ جاتی ہیں میرے ڈیڈ میری خاطر ”اُن“ سے ملنے آرہے ہیں۔ تین دن سے بی بی لو چل رہا ہے۔“ وہ لاپرواہی سے گھبراہٹ رہی تھی۔

\*\*\*

نوال کے موبائل کا چارجر خراب ہو گیا تھا۔ وہ گھر بھر سے پرانے چارجر کا ڈھیر اکٹھا کر کے بیٹھی تھی۔ ہر چارجر سے صبح اور قابل استعمال چیز نکال کر اسے فوری طور پر ایک نیا چارجر بنانا تھا۔

ذرا فاصلے پر انخفش انعام براہمان تھا۔ کیونکہ نوین اس کے گھر جاتی نہیں تھی سو وہ اپنے قدموں چل کر اپنی خیریت بتانے آیا تھا۔ ہاتھ کا پلاستر کھل گیا تھا۔ فزولوجی اسٹ کے پاس جانا تھا کچھ دن تک۔ البتہ ٹانگ ہنوز پلستر میں جکڑی ہوئی تھی۔

نوال کو دھیان آیا۔ جس دن سے وہ اسی حال میں تھا۔ کھلے پانچھ کی برمودا (گٹھنوں تک کانیک) میں ملبوس ہوا کرتا تھا۔ اور بی شرٹ یونیورسٹی جاتے وقت بھی یہی حلیہ۔۔۔ ہاں یونیورسٹی واسے برمودا کی لسبلی گٹھنوں سے نیچے ہوتی تھی۔

”کیا ضرورت ہے۔ اتنی محنت کرنے کی۔۔۔ ڈیڈ سو روپے کا نیا چارجر پر ملتا ہے۔ بے خود کو بیچ کر منگوا سکتے ہیں۔ مگر نہیں جی۔ ہم نے تو اپنی مہارت دکھانی ہے۔ موقع کیسے جانے دیں۔“

یہ بات نوال بخوبی جانتی تھی۔ مگر ایک تو اس کا موبائل بند ہو گیا تھا دوسرے وہ کسی جگر میں یہاں بیٹھی تھی۔ (نعمان بھائی کی امریکہ سے کل کسی بھی وقت متوقع تھی)

”ضرورت کی بھی خوب کسی۔ انسان کب سمجھتا ہے اپنی اصل ضرورتوں کو۔ ایک تو ایکسٹنٹ کروا کے شاندار One Two five کا پیرا غرق کیا۔

دوسرے عرصہ دراز سے ناکارہ ہو کر گھر میں پڑے ہو۔ لباس کے نام پر نیا خرچ۔۔۔ ان برمودا اور شارٹس سے بھر لیں تم نے الماریاں۔ ضرورت ہی کیا تھی۔ سب پرانی شلواروں کے پانچھوں کی سلائی گٹھنوں



تک کھول لیتے۔ یہ کڑواوت بھی گزر جاتا اور بچت کی بچت۔ اس نے حساب۔ برابر کیا۔

انفخ اول تو سمجھا نہیں پھر شاید تصور کی آنکھ سے خود کو دکھا اور سمجھا تو چہرہ لال، بھبھوکا ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ منہ کھولتا سوال نے لب کھولے۔

”تانیخ کی سلائی کو کھولی نہیں آئی تو۔ گھٹنے تک شلوار کاٹ لیتے کیوں خالد۔ آپ نے تو لوائڈ اینڈین اور پاکستانی فلموں کے ہیرو دکھ رکھے ہوں گے۔ جس وہی حلیہ بن جانا اور تمہارے ہونٹ مارے خوشی ہی کے کپکپا رہے ہوں گے؟ ہے ہاں کہاں تم۔ اور کہاں دلپ نگار اور ندیم اور علاؤ الدین جیسے مہمان کلاکار ویسے وزن کم کر کے شیوہ پھالو اور فلمیں لائے سوالیہ نشان کی طرح رکھ لو تو تھوڑی بہت مشابہت آہی جائے۔“

وہ ہیرا اسے بولنے کا موقع دے بغیر خود ہی شروع ہو رہی تھی اور ہیرا تیری لن ترانی۔

وہ مٹھیاں بھینچتا کھڑا ہوا ہی تھا کہ ریسور کلن سے لگائے زینت بیگم کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ایک ہاتھ دل پر دھرا تھا۔ اور عجب شادی مرگ کے عالم میں وہ سن رہی تھیں۔ یہ تینوں ہی ان کی طرف بھاگے۔

”نوسا۔۔۔۔۔ آ رہا ہے عید پر بیوی بچوں کے ساتھ۔“

”نعمان بھائی! نوین کے منہ سے جملہ اور آنکھ سے آنسو ایک ساتھ ہی برآمد ہوئے۔ وہ فرط مسرت سے ہاں سے لپٹ گئی۔

انفخ کو بھی بھول گیا۔ ابھی اس کی کتنی گت بتائی تھی نوال نے۔

نوال نے چار جگہ لگا کر دیکھا۔ ریڈ بلب آن ہو گیا تھا۔ یعنی الارٹ۔

اوکے (سب کچھ پلان کے مطابق اب تک ٹھیک جارہا تھا)

☆ ☆ ☆

”کیا پہلے بھی ایسے ہی کرتا تھا؟ سوال کا اشارہ ٹینٹ

اندر کی گئی سجاوٹ کی جانب تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ٹکرا اس پر تو حد ہی کر دی ہے۔“

حاسد نگاہ سے ہر چیز کو دیکھتا تھا۔ ”لنڈ پوٹے گا۔ قرآن کا مطلب ایسے تو نہیں ہوتا ہاں۔“

وہ انفخ کو گناہ گار ثابت کرنا چاہتا تھا۔ نوال نے سر زور زور سے ہلا کر تائید کی۔ بے خود کے چہرے کی حد تک سکون پھینچا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم بھی اندر جا کر بیٹھ جاؤ ناں۔“ (دونوں ایک جھری سے اندر دیکھ رہے تھے)

”وہ نہیں بیٹھنے دے گا۔“ بے خود بولا۔

بے حد خوب صورت سفید براق سمندر دست تھوڑا بیلوں کی جوڑی۔ اتنے خوب صورت جانور تھے کہ نظر ثنی مشکل تھی۔ ان کی سب سے نمایاں خوبی ان کا ہم شکل ہونا تھا۔ دونوں کے چاروں پاؤں کھڑے ایک باشت اوپر تک سیاد تھے۔

بڑی بڑی آنکھیں اور حد سے زیادہ معصوم چہرے۔ ان کے قد چھوٹے تھے اور جسم بے حد توانا۔

چلو یہ تو لاش کی جناح تھی۔

اب آگے انفخ صاحب کی کار کریگی۔ اس نے شامیانے کے اندر کرسیاں لگوا رکھی تھیں۔ درمیان میں ریڈ کاربٹ بچھا تھا۔ جس پر تیل کوواک بھی کراواں جاتی تھی۔ بیلوں کو چٹا کر کھانا بہت دیا گیا تھا۔ ان سے اپنا بوجھ اٹھانا مشکل تھا۔ وہ یوں چلتے تھے جیسے منوں بوجھ لدا ہوا میٹھوس۔ اور گرد سے بے نیاز۔ دھرتی کا بوجھ سائلتے تھے۔

ٹھنڈے پانی کے کور۔ پچھے اور قلعوں کی سجاوٹ بہت اعلیٰ۔

فوٹو سیشن ہو چکا تھا۔ بے زار لالا اور انفخ نے دو سیکورٹی گارڈ کا بندوبست بھی کر دیا۔ بیلوں کی نمائش صرف چار سے سات بجے ہوتی۔ وہ بھی انفخ کے زیر نگرانی۔ وہ دونوں بیلوں کے درمیان ان ہی جیسی مغرور نخٹا خفا ہی چال چلتا ہوا ان ہی کا تیسرا بھائی معلوم ہوتا۔

اگر جو ماتھے پر ستاروں سے بھی سرخ کوئی بی باندہ

بیلوں کی سجاوٹ اور انداز کے مغرور اثر سے یوں جیسے تک چڑھا دینا لالچ پر ارجحان ہو اور سائیلوں کی مذاق پر بھی اسے ہنسی نہ آئی ہو۔ دفع۔

”تم کیا چاہتے ہو بے خود؟“ اس نے سید حاسوال بولا۔

”میں بس یہ چاہتا ہوں، ہر وقت ان بیلوں کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ مگر وہ سیکورٹی گارڈ مجھے گھٹنے بھی نہیں دیتا۔ دادا (بے زار خان) بھی نہیں جانے دیتے۔“

وہ روٹا ہوا گیا۔

”چھ ماہیں کھول گی انفخ سے۔“ نوال نے تشفی کرائی۔

”ہمارے بکرے بھی نہیں آئے۔“ وہ رونے ہی لگا۔ ”دبک آئیں گے؟“

”اب نعمان بھائی ہی لائیں گے۔ وہ آ رہے ہیں۔“

”مجھے بھی ساتھ لے کر جائیں گے؟ اور آپ بھی نہیں گی؟“

”ہمیں لازمی لے کر جائیں گے۔ میرا البتہ شکل ہے میں بہت ضروری شے پر ہوں بے خود۔“

”یاد ضروری ہے۔“

اس نے اس کے کندھے پر چھکی دی۔ وہ اس کا لڑا ہوا زور ست نہ ہوا مگر سر ہلا کر لگا۔

☆ ☆ ☆

ڈرائنگ روم کی رونق عروں پر تھی۔ خالی گھر بھر کا خمیر خان بمعہ اہل و عیال۔

نعمان خان۔ امریکی بیوی بچوں کے ہمراہ۔ اور ابھی ابھی آکر بیٹھے اشتیاق احمد مصوفیہ اور انفخ۔ ان کے ہمراہ ڈھیروں مٹھائیاں اور فروس کے گیسے تھے۔ کچھ گفٹ پکس بھی۔

اس نے نعمان خان کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیا اور بچھا دیا تھا۔ گلاب بھی بوقت حال تھی۔

نعمان نے آج صبح لال میں ٹوٹھ برش کرتے ہوئے جب وہ صبح سے لطف اندوز ہو رہے تھے پاکستانی اور قبائلی روایات کو بھی اسی گھاس کی طرح روند دیا جس پر وہ چل رہے تھے۔ بڑے مزے سے اشتیاق انگل کو مخاطب کیا اور پوچھا۔

”وہ چرواہا لے کر شام ہی کو کیوں نہیں آجاتے۔“ اور انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔“

زینت بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”کوئی اپنے منہ سے بھی ایسے کہتا ہے۔“

مگر نوال کو برا مزہ آیا۔ بعض معاملات میں امر کی ہونا زبردست ہوتا ہے یہاں سب یہ جانتے تھے کہ آج انفخ اور نوین کا نکاح کر دیا جائے گا۔ سوائے نوین کے۔

(آج انفخ اور نوال کا رشتہ طے ہوتا ہے۔ نوین کی خیریت تھی)

وہ دل پر مہر کا پتھر رکھے۔ ہونٹوں پر ایثار بندانہ مسکان لیے خود کو کاموں میں الجھائے ہوئے تھی۔ یہاں کسی کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ ہر جگہ نوال ہی کا ذکر تھا۔ جو شام ہی سے لال سرخ جوڑا چھاکر بیٹھ گئی تھی۔ لال سرخی بھی لگلی۔

ایک دھیر اندہ بھی نوال سے زیادہ ایکسائٹڈ اور تیار تیار تھا۔ وہ بھی نعمان کی امریکی موٹی بیوی۔ وہ پہلی بار پاکستان آئی تھی اور اس نے خود ہی سے فرض کر لیا تھا کہ اسے دلن کی طرح رہنا ہے۔

اس نے کسی برائیداد شاپ سے پانچ سات بھاری کاڈر جوڑے خرید لیے تھے۔ جنہیں وہ صبح اٹھ کر نہاتے ہی پہن لیتی۔ اپنے دس دس سال کے بیٹوں کا بھی کوئی خیال نہیں۔

زینت بیگم کے دیے زیور بھی تن پر سجے ہوتے۔ جس میں ہاتھ پائی، گلوبند اور جھکے سب شامل تھے۔

اس وقت بھی وہ میوون لیٹے میں سارے زیورات کے ساتھ سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ نیلی سمندر آنکھوں کے پپوٹوں پر ڈارک میوون آنی طر



تب اخطب اور انھیں ہمراہ مولوی اندر تشریف لے آئے نوین نے کتنے عرصے بعد اس شخص کو دیکھا تھا۔ وہ وہاں ہی ساجر تھا۔ مگر وہ کتنا خوش لگ رہا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اسے دوبارہ کبھی دیکھے گی۔ نہ ہی اپنی صورت دکھائے گی۔

وہ اس کے لیے تو نہیں آیا تھا۔ نہ اسے دیکھنے نہ دکھانے۔ وہ تو اب کسی اور کے لیے یہاں تھا اور اسی کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ مگر دل میں اتنا شدید رویوں۔ یہ آنکھوں کے آگے رھند کیسی؟

ضمیر بھائی کا ہاتھ اس کے شانے کے گرد نرمی سے کسا تھا اور نعمان بھائی نے اس کا ہاتھ تھام کے دیا اور صوفیہ بیگم کی وکیل چیز اس کے عین سامنے آ کر کی تھی۔

کیا دکھ اور کشمکش! احساسِ زباں اتنا حاوی ہو گیا کہ سب اپنے لیے طور سلی دینے آگے بڑھ آئے تھے۔ ”کو بیٹا! قبول ہے؟“ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی سماعتوں سے جملہ ٹکرایا۔

تو یوں لگا کسی نے دل میں دودھاری فخر اتار دیا ہو۔ ”کو نوین۔۔۔ صرف ہاں بول دو۔“ یہ صوفیہ بیگم کی آواز تھی۔

”نوین! مولانا صاحب خنجر ہیں۔“ یہ نعمان بھائی کی دو ٹوک آواز تھی۔ ساتھ ہی ہاتھ کی گرفت پر سختی کا سا احساس۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سر اٹھادیا۔

نوال شدید اضطراب کے عالم میں ہاتھ مسلحی کھڑی ہو چکی تھی۔ زینت بیگم بھی کھڑی تھیں۔

نوال کی ممی درگھال آنے والے وقت کے خوف سے لرزہ برانداز تھیں۔

امریکی بھابی اور بچے پہلی بار پاکستانی نکاح دیکھنے کے اشتیاق میں اس کے سر پر چڑھے آ رہے تھے۔ دائرہ اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ مولوی صاحب اسٹول سے گرنے والے ہو رہے تھے۔ ضمیر خان کا سلاتا ہوا ہاتھ اور نعمان بھائی کی گرفت۔

صوفیہ بیگم کی آنکھ سے گرتے آنسو سب کی

سانس رکی ہوئی تھی۔ ”گھوہو! نعمان خان کی آواز بلند ہوئی۔ وہ سب بھول گئی۔ سینکڑوں کا دقت۔ جس منہ سے نکل گیا۔

”ہاں!“

”یا ہو۔“ سب سے بلند آواز نوال کی تھی۔ اور پھر مبارک سلامت کا شور۔

نعمان خان کے کرخت چہرے پر نرمی اور پرانے جذبات اُٹھ کر آئے تھے۔ انہوں نے گڑبا جیسی نازک نوین کو اپنے بازوؤں میں یوں سمویا کہ وہ دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ آنسوؤں کی زبان۔ خوشی کا اظہار۔

”آپ کی جگہ میں ہوتی تا وہاں تک بھگتے ڈال ڈال نشن پائی کر دیتی۔ ارے آپ کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ یہاں ہو گیا ہے۔“ وہ سنجیدہ و متین اخطب کے سر پر پچھی۔ اخطب نے ایک گہری سنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی۔

”تو در کس بات کی۔“ کلاہ صوفیہ پر پٹا۔

”شروع ہو جاؤ۔“ نعرے کے ساتھ ہی وہ اندھا دھند ناچنا شروع ہو چکے تھے۔

”ہاں!“ نوال نے منہ پر ہاتھ رکھا۔

\*\*\*

اتنا بڑا۔ اتنا مشکل کام۔ اتنی آسانی (حال بازی) سے ہو گیا۔ دنیا میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے؟ لیکن ہو گیا تھا۔

نوال نے سر پر جمانا دو ٹانویج کر کندھے پر نکالیا اور دھپ سے صوفیہ پر گر پڑی۔ اسے نوین نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیونکہ میز پر کھڑا کر انھیں صاحب کا ڈانس اخطب صاحب بے خود ڈانس اور اشتیاق انکل خشک ڈانس کے اسٹیج لے رہے تھے۔

ایک باہکار میں امریکی بچے فیوژن پیش کر رہے تھے۔ لگتا تھا ان کے جسم میں ہڈی ہی نہیں ہے۔ امریکی ہوتا یاں بیٹ رہی تھی۔

ایک ہنسی کا طوفان تھا۔ تب ہی گھال نے نوال سے کہا۔ ”یہ شو ساری شام چلے گا۔ ایسا نہ ہو نوین مگو گھٹ الٹ کر دھاڑ ماریں اور ہر بندہ اسٹاپ ہو جائے۔ انہیں تو اندر لے کر چلو! اب اللہ جانے مگو گھٹ کے اندر خوشی کے مارے ہانپ رہی ہیں یا غصے کے مارے کلپ رہی ہیں۔“

”ہاں نہیں یا کانپیں۔ اب یہ ہمارا دور سر نہیں۔ اور میں نہیں لے کر جارہی اندر۔ ایسی لائو ریفرامس کوئی روز، روز دیکھنے کو ملتی ہے؟“ نوال کی نظریں پر فارمز پر تھیں۔ صفا جواب دے دیا۔

”یوں بھی اس وقت میں ان کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ اتنے دن کی ٹینشن کے بعد ابھی تو ملا ہے ریلیکس۔ آپ ہی لے جالیے۔ آپ کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکیں گی۔“

نوال کو پتا نہیں کس چیز نے روک رکھا تھا نپٹے سے ہنرورہ بیٹھے بیٹھے ہی ڈانس کے وہ وہ اسٹیج لے رہی تھی کہ کیا کہنے۔

گھال مایوس ابھی اور اپنی ممی کے کانوں میں گھس گئی۔

اگلے منٹ میں ممی اور گھال ”نوین کو سارا دیے اندر کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ جو بچ لاش کی طرح کھنٹی جارہی تھیں۔“

”کیا پچھو کو کوئی میڈیکل برالیم ہو گیا ابھی ابھی جو انہیں سب سہارا دے کر لے جا رہے ہیں۔“

امریکی بھابی نے ولعتا ”اپنے دوسرے امریکی بھائی سے امریکی پر تشویش لہجے میں دریافت کیا۔ دوسرا بھائی بھی حیرت سے کمرے سے نکلتی پچھو کو دیکھ کر شانے اچکا گیا۔ مگر سب متوجہ ہو گئے تھے۔ ہذا نوال کو ایک بار پھر میدان میں کودنا پڑا۔

”بے وقوف! پاکستانی ولہن دھڑ دھڑ کرتی فلا نہیں ٹیس بھرتی۔ اسے ایسے ہی فریڈز نکاح کے بعد سارا اسے لے کر جاتی ہیں۔“

”کیوں۔ نکاح کے بعد کیا اسے کوئی میڈیکل

پر اہم ہو جاتا ہے؟ اور ہمارے ہاں تو رانیڈ خوب ہنستی ہیں اور ڈانس کرتی ہیں۔ پچھو نے ڈو ڈانس بھی نہیں کیا۔ کیا وہ خوش نہیں ہیں؟“

”ہائے یہ امریکی بچے“ نوال نے مدد طلب نظروں سے سب کو دیکھا، کوئی تو ہوجو مگر سب ہی انگشت بدنداں تھے۔ بچے دو ٹوک تھے اور اس شرمیلی صورت حال کو مطمئن نہیں کر پا رہے تھے۔

”بیٹا! ایسٹرن برائیڈ کے دل میں لٹو پھوٹے ہیں۔ وہ بند کرے میں بھگتے ڈالتی ہے۔“ صوفیہ بیگم نے وریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ سب کے ہونٹوں پر مسکان آگئی۔

”لٹو۔“ دونوں بچوں نے حیرت سے لفظ دہرایا۔

ایک دوسرے کو دیکھا۔ ”واٹس لٹو۔“ ضمیر خان اور نعمان خان نے بلند آہنگ تہقیر لگایا۔

”اب لٹو دکھایا بھی جائے اور کھلایا بھی جائے۔ اور چلو یہ تو بابل ہے۔ مگر اس چیز کو کیسے ایکسپلین کیا جائے لٹو پھوٹا۔ نپٹے اب نوال ہی۔“ مگر بچوں کی رواں گلی جملے نے پلٹ دی۔

”یو مین“ پچھو اس وقت بند کرے میں بھگتے ڈال رہی ہیں ”واٹس“ دونوں نے شرر انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ ”لٹو گسٹ“ وہ سرپٹ دوڑے بند کرے میں سرخ جوڑے میں ملبوس پچھو باج رہی ہوں گی۔

ان کے بھائے کے قدموں کو گھال اور ممی نے روکا۔ وہ نوین کو پچھو ذکر آ رہی تھیں۔

”اے خبرا۔ وہ پڑے پھینچ کر رہی ہیں۔“ ”نہیں۔ اونٹ۔“ بچے اور اخطب اشتیاق ایک ساتھ ہی جو گئے۔

”اے ٹو ٹو ٹو سیشن بھی نہیں ہوا۔“ وہ انھیں کے کان میں بڑبڑاتے تھے۔

دونوں کی نظریں گھال اور نوال کی سمت گھومیں۔

”آپ دونوں اپنی ڈانس پر فارمز پر ہی دھیان دیں تو بہتر ہو گا۔ کہیں ٹو ٹو سیشن کے شوق میں فٹ



سیٹن (ناول) نہ شروع ہو جائے، ہونہ۔  
 ”لیکن وہ میری بیوی ہے۔“ اخطب کو کچھ سمجھ  
 میں نہ آیا تھا مگر سینہ ٹھونک کر حق ملکیت دائر کرنے  
 میں بڑا لطف ملا۔  
 نوال اور گلال نے ان کی خود اعتمادی اور بے خبری کو  
 گھور کر دیکھا تھا مگر اگلے ہی پل دونوں بری طرح ٹپس  
 دیں۔  
 نوین سے ملاقات اس نے سب کے جانے کے بعد  
 باقاعدہ تیاری سے کرنا تھی۔

\*\*\*

لیکن نوال کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ اسے نوین کو  
 اکیلے ہی چھیننا ہو گا۔ نکاح کے بعد کھانا اور کھانے کے  
 بعد جیسے بارانی چرنا بھول گئے۔ ”بسی مذاق“ قہقہے  
 رات ڈھائی بجے ان کے رخصت ہونے کے بعد سب  
 جہاں کہیں لڑھکنے کے مصداق پڑ گئے تھے۔ بے ہوشی  
 کی غنیمت تھی۔

بلی بچیاں دلی سسکیاں۔ جو شور و غوغا میں کسی  
 کے کان نہ پڑی تھیں۔ سناٹے میں سب کو بیدار  
 کر گئیں۔ مندی آنکھوں چکرائے سروں اور  
 لڑکھائے قدموں سب آوازوں کے تعاقب میں جب  
 نوین کے کمرے تک پہنچے تو منظر حیران کن تھا۔ وہ اسی  
 سرخ سوٹ میں لمبوس تھی۔ دوپٹا چوڑی پہ پڑا تھا اور  
 گٹھنوں میں منہ کر کے روئے چلی جاتی تھی۔

اس کے رونے کی وجہ سے سب واقف ہی تھے۔  
 2013ء میں ایک بڑھی کبھی لڑکی کی زندگی کا اتنا  
 اہم ترین فیصلہ ایسے طریقے سے کیا جاتا تو نہیں چاہیے  
 تھا مگر سب جانتے تھے وہ راضی تھی۔ منہ سے بس اتنی  
 نکلتی تھی۔

ضمیر خان اور می کے مطابق نوین کو سمجھایا جاسکتا  
 تھا۔

نعمان خان کے پاس دقت نہیں تھا۔ وہ نوین کے  
 فرض سے فائدہ ہو کر اس لئے جانا چاہتے تھے۔  
 اگر کچھ اور عرصے یہ کشش جاری رہتی تو صوفیہ اپنی

مغذوری و بڑھاپے کے واسطے دے کر بیٹے کو اپنے  
 راستے کی نشان دہی کر دیتیں اور ماؤں کو آخر تک بیک  
 ٹالا جاسکتا ہے۔

رہی نوال ضمیر خان۔ اس کی زندگی میں کبھی  
 تکمیل تک پہنچنا سب سے اہم مشق تھا۔ وہ بچپن  
 جب کب کس نتیجہ حسب فضاء ہونا چاہیے سو  
 اس کی عقل اور فیصلہ کچھ دیر تک حیرت سے  
 کھڑے سب لوگ اسے دیکھتے رہے۔ زینت منیر خان  
 اب تک کچھ نہ سمجھی تھیں وہ بس خوش تھیں۔ بچی مگر  
 کی ہوئی اور گھر والا بھی بے سندید ہے۔ لڑکیاں ایسے مرحلوں  
 پر روئی ہی ہیں مگر نعمان خان نے ایک کرسی حسین اور  
 نوین کے عین سامنے بیٹھ گئے۔

”سب جانتے ہیں نوین۔ ہمیں اس رشتے پر کوئی  
 اعتراض نہیں تھا۔ نہیں ہے۔“ ان کی آواز واضح  
 دو ٹوک اور بے لچک تھی۔ ”وہ وہی ہوا جو تم چاہتی تھیں  
 جس کے پیچھے تم کسی بھی اور راستے کی چاہ نہ کر سکتیں  
 اور۔۔۔“

”لیکن بابا کو اعتراض تھا بلکہ شدید اعتراضات۔“  
 اس کا جواب ترنت اور نعمان خان سے زیادہ قلعی  
 تھا۔

”تو تمہارے خیال میں ایک بے وقوفی بابا کر گئے اور  
 ایک بے وقوفی کرنے کے لیے تمہیں آزاد چھوڑ دیا  
 جا تا۔“ نعمان خان ناؤ کھا گئے۔

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ بے وقوفی تھی  
 یا کیا؟ مجھے صرف بابا کے فیصلے کا احترام کرنا تھا۔“ وہ اپنی  
 سوچ میں پختہ تھی۔

”میرے بابا کی خواہش کا اتنا احترام۔۔۔ اور زندگیوں  
 کی فکر و پریشانی کا کوئی احساس نہیں۔ تمہیں احساس  
 ہے تمہاری بے جا زندگی کیسے ان کے پیاروں  
 بوڑھے جسم اور لڑکھائے اعصاب کو ختم کیا ہے؟ وہ  
 بلند آواز میں بولے تھے۔ ”ہر روز۔۔۔ ہر۔۔۔ تمہیں

زندہ مال کی ذرا پروا نہیں اگر ہوئی تو کب کی گھر باکر  
 انہیں سکون سے مرنے کی اجازت ہی دے دیتیں۔  
 تمہارا وراثت سمجھ میں آتا جب ہم واقعی جبر کرتے اور

کسی بھی بندے کو پکڑ لاتے مگر ہم نے وہی کیا جو  
 تمہاری بھی خواہش تھا۔“

نوین نے پہلی بار ظاہری و باطنی دونوں آنکھیں  
 کھول کر بھائی اور ماں کو دیکھا۔

زینت منیر خان جو اس پابند تھیں اور نا سبھی  
 میں آنسو بہا رہی تھیں۔ اور نعمان خان جو سخت درمزد  
 تھے۔ حاضرین کے چہرے نعمان خان کی تائید پر مائل  
 تھے۔

”لیکن بابا کی خواہش۔۔۔“

”بابا مر چکے ہیں نوین۔ اپنی سوچ اپنے وقت  
 اپنے مزاج اپنی خودی کے سارے روپ ان کے ساتھ  
 دفن ہو چکے تھے۔ زندہ انسانوں کو زندگی اپنے حساب  
 سے گزارنی ہوتی ہے۔ بزرگوں کی خواہشات و خواہوں  
 کا احترام واجب ہو مابہ مگر اس وقت جب وہ شریعت  
 اللہ رسول کے فیصلوں سے نہ ٹکرائیں۔

بابا کا فیصلہ اپنے وقت کے حساب سے تھا۔ صحیح یا  
 غلط لیکن اب وقت بدل چکا ہے۔“

”تو تو کیا بابا غلط تھے؟“ وہ ان کی بات کاٹ کر  
 تیزی سے بولی تھی۔

”نہیں۔ مگر جو آج ہم نے کیا وہ بھی غلط نہیں۔“

نعمان خان نے جمائی لی۔ انہیں اب اور کچھ نہیں  
 کہنا تھا۔ سننا بھی نہیں تھا۔

نوین کا چہرہ متزلزل تھا۔ وہ صحیح اور غلط کا فرق نہیں  
 کر پا رہی تھی۔

ضمیر خان کو اس پر ترس آیا۔ پیار آیا۔ اپنی وہیل  
 جبر کو ذرا سی حرکت دے کر وہ نعمان خان کے برابر  
 آگے مرنے والے کی خواہش سے زیادہ زندہ رہنے  
 والے اہم ہوتے ہیں نوین! امیرا کہنے کا مقصد فقط یہ  
 ہے کہ زندہ انسانوں کو زندہ فیصلہ کرنے چاہئیں جو زندگی  
 کے لیے ضروری ہوں۔“

سب کان کھول کر سن رہے تھے اور نوال منہ کھول  
 کر۔

”مگر یہ نوال تو کچھ اور کہہ رہی تھی۔“ نوین نے  
 یکدم اونچی آواز میں کہا اور نوال کو بغور دیکھا۔ نوال

ہری طرح سپٹائی ”اب کیا۔۔۔ وہ سب کہہ دیں  
 گی۔“

”لوگی۔ میرے کہے پر کھن دھریے آپ نے۔  
 میرے کہے کو بھی اہمیت نہ دیں۔ بس میرے کہے پر  
 دھیان دیں اور میں تو کچھ بھی کہتی رہتی ہوں۔ ہے نا  
 گلال۔۔۔ بے جا ڈنڈ۔“

ضمیر خان کچھ نہ بولے۔ بیگم نے ان کی وہیل چیز  
 کو سارا دیا۔ باہر نکلے تو سب ہی باہر کو نکلے۔ نوال  
 وہیں کلپٹ پر ڈھے گئی۔ گلال بھی اب خطرہ نہیں  
 تھا۔ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی نوین کا چہرہ  
 پر سوچ تھا۔ نوال اور گلال جمائیاں لے رہی تھیں۔

”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم۔۔۔“ وہ اخطب کہنے  
 سے جھجکی۔ ”یعنی تم ان سے۔“ نوال نے بھاڑ منہ  
 کی جمائی روکی۔

”وہ تو میں آپ کو چیک کر رہی تھی کہ چرچ راہبیل  
 کر سرپٹ دوڑ پڑی ہیں یا پیچھے مڑ کر بھی دیکھتی ہیں۔ پتا  
 لگا۔ آپ فقط اٹھاتی ہیں نہ صرف سب کو۔ بلکہ اپنے  
 آپ کو بھی۔“ اس نے تائید طلب نگاہوں سے گلال  
 کو دیکھا جو مسکرا رہی تھی۔

”اور مجھے کیا کالے کتے کا کالے کہ میں ان سے  
 دفع دور لیو بندہ پہلے ہی کسی کے عشق میں عاشق  
 صادق بن گیا ہوتا ہو اس سے دل لگا کر مجھے کیا لے گا۔

اور رہا ان کا لاشقات۔“ نوال نے سرد آہ کھینچی۔  
 چہرے پر افسردگی چھا گئی لہجہ ملال سے پر۔ ”اور رہی  
 میں۔۔۔ ان کی نظر میں ہاں ملتے بھی شے باتیں بھی  
 کرتے تھے۔ خیال بھی رکھتے، آنکس کریم بھی کھلائی،  
 گلانے بھی سناوائے مگر مثال میری وہی تھی کہ ”مگ  
 لیل بھی پیارا ہوتا ہے“ میں تو خیر لیلی کی سگی بھانجی  
 تھی۔“

نیند سے کسی قدر ڈھیلی ہوتی گلال کا روالا رواں  
 تن گیا وہ تکیے کو پیچھے پیچھے ہنسی سے وہری ہو گئی۔  
 سانس تک رکھنے لگی۔ جبکہ نوین کی گویا قوت گویائی کو  
 گئی۔ کوئی بھلا اپنے آپ کو یوں بھی کہتا ہے وہ فقط  
 لاجول کہہ پاتی۔

صبح بہت دیر سے ہوئی۔ ناشتے کے بعد کام شروع  
شادی کی تیاری تھا جو عید کے چوتھے روز کر دی گئی  
تھی سب کی بانی رائے اور فیصلے۔

ایک چیز کا ذکر کرتے پھر دوسری کا۔ ضروری غیر  
ضروری۔ سب جان بوجھ کر موضوع کو طول دیتے  
بلکہ بول لگا جیسے چاہتے ہی نہیں کہ ٹاپک بدلا جائے۔  
لیکن نوال کی ایک عمارت کے ساتھ سب جو کچھ  
نویں کو کچھ دکھائی تھی اور کچھ کہہ رہی تھی۔ نویں  
کے چہرے پر حیرت، بے یقینی نے عجیب خوف زدہ سے  
تاثرات پھیلا دیے۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا اور ایک  
دھیر سا ٹیبل پر۔ سب نے آگے بڑھ کر اس کے منظر  
کو کھول کر ایک ایک کتاب اٹھالی۔

”سلیپ۔“ نویں منبر خان کا شعری مجموعہ۔

انتساب ”نوال ضمیر کے نام“

”ہائیکو۔“ ہائیکو۔ یہ کب ہوا؟

”ارے نویں! تم پوٹری بھی کرتی ہو۔“ الگ الگ  
تعبیرے اور اچھے بھرے جملے۔ نویں کی جواب دیتی وہ  
خود ایک شاک کے زیر اثر تھی۔

وہ سرورق پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ سیاہ سرورق پر  
دھیرے دھیرے معدوم ہوتے سائے کا نقش تھا، مگر  
جہاں جا کر سلیپ ختم ہوتا وہاں سے اچانک روشنی پھوٹی  
محسوس ہوتی تھی۔

یعنی مایوسی میں کرن یعنی خاتمے کے گنگن پر یقین کا  
آقا۔ بہت خوب۔ نویں کو اپنی زندگی کی گنگائی لگا  
سرورق۔

نوال شاہانہ بے فکر انداز میں یوں بیٹھی تھی جیسے  
اس منظر سے قطعاً ”وچسپی نہ ہو۔“ یا وہ کچھ جانتی ہی نہ  
ہو۔

زینت منبر عجیب نا سنجھی کے عالم میں کتاب کو  
تھامے بیٹھی تھیں۔ مٹی کا استیجاب نگاہوں کے سامنے  
تھا، مگر آنکھوں سے پھٹکتی شادی مرگ کی سی کیفیت۔  
نعمان خان نے کتاب کو کھولے بنا آگے پیچھے سے  
سمجھا کر دیکھا اور ”گندہ“ کہہ کر بات ختم کی۔

امریکن بھابی اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں با آواز بلند

اشعار پڑھ رہی تھیں اور جواثر سننے والوں پر بڑا ہاتھ  
اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ سامعین اور شاعر خود بھی کچھ  
پل جاتے کپڑے پھاڑا بل فوج جنگلوں میں جا نکلتے  
بھابھی بھی ہر شجر کے اختتام پر دلو طلب نگاہوں  
سے سب کو دیکھتیں۔ نوال پر نگاہ پڑتی تو اسے پوری  
پوری داؤ بھی دیتی پڑتی اور ساتھ کپ لٹاپ کا شکار  
ہوتی۔

”بابا کو پسند نہیں تھا یہ سب۔“ بہت دیر بعد بولی۔

”پھوڑیں جی۔“ آخر انہیں پسند تھا کیا؟ ”نوال جی

بھر کے بد مزہ ہوئی۔“ اب انہیں جوڑی ہوا رہا جائے کرنا

اور چٹا ہوا دھنسا کب پسند ہو گا اپنے لیے، مگر آپ نے

پھرتی ہیں نا۔ خالہ! آپ سمجھ کیوں نہیں لیتیں کہ کچھ

چیزیں انسان کی اپنی ذات کے لیے ہوتی ہیں۔“

نوال نے اسے انداز سے وضاحت کی۔ نعمان خان

اور ضمیر خان کا متحضر کہہ کر منہ کھولا۔ نویں کا

منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”بند کریں اسے کھیاں تمہیں گی اندر۔“ اس نے

ڈنٹا۔

سب ورق گردانی کر رہے تھے۔ نویں کے حیران چہرے

پر اب خوشی چمک، مخربیرا ہوا شروع ہوا۔ نہ منت حکیم

اور نوال اسی کو دیکھ رہی تھیں۔

نویں کا ایک نیا دمکا چہرہ۔

\*\*\*

نکاح جیسے اہم معاملے کو حل کرنے کے بعد اب

نوال کے پاس بظاہر کوئی کرنے والا کام نہیں تھا۔ تب

ہی بے خود چلا آیا۔

”آپ مجھے بس ان بیلوں کے پاس بٹھا کر آجائیں

اور انھیں بھائی جان سے کہہ دیں کہ یہ یہاں سے بے

مجھے بھی نہیں۔ قربانی کے دن تک۔“

”کل آتو رہے ہیں ہمارے کمرے۔“ نوال پر

سستی سوار تھی۔

”وہ تو آئیں گے ہی، مگر مجھے ان بیلوں کے ساتھ

رہنا ہے ہر وقت۔ اتنی شوماری ہے میں نے اپنے

اسکول کے لڑکوں کے سامنے۔ وہ سب دیکھنے کے لیے  
آنا چاہتے ہیں۔“

”تو لے آؤ نا اس میں کیا مسئلہ ہے؟“

”مسئلہ یہ ہے کہ جب میں ان سب کو لے آؤں

اور دوسرا بھائی جان نے مجھے سب کے سامنے ڈانٹ کر

بھاگا دیا تب میری کتنی عزت خراب ہوگی۔“

”تو اتنے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا تھی؟“ نوال

کو اس کا رد ناپے چین کر گیا۔

”آپ کی وجہ سے۔“ اس نے ہنسی لی۔ ”آپ

سب کر سکتی ہیں نا۔“

”اچھا!“ نوال نے ہار مان لی۔ ”تو چلو آؤ پھر ابھی

چلتے ہیں۔“

تیز میوزک ٹینٹ کے اندر سے ابھر رہا تھا۔ ایک

شور کا عالم۔

”تم کو کمرہ رہے تھے شام کے وقت لوگ آکر دیکھتے

ہیں۔ یہاں تو صبح گیارہ بجے ہی انتشار ہے۔“

بے خود لا علم تھا اس نے کندھے اچکا کر نفی میں

گردن ہلاتی۔

”دفعہ“ نوال کے ہونٹ سٹی کے سے انداز میں

سکڑے۔ یہ بابا کا رانٹ انعام کے دوستوں نے چا

رکھی تھی۔ نوال نے داہنی کا سوجا۔ اسے یاد آگیا

انھیں نے پہلے اس کے دوستوں کے سامنے آجانے پر

کس قدر رانا مانا تھا، پھر نا تو بھی تھا ہوئی تھیں۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی کے لیے قدم بڑھاتی

انھیں انعام کی بوجھانے قدم روک دیے۔

”تم!“ نوال کو جواب نہ سوجھا۔

”تمہارے قتل دیکھنے آئے ہیں۔ تم نے تو ایک بار

بھی دعوت نہ دی۔“ وہ دوستانہ انداز میں شکوہ نکال

ہوتی۔

”تمہیں دعوت کی کیا ضرورت۔ چوری جیسے دیکھ تو

رہی تھیں اس دن۔“ اس کے جملے میں طنز کی آمیزش

تھی۔ نوال ہنسی۔

”نوال! اندر میرے دوست ہیں۔“ وہ معاملانہ انداز

میں بولا۔ نوال کے عذاب تم چہرے سے جھلک رہے

تھے۔

”میں دوست ہی ہوں گے دشمنوں کو تو تم نے باہر  
کھڑا رکھا ہے۔“

”کیسی بات نہیں ہے، تم بعد میں آنا۔“ وہ اسے

جلد از جلد رخصت کرنا چاہتا تھا۔ مبادا کوئی باہر آئے

جبکہ نوال کو اس کے صبر کو آزمانے میں مزہ آ رہا تھا۔

”اور تم نے اس بیچے کے چارے سے کاہے کی

دشمنی پال لی۔ اسے اندر کیوں نہیں آئے دیتے؟“

انھیں نے بے خود کو گھورا جو اپنی طاقت (نوال)

کے سہارے بڑے انداز سے کھڑا تھا۔ وفا واریاں بدل

لینے والا غدار۔ انھیں نے اسے معاف تو نہیں کیا تھا

نوال کو بانی بنالینے کے بعد۔ بھائی جان والا ورق جیسے

پھاڑ چکا تھا۔

”شام کو آیا کرے نا۔“

”تم بھی تو سارا دن بیٹھیں ہوتے ہو۔“

”اس لیے کہ یہ میرے تیل ہیں۔“

”ایک بچہ اگر تھیں سامنے بیٹھ کر دل خوش کرے گا

ٹوکیا تمہارا ثواب کم ہو جائے گا۔“

اندر سے انھیں کے نام کی پکار بڑی تھی۔ یہ نوال

کی بچی اگر اب بھی نہ مٹی اور اگر کوئی باہر آگیا تو۔

”اب تم جو بھی سمجھو۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

”اور پلیز جاؤ۔ خود خرید کر لاؤ کمرے اور کرواؤ اس سے

چاکری۔“

”وہ تو ہم لے ہی آئیں گے۔ ہمیں کون سی نمود

نمائش کرنی ہے، ہم تو لائڈ کی خوشنودی کے لیے۔“

انھیں نے چہرے پر ایسے تاثرات جمائے جیسے سن

ہی نہ رہا ہو۔ نوال سب سمجھ رہی تھی وہ بس اسے

وہاں سے رخصت کرنا چاہتا تھا۔

”آؤ بے خود!“ اس نے بے خود کا ہاتھ تھما اور

داہنی کی راہ لی۔

”لیکن میرے دوست!“ وہ منمنایا۔

”تم آؤ تو۔“ انھیں کو یہ حرکت بہت مہنگی پڑے

گی۔ تم کل اپنے دوستوں کو بلا لینا سبکی جگہ پر

چھوڑو۔“

واپس گھر آکر اس نے نوین کے سامنے خوب شور مچایا۔

”بس آپ نے پہلا کام یہ کرنا ہے۔ ایک بری چاچی بن کر سب سے پہلے اس شخص کا پتا صاف کرنا ہے نکال دینا گھر سے باہر۔ اس بن ماں کے بچے کو۔“  
”اس کے دوست تھے نوال! اب ہر طرح کی سوچ رکھنے والے ہو سکتے ہیں۔ کس کس کو وضاحتیں دینا کہ ایک اتنی خوب صورت لڑکی اتنے لوگوں میں۔“  
”اس نے اس بار مجھ سے ڈائریکٹ پوچھا ہے نانی جان۔!“

”چھوڑو بیٹے! اتنا پیارا بچہ ہے۔ پتا نہیں تم نے اہل روز سے اس سے کیسا پیرا بندھا۔ اسے عور میں ڈھکی چھپی پسند ہیں، لچائی شرمائی۔ تم اس کی سوچ کا الٹ نکلیں یا انکو اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرنے والی اور۔“

”نانو! نوال حلق کے بل چلائی۔“ زیادہ طرف واری مت کریں۔ آپ فیصلہ کر دیجئے۔ آپ نے مجھے رکھنا ہے یا اسے؟“

”دونوں کو۔“ زینت بیگم نے مسکرا کر فیصلہ سنایا۔

”ایک میان میں دو ٹکواریں نہیں رہ سکتیں۔“ وہ قطعی بن سے بولی۔

”تو ٹکوار بننے کی کیا ضرورت ہے۔ پھول بن جاؤ۔ ایک گلہان میں دو پھول تو رہ سکتے ہیں نالکے گلہستہ۔“  
نانو نے لا جواب کر دیا۔ وہ چند بل کو چپ کی چپ رہ گئی۔ پھر وہ بیان آیا۔

”میں اب بھی آپ غلط ہیں۔ پھول تو میں ہوں اور وہ۔“ اس نے قصداً ”جملہ اوصورا چھوڑا اور گل پھلا لیے بساط بھر۔“

”پھول ہے وہ بھی، مگر آپ نے کبھی گو بھی کے پھول کو گلہان میں بٹاتا کھا ہے۔“  
نانو کاٹکٹا کھلا کھلا رہ گیا۔

نوین کی جلتیگ نبی نے نوال کو چونکایا۔ نبی میں ایسی کھٹک پہلے نہیں تھی زینت بیگم نے بھی اس بل پر یہ احساس کیا تھا۔

”تمہارے دوست تو نہیں ہیں نا اندسہ کیا ہم اب آسکتے ہیں؟“

آج پھر نوال دست سوال دراز کیے ٹیٹ کے باہر کھڑی تھی بے خود اس کے بالکل پیچھے تھا۔ ذرا سی گردن نکال کر اس امید بھری نگاہوں سے ان شخص کو دیکھ لیتا جو فیصلہ اب وہ سنائے۔

دونوں کے چروں پر اتنی ساوگی، شرافت اور عاجزی تھی کہ ان شخص شرم سے ہائی پانی ہو گیا۔ اسے اپنے کل کے رویے کی بد صورتی کا بخوبی احساس تھا مگر اس کے دوست کتنے کینے اور غیبت تھے۔ وہ اس بات کو بھی بخوبی جانتا تھا۔

”وہ آئی ایم سوزی۔“ اس کے منہ سے نکلا۔

”اُس اوکے۔“ میں سمجھ سکتی ہوں۔“ نوال تو کھلی جارہی تھی۔

ان شخص نے راستہ چھوڑ دیا۔ دونوں ریڈ کارپٹ پر چلتے بیلوں کی جوڑی تک آگئے۔

جانور بے پناہ خوب صورت تھے اور ان کی قیمت لاکھوں روپوں تک تھی۔ ان شخص کے پیلا سالوں سے وعدہ کر رہے تھے کہ وہ اس بار لازماً ”عید اس کے ساتھ کریں گے“ مگر وہاں امریکا میں ان کی پوری فیملی تھی۔

ہر بار معذرتی کال آجاتی۔ اس بار اپنی غیر حاضری کو بہت سارے نوٹ بھیج کر بھرنے کی کوشش کی تھی۔ ان شخص خوش تھا بہت زیادہ۔ ماں کی ایر کرش میں موت۔ باپ کا نئے ملک میں نئی دنیا بانی اور اسے بھول ہی جانا۔ اس کے دل کے زخم تھے۔ اس کے بھاری بھر کم جو میں ایک دل تھا جو حساس تھا تاہم اور بے قرار۔

بے خود نے تو بیلوں سے لپٹ کر چوم چوم کر اپنی پسندیدگی محبت اور بے خودی کا اظہار کیا جبکہ نوال نے

ایک طویل تعریفی پیرا گراف پڑھ کر سنایا جس کے ہر جملے پر ان شخص کے چہرے پر ایسے اثرات پھیل جاتے تھے جیسے اس کی تعریف کی جارہی ہو۔ رنگ سرخ۔ انھوں میں چمک اور تازہ سبز۔

”تم نے اتنی کو کیسے منایا نوال؟“ وہ قطعاً ”نہیں پوچھنا چاہتا تھا مرکز ذہن و دل میں مگر اتنا سوال اسے سامنے دیکھ کر خود بخود منہ سے نکل گیا اور جملہ پورا ہوتے ہی اس نے خود کو تارڑا۔ اب نوال کے چہرے کے فحشہ اثرات خود ستائشی والے جملے سننے پڑیں گے۔

لیکن نہیں۔ وہ نوال کو ابھی جانتا نہ تھا۔ نوال آج کی اور ہی مشن پر تھی۔

”دس نے کیا منانا۔ بس سب نے سمجھایا ہی تھا۔ انکار کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔ مجھے تو بس یہ خوشی ہے کہ کہانی کا اینڈ بھی ہے۔“ وہ متانت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

”تم آج شاپنگ پر جاؤ گے اپنے چاچو کے ساتھ۔“ اس نے جیسے یک دم یاد آنے پر پوچھا تھا۔

”جانتا تو چاہتا تھا مگر یہاں بیلوں کے پاس میری زیادہ ضرورت ہے۔“ اس کے دوستانہ انداز پر اس نے بھی اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔

”ذرا اصل میں شہ بالا بنوں گا۔“ وہ خوشی اور فخر سے بولا۔

نوال نے فوراً ”ابنی نگاہیں بیلوں کے گوبر پر نکاویں شہ بالا نے ان شخص کو دیکھنے سے جو گدگدی ہوئی تھی۔ اس کے تاثرات چہرے سے نہ چھلکیں لہذا کسی الٹ سے کو نہ کھاجائے۔

”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ تو تم جاؤ نا۔ یہاں سیکورٹی گارڈز ہیں اور بے زار لا لا داوا جان کو بھی ہلا لیتے ہیں۔ پھر بے خود اور میں بھی نہیں ہیں میرا تو بٹنے کو دل نہیں کر رہا۔ اتنے تو یہ پیارے ہیں۔ دل کرنا ہے بس دیکھتی ہی رہوں۔“

نوال نے لہجے میں بے حد اشتیاق محبت اور بے لگی شامل کر لی۔ وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا

کر دہری ہی ہو گئی تھی۔ اس کی مجبوری نے ان شخص کا دل موم کر دیا۔

”ہاں۔ ہاں تم تو روہنا اور ہری رو۔ دن کے وقت تو ادھر کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ شام ہی میں آتے ہیں لوگ۔“

”تو تم بھی اپنی شاپنگ کر آؤ نا۔ میں ہوں نا ادھر۔“

ان شخص نے سر ہلایا نوال کی موجودگی اطمینان کا باعث تھی۔

عید کا دن واقعی عید بن کر دونوں گھروں میں اترا تھا۔ دیو دیوار تک سے خوشی کے رنگ پھوٹ رہے تھے۔ ہر چہرہ دمک رہا تھا۔ ہر دل دھڑک رہا تھا طمانیت سے۔

زینت بیگم کی خوشی کا عالم۔ پچھلے برس آنکھیں دکھ سے بھٹی تھیں اس بار خوشی سے چھلکتی تھیں۔ اتنی رونق آتی آوازیں، توتھے، ٹیٹا، بو، پوتے، بھانجا، بھانجی، بھتیجی اور نوین کی صورت اس نے ایک بار بھی تکتے نہیں لگایا تھا۔ نہ وہ بہت زیادہ بول رہی تھی۔ مگر ایک خوش گو اور دل موہ لینے والی تحریر تھی جسے سب ہی پڑھ رہے تھے۔ نوین کی نبی بے آواز تھی، آنکھوں سے چھلکی پڑتی تھی۔

اتنے بڑے جانوروں کے ذبح ہونے کا منظر دیکھنے کے لیے ایک جم غفیر اکٹھا تھا۔ لڑکیاں بھی سب ٹیرس پر کھڑی تھیں۔ بروڈ فیمل قصابی آئے تھے، مگر اشتیاق احمد اور ان شخص بھی فل فام میں تھے۔

تیل بے حد ستر دست اور جان دار تھے۔ چروں پر معصومیت اور شرافت تھی، مگر شرافت سے بچنے کر کر ذبح ہونے کو تیار نہیں تھے۔ اسے بانہ جھنے کے بعد سب نے زور بازو آزما، مگر کرتی ہوئی دیوار کو آخری دھکا ان شخص ہی نے دیا۔

سب خواتین کی آنکھوں میں ستائش آن رہی۔ ”ہو ہونس۔ تیل نے تیل کو گرایا۔ کون سا کمال



دیکھا؟" نوال کی اپنی قطعی سوچ تھی۔  
 نوین نے اس کی پسلی میں چٹکی لگائی۔ "میرے  
 جملوں پر کان کھڑے کرنے کے بجائے اپنی آنکھیں  
 کھول کر ادھر دیکھیں، جہاں آپ کے موصوف نوؤ  
 انسکریبن کر محض جائزہ ہی لے رہے ہیں۔" نوال  
 کا اشارہ اخطاب اشتیاق کی طرف تھا۔  
 "مجھے کیا ضرورت ہے دیکھنے کی۔" وہ مکرنگی۔  
 "سماری عمر جو دیکھنا ہی ہے۔" گلال نے کلزا  
 جوڑا۔

"وہ ملنے کو بے تاب ہیں۔" نوال نے یاد دلایا۔  
 "جب اتنے عرصے صبر کیا تو پھر میں چار دن کی توہ  
 گئے ہیں۔" گلال نے کہا۔  
 "وہ کہتے ہیں چار دن بعد تو پھر آوازیں لگا کریں گی۔  
 نوین! میرے سونے لاؤ اور چائے۔ پیوی تو پھر پیویوں  
 جیسی ہی ہوگی۔ بیس سال پرانے عشق کی یاد گار ایک  
 جملہ تک نہیں۔"  
 نوین نے دہل کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

نوال نے ہانپتے ہوئے اور جھجھلائے انداز میں آکر  
 نوین کو پکارا۔  
 "میری سم نہیں مل رہی۔ اب آپ ڈھونڈ  
 کریں۔" وہ اتنی پریشان دکھائی دے رہی تھی کہ نوین  
 فوراً "مدد کو آئی۔"  
 "تم نے نکالی ہی کیوں تھی؟"  
 "پہلے چار جر خراب ہوا۔ اب فون بھی تنگ کر رہا  
 ہے۔ اس کو بلا جلا کر دیکھ رہی تھی۔ بیڈ پر گری یا  
 کارپٹ پر کچھ خیر نہیں ہوئی۔" نوال سبے زار تھی۔  
 "تو تمہارا کمرابھی تو کبنا ڈھانڈا ہے، ہر چیز بے جگہ۔  
 سوئے وقت بستر تک تم بھاڑی نہیں ہیں جہاں نیند  
 آئی اٹا غفل۔" نوین دہکتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔  
 "تم بیٹھی اکیلا تھیں جب سم گری ہے۔"  
 "وہیں بیٹھی تھی جہاں اب آپ کے" وہ بیٹھے  
 ہیں۔" نوال کی آوازیں غلج تھی اور ساتھ ہی دروازہ

بولت ہو گیا۔  
 "نوال۔" نوین نے تیزی سے مرکز دروازہ اپنی  
 جانب کھینچا اور دھڑوڑھڑایا۔  
 "آجاول کی چندہ منٹ بعد۔ زیادہ شور نہ کریں  
 ایسا نہ ہو سارا گھر ادھر آکر پندہ منٹ مگر زور کا  
 انتظار کرنے لگے۔" نوال کی آواز کم ہو رہی تھی۔  
 شاید پلٹ گئی تھی۔  
 نوین کچھ نہ سمجھی اور جو سمجھ میں آیا تھا اس کے  
 پیروں سے زمین سرکنے لگی۔ اپنی پشت پر جمی پر شوق  
 نگاہوں کی پیش تن من کو پھونکنے والی تھی۔ اس نے  
 دو سرا ہاتھ بھی ملا کر رکھ لیا۔

اخطاب بیڈ پر پاؤں زمین پر جمائے بیٹھے تھے۔  
 دونوں کہناں گھٹنوں پر تکی تھیں۔ ہاتھ ایک دوسرے  
 میں پھنساتے وہ دس اس خرچی گردن کر کے اسے سرتاپا  
 دیکھ رہے تھے۔  
 اخطاب ذرا سا جھکے بیٹھے تھے اور نگاہیں روں پر پڑتی  
 تھی۔  
 سلور انگوٹھے والی چیل۔ سلور نیل پاش۔

ہلکا گلابی چوڑی دار پاجامہ، نگاہ کا سہل پسند منتر قیص  
 کے دامن پر پہنچا۔ سلور نیل گلابی رنگ پر ہمار دکھاری  
 تھی۔ نازک کمر پر چھوٹی چوٹی جھان کا گول سلور چوڑی  
 برابر کا آؤرنہ تک ساکت تھا۔ جارح کا سلور نیل لگا  
 دوپٹا شانے پر سٹا تھا۔  
 "جتنے سال تمہاری قسم کی پاس داری میں تمہیں  
 نہیں دیکھا۔ اس سے ڈبل وقت میں تمہیں اسی طرح  
 بیٹھ کر دیکھتے ہوئے گزار سکتا ہوں نوین! مگر نوال نے  
 صرف چندہ منٹ بے ہیں۔"  
 نوین کچھ نہ بولی۔ اس کا دل بہت زور سے اچھلا اور  
 آنکھ سے ہنسنے لگا۔ اس کے اندر رخ موڑنے کی طاقت  
 تھی ہی نہیں۔  
 "تمہیں خبر ہے، میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔  
 یقین کے ہمراہ کسی اور جانب دھیان کیا ہی نہیں۔"  
 ہنوز خاموشی۔  
 "کیا اب بھی کسی قسم نے تمہیں روک رکھا ہے؟"

جنش پر بھی آمادہ نہیں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے بتا دو  
 یا۔ تمہیں شاید اب تک میرے ضبط کا اندازہ نہیں  
 ہوا۔"  
 اخطاب کے لہجے میں افسوس کھل گیا۔  
 نوین نے لاک کو اتنی مضبوطی سے تھام رکھا تھا کہ  
 نرم ہاتھوں کی رگیں تک ابھرنی لگیں۔ وہ اس کا سامنا  
 کرنے کی خود میں ہمت نہیں پاتی تھی۔ یہ شرم "حیا"  
 کے خانے میں نہیں بیٹھتی تھی یہ شرم "بدرامت"  
 کے زمرے میں آتی تھی۔

"میں جانتی تھی اخطاب! آپ جے رہیں گے اور  
 ڈنٹے رہیں گے۔ میرے قدم مضبوطی سے جے تو وہ  
 آپ کی موجودگی کا احساس ہی تو تھا کہ آپ ہیں اس  
 طرف۔" نوین کی آنکھیں بہہ رہی تھیں اور دل کہہ  
 رہا تھا۔  
 "میری خند نے آپ کو کس کس طرح آزمایا ہوگا۔  
 بے اندازہ مجھ سے خود کو شرمسار پاتی ہوں اخطاب!  
 آپ سے سامنا کرنے میں۔ ورنہ مجھ میں ایسا کچھ  
 نہیں تھا کہ میری خاطر۔"

اس کے دل سے اچھے جملے اس کے لیے تکلیف دہ  
 تھے۔ ایک سسکی سے ابھری اور اخطاب کی سامتوں  
 سے ٹکرا کر انہیں بے تاب کر گئی۔  
 "بہت من باتیں کر لیں تم نے نوین منیر خان۔  
 ان آنسوؤں کو پوچھنے کے لیے اب بھی کیا میں تمہاری  
 اجازت کا انتظار کروں گا۔" وہ کچھ جارحانہ انداز میں  
 دھمکی دیتا کرتے ہوئے کھڑے ہوئے تھے۔  
 تب ہی چار جٹ کا دھیمی حرکت نے سرکنا دوپٹا  
 شانے سے دامن تک پھسل گیا اور اگلے پل۔ زمین  
 بوس ہو گیا۔  
 نوین نے ذرا اخصبہ لہجہ حیرت سے سنا تھا اور بیڈ  
 کے چرچے ان کی آواز بھی وہ کرنٹ کھائے انداز میں  
 گھوٹی تھی۔  
 اخطاب ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ اس کا دوپٹا۔  
 اوس۔ اوس۔ ابھی تو اپنے صبر اور ضبط کا قصہ سنار ہے  
 تھے اوس۔ لیکن نہیں دوپٹا خود ہی سرکا تھا۔ اخطاب

جارحانہ انداز میں اٹھے ضرور تھے مگر اپنی جگہ سے ہلے  
 نہیں تھے۔ نوین کے اندر اتنی سکت بھی نہ رہی کہ وہ  
 ذرا جھک کر دوپٹا اٹھا لے۔  
 وہ پورے قد سے پوری رعنائیوں کے ساتھ عین  
 سامنے تھی۔  
 اخطاب تین قدموں میں اس تک پہنچے تھے۔  
 نوین کو سب بھول گیا۔ رات دن عہد، قسم، رشتے  
 ملتے کیوں تک، کیسے کے مسائل۔

یہ اتنی بڑی زنن تھی اور آسان۔ اور اس میں بے  
 بس کی دھانسن۔ باقی سب چھو متر ہو گیا تھا۔ کچھ رہا  
 تو صرف لفظ محبت، احساس محبت، انجام محبت۔  
 وہ حالت تک کو بھول گئی تھی۔ بس حال نظر آ رہا  
 تھا۔ جو زمین پر ذرا سا جھکا گلابی سلور پھولوں سے  
 بو جھل دوپٹا اٹھا رہا تھا۔  
 اخطاب نے دوپٹا ذرا سا بھاڑا، پھیلا یا اور بہت لگاؤ  
 سے اس کے سر پر لاؤ ڈھایا۔ نوین کی ٹھوڑی سینے سے  
 چپک گئی تھی۔

"تمہیں گمان ہوا میں نے تمہارا دوپٹا کھینچا ہے  
 نوین! میں سارے حقوق لے کر آیا ہوں۔" نوین کی  
 آنکھیں جھرمجھرنے لگیں۔ اس نے ہونٹ کانٹے  
 ہوئے لہجے میں گردن ہلائی تھی زور زور سے۔  
 اخطاب نے اس کا بازو شانے کیس سے پکڑا۔  
 "ایک لفظ نوین۔ فقط ایک لفظ۔" دوسرے ہاتھ  
 کی شہادت کی انگلی ہوا میں اٹھا کر لپٹی لہجے میں۔ جیسے  
 ہار گئے تھے۔  
 ان کے لہجے میں کچھ تھا "نوین نے نگاہیں اٹھائیں"  
 اس کا رونا اب با آواز ہو گیا تھا۔  
 "ایک جملے کی گزارش ہے۔ آواز بھولا نہیں  
 ہوں۔ بس یاد تازہ کرنا چاہتا ہوں۔" گہری خوب  
 صورت آنکھیں اس کے ترتر خرے پر جمی تھیں۔  
 "یقین تھا آپ پر۔ خود سے زیادہ۔" نوین کی  
 جھجکی ڈری مدام لٹی آواز ابھری۔ "مجمعی طرح جانتی  
 تھی آپ کسے جب ہی اٹا پرا داؤ کھیل گئی۔"  
 "ہائے نوین!" اخطاب نے لمبا سانس لے کر

جہت کو دکھا۔ ان پر اتنا گمراہ تھیں۔

اعتراف کامل۔ اظہار کا وقت۔ دیر۔ کہاں کی دیر کیسی دیر۔ غیبت میں دیر نہیں ہوتی۔ اخطب کچھ کہہ رہے تھے جذب دل کی شدتیں، نارسائی کا کرب، اک نگاہ کی حسرت۔ نوین کچھ نہیں کہہ رہی تھیں۔

وہ محض سن رہی تھی اور اخطب مسلسل بول رہے تھے۔ تجاے کیا؟

\*\*\*

”اگر تم پندرہ منٹ اور دوا دو تو۔“ اخطب نوال سے کہہ رہے تھے۔

”نوال نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”آپ کو پوری زندگی دے دی گئی ہے۔ اتنی چھوٹی بات مت کریں۔“

”اور باقی داوے کہنے کیا گئے تھے اور کیا سن کر آئے۔ اٹھاؤ اٹھاؤ سلامت ہے؟“

اخطب زور سے ہنس دیے اور دھیرے سے اس کے سر پر چیت لگائی۔

”تم بڑی چیز ہو نوال۔“

”آپ ابھی آدھا سچ جانتے ہیں جناب خالو صاحب۔“ نوال کو یاد آیا۔ نوین کا جبری نکاح اخطب کے علم میں اب تک نہیں تھا۔

”خالو۔“ اخطب کا انداز مخاطب بڑا ہی مضحکہ خیز لگا۔

ان کی بگڑی صورت پر نوال قہقہہ لگانے والی تھی، مگر یہ اخطب انعام کی دھاڑ بھی اور ساتھ بے خودی منتناقی آواز۔

وہ ذہن کیے بکرے کی طرح ڈکرایا تھا اور بمشکل باریک آوازیں پکار رہا تھا۔

”نوال باقی۔“ دونوں آوازیں۔ اور ساتھ دیگر آوازیں کچھ غیر فطری تھیں کہ نوال سر ہٹ دوڑی۔ اخطب بھی چند لمحے شرمے اور تیز قدموں سے پیچے چلے۔

نیچے کا سن کا منظر عجیب و غریب تھا۔ نوال کا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا کیونکہ اخطب نے اسے گریبان سے پکڑ کر زمین سے کافی اونچا اٹھا رکھا تھا۔ اور باقی حاضرین۔ ششدر تھے۔ اتنے کہ اخطب کو منع بھی نہیں کہتے تھے۔

نوال کی صورت دیکھ بے خود کے چلانے میں اور شدت آگئی۔ وہ اخطب کے سامنے بے بس تھا لیکن اب جیسے ہمت عود کر آئی۔ اس نے پوری طاقت لگائی اور خود کو چھڑاتا بھاگا ہوا آیا اور نوال کے پیچھے چھب گیا۔ اخطب بھی اس قدر تیزی سے بھاگا تھا اور نوال کو دیکھ کر بمشکل رک سکا۔ اب وہ اس انتظار میں تھا کہ نوال درمیان سے ہٹے اور ایک بار پھر یہ بے خود اس کے ہاتھوں میں ہو۔

”ارے کوئی بتائے ہو کیا ہے۔ کیوں بچے کے پیچھے پڑے ہو؟“ نوال نے چیخ کر کہا۔

”بچہ۔“ بچہ ہے یہ۔ پیٹ میں واڑھی ہے اس کی۔ وہ حلق کے بل چلایا اور مزید آگے ہوا کہ ایک بار ہاتھ آجائے۔ وہ اور بے خود گڑ گڑا۔ اور ہے تھے۔ درمیان میں نوال سیسہ پلائی دیوار بھی کھینچا۔

”لیکن ہوا کیا ہے؟“ وہ ذرا اونچی آواز میں چلائی تھی۔ تب سب ہی اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے اور سے چلتی وی۔

”اسے تو بند کریں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

انہ لگاتے لمحے میں تیز تیز بولتا نیوز اینکرو اسے بڑا برا لگا۔ اس نے دیکھا سب پوری طرح نیوز اینکرو کی سننے لگے اخطب اور بمشکل منہ نکال کر بے خود بھی دیکھ رہا ہے۔

اخطب کی ”ارے“ پر کچھ بولنے کے لیے منہ کھولتی نوال کا منہ بند ہوا اور پھر دوبارہ کھل گیا۔

”ہاں۔“ یہ تو کچھ جانا پہچانا منظر تھا۔ ”اوہ۔“ سب سمجھ گئی۔ ساتھ ہی ہونٹوں پر مسکان آن دی۔

وہ اخطب کے بیلوں کی جوڑی تھی جن کی خوب صورتی بے مثال تھی۔ بی دی کے رنگوں میں وہ اور

بارنے دیکھتے تھے۔ ان کا بی دی پر آنا جن کن نہیں تھا۔ کئی چینل والے آکر فوج بنا کر لے گئے دو اخطب انعام جو بیلوں کی رونمائی کے بعد فلسفہ قربانی پر ایک چھوٹی سی تقریر بھی کرتا تھا۔ لیکن اس بار منظر کچھ الگ تھا۔ بیلوں کی فوج کے ہمراہ بے خود خان پر کیڑا جاتا تھا۔

اور پھر چلتی نیوز اینکرو کی زبان۔

”مگر ناظرین آپ اس بچے کو دیکھیے۔ یہ کتنی مہارت سے اندر آتے دیکھیں اور بڑی عمر کے لوگوں سے بیلوں کو دکھانے کے لیے غور رہا ہے اور بچے کی کاروباری ذہنیت کا اندازہ لگائیے کہ دیکھنے کے دس اور ہاتھ لگانے کے پندرہ اور تصاویر بنانے کے پچاس روپے ملے کر رہے ہیں۔ اور ناظرین۔ لوگ خوشی خوشی بغیر کسی بارگیننگ کے جیسیں خالی کر رہے ہیں۔ ناظرین۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اگر قربانی میں محض چند دن اور رہتے تو یہ بچہ جانور دکھا دکھا کر ان بیلوں کی قیمت جو کہ لاکھوں میں ہے جو خرید کر لیتا۔“

ایک لمحے میں چار بار چلنے والی یہ خبر۔ اب تک نل کے ساحل سے لے کر تائب خاک کا شغری تک پھیل چکی ہوگی۔

”یہ کب ہوا؟“ نوال نے دانت پیس کر بے خود سے پوچھا۔

”میرے کو نہیں پتا۔“ بے خود لا علم تھا۔

خبر بدی تو سب ایک بار پھر بے خود کی جانب متوجہ ہوئے جن میں سب سے اشتعل انگیز توجہ اخطب انعام کی تھی۔

وہ کسی رولسٹر کی طرح اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر پتھریاں دیتا چاہتا تھا اور اپنا کوڑا کی طرح نکل کر اگلے دن اتارو سرابا بنا رہا۔

مگر اب سب بڑے جو سیلے انگشت بدندان تھے دھیرے دھیرے سے وار ہونا شروع ہوئے۔

”میرے کو موٹا مل لیتا تھا۔“ وہ ہچکچوں سے رو رہا۔

”تو تم کسی سے بھی کہہ دیتے۔ کون منع کرنا۔“ اخطب پر موٹی آنکھوں کے آنسوؤں کا اثر ہوا۔

سب ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

”نوال باقی نے کہا تھا کہ۔“ انک کر چیز لینے سے عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔“ اس نے ایک انگ کر مشکل لفظ کہا۔ ”اس لیے اپنے ہاتھ کی کٹائی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“ اس نے آستین آنکھوں پر پرکڑیں۔

”تو یہ خبر اپنے ہاتھ کی کٹائی تھی سالے۔“ اخطب کا دماغی توازن الٹ گیا۔ ”میری ساری قربانی خراب کر دی۔ تجھے تو آج میں۔“

بے خود چوچ چوچ کر گیا۔ اس کی گھٹکی بندھ گئی۔ اس نے نوال کو دکھا جو مزے سے کھیر کپالہ بھر کے بیٹھی تھی۔

”محنت کی حق حلال کی کٹائی کے لیے تجھے میرے ہی تیل نظر آئے۔“

”نوال بدلی۔“ بے خود کی بھیجی آواز نکلی۔

”تو اتنا تنہا ساتھ برس کا بچہ اب کہاں محنت مزدوری کرنے جاتا اسی لیے میں نے کہا کہ شروعات اپنے گھر سے چھوٹے پیمانے سے کرو۔“

نوال نے ایک بڑا بڑا منہ بھر کے بولنا شروع کیا۔

”آپ کہیں باہر جاتا تو چائلڈ لیبر کا کیس نہ بن جاتا۔“

اخطب غش کھائے انداز میں صوفے پر گر اٹھا۔

اخطب کے ہاتھ سے بھی بے خود کا ہاتھ چھوٹا تو وہ تیر کی طرح دوبارہ نوال کے چروٹوں میں جا بیٹھا۔

”آپ تک پورے ملک میں یہ ٹکڑا خبر پھیل چکی ہوگی کہ اخطب انعام نے اپنے جانوروں کی قیمت رکھی ٹکٹ لگا کر۔“ وہ شدت غم و شرم سے مرجانے کو تھا۔

”تم کو تو میں سارے ملک کی کیبل وائر اڑا دوں ایک دم دھماکے سے۔“

”نوال!“ ضمیر خان کی آواز گونجی۔ ”اس بار زیادہ ہو گئی کو سوری۔“

آؤ نوال میرے تیل دیکھو۔ اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا اسے سبق سکھانے کا۔ نوال ضمیر خان سے پنگا۔  
 اور۔۔۔ ”نوال نے خود ہی جھڑپ کر لی۔

”بے خود تو بس ایک سبب بن گیا۔ ورنہ میرے پاس تو اور بھی پلان تھے۔ سستے میں بیچوٹ گئے انھیں  
 انعام! ورنہ میں مجتہ خور بن کر تم سے پیسے لوٹتی۔ یا  
 چھو۔۔۔

”اب بس کرو نوال۔“ مہی نے اسے ٹوکا۔ ”تم  
 نے زیادتی کی ہے سو ری کہو۔“

”سو ری کہنے سے کیا میری بے عزتی کم ہو جائے  
 گی۔“ انھیں نے لہجے میں ہار آگئی۔ وہ نوال سے نہیں  
 جیت سکتا تھا۔

”مگر تمہاری انا کو تسکین ضرور پہنچے گی۔“ نوال نے  
 کولڈ ڈرنک گلاس میں ایڑلی۔

نوال کے اشارے پر بے خود دھیرے دھیرے  
 کمرے سے سرکا۔

ٹی وی پر ایک بار پھر وہی خبر چل رہی تھی۔ سب  
 متوجہ ہوئے اور پھر اشتیاق احمد کے فلک شگاف  
 مسلسل قہقہے نے سب کو چو نکایا اور جیسے سب کے  
 ہنسنے کی راہ ہموار کر دی۔

”دو گھر آؤ ذرا تم۔“ اشتیاق احمد نے اپنے پاس جگہ  
 بناتے ہوئے اسے پکارا۔

”یہ تمہارے پاس اس قسم کے آئیڈیاز آتے کہاں  
 سے ہیں؟“

”کہاں سے آتے ہوں گے۔ دراصل میرے  
 سارے ایکشن، ری ایکشنز ہوتے ہیں۔ جب اس  
 طرف سے ایسی کیننگی آتی ہے۔“ اس نے انھیں کی  
 جانب دیکھا۔

”اور تم اس سارے عرصے میں کیا کرتی رہیں۔“  
 گلاب نے پوچھا تھا۔

”میں نے کیا کرنا تھا۔ باہر نظر رکھ کر بیٹھی تھی۔  
 سیکورٹی گاؤڈز کو چائے، ناشتے کے بہانے باتوں میں الجھا  
 کر رکھا۔ بس گڑبڑیہ ہوئی۔“ نوال کے چہرے پر ابھرن  
 پیدا ہوئی۔ ”یہ میڈیا والے وہاں کیسے پہنچے؟“

”میڈیا نہیں پہنچا۔ کسی نے اسے موبائل سے  
 ویڈیو بنا کر بھیجی ہے۔“ انھیں نے ہنسی کی جلی آواز نکالی۔  
 ”وہ۔۔۔“ نوال سمجھی اور ساتھ ہی زور سے ہنس  
 دی۔ اس کی ہنسی جیسے اشارہ تھی۔ پورا کمرہ قہقہوں  
 سے گونج اٹھا۔ ہنسی چھوٹ کی پیاری ہوئی۔ سخت سے  
 سخت جان بندے کو بھی لگ جاتی ہے۔

انھیں پکا منہ کر کے بیٹھا تھا۔ مگر ایک دو تین۔  
 تناؤ والا چہرہ دھیمہ ہوتے ہوئے مکان لے آیا اور پھر  
 سب سے بلند آہنگ قہقہہ خود اسی کا تھا۔ سب نے  
 دلچسپی سے اسے دیکھا۔

اور اس نے نوال کو۔۔۔ وہ واقعی نوال کے ذہن تک  
 نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے سوچا تھا۔ نوال بیلوں کے  
 ساتھ یہ وہ۔۔۔ وہ سب کر سکتی ہے، یا اس کے ساتھ  
 (پچھلے برس کا بدلہ لینے کے لیے) لیکن جو اس نے  
 کیا تھا۔ وہ اس کے سامنے گن میں بھی نہیں آیا۔

دل کو تھوڑا سا بڑا کر کے مسکرا دینے سے زندگی  
 کتنی خوشگوار اور آسان ہو جاتی ہے۔

انھیں نے سوچا۔ اس نے بہت طہائیت سے  
 براجمان اپنے چچا کو دیکھا اور وہیں کوئے میں ذرا سا مٹی  
 اپنی آئی نوین کو۔

نوال نے خوشگوار اینڈ لکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ کچھ  
 لوگ اپنے زور بازو اور قوت فیصلہ اور عجیب ہونے پر  
 ڈٹ جاتے پر کس قدر نصیحتیں رکھتے ہیں۔

نوال ضمیر خان ان ہی میں سے ایک تھی۔  
 انھیں نے اسکرین پر نظر آتے بے خود خان پر  
 نظریں جمائیں۔ جو دونوں ہاتھوں سے نوٹ بنور رہا  
 تھا۔

اس نے نوال کا بڑھاپا کھیر کا پالہ تمام لیا۔ دونوں کی  
 نظریں ملیں تو چند لمحوں کے توقف کے بعد ایک بے ریا  
 ہنسی کمرے میں گونج اٹھی۔ جس میں سب کے قہقہے  
 بھی شامل ہو گئے۔





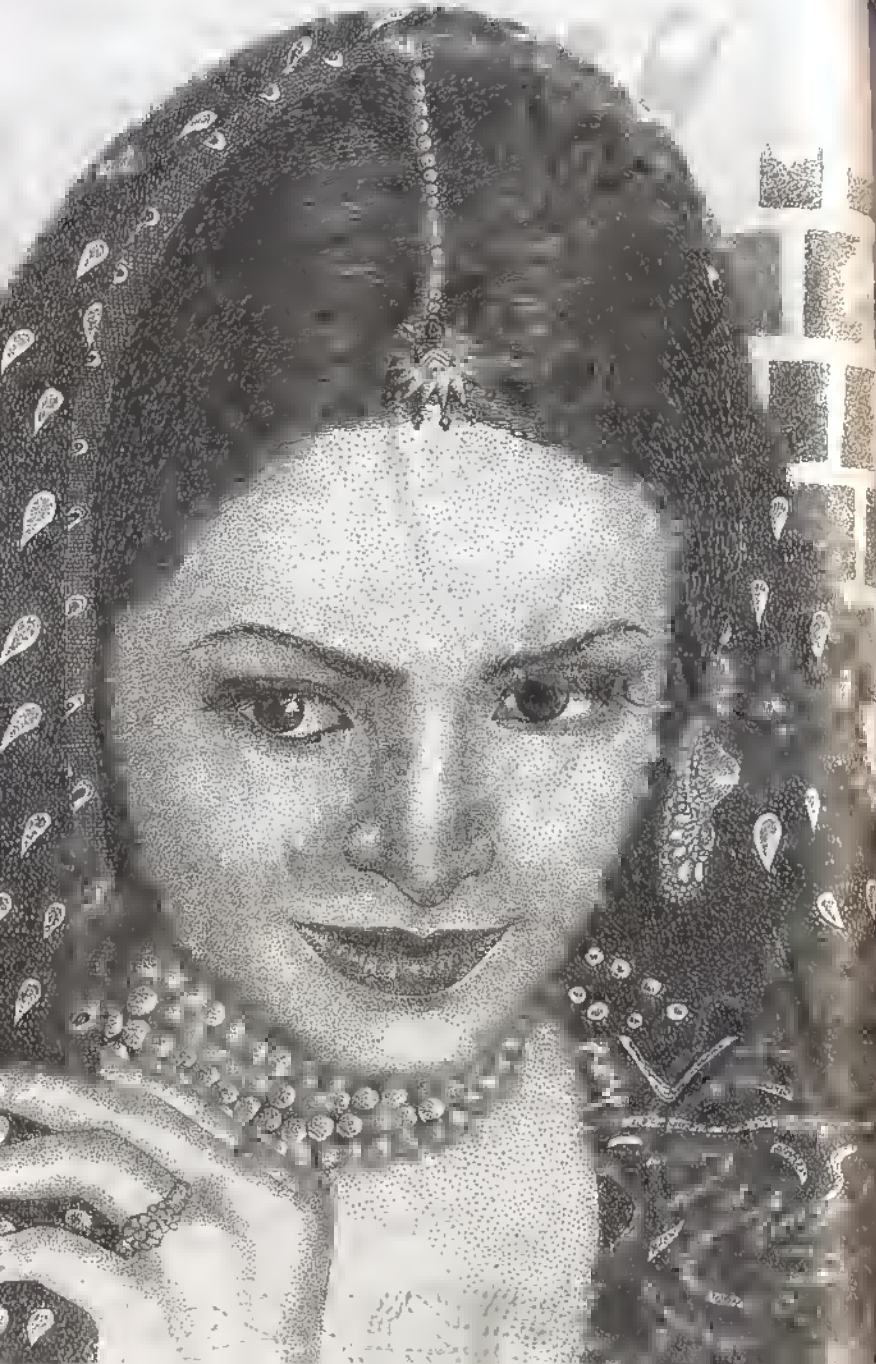
# لوگ بھول گئے

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بیوی ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں رواجی ساس بھو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحت پر ہنس بھوسے لگاوت دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی مندر فوزیہ کا بالا خرا یک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دوا طہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو بتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں بتا چلا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑیں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوش خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے، جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ذمیت کی وادعات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے



وصول کر پاتی ہے۔ زیرِ مگر خریدے میں سے بھی عاصمہ کی بدکردار ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقنن کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں سوہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکرِ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنارہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس کو خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ سوہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سو اور اس کے گھر والوں کو موردِ اِزارام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوا ہے۔ عدیل پیش میں بشری کو روکھتا ہے۔ اس کا ایثار بن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ نوزائیدہ رہتی ہے اور اپنا تالے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اِستِحال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی باہم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے باہم کو بتا چکا ہے کہ زیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد باہم عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

## دسویں قسط

فوزیہ نے فکر مند نظروں سے گھرا میٹر کو دیکھا اور دوسری نظر نیم بے ہوش سرخ چہرے لیے مثال پر ڈالی۔  
”کیا ہے؟“ نسیم بیگم کو ملے انداز میں بولیں۔  
”دکھاؤ مجھے“ عدیل بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ گم صم سا بیٹھا تھا۔ فوزیہ کو گھرا میٹر ہاتھ میں لیے دیکھ کر چونکا۔  
”ایک سو تین سے تیس چکر کھای نہیں ہو رہا۔“ فوزیہ دھکیلتے میں بولی۔  
”میرے اللہ! رحم کر معصوم اپنی پر۔“ نسیم کو ہالی دینے والے انداز میں بولیں۔  
”کہا تھا میں نے، اُمی! اسے ماں سے دور نہ کر بہت ملی ہوئی ہے بشری سے۔ اتنی آسانی سے نہیں سنبھلے گی مگر مجھ خبیث کی دستا کو بے اس گھر میں۔“ نسیم جلتے کٹے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

عدیل نے عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھا۔  
”اُمی! بھی آپ کو یہ لگے ہے؟“ اس کا لہجہ استہزاء تھا جیسے خودیہ زور سے ہنسا ہو۔  
نسیم اور فوزیہ نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ فوزیہ نے نظریں چرا لیں۔ نسیم کو غصہ تو بہت آیا اور سخت ست بنانے کو بھی چاہا مگر فوزیہ نے ماں کا ارادہ بھانپتے ہوئے آنکھوں کے اشارے سے منع کر دیا۔  
بھلی گھڑی تھی جو نسیم کو بھی یہ شبیہ سمجھ میں آگئی جو اب میں وہ آہی بھر کر چکی رہیں۔  
”اما۔ اما۔ اما! مجھے اما پاس۔ اما!“ مثال نیند میں رک رک کر کہتا ہوا بول رہی تھی۔  
نسیم نے فتح مند نظروں سے عدیل کو دیکھا۔  
”دیکھا! میں نہیں کتنی تھی یہ بھی ماں تکتے والی نہیں۔“

عدیل بے بسی سے مثال کا ہاتھ سسلانے لگا۔

”اسے دوبارہ لے کر جاؤں ڈاکٹر کے پاس۔ بخار تو کسی طرح کم ہی نہیں ہو رہا اس کا۔“ وہ گس کو بھی مخاطب کیے بغیر بولا۔

”حالا! نک میں۔ نے تو باقاعدگی سے دوا دی ہے مثال کو کم از کم بخار تو اتنا چاہیے اس کا۔“ فوزیہ نرم لہجے میں بولی۔  
”ارے کم بجت لیرے ہیں یہ آج کل کے ڈاکٹر سارے۔ اب اگر پھر سے لے کر جاؤ تو نئے سرے سے فیس لیں گے۔“ انہیں کوئی خوف خدا تھوڑی آئے نا اور جی میں آیا تو چھ چار ٹیٹ بھی لکھ ڈالیں گے۔ اپنی کوتاہی تھوڑی بائیں گے کہ ان کی لکھی دوائے خاک اثر نہیں کیا۔“ نسیم کو فت بھرے انداز میں بولی چلی گئیں۔  
یوں بھی کسی کم جہاں پاک تو ہو چکا تھا مگر رات سے جو اس باشت بھر کی لڑکی نے مفت کی پریڈ کر رکھی تھی۔ اس سے جی خوب ہی بے زار تھا۔

ذرا جو اس شان وادب کی خوش منانی جاسکی ہو سنی الحال جانِ نغز نے کا اور کوئی رستہ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔  
”کیا ہوا امی!“ فوزیہ تشویش سے بولی۔  
عدیل نے بھی چونک کر ماں کو کھنکھارنے لگا۔ روزِ بہت دیر سے ایک تک صرف امی لاڈلی کو ہی دیکھے جا رہا تھا جو رات بھر میں چکر تو مچی ہی نہیں روکئی تھی۔ گالوں کی گلابیاں پٹا ہٹ میں بدل گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہی ابھر آئی تھی۔ سوکھے خشک ہونٹ، بکھرے بے رونق ہال اور یوں بے ہوش۔  
عدیل کا دل کٹا جا رہا تھا۔

”امی! ٹھیک ہیں نا آپ؟“ پھرے پر تکلیف کے آثار لیے ہوئے ہولے ہولے بائیں طرف سے ایک سینہ اور بانو دبا رہی تھیں۔  
”امی۔ کیا بات ہے؟“ عدیل کو بھی پوچھنا پڑا۔

”ٹھیک ہوں میں۔“ نسیم جیسے کراہ کر دھکی آواز میں بولیں۔  
”آپ رات بھر سو بھی نہیں سکیں گے۔ بے آرامی کی وجہ سے آپ کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔ آپ جا کر آرام کر لیں۔“ فوزیہ تشویش سے بولی۔  
”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس اللہ میری مثال کو جلدی سے اچھا کر دے پہلے کی طرح جنتا کھلے گا۔“ کیے تکتی کی طرح میری بچی اس آنگن میں اڑی پھرتی تھی۔ رات بھر میں مرجھایا پھول بن کر رہ گئی۔“ نسیم سسکی سی لے کر رند مچی آواز میں بولیں۔  
”فوزیہ! امی نے دوائی ہے آج؟“ عدیل ہی کو دیکھ کر فکر سے بولا۔  
”جی بھائی! فوزیہ ایک دم سے ہی بہت سعادت مند، فکر کرنے والی خیال رکھنے والی بن اور بیٹی بن گئی تھی بشری کے جاتے ہی۔

”امی! آپ جا کر آرام کریں۔“ عدیل نرمی سے بولا۔  
”اما!“ مثال پھر کر آئی۔  
”میری بچی! میری گڑا! نسیم تڑپ کر بولیں۔  
”جا عدیل! اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا۔ آنکھیں کھولے۔“ وہ نائے بھر کی محبت تڑپ لہجے میں سمو کر بولیں۔  
”مثال۔ میری بچی دادی کی جان! آنکھیں کھول کر ایک بار تو دیکھ ہم تینوں رات بھر سے تیرے لیے کتنے



پریشان ہیں۔ تیری اس سنگدل مہال کی طرح نہیں جو تجھے چھوڑ چھاؤ کر گئی تو لپٹ کر خبر بھی نہیں لی اس نے کوہلیا کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ”وہ مثال پہ جھلی اسے پیار کرتے ہوئے کئے جا رہی تھیں۔ عدیل نے کچھ ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

”ای! آپ کچھ دیر جا کر سو جائیں۔“ فوزیہ نے فوراً ”عدیل کے چہرے کے بگڑتے دواویہ دیکھ کر کہا۔

”میں کہاں سو سکوں گی میری شہزادی اس حال میں پڑی ہے۔“ عظیم آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولیں۔

عدیل گھڑی دیکھ کر کھرا ہو گیا۔

”فوزیہ! میں گاڑی نکالتا ہوں۔ تم مثال کو لے کر آ جاؤ۔ ڈاکٹر پانچ بجے تک کلینک آجائے گا تو ایک بار پھر چیک اپ کروا لیتے ہیں بلکہ شاید وہ اسے ایڈمٹ کر لے۔“ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

فوزیہ اور عظیم کو دفعت سے اسے جا نا دیکھتی رہ گئیں۔

\*\*\*

”لیکن میڈم میں نے تو چھٹی کی درخواست بھیجی تھی۔“ عاصمہ کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ تھی۔

میڈم کے چہرے کے تاثرات اسے بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔

”کتنی بار درخواست بھیجی ہے آپ کی پورے مہینے میں۔“ میڈم نے کڑی ذرا سی گھماتے ہوئے عاصمہ کے چہرے پر نظر س جاکر طنز سے کہا۔

عاصمہ نظریں جھپکاتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھتی تھیں۔

”میری مجبوری تھی میڈم۔“ اب کوئی توبہ نہ تھی اس بات کو آگے بڑھانے کے لیے۔

”اور میری مجبوری یہ ہے کہ عاصمہ! کہ مجھے اس اسکول کو چلانا ہے۔ آپ صرف مجھے جواب دہ ہیں اور میں اس اسکول میں موجود ڈھالی سو بچوں کے والدین کے سامنے جواب دہ ہوں جن ہفتے میں تین دن اپنے بچوں سے نہ ملنے کو ملتا ہے کہ ان کی سچر آج ایب سینٹ تھیں۔“ وہ سارا لحاظ موت اظہار بالائے طاق رکھ کر گذر سے بولیں۔

”میڈم! میری بیٹی بیمار تھی تو مجھے بہت مجبوری تھی۔“ عاصمہ کی آواز کو شش کے باوجود رندہ گئی۔

”تو ایک کام کرتے ہیں میں عاصمہ! جس سے آپ کی اور میری مجبوری آرام سے ختم ہو سکتی ہے۔“ وہ آگے ہو کر سر دیکھنے میں بولیں۔

عاصمہ کو میڈم کی سر دی مسکراہٹ جواب میں مسکرانے پر مجبور نہیں کر سکی۔

”میڈم! میں کو کوشش کروں گی آئندہ چھٹی نہ ہو۔“ عاصمہ نے جلدی سے کہا۔ مبادا کوئی خوفناک بات نہ اسے سننی پڑ جائے۔

”میں جانتی ہوں آپ یہ سب کچھ اپنے شوق سے نہیں کرتیں لیکن میں بھی مجبور ہوں۔ میں اسکول شوقیہ کھول کر نہیں بیٹھی ہوں۔ میں اگر بچوں کے والدین سے فیس لیتی ہوں تو مجھے انہیں مطمئن بھی کرنا ہوتا ہے۔ گزشتہ چھ ماہ میں آپ نے ہر ہفتہ ایک سے دو چٹھیاں کیں۔ چلیں میں وہ بھی برواشت کر گئی لیکن ہر ہفتے تین چٹھیاں۔“

”میڈم! میں۔“

”سوری مس عاصمہ۔ آپ جا کر کشمیر سے اپنا حساب کر لیں۔ فی الحال ہمیں آپ کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بے لکب لہجے میں بولیں۔

عاصمہ کوچے کچھ بھری پھرتی ہوئی۔

”میڈم۔ اس بار۔ صرف اس بار آپ معاف کر دیں۔ پراس۔“ وہ سخت پریشانی میں بے ربط ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی ہلکے رے لے رہی تھی۔

”ہم نے کل ہی آپ کی جگہ کسی اور ٹیچر کو پلانٹ کر لیا ہے۔“ میڈم نے اس کے سامنے ایک اور دھماکا کر دیا۔

وہ مسرت کی دیمکتی رہ گئی۔

”اور آپ جانتی ہیں میں کوئی صاحب ثروت تو ہوں نہیں کہ ایک آپ کی چھٹیوں کے لیے ایکسٹرا ٹیچر رکھ لوں۔ میرے بھی دس ہزار اخراجات ہیں پھر اس اسکول کی مصیبتیں بہت سی میری بھی مجبوریاں ہیں جنہیں یہاں دہرائیگا کہ نہ میرے پاس اتنا وقت ہے نہ آپ کو اس میں دلچسپی ہوگی۔ سو آئی ایم سوری۔“ وہ کندھے اچکا کر دو ٹوک لہجے میں بولیں۔

میڈم! آپ جانتی ہیں میرے بچوں کا آسرا کی جانب ہے۔“

”اگر آپ اس بات کو سمجھتیں تو اس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیتیں۔ میں نے بھی آپ کو کچھ سوچ کر آپ کو جواب دی تھی۔“ وہ تھکا کر طنز سے بولیں۔

میڈم! میری بچی کو ڈبل نمونہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے۔“

”آپ پلیراب جاسکتی ہیں۔ مجھے کچھ اہم کام پٹانے ہیں۔ آپ کشمیر سے اپنا حساب لے کر جائیں۔“ وہ اپنے آگے بڑی فائل کھولتے ہوئے روکے لہجے میں بولیں۔

”میڈم! گلیز! ایسا نہیں کریں۔ میں کیا کروں گی۔“ وہ آخر میں گڑ گڑائی بیٹھی۔

کل ہی نو اوپر سے کرائے دار بھی طے کئے تھے۔ اس ماہ کرایہ ملنے کی بھی امید نہیں تھی۔ اگر نوکری بھی چلی جاتی۔ جو کہ جا ہی چکی تھی تو وہ پورا مہینہ کیا کرے گی وہ بے اختیار رونے لگی بے بسی تھی۔

اسے خود پر ترس آنے لگا۔ ایسا تو اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ چند ہزار کی معمولی اسکول بچہ کی نوکری کے لیے اسے یوں تیش کرنا ہوں گی۔

”میں آپ کا نام فیکسٹ کمنٹنگ ٹیچر میں رکھ رہی ہوں جیسے ہی ہمیں آپ کی ضرورت ہوگی۔ ان شاء اللہ میں سب سے پہلے آپ کو کال کروں گی۔ آپ بلاشبہ ایک محنتی ٹیچر ہیں اور بچے بھی آپ سے جلد مانوس ہو جاتے ہیں۔ میں ضرور آپ کو کال کروں گی۔ اب آپ جاسکتی ہیں۔“

انہوں نے بہت طے سے بات ختم کر دی۔ وہ دیمکتی رہ گئی۔

”وش یو ہسٹ آف لک۔“ میڈم نے الوداعی مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ عاصمہ نے اپنا ٹھونڈا ہاتھ ان کے ہاتھ میں ڈر اسادیا۔

”اللہ حافظ!“ وہ کہہ کر فون کوئی نمبر لاکر بات کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

عاصمہ چند لمحوں کے لیے بس سی بیٹھی اپنے ہونٹ چباتی رہی پھر آہستہ سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے آس بھری نظروں سے مڑ کر دیکھا اور میڈم کا منہ دوسری طرف دیکھ کر اپنا چہرہ صاف کرتی باہر نکل گئی۔

\*\*\*

”ای! میں نے قسم کھائی ہے جب تک میری مثال مجھے نہیں مل جاتی۔ میں ایک لقمہ نہیں کھاؤں گی۔ اس دنیا کی ہر نعمت مجھ پر حرام ہے۔“



بشری نے کھانے کی نرے اتنی زور سے پرے کی کہ سالن نرے میں گر گیا اور ذکیہ تو کچھ لول ہی نہ سکیں۔  
 ”تین دن ہو گئے ہیں میری بیٹی! تجھے آج کچھ کھائے پیے۔ ہر دو گھنٹے بعد تو بے ہوش ہو جاتی ہے ڈاکٹر ابھی کر  
 کر گیا ہے اگر تو نے کچھ کھایا نہیں تو۔“  
 ”مرول کی پھر بھی نہیں ای! میں بہت سخت جان ہوں۔ بہت ڈھیٹ مجھے موت نہیں آنے والی۔ مجھ جیسی ماہر  
 کو موت آیا بھی نہیں کتنی۔ میری عطیلی جو میں اس رات اپنی بیٹی ان وحشیوں کے پاس چھوڑ کر چلی آئی۔ مثال  
 میری بیٹی میری گڑبا۔ ہائے تین دن سے تین راتوں سے میں نے اسے نہیں دیکھا اسے نہیں چھوا اس کو نہیں  
 چوما۔ مثال میری گڑبا مثال۔ مثال۔ مثال۔“ وہ پاگلوں کی طرح منہ اونچا کیے آنکھیں بند کیے گلا پھاڑے چیختے  
 لگی۔

ذکیہ اسے سنبھالتے خود بھی بکھر نے لگیں۔  
 ”مثال۔ مثال کہاں ہے مجھے کیوں نظر نہیں آتی۔ ییری گڑبا۔ ییری بیٹی۔“ وہ ارد گرد سے بیگانہ ہر احساس  
 سے ماوراء صرف مثال کے لیے چیخ رہی تھی اور رہی تھی۔  
 ذکیہ اسے سنبھالنے میں بیڑ محال ہو چکی تھیں۔ جب عمران کمرے میں بھاگتا ہوا آیا۔  
 ”آئی۔ آئی خدا کے لیے ہوش کریں۔ کچھ نہیں ہوتا مثال کو۔ میں لے کر آؤں گا اسے۔ آپ ہوش کریں۔  
 خود کو سنبھالیں۔“ وہ اسے بازوؤں سے پکڑ کر روکنے لگا۔  
 وہ بغیر دوپٹے جوتوں کے پھر بے گھر سے باہر بھاگ رہی تھی چیختے ہوئے سب انکل کوئی پاگل دیوانی لگ رہی تھی۔  
 ”مجھے صرف میری بیٹی لاؤ۔ مجھ سے سب کچھ لے لو۔ میری مثال میری گڑبا مجھے لاؤ۔ میں مر جاؤں گی اس کے  
 بغیر۔ میں خود کو ختم کر لوں گی۔“ وہ ایک دم سے لاؤنچ کے ستون سے پاگلوں کی طرح سر ٹکرانے لگی تھی۔  
 عمران مرد ہو کر اس کی وحشت کو قابو نہیں کر پا رہا تھا۔ خون جھل جھل اس کے ماتھے اور سر سے پسینہ لگا۔ ذکیہ کی  
 چیخیں نکل نکلیں۔

عمران جب تک بشری کو سنبھالتا وہ چیختی ہوئی بے ہوش ہو چکی تھی اور اب فرش پر بے دم پڑی تھی۔ باڈی  
 چکنی ٹانگوں پر اس کا سر خون نشینی کی گھیرنا ہوا جا رہا تھا۔ ذکیہ غاقون کا جیسے دل ہی بیٹھنے لگا۔  
 ”میری بیٹی میری بشری مر جائے گی عمران! اسے لے چل گئیں۔  
 بلا ڈاکٹر جلدی کر مر جائے گی۔ اسے کچھ ہو جائے گا۔“ ذکیہ نے خود ہاتھ پاؤں چھو ڈیے تھے۔  
 عمران نے نہ دقت بشری کو بازوؤں میں بھر اور باہر جانے لگا۔  
 ”ای! ایس! آپنی کو گاڑی میں ڈال رہا ہوں۔ آپ پکڑ جلدی سے لاک لگا کر آجائیں باہر۔“ وہ جاتے ہوئے پکارا۔

بشری کی ایسی حالت تو ان تین دنوں میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ پہلے دو دن تو جیسے کتے میں رہی تھی۔  
 ذکیہ اسے رلانے اور سملانے کی کوشش کرتی رہیں۔ تیسرے دن اسے بار بار طلاق کا یاد دلا کر رلانے کے جتن  
 کرتی رہیں۔ مگر بشری رات کے آخری پہر کس وائش دوم گئی اور وہاں اس نے مثال کا خوب صورت سا بیڑ بنادیا اور  
 پونی دوپٹی جو اس نے اس عید پر بہت مذکر کر کے لیے تھے۔ بشری اس کی ساری شانچنگ پہلے ہی کر چکی تھی اس لیے  
 یہ دونوں چیزیں لے کر دینے کے حق میں نہیں تھی مگر عدیل نے یہ دونوں چیزیں بہت آرام سے خریدیں اور آخری  
 بار وہ یہ دونوں چیزیں نانی کے گھر بھول گئی کہ اسے ان سے اتنا لگاؤ نہیں رہا تھا۔  
 اس گلابی رنگ کے سپرینڈ اور پونی کو ہاتھ میں لیے بشری ساکت سی انہیں دیکھتے ہوئے بہت کچھ یاد کرتی رہی۔  
 مثال یہ پن کر کیسی لگتی تھی۔ جیتی جاتی ہستی کھیتی کو دنی بیاری سی باہل ڈول۔

اسے بے اختیار وہ ظالم شام یاد آئی جب طلاق کے بعد مثال اس کے ساتھ جانے کے لیے تڑپ تڑپ کر کپٹ  
 کر چلتی ہوئی روئے جا رہی تھی۔  
 ”مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔ مجھے ماما کے ساتھ جانا۔ ماما۔ بشری کی سماعتیں اس کی معصوم  
 فریادوں سے ہلنے لگیں۔ سب کچھ جیسے اس کی نظروں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلنے لگ عدیل کا وحشی روپ  
 اور طلاق کے الفاظ۔ سیم اور فوزیہ کی فاختانہ نظرس اور پیروں میں بکھری رنگ برنگی مٹھائی۔  
 اسے کسی بھی چیز نے اتنی اذیت نہ دیکھی تھی۔ رات کے اس پھر جتنی تکلیف اسے مثال کی حالت یاد کر  
 کے ہوئی۔

”مثال۔ مثال کہاں ہے؟“ اس نے مٹھی میں دونوں چیزیں جکڑ کر یاد کرنے کی کوشش کی۔  
 ”وہ تو۔ وہیں رہ گئی تھی! اس ظالم انسان نے اسے باہر دھکا دے کر مثال کو اپنے پاس اندر کھینچ لیا تھا اور وہ  
 روئے جا رہی تھی۔ اسے پکار رہی تھی اور اب اتنے دنوں سے وہ کیسی ہو گئی۔ وہ بھی ٹھیک نہیں ہوگی۔  
 ”مثال۔ مثال!“ اور خود سے پاش کرتے ہوئے پتا نہیں وہ کب چیختے لگی۔  
 ذکیہ جن کی ذہنت آنکھ لگی تھی۔ بشری کی وحشت بھری چیخ سن کر دیوانہ وار ہاتھ روم میں آئیں۔ جہاں بشری  
 چیختے چیختے بے ہوش ہو چکی تھی۔ اور اب وہ ذہنی حالت میں پونی رنگت۔ کمزور چہرے اور لاغر جسم کے ساتھ ذکیہ  
 کی گود میں پڑی تھی۔

اس کے سر پر دھنا کس کربانہ دیا تھا مگر خون پھر بھی سے جا رہا تھا۔ ذکیہ کے کپڑے بھی خون رنگ ہو چکے تھے۔  
 وہ خود بھی بری طرح روئے جا رہی تھیں اور ان کے آنسو بے ہوش بشری کے چہرے پر گر رہے تھے۔  
 ”جلدی کر عمران! بخون سے جا رہا ہے اسے کچھ ہونے جائے۔“ وہ پوچھتی ہوئی آواز میں بولی۔  
 عمران متھکر سا بے ہوش بشری کو بیکہ یو مر میں دیکھ کر اور بھی تیزی سے گاڑی چلانے لگا۔



”یہ ضروری ہے عدیل صاحب! ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔  
 ”مگر ڈاکٹر صاحب! یہ ممکن نہیں ہے میرے لیے۔“ وہ بہت دیر بعد آسکی سے بولا۔  
 مثال چند ہی دنوں میں بہت بیمار اور قابل رحم نظر آنے والی بیٹی میں ڈھل گئی تھی اس کی گلابی رنگت میں  
 پتلا ہٹ اتر چکی تھی اور خشک ہونٹ یوں ایک دوسرے میں پیوست تھے جیسے اس نے کبھی کسی سے بات نہیں  
 کی۔ اس کی آٹھ سالہ معصوم شکل پر کیسی بوڑھوں جیسی سنجیدگی اور دکھ نظر آنے لگا تھا۔  
 ”کیوں؟“ ڈاکٹر نے اس استفسار پر عدیل کو غصہ تو بہت آیا کہ یہ حق کسی ڈاکٹر کو نہیں ہے کہ وہ یوں آپ کی  
 پرسنل لائف کے بارے میں سوال کرے۔

”میں مجبور ہوں عدیل صاحب! سوال آپ کی بیٹی کی زندگی کا ہے۔ خدا خواستہ اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو  
 یہ بخار اس کے دماغ کو متاثر کر سکتا ہے جس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ پڑھے لکھے سمجھ دار ہیں اس بات  
 کو سمجھ سکتے ہیں۔“

ڈاکٹر نے عدیل کی ناگوار نظروں پر فوری وضاحت دے ڈالی۔  
 عدیل کم صدمہ سا ہو گیا۔

مثال کا بخار صرف ایک دو درجہ کم ہو رہا تھا بہت ٹیوشنٹ کے بعد مگر کچھ آٹھ گھنٹوں کے بعد وہ پھر اسی درجے پر  
 آجاتا۔

مستقل سلسلہ اس کا نصاب بدن جس تکلیف اور درد سے بے حال تھا عدیل جیسے پیار کرنے والے باپ کے لیے یہ

”بہت بڑی آفت تھی۔“ میں اپنی مسز کو ذاتی طور پر دے چکا ہوں۔“ وہ بہت ڈوبی ہوئی آواز میں بمشکل بول سکا۔  
 ”تو بھی؟“ ڈاکٹر بالکل نارمل رہا جیسے اسے معلوم تھا کہ عدیل اسے یہی وجہ بتائے گا۔  
 ”تو بھی عدیل صاحب! اس بچی کا کچھ دنوں بلکہ کچھ مہینوں تک اپنی ماں کے پاس رہنا ضروری ہے۔“ عدیل کچھ بول ہی نہیں سکا۔

”جب تک یہ ذہنی بلوغت آئی میں اُجب تک یہ بچی ذہنی طور پر آپ دونوں کی اس علیحدگی کو تسلیم نہ کرے۔“  
 ”میں اپنی بچی کو خود سے ایک میل کے لیے بھی الگ نہیں کر سکتا ڈاکٹر صاحب!“ وہ بہت مگرحتی لہجے میں بولا۔  
 ”یہ بات تو آپ کو یہ انتہائی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔“ ڈاکٹر جتا کر بولا۔ ”آپ اس بچی کی حالت دیکھ رہے ہیں۔ وہ آپ سے زیادہ حساس اور آپ سے زیادہ کمزور ہے۔ وہ کتنی تکلیف سہہ رہی ہے آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ آپ اگر اس بچی کے بغیر نہیں رہ سکتے تو یہ اپنی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی اور بلکہ میرا تو خیال ہے اسے آپ کی جدائی بھی بہت آزار دہنے کی۔ اصل میں طلاق کے بعد آپ دونوں کی زندگی میں تو شاید اتنے فرق نہ آسکے مگر اس کے ننھے دل و دماغ کے لیے آپ نے ایک مستقل جنم کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اتنے لاڈ پیار کے بعد آپ نے ایکسی جھگڑے میں اس کے ننھے جسم کی عمارت کو دھڑلے کے جھٹکوں کی زد میں رکھ دیا ہے۔“  
 ڈاکٹر ضرورت سے زیادہ بول رہا تھا عدیل کو ہی اس کی اتنی زیادہ تنقید برداشت نہیں ہو رہی تھی۔  
 ”اب اسے کب تک آپ کے پاس لے کر آنا ہوگا۔“ وہ بمشکل منہ دیا کہ بات ختم کرنے کو بولا۔  
 ”میرے پاس اسے لائے گا کچھ خاص فائدہ نہیں ہوگا آپ کو۔“ ڈاکٹر آگے پڑی فائل عدیل کی طرف کھسکا کر

لا تعلق سے انداز میں بولا۔

”کیا مطلب؟“ عدیل ناگواری سے بولا۔

یہ اس شہر کا سب سے بہترین اور مہنگا ترین چائلڈ اسپیشلسٹ تھا جب ہی عدیل اس کی اتنی تلخ باتیں سہہ گیا تھا۔  
 اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں بہت شفا تھی اور عدیل کو وہی ہنسی کی جاتی مثال چاہیے تھی۔  
 اسے امید تھی یہ ڈاکٹر اس کی بچی کو بالکل ٹھیک کر دے گا وہ بالکل پہلے جیسی ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ بھی اس کی خوش فہمی تھی کہ اب کچھ بھی پہلے جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔  
 ”اس بچی کی بیماری کا علاج صرف اس کی ماں کے پاس ہے۔ آپ اسے کچھ دنوں کے لیے ان کے پاس چھوڑ دیں۔ اسے تھوڑا نارمل ہونے دیں پھر وہ خود فیصلہ کر لیں۔“ عدیل نے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”محببت کا فلسفہ جھاڑ کر زبردستی رکھیں گے تو یہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگی۔ اینڈ ٹھیک یویریٹ۔“ کہہ کر اس نے پروفیشنل انداز میں انٹرکام پر اگلے مریض کو آنے کے لیے کہا۔

عدیل کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔

مثال تو کسی بہت کی طرح سہکت اور بے حس بیٹھی تھی جیسے اس نے ان دونوں کی گفتگو کا ایک لفظ نہیں سنا تھا۔

”شکریہ ڈاکٹر صاحب!“ عدیل نے ذہنت کما اور مثال کا بازو پکڑ کر شکست خوردہ سا باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر اسے جاتے ہوئے تأسف بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

\*\*\*

”اب کیسی طبیعت ہے ورہ کی؟“ وہ جھکے ہوئے انداز میں چادر اتار کر ایک طرف بیٹھے واقف سے بولی جو

اسکول کا ہومورک کر رہا تھا۔

”سورہی ہے؟“ اس نے دو انگلیوں سے سر دیا۔

”تم نے آتے ہی ہومورک شروع کر دیا۔ کھانا نہیں کچھ؟“ وہ عدیہال سی اس کے پاس بیٹھ گئی۔

واقف ماں کے لیے پاتھ روک کر جیسے غور کرنے لگا۔

”حیدرہ خالہ کب گئی تھیں؟“ وہ خود ہی سوال پر سوال کیے جاری تھی اس دلچسپی کے بغیر کہ واقف نے اسے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔

”آپ جلد ہی کیوں آئیں اسکول سے؟“ واقف ماں کے سارے غیر ضروری سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

عاصمہ جیسے مشکل میں پڑی کہ وہ واقف کو کیا بتائے۔

”حساس بچہ ساری مشکلیں ہی ابھی سے اس پہ ڈالے جا رہی ہوں۔ کہیں اس کا ذہن کہیں اور نہ لگ جائے۔“ وہ واقف کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

”یونہی بس کچھ زیادہ کام نہیں تھا اسکول میں۔“ وہ نظریں چرا کر نالے والے انداز میں بولی۔

واقف یک ٹک ماں کو دیکھتا رہا۔

”کب سے اسٹارٹ ہو رہے ہیں تمہارے ایگزٹم؟“ وہ اس کی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”اچھے ہفتے۔“ وہ مختصر ا بولا۔

دونوں خاموش ہو گئے۔

”ارہہ اور ارشہ کہاں ہیں بظہر نہیں آرہیں مجھے۔“

”سو گئی ہیں۔“

”کچھ کھائے بغیر؟“ عاصمہ چونکی۔ اسے فکر سی لگ گئی۔ وہ بہت دیر یونہی اسکول کے گراؤنڈ میں بیٹھی سفید

دور عیاد حوب کو دیکھ کر سوچتی رہی کہ اب وہ کیا کرے گی۔

”نہیں! ماں گرم کر کے میں نے بازار سے انہیں روٹیاں ملا دی تھیں۔ آپ کو بھوک لگی ہوگی۔ لے آؤں

کھانا آپ کے لیے بھی۔“ وہ کہہ ا بھ گیا۔

”نہیں۔“ واقف جیسے بھوک نہیں ہے۔ تھیں پکا دوں روٹی۔ تمہا بازار کی نہیں کھاتے ہوتا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”مما! اسکول میں آج کیا ہوا ہے؟“ واقف گہری تنہید کی سے بولا تو عاصمہ جیسے ہار گئی کہ وہ مزید اپنے جھوٹ کو

نہیں سنبھال سکے گی۔

”جواب سے فارغ کر دیا ہے میڈم نے مجھے۔“ وہ پھر سے تھکی ہوئی بیٹھ گئی۔

واقف غم صم سا ہو گیا۔ اس کو ماں کا چہرہ دیکھ کر کچھ انہونی کا اندازہ تو ہو گیا تھا مگر جواب سے فراغت کا اس نے

نہیں سوچا تھا۔

”کیا کریں گی اب آپ؟“ وہ بہت دیر بعد بولا۔

”چاہ نہیں۔“ عاصمہ کو واقف بتا نہیں تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ کراہے بھی اس ماہ نہیں ملنا تھا اور اسکول سے

تھوڑا بھی نہیں۔ صرف تھوڑی سی ٹوشن تھیں جنہیں شام میں وہ اور واقف مل کر پڑھاتے تھے یا وہ تھوڑی بہت

سلائی کرتی تھی۔ اور آج کل تو درہ کی بیماری کی وجہ سے کچھ بھی نہیں کپا رہی تھی۔

”میرے دوست کے کاموں کا اسکول ہے۔ انہیں بھی پیچڑ کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے بتا رہا تھا ماما! آپ پریشان نہ

ہوں۔ میں علی سے بات کر دوں گا۔ آج ہی بلکہ اسے فون کر کے پوچھتا ہوں پھر ہم وہاں جا کر دیکھ لیں گے۔“

اسے بھی بھی لگتا تھا واقف کے اندر کہیں نہ کہیں فاروق صاحب جیسے بیٹھے ہیں۔ جیسے ہی ایسے ہوتا آیا تھا۔

جب سے وہ بیاہ کر آئی تھی۔ عقیان کی نوکری کا مسئلہ ہوتا یا گھر کا کوئی اور نظا ہرنہ حل ہونے والا کوئی بھی گنہگار نہ تھے۔ سن کر فاروق صاحبِ بہمت دیر تک پوچھی خاموش ہو جاتے اور جب بولتے تو اس طرح کہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہوتا۔ عاصمہ جیڑائی سے واثق کو دیکھنے لگی۔

”ہاں ناں ماما! آپ بھی تو کہتی ہیں ایک درمزد تو سولے۔ یہ زندگی ہے اور مشکلات مسائل اس کا حصہ۔“

بہت ہلکے ہلکے انداز میں بالکل ولاد کی طرح بولا۔

عاصمہ بے اختیار ہنس پڑی۔ واثق حیران سامان کو دیکھنے لگا۔ کہاں تو کچھ دیر قبل جیسے رو دینے کو تھیں اور اب ایک دم سے ہنس پڑیں۔

”آپ کیوں ہنسیں۔ آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو میں ابھی علی کو فون کرتا ہوں آپ خود اس سے بات کر لیں۔“ وہ معصوم سی حلقی سے بولا کہ ماں نے اس کی ذہانت پر شک کیا ہے۔

عاصمہ نے بے اختیار واثق کو اپنے ساتھ لگایا۔

”میری جان! مجھے خود پر تو شک ہو سکتا ہے مگر اپنے اس بہادر عقل مند اور مت والے بیٹے پر ہرگز شک نہیں ہو سکتا۔“ وہ بہت حوصلہ مند آواز میں واثق کو ہلکے لگا کر بولی تھی۔

وہ جو کچھ کہتے پہلے تک اتنی مایوسی اور دل گرفتہ تھی صرف واثق کے ایک جملے نے اسے اپنے پورے قد پر کھڑا کر دیا۔

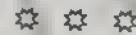
”یہ زندگی ہے اور مشکلات مسائل اس کا حصہ۔“ اس نے واثق کو کم سکھایا تھا واثق اسے زیادہ سکھاتا ہے۔ عاصمہ کو کیلی لگا۔

”ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم مل کر ساری مشکلات پر قابو پالیں گے۔ مجھے پورا یقین ہے۔“ وہ واثق کا حوصلہ بڑھانے کو بڑے عزم سے بولی۔

”ان شاء اللہ امی! وہ معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کھل سا گیا۔

”اب ہم دونوں کھانا کھاتے ہیں پھر جا کر ایساں انکل کو بلا کر لاؤ۔ حمیدہ خالہ کو ساتھ میں بیٹھا دے آنا کہ وہ بھی آجائیں تو ہم ایساں انکل کو کسی ایچھے کرانے وار کے لیے کہہ دیں کیونکہ اس کے بغیر گزارہ مشکل ہے۔“ عاصمہ آگے کالائجہ عمل اسے بتاتے ہوئے بولی۔

کچھ دیر پہلے اسے اپنے آگے صرف کھانا ٹاپ اندر مایوسی اور مصائب کا پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ مگر اب جیسے کچھ بھی نہیں تھا۔ سب کچھ بھلانا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں۔ وہ مطمئن سی روئیاں ڈالنے بچن کی طرف بڑھ گئی۔



”نہیں مجھے کچھ نہیں کھانا۔ میں اسی طرح مرجواں گی مگر اپنی مثال کو دیکھے بغیر میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔“ بشری نے سوپ کا بالالہ سامنے دیوار پر دے مارا تھا۔

ملازمہ نے پیچھے ہٹ کر خود کو گرم سوپ سے بچایا۔

اور ذکیہ کو لگا دو اتنی بشری کے پاگل پن کے ہاتھوں یا تو پاگل ہو جائیں گی یا دنیا سے گزر جائیں گی۔

”میری بچی نے اتنے دنوں سے معلوم نہیں کچھ کھایا یا نہیں۔ اس کی کیا حالت ہو گی میرے بغیر۔“ وہ کہہ رہے تھے۔

کی۔ وہ اتنا رو رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کی چٹخیں میں کچھ نہیں بھول سکتی۔ ”وہ کیسے برسرِ پختہ تھی۔“

ڈاکٹر نے ایک دن رکھ کر اسے دس سچا کر دیا تھا۔ ذمہ زیادہ مگرے میں تھے مگر جو کھاؤ اس کے دل اور صحت میں لگے تھے ان کا مزہ ذکیہ اور عمران کو کبھی سے نہیں مل رہا تھا۔

”لے لوں گی اسے بھی تم کچھ کھاؤ تو۔ تمہاری طرف سے کچھ بے فکر ہوں تو ان بد بختوں سے جا کر دو ہاتھ لڑیں۔ میری بچی تم تو خود کو سنبھالو۔“ ذکیہ نے پاس آ کر اسے ساتھ لگا کر سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ”نہیں نہیں میں مثال کو دیکھوں گی تو مجھے قرار آئے گا ورنہ آپ مجھے مر جائیں گی ای!۔“ وہ اتنی ضدی بھی نہیں تھی۔ آج چار دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

ذکیہ کا دل سخت پریشان تھا۔ ڈاکٹر نے بھی ڈرایا تھا کہ اس کا کچھ کھانا ضروری ہے مگر بشری نے ذکیہ صدمے میں بھی نہیں ملازمہ فرش صاف کرتے ہوئے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”نہیں کھایا آپ نے کچھ؟“ عمران دروازے کے پاس بیٹھ رک کر کمرے کی حالت سے اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔

ذکیہ نے لا چاری سے نفی میں سر ہلا دیا۔

بشری پوچھنے کی طرح چست سے نگاہیں نکائے خشک ہونٹوں کے ساتھ ”مثال مثال“ پکارے جا رہی تھی۔

”یہ پاگل ہو جائے گی عمران! اسے کچھ ہو جائے گا۔ خدا کے لیے کچھ کرو۔“ ذکیہ رونے لگیں۔ عمران مٹھیاں پیچھے کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر سخت غصہ تھا۔

”میں آتا ہوں ابھی۔“ وہ تیزی سے جانے لگا۔

”عمران! کہاں جا رہے ہو۔ مجھے کچھ بتا کر جاؤ۔“ ذکیہ کو کسی خطرے کا احساس ہوا تو اس کے پیچھے جاتے ہوئے بولیں۔

”آ رہا ہوں۔ پریشان نہ ہوں آپ آپ سے کہہ دیں۔ میں مثال کو لے کر آ رہا ہوں۔“ وہ کہہ کر ذکیہ کے پیچھے سے پہلے گاڑی نکال لے گیا۔

”عمران! عمران! کوئی جھگڑا نہ کرنا میرے بچے! جلد بازی نہ کر۔ میں خود دیکھ لوں گی۔“ وہ بے کار مشد بولتی رہیں۔ عمران جا چکا تھا۔

”ابھی دفتر سے تھکا ہارا آیا ہے۔ خدا جانے غصے اور جوش میں کیا کر ڈالے۔ وہ وحشی عدیل بھی کچھ کم نہیں۔“

اس کی ذیل ماں نسیم کیڑے پڑیں قبر میں جو ظلم تو نے میری بیٹی کے ساتھ کیا ہے میری اولاد اور تو کبھی سکھ نہ پائے۔“

ان چار دنوں میں وہ ان تینوں کو اتنی بدعاتیں دے چکی تھیں کہ اب انہیں لگتا ان کی بدعاتیں بھی کھوکھلی سی ہو گئیں تھیں۔



عدیل نے گاڑی گیٹ کے آگے روکی۔

وہ خود اتر کر گیٹ کھولنے لگا مثال گاڑی میں ہی بیٹھی تھی اسی طرح ارد گرد سے بے خبر لا تعلق بخار میں سکتی، باج چلے۔ عدیل کو بیٹی پر بے تحاشا ترس آیا۔

”کاش! میں نے اتنی جلد بازی نہ کی ہوتی۔“ اب تو اس کا دل کھل کر اسے ملامت کرنے لگا تھا۔ شاید یہ

جگہ اتنی جلدی شروع نہ ہوتے اگر مثال یوں مشغول بیمار نہ پڑتی۔ میں نے صرف امی اور فوزیہ کے جذبات کا

دل کیا۔ ایک بار بھی مثال کے بارے میں نہیں سوچا۔ ضد بھی اتنا تھی اور غصہ تھا کہ بشری کی سب خواہشیں

میں پوری کرنا ہوں تو اسے بھی میری ہر جاوے جا خواہش آ نکھیں بند کر کے پوری کرنی ہوگی۔

خدا! اور جلد بازی۔ گھر تو اجڑا ہی دل بھی برباد ہو اٹھتا۔ بچی اسی طرح ذات جھیلے گی۔ میں نے ایک بار بھی

دل سوچا۔ کاش میں صرف ایک بار سوچ لیتا۔ مجھے تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ مثال بشری کے بغیر ہی نہیں سکتی۔



میری محبت کا فیصلہ اب تو جیسے میری پکی کادم گھونٹ رہا ہے۔ میں اسے اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں دے رہا۔

نہ کسی محبت ہے۔ ”وہ ساکت سا گاڑی سے نیک لگائے سوچتا چلا جا رہا تھا اسے پتا بھی نہیں چلا کہ عمران کی گاڑی اس کی گاڑی کے برابر میں آکر رہی۔ عمران بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اچھل کر گاڑی سے نکلنا اور دوسرے لمحے اس نے عدیل کی گاڑی سے فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی مثال کو کھینچا اور اپنی گاڑی میں بٹھانے لگا۔ عدیل جیسے کسی سحر سے جاگا۔ وہ تیزی سے عمران کی طرف لپکا۔ دوسرے لمحے دونوں ٹھٹھم تھا ہو چکے تھے۔ غفلتات پہلے وہ دونوں ایک دوسرے کا شجر کو کھنگال رہے تھے۔

مثال سہمی ہوئی عمران کی گاڑی کے پاس کھڑی تھی بھر وہ یک دم چیخنے لگی۔ ”دونوں ایک دوسرے کا گریبان چھو چکے تھے۔ مثال کی چیخوں پر دونوں جیسے ہوش میں آگئے۔

”تم میری پکی کو ہاتھ تو لگا کر دیکھو میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گا۔“ وہ عمران کو پرے دھکیل کر خود غور لمبے میں بولا۔

”یہ صرف تمہاری بیٹی نہیں بے غیرت انسان! تم میں اتنی غیرت ہوتی تو تو طلاق دینے سے پہلے سوچتے۔“ بھی جواباً ”چلا کر بولا۔

”تو اب لگتا ہے میرا؟“ عدیل پہلے ہی ڈاکڑ کی باتوں سے تپا ہوا تھا۔ عمران کی بات اسے اور آگ لگائی۔

دونوں پھر ٹھٹھم تھا ہو گئے۔ فونیز بھاتی ہوئی باہر آئی اور بار بار کا منظر دیکھ کر سکتہ میں آگئی دوسرے لمحے نسیم بھی باہر آئی آپنچیں۔ ارد گرد کے گھروں کے گیٹ کھلنے لگے۔

اور وہ دونوں سب سے بے خبر لڑے جارہے تھے۔ مثال اسی طرح چیخ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”فونیز! اجالہ جلدی سے اس مثال کو تو پکڑ کر لا۔ اس نے آسمان سر آٹھا رکھا ہے چیخ کر۔“ نسیم گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے بولیں۔ وہ عدیل کو کھینچنے لگیں۔ ”دونوں غصے میں بری طرح سے پتھر پتھر ہوئے تھے انہیں الگ کرنا آسان نہیں تھا۔ ایسے میں محلے کے دو تین لوگ آگے بڑھے اور انہیں چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ نسیم عدیل کو کھینچ کر روڑے چلنے لگیں۔

عمران نے عدیل کو دھکا دیا اور دوسرے لمحے مثال کی گاڑی کا دروازہ کھول کر اس نے اپنی گاڑی میں پھینکا اور خود تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

عدیل اور دوسرے لوگوں کے راستہ روکنے سے پہلے وہ اندھا دھند گاڑی اڑاتا ہوا تھا۔

”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آج یہ نہیں بچے گا میرے ہاتھوں سے۔“ عدیل پھنے گریبان ڈھکی چہرے کے ساتھ منہ سے کف اڑاتا گاڑی میں بیٹھنے لگا۔

نسیم چلا کر ہائی وے دینے لگیں۔ اور اس کے بازو سے لپٹ گئیں۔

”نہ میرا بچہ۔ اس وقت اس کے پیچھے نہیں جا۔ تیری حالت نہیں ایسی کہ گاڑی چلائے۔ کوئی حادثہ کر بیٹھے گا۔ میں یہ وہ برباد ہو جاؤں گی۔ مثال انہیں نہیں جانے کی تمہوڑا حوصلہ کر۔“

وہ اسے اپنی طرف پورا زور لگا کر پھینچے ہوئے تھیں۔

”ای! اچھوڑو مجھے جانے دو اس کے پیچھے میں مثال کو لے کر آؤں گا۔“ وہ خود کو چھڑا رہا تھا۔

”بھائی صاحب! کیا جا رہے دو تین دن سے یہ بنگاہ چاہے آپ کے گھر میں اگر کوئی جھگڑا ہے تو گھر میں بیٹھ کر پنہائیں۔ نہیں تو پولیس کو بلا لیں۔“ ایک بزرگ ذرا آگے ہوئے گج میں کہتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔

”چل اندر بیٹھ کر بات کر لیں۔ میں ابھی خود تیرے ساتھ جاؤں گی اور مثال کو لے آؤں گی۔“ نسیم کہنے لگی۔

وہ اندر لے گئیں۔ محلے والے چہ گوئیاں کر رہے تھے جب فونیز نے گیٹ بند کیا۔

علی نے اسے ماموں سے فوراً ہی فون پر بات کرادی۔

نسیم صاحب نے عاصمہ کو انگلی دی دن آفس بلا لیا کہ وہ اس کا نارمل سائٹرو پولیس گے اور اسے اپائنٹ کر لیں۔

انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اس کی تنخواہ پہلی صاب کے مقابلے میں کافی اچھی ہوگی۔

عاصمہ کو لگا اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔

نسیم صاحب کافی خوش اخلاق اور مہربان شخص لگتے تھے۔ عاصمہ کے حالات جان کر وہ اور بھی ہمدردی کا اظہار کرنے لگے تو عاصمہ کچھ ڈری گئی کہ پہلے اتنی ہمدردی اور مہربانی سے بہت بڑا نقصان اٹھا چکی تھی۔ اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے اس نے فون رکھائی تھا کہ واقعی پر اپنی ڈیڑھ الیاس اور حمیدہ خالہ کو بلا لایا۔

حمیدہ خالہ نے ہی الیاس سے بات کی کہ اب کے وہ کیسے کرانے والے کر آئے ”کرانہ اچھا دس اور وقت پر آئے یہ بہت ضروری بات ہے لیکن اس سے بھی ضروری ہے کہ وہ بہت شریف لوگ ہوں۔ اپنے رستے آئیں اپنے رستے جائیں۔ بہتر ہے بال بچے اور مہیلی ہو۔“ وہ الیاس سے خوب ٹھوک بجا کر بولیں۔

نسیم پوری کوشش کروں گا خالہ جی! کہ جلد سے جلد انتظام کر سکوں۔ کیونکہ کل مجھے ہاشم بھائی نے بھی فون کر کے تاکید کی ہے۔ میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا۔“ الیاس حمیدہ کی شرطوں سے کچھ اکتا کر بولا۔

اس کے خیال میں پہلے کرانے دار بھی حمیدہ خالہ کی روز روز کی احتیاطی نصیحتوں اور سارے دن میں وقت بے وقت چھانے مارنے سے بھاگے تھے۔

”بھابھی! آج بھی کوئی کرانے دار مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہاں کے لیے مناسب تو میں آپ کو پیغام بھیجوا دوں گا۔“

کی اجازت دیں۔ دکان اکیلی چھوڑ کر آیا ہوں۔“ اس سے پہلے کہ حمیدہ خالہ مزید شرطیں بیان کرتیں وہ وہاں سے ہٹا۔

”نسیم! شیر سے کتنی ہوں! وہ ایسے کسی واقف ڈیلر سے بات کرے۔ مجھے تو یہ الیاس بھی ایویں سا لگتا ہے۔“

”بھابھی! خالہ! بیٹے کا حوالہ دیتے ہوئے غیر مطمئن سی بولیں۔“

”الیاس! بھائی! آج بھی ہیں۔ بھروسے کے لوگوں کو لے کر آتے ہیں خالہ۔“ عاصمہ نے آہستگی سے کہا۔ حمیدہ خالہ نے اسے فہمائشی نظروں سے گھورا۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ ”تم پھر اندھا اعتماد کرنے لگیں؟“ عاصمہ نظریں چرا لیں۔

”اور میں نے سنا ہے تم نے نوکری بھی چھوڑ دی اسکول کی؟“ نسیم یاد آیا تو فوراً بولیں۔

”میں نے نہیں چھوڑی۔ انہوں نے نکال دیا ہے۔“ وہ جی سے بولی۔

”ہائیں! اچھا! میں بات کرتی ہوں ابھی جا کر۔ کیا تکلیف ہوئی ان کو بھلا تم سے۔ اچھا بھلا تو ذمہ داری سے کر رہی تھیں تم۔“ حمیدہ خالہ چیخ کر بولیں۔

”بھابھی! خالہ! میں نے کافی کوشش کی۔ مگر میڈم نے معذرت کر لی۔ ورنہ کی بیماری کی وجہ سے بہت چھٹیاں لیں تھیں اس لیے۔“

عاصمہ کا دل نہیں تھا کہ دوبارہ سوہ کی کس سفارش پہ جائے اس لیے منع کرتے ہوئے بولی۔  
 ”اے لو! اس میں کیا جھوٹ ہے بھلا۔ تم کوئی جان کر چٹیاں کر رہی تھیں، یہی کو خدا نے دوسری زندگی کی  
 ایسی ٹھنڈی گئی کہ اس کے بچنے کی امید کب تھی بھلا۔“ حمیدہ خالہ اپنے انداز میں بولتی چلی گئیں۔  
 ”خیر! آپ پریشان نہیں ہوں۔ ایک جگہ کل جا رہی ہوں انٹرویو کے لیے اگر خدا خواست وہاں بات سنیں سنی  
 تو پھر آپ سے یہ کہوں گی۔“ عاصمہ نرمی سے منع کرتے ہوئے بولی۔  
 ”سہما! بچی کا سنگ سارا بھر گیا ہے اس کا پائپ نیچے سے بندھے گا۔“ ارمیہ اندر آکر بولی۔  
 ”فہ! ایک تو یہ آئے دن کی مصیبت ہے۔ نیچے سے پائپ اتنا چھوٹا ہے ذرا سا کچرا یا چکنائی چلی جائے فوراً  
 بند ہو جاتا ہے۔ یہی حال غسل خانے کے پائپوں کا ہے۔“ عاصمہ کو فٹ سے بولی۔  
 اسے تو پوں چند میمنوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ گھر چلانے کا مطلب صرف خرچ کے لیے پیسے فراہم کرنا یا انہماک  
 ہونا ہی کافی نہیں۔ چھوٹے بڑے ہزاروں اسنے مسائل ہوئے کہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا ہوا کر رہ جاتی۔ مگر  
 مسئلے کم نہ ہوتے۔

”تو لکسی! بلبر کو بلا کر ٹھیک کر آؤ۔“ حمیدہ خالہ نے مفت مشورہ بھڑاڑا۔  
 ”خالہ! بہت بار بلا چکی ہوں۔ وہ کہتے ہیں اندروالے پائپ چھوٹے ہیں اور پائپ بدلوانے میں سبھیں لاکھ کا  
 خرچ ہے۔“ عاصمہ کو فٹ سے بولی۔  
 ”خیر! اب تم اتنے لیے کیمپوں میں مت الجھو۔ فی الحال گزارہ کرو اور پائپوں میں کوئی ایسی دلی چیز ہی نہ بیچنا  
 کرو۔“ حمیدہ خالہ چادر ٹھیک کر لی جانے کو تیار تھیں۔  
 ورنہ عاصمہ کا دل تھا کہ وہ ان سے کہتی کہ اچھے ٹھیکہ دار سے بات کر کے اس مسئلے کا کوئی حل نکال دیتیں۔ بشر  
 ان کا بیٹا بے کام کر سکتا تھا۔ اس کے کئی ٹھیکہ دار واقف تھے۔  
 ”جتنی ہوں میں۔ ابھی مجھے مرغی لینے جانا ہے۔ بشر آج بریانی کی فرمائش کر کے گیا ہے۔ اور بیگم صاحبہ نے  
 نوٹ میرے ہاتھ میں آتے ہوئے پکڑا دینے کے آتے ہوئے مرغی لے کر آتا۔ ابھی اوھر جا کر کھڑا ہونا پڑے گا۔“  
 وہ دروازے سے گذر کر اسی دیر میں پہنچ بھی گئیں۔  
 ”سہما! بچن بھر رہا ہے پانی سے۔“ ارمیہ نے پھر آکر اطلاع دی۔  
 ”تو تم نے ٹوٹی کیوں کھولی؟“ فارغ خراب ہے تمہارا۔“ اسے ایک دم سے شدید غصہ آگیا۔  
 ”سہما! توئی تو مند ہے۔ مگر پانی۔“ ارمیہ ڈر گئی۔  
 ”دیکھتی ہوں میں۔“ اسے معلوم تھا اب بلبر کو بلائے بغیر گزارہ نہیں اور اس کے پاس پیسے بھی کم تھے۔



”انسپکٹر طارق بات کر رہے ہیں۔ جی۔ میں عدیل ہوں۔ جی۔ جی بالکل۔ آپ پولیس اسٹیشن ہی میں  
 ہیں نا۔ میں آ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں۔ جی! مسئلہ ہی ہے۔ میری بیٹی کو میری سابقہ بیوی کا بھائی اغوا کر کے لے  
 گیا ہے۔ جی۔ تاوان کا بھی مسئلہ ہو سکتا ہے اور وہ بھرانہ ذہنیت کا شخص ہے۔ میری بیٹی کو نقصان بھی پہنچ سکتا  
 ہے۔ ٹھیک ہے! میں تھوڑی دیر میں آکر تفصیل بتاتا ہوں اور ایف آئی آر کٹواتا ہوں۔ شکریہ! بس میں آ رہا  
 ہوں۔“ عدیل نے بات کر کے فون بند کر دیا۔  
 پیچھے کھڑی ٹیکسہ دھک سے رہ گئیں۔ یہ تو ان کے گمان میں نہیں تھا کہ یہ معاملہ پولیس میں بھی جا سکتا ہے۔  
 ”بس آتا ہوں اے۔ ابھی۔“ عدیل نے پڑے بدل لیے تھے۔ مگر چہرے پر سختی و زحم کی سوجن اور نشان اسی

ملحوظ رہے۔

”عدیل! بیانات سن میری۔“ نسیم پریشانی سے بولیں۔  
 ”ہی! آپ کو جو بھی کہتا ہے۔ میں اگر بات کروں گا۔ انسپکٹر صاحب چلے جائیں گے پھر۔“ وہ کہہ کر جانے لگا۔  
 ”اگر یہ چلا گیا تو۔“ نسیم تیزی سے اس کے پیچھے لگیں۔  
 ”عدیل! میرا بچہ۔ دو گھنٹی صرف میری بات سن۔ لے پھر چلے جانا۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولیں۔  
 ”اے! اجلے دن سب مجھے۔ لیٹ ہو جاؤں گا۔“ وہ چڑ کر بولا۔  
 ”دیکھو عدیل! بہتر ہے یوں معاملہ تھانے پھری میں لے جانے کی بجائے مل بیٹھ کر۔“ نسیم نے پہلی بار جیسے  
 ہوش کے ناخن لیے تھے۔ تھانے پھری کا مطلب پورے محلے اور خاندان میں باتیں اور بدنامی تھی۔ پھر سب سے  
 بدنامی کر انہیں ابھی فوریہ کی شادی کرنی تھی اور عدیل کی بھی تو۔  
 ”دیکھو بچہ۔ اس میں نقصان۔ تمہارا۔“  
 ”نہیں کیوں۔ میں تو برباد کروں گا ان دو ٹکے کے لوگوں کو۔ میری بیٹی ان لوگوں کے پاس۔“ وہ غصے میں  
 بھڑک کر بولا۔

”عدیل۔ مثال کا سوچ۔“ وہ اس کا بازو زور سے ہلا کر بولیں اور یہ بات نسیم نے اس وقت نہیں کی تھی  
 جب وہ مسلسل اسے بشری کو طلاق دینے کا کہہ رہی تھیں۔ عدیل بھی ٹھٹھک کر رہ گیا۔  
 ”کیا مطلب؟“ وہ ناگواری سے بولا۔ مثال کے نام پر وہ ہر بات سننے کے لیے تیار تھا۔  
 ”میرا بچہ! اس بچی پر اور ظلم نہ کر۔ اسے تو اب باپ دونوں چاہئیں۔ تو اس طرح اسے تھانے پھری میں لے  
 کر جائے گا۔ اس کی ساری نفسیات تباہ ہو جائے گی اور پھر اگر تو تھوڑا بہت قانون پڑھ لے تو تجھے پتا چلے گا کہ  
 قانون صرف ماں کی حمایت کرے گا۔ تو عدالتوں پھری میں جائے گا۔ بچی بشری کے پاس چلی جائے گی جو سراسر  
 نقصان ہی ہے۔“ وہ نرم لہجے میں اسے سمجھا رہی تھیں۔  
 ”اچھا تو آپ کا مطلب ہے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہٹا رہا ہوں۔ سوہ بد معاش میری آنکھوں کے سامنے میری بچی  
 مجھ سے چھین کر لے گیا اور میں جو ذیباں پن لوں؟“ وہ بھڑک اٹھا۔  
 ”تھوڑا صبر، قتل سے کام لے۔ اگر ایسی بے صبری کرے گا تو مثال نہیں ملنے والی تجھے۔ پہلا حق ماں کا ہی ہے۔  
 بچی کے بالغ ہونے تک یہ تو یاد رکھ۔ دنیا کی کسی بھی عدالت میں چلا جا۔ وہ فیصلہ ماں کے حق میں ہی کرے گی۔“  
 نسیم نے پہلی بار اسے ایسی حقیقتوں سے آگاہ کیا۔  
 اور وہ تو جیسے ششدر سماں کو دیکھے ہی جا رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں۔ تو اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ انکو تو بیٹی ہے تیری۔ ایسا پیار ہونا بھی چاہیے اور جس طرح  
 کی وہ بشری اور اس کی ماں ہے۔ مثال کو تو میں بھی ان کے نرمے میں نہیں رہنے دوں گی۔“ وہ مخصوص انداز میں  
 بولیں۔  
 ”تو کیا کروں پھر۔ میں اپنی بچی کے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔“  
 ”تو یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ مثال کو وہ خود سنا دے کر جائیں گے۔“ نسیم عزم سے بولیں۔  
 ”وہ کیسے؟“ عدیل بے ہمت سا ہو گیا۔  
 ”مجھے۔ چھوڑ دے۔ یہ کھیل جوش لڑائی اور جھگڑے سے نہیں۔ طریقے سے کھیلنا ہے۔“ نسیم کے لیے پھر  
 سے ایک محاذ کھل گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں مخصوص چمک تھی جو ایسی صورت حال میں ہوتی تھی۔ عدیل ماں کو  
 کو فٹ سے دیکھنے لگا۔

”میری جان! اب تجھے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ کوئی تجھے سے دور نہیں لے جاسکتا۔ میں اپنی جان کو  
 نہیں نہیں جانے دوں گی۔ اب تم میرے پاس ہی رہو گی میری جان۔“  
 ”اُپنی! بس کرونا۔ کیوں اپنی اپنی کو اور پریشان کر رہی ہو؟“ عمران جواں بیٹی کی ایسی پانگلوں سی محبت کافی دیر سے  
 دیکھنے جا رہا تھا۔ اسے نوک کر بولا۔  
 ”عمران۔ میرے بھائی! میں کس طرح، کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے میرے ساتھ جو نیکی کی  
 ہے۔ میری مثال کو میرے پاس لے کر آئے۔“ بشری مغلوب سی ہو کر رونے لگی۔  
 عمران اٹھ کر بس کے پاس آیا۔ ”اُپنی! کہیں مجھے شرمندہ کر رہی ہو؟ میرے لیے تو یہ شرمندگی کیا کم ہے کہ  
 میری وجہ سے آپ کا گھر برباد ہو گیا۔“ وہ شرمندگی سے بولا۔  
 ”تمہاری وجہ سے نہیں۔ اور میرا گھر تو جیسے پانی پر بنا تھا۔ ایک نہ ایک دن اسے ٹوٹنا ہی تھا۔ بس! میری مثال  
 میرے پاس رہے۔ مجھ سے دور نہ رہے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ پھر سے مثال کو پیار کرنے لگی۔  
 ”مثال۔ جانف۔ تمہیں بخار ہے؟“ وہ چونک کر اس کی کمر پر ہاتھ پھیر کر بولی اور پھر اس کے جسم کے مختلف  
 جگہوں پر چیک کرنے لگی۔

”کب سے بخار ہے تمہیں؟“ وہ پریشان ہوا تھی۔  
 ”بہت دنوں سے ماما۔ جب سے آپ مجھے جھوڑ کر آئیں۔“ مثال رونے لگی۔  
 بشری نے اسے اپنے ساتھ بھیج لیا۔  
 ”ڈاکٹر کو نہیں دکھایا کسی نے تمہیں؟“ وہ مغلوب لہجے میں بولی۔  
 ”بہت بات۔ آج بھی جب مجھے ماموں لینے گئے تو تو پیلا مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر آئے تھے۔ پیلا بہت پریشان  
 تھے۔ وہ ساری رات میرے ساتھ جاگتے تھے۔“ وہ ایک طرف بیٹھے عمران کو کن اکھیں۔ سو دیکھ کر بولی۔  
 ”تو پھر بخار کیوں نہیں اترا تمہارا؟“ وہ اسے تھوپی جا رہی تھی اور پریشان ہوتی جا رہی تھی۔  
 ”ماما۔“ وہ ماں کی بات جیسے سن نہیں رہی تھی۔ جھجک کر بولی تو بشری نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”کیا۔“ ہوا تمہارے پیلا کو؟“ بشری نے بڑی مشکل سے ”تمہارے پیلا“ زبان سے ادا کیا۔  
 ”پیلا اور ماموں۔ میں ابھی بہت لڑائی ہوئی تھی۔ پیلا کے چہرے پر۔ ماما۔ پیلا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ  
 بہت پریشان تھے اور۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنے احساس کو بیان کرے۔  
 ”میری جان! اگر تمہارے باپ کو تم سے پیار ہوتا۔ تمہارا احساس ہوتا۔ تو کیا وہ یوں تمہیں مجھے خوشے کاٹ  
 کر پھینک دیتا۔ ان دو کھینی عورتوں کے تیرے۔“ بشری نفرت سے بولی۔  
 ”بشری! بس کرو بیٹا! اب مثال کو تھوڑا آرام کرنے دو اور تم بھی آرام کرو۔ اتنا نہ تھکاؤ خود کو۔“ ذکیہ شکرانے  
 کے نقل پڑھ کر اندر آئیں۔ دونوں پر دم کرتے ہوئے پھونک ماری اور دونوں کو گنگے لگا کر پیار کرتے ہوئے نرمی  
 سے بولیں۔  
 ”ای! دیکھیں مثال کو۔ اتنا تیز بخار ہے۔ وہ بھی اتنے دنوں سے۔“ وہ رو ہانسی ہو کر ماں سے بولی۔ ذکیہ، مثال کو  
 چھو کر دیکھنے لگیں۔

”تمہاری جدائی کا بخار ہے۔ ان شاء اللہ ابھی کچھ دیر میں اتر جائے گا۔ اس کی تم فکر نہیں کرو۔ آؤ مثال!  
 تمہیں لٹاؤں میں تمہارے بستر۔“ ذکیہ مثال کو لے کر جانے لگیں۔  
 ”نہیں ای! اسے میرے پاس رہنے دیں۔ یہ میرے پاس لیٹے گی۔ آپ اس کے کھانے کے لیے کچھ بنواویں۔  
 کیا کھانے کی میری جان؟“ وہ مثال کو اپنے ساتھ لٹا کر پیار کرتے ہوئے بولی۔

”ابھی ایک دو دن اسے ماں کے پاس رہنے دو۔“  
 ”ایک دن بھی نہیں۔ بلکہ ایک گھنٹہ بھی نہیں۔“ وہ بات پوری ہونے سے پہلے تڑپ کر بولا۔  
 ”عدیل! مثال بیمار ہے۔ اس کا بخار ماں کے پاس جا کر ایک دو دن میں کم ہو جائے گا۔ تو پھر میں اسے جا کر لے  
 آؤں گی۔“ وہ نرمی سے سمجھانے لگیں۔  
 ”آپ کے خیال میں وہ آپ کو مثال کو دے دے گی؟“ وہ طنز سے بولا۔  
 ”ماں پر بھروسہ تو کر کے دیکھو۔“ نسیم اسے نیچے کی طرح پچکار کر بولیں۔  
 ”ہی! میں جا رہا ہوں۔ اب آپ مجھے نہیں روکیں گی۔“ اس نے ماں کا ہاتھ جھٹکا اور اٹھ کر جانے لگا۔  
 ”اچھا۔ سن چلا جا۔ میں تیرے ساتھ جاؤں گی۔“ وہ تیزی سے بولیں۔ عدیل نے ماں کو یوں دیکھا۔ جیسے ان  
 کا دل غ چیل گیا ہو۔  
 ”ہی! میں تمہارے جا رہا ہوں۔ پولیس اسٹیشن۔ آپ کیا کریں گی جا کر۔“ وہ جڑ کر بولا۔  
 ”وہ انسپکٹر جس سے تو ابھی بات کر رہا تھا۔ تیرا جاننے والا ہے کوئی؟“ نسیم اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے  
 بولیں۔

”دوست سے میرا۔“ وہ بے زاری سے بولا۔  
 ”بس! ابھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اب تو میری بات غور سے سن اور درمیان میں اچھل اچھل کر بولیو نہیں۔“ نسیم  
 شاعرانہ انداز میں بولیں۔  
 ”ہی! مجھے کچھ نہیں سنتا۔“ وہ پھر نرمی سے تڑا کر جانے لگا۔  
 ”سن لے بات۔ دل کو نہ لگے تو پھلے سے چلے جانا۔ میں نہیں روکوں گی تجھے۔ سن تو لے۔“ وہ اسے کچھ ایسے  
 طریقے سے روکتے ہوئے بولیں کہ عدیل گہری سانس لے کر رہ گیا۔  
 ”نسیم کو انسان کو راہ پر چلانا اور راہ سے بھٹکانا دونوں ہی خوب آتا تھا۔ اس نے دل میں ماں کی اس صلاحیت کا  
 اعتراف کیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔  
 ”میں فون کرتی ہوں ابھی تیری سرال۔“  
 ”نہیں سے وہ اب میری سرال۔“ وہ سختی سے تیز لہجے میں بولا۔ نسیم بھی لمحہ بھر کو خاموش سی ہو گئیں۔  
 بات تو دکھائی تھی۔ بشری جیسی بھی سسی ”ان کے لیے۔“ بیٹے کا گھر تو اجڑ گیا تھا۔ نسیم کو کبھی نظروں سے دیکھ کر  
 رہ گئیں۔



بشری پانگلوں کی طرح مثال کو گنگے سے بھیچنے سے بار بار چوڑے جا رہی تھی۔ ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اسے  
 دیکھنے جاتی اور پھر سے اسے چوڑے لگتی اور چومتی چلی جاتی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ مثال اس کے پاس  
 ہے۔ اس کی بانہوں میں۔ اس کے بہت قریب۔  
 ”میری! مجھے میری لڑکیا۔ میری جان! تو نہ آتی تو تیری ماں مر جاتی تیرے بغیر۔ میری مثال۔ میری جان۔“ وہ  
 پھر اسے گنگے لگا کر بھیچنے لگی۔  
 ”ماما۔ مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے۔ مجھے اب واپس نہیں جانا۔ میں آپ کے پاس رہوں گی۔ مجھے  
 دادو اور پچھو کے پاس نہیں جانا۔“ مثال کی آنکھوں سے بہت دنوں کے بعد ایسے گرم گرم آنسو نکلے تھے بشری  
 اسے چوڑے لگتی۔



”معاذ اللہ! اسی چہرہ جی ہیں۔“ وہاں کو پہنچ کر سر سے جاڑے ہوئے بہت دنوں بعد تو اسے ماں کی آغوش میسر آئی تھی۔ اس نے دونوں بائیں بشری کے گرد پھیلا دیں اور آنکھیں موند لیں۔  
 ”ابھی اسے گرم دودھ دے دو۔ کچھ دیر سوئے گی تو پھر اٹھ کر کچھ کھالے گی۔“ ذکیہ کہنے لگیں اور دودھ کے لیے ملازمہ کو آواز دینے لگیں۔  
 ”عمران! تمہیں عدیل سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ ذکیہ نے عمران سے کہا۔  
 مثال بے اختیار آنکھیں کھول کر نانی اور ماموں کو دیکھنے لگی۔  
 ”امی۔ پلیز۔“ بشری نے اشارے سے ماں کو اس موضوع پر بات کرنے سے منع کیا۔  
 ”ہاں! وہ تو جیسے بڑے پیار۔ سے مثال کو سمجھ دے رہا تھا۔ جھگڑانہ کرتا تو اور کیا کرتا۔“ عمران ہنسنے لگا اور کباہر کل گیا۔



”کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں؟“ نسیم فون کلن سے لگائے بیاباں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔ نئی بوی جینل بدلتی فوزیہ نے چونک کر ماں کو نہ کھلا۔  
 ”نہیں۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔ بے یقینی کی بات نہیں۔ جی۔ آپ نے ٹھیک کہا۔ بالکل۔“ وہ ایسے تابع واری سے سر ہلائے جا رہی تھیں۔ جیسے دوسری طرف کوئی بادشاہ وقت ہو۔ فوزیہ نے نئی بوی کی آواز کم کر دی۔  
 ”جی بالکل۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ آجائیں کل کسی بھی وقت۔ نہیں، نہیں۔ مجھے کہاں جانا ہوتا ہے۔ اس بیماری نے تو بس گھر میں بٹھا دیا ہے۔ اللہ مجھے میری بیٹی کے فرض سے سبکدوش کرے تو پھر کوئی لاچ نہیں۔ بھٹلے ملک الموت آئے اور اس مٹی کے ڈھیر کو لے کر چلتا ہے۔“ وہ انتہائی عاجزی اور مسکینی سے کہہ رہی تھیں۔ فوزیہ مسکرا کر رہ گئی۔  
 ”قسم سے امی! آپ اگر ایکٹر لیں ہوتیں تو پرائیڈ آف پرفارمنس تو آپ کا پکا تھا۔“ فوزیہ ہنس کر آہستہ سے

بولی۔  
 ”قسم نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور الوداعی کلمات بول کر فون رکھ دیا۔  
 ”کیا ہوا؟ کون تھا؟“ فوزیہ کو سخت بے چینی لاحق تھی۔ فوراً پوچھنے لگی۔  
 ”نسیم جوش بھرے انداز میں اٹھ کر فوزیہ کے پاس آئیں اور اسے گلے لگا کر خوب پیار کرنے لگیں۔  
 ”امی! اس بے موقع پیار کی وجہ تو یہ تھیں۔“ وہ ماں کے اس عجیب انداز پر کچھ بوکھلا کر بولی۔ وہ کب عادی تھی ایسے والہانہ پیار کی۔

”میرے اللہ نے میری سن لی فوزیہ۔ میری بچی۔ اللہ نے ہماری سن لی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔“ وہ جوش سے سس چہرہ لے ہوئے بے ربط کھی سے بولی۔  
 ”امی! ہوا کیا ہے۔ بتاؤ دیں کچھ۔“ فوزیہ کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔  
 ”وہ کل خالد کی ماں اور خالہ نہیں آئی تھیں مجھے دیکھنے۔ یاد ہے نا مجھے کہ نہیں؟“ وہ خوشی کے عالم میں اوت پانگ بولے جا رہی تھیں۔

”امی! کل کی بات کون بھول سکتا ہے اور کیا شخص عورتیں تھیں وہ بھی۔ آپ نے کسی قدر دکھی انداز میں میری طلاق کا قصہ سنایا اور انہوں نے نہ ہمدردی کی نہ کوئی لفظ بولا۔ چائے پی اور خاموشی سے اٹھ کر چل دیں۔“

فوزیہ برے برے منہ بنا کر بولی۔

”وہ دونوں عورتیں حلیمہ اور چہوں سے بس اچھے گھر کی تھیں۔ شریف، کم گوار اور کچھ تھپی سی۔“ فوزیہ نے پردے کو فٹ کے عالم میں ان کی مدارات کی تھی۔ اور سچی بات اسے وہ دونوں عورتیں کچھ اچھی بھی نہیں لگی تھیں اور کل سے ابھی تک اس نے ان کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔

”تم انہیں پسند آگئی ہو اپنے بیٹے کے لیے فوراً شادی کر لیں گی مہینے بھر کے اندر۔ کویت میں ہوتا ہے ان کا بیٹا۔ اسی ہفتے چھٹی پر آ رہا ہے۔ اس کے آتے ہی شادی کر دیں گی وہ۔ میرے اللہ! مجھے تو لگتا ہے میرا تو دل خوشی سے بند ہو جائے گا۔“ نسیم بولا فچی خوشی سے بے ہوش ہونے کو تھیں۔

اور شادی مرگ تو جیسے فوزیہ پر بھی ہو گیا۔ اس کے تو گمان میں بھی یہ معجزہ نہیں تھا اور طلاق کا داغ گلے کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ وہ یوں ماں کو دیکھتی رہ گئی۔ جیسے اسے ماں کے اس مذاق پر سخت غصہ آ رہا ہو۔

”میری بھی یہی حالت ہوئی تھی فوزیہ! جب اس غزالہ ہمن نے مجھ سے یہ کہا۔ نسیم سے مجھ سے تو بہت دیر تک کچھ بولا نہیں کیا۔ بول! بے نامعجزہ؟ میری دعا میں اللہ نے سن لیں۔ آخری بیٹا ہے۔ جس کی شادی کرنی ہے اور سب سے بڑی بات وہ تجھے ساتھ لے کر جائے گا۔ ایک مہینے کی چھٹی کے بعد چلا جائے گا اور وہاں جاتے ہی تجھے بلا لے گا۔ فوزیہ۔ میری بیٹی کے ایسے بھاگ کھلیں گے۔ میں نے تو بھی سوچا نہیں تھا۔“ وہ اسے ساتھ لگا کر حٹ چٹ پیار کرتے لگیں تو فوزیہ بھی لپٹیں کرتے ہوئے شرماسی گئی۔ اس نے بھی یہ سب کچھ سوچ کر کھا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت دنوں بعد نئے خواب بننے لگیں۔ نسیم کیا بول رہی ہیں اب اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

\*\*\*

مثال بشری کے ساتھ لپٹی گہری نیند سو رہی تھی۔

ذکیہ رات کے وظائف ختم کرنے کے بعد مصطفیٰ سیٹھی انھیں اور اندر آ کر دونوں پر دم کرتے ہوئے کچھ سوچنے لگیں اور پھر جیسے دل تمام کر بیٹھ گئیں۔

”میری بشری کی عمر ہی کیا ہے۔ اس اکتوبر میں انتیس کی ہوگی۔ اس عمر میں تو لڑکیاں اپنے گھروں کی ہوتی ہیں اور اس کا گھر بس کراچی بھی گیا۔ کیا کرے گی میری بیٹی اب بانی کی عمر بھر۔ بیٹی کا ساتھ۔ میرے اللہ! رحم فرما میری بشری پر۔“ بے اختیار ذکیہ کا دل بھر آیا۔ بہت دنوں بعد تو انہیں یوں فرصت سے اس سانچے پر رونے کا موقع ملا تھا۔

باہر ڈور بتل زور سے بجی۔

ذکیہ نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔ عمران لاؤنج میں ہی لیپ ٹاپ لیے بیٹھا تھا۔ اٹھ کر دروازہ کھولنے چلا گیا۔

شمس خیال کے تحت ذکیہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چلی گئیں۔

”تو وہ تم ہو جس نے عدل صاحب کے گھر کے باہر سے ان کی کم سن بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ گرفتار کرو اسے۔“ باہر سے آتی رعب دار آواز نے ذکیہ کے ہوش اڑا دیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بچ بچا کر تو ہم چلے تھے بہت  
پھر بھی قسمت میں حادثے تھے بہت

مے جنوں کو کیا ہوا، وہ دشتیں کہاں گئیں  
ہم اہل اضطراب کی وراثتیں کہاں گئیں

وہی ہوا کی برہمی، وہی جہاں کی سرکشی  
مگر وہ اپنے حوصلے، وہ جراثیم کہاں گئیں

دوام جن کی جستجو، قیام جن کی آرزو  
وہ مے گسا دیکھا ہوئے، وہ حالمیں کہاں گئیں

کبھی تو شہر کی سٹو، کبھی تو یہ حساب دو  
گلی گلی جو عام تھیں، وہ قربتیں کہاں گئیں

چلیں تو منظر رواں، ریکس بہار کا سماں  
نہ جلنے شام اس برس وہ قامتیں کہاں گئیں

محمود شام

باقی احمد پوری

## ادیب

ایک شخص نے اپنے دوست سے پوچھا۔ ”اور سناؤ تمہارے باقی دو بھائی کیا کر رہے ہیں آج کل؟“  
”میرا ایک بھائی تو ادیب ہے۔“ اس نے فوراً جواب دیا پھر گہری سانس بھر کر دوبارہ بولا۔ ”اور دوسرا بھی بے کار ہے۔“

افشاں۔ عبداللہ آباد

## مورور الزام

ایک صاحب نے اپنے دفتر کے ساتھی سے پوچھا۔ ”آپ کی بیوی سے آپ کی پہلی ملاقات کس نے کروائی تھی؟“  
ساتھی نے طویل آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”بس سمجھ لو خود ہی ہو گئی تھی۔ میں کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہراتا چاہتا۔“

شگفتہ فیاض۔ مٹی سن امریکا

## اطمینان

وہ دونوں اتوار کا سارا دن ساحل سمندر پر گزار کر واپس آ رہے تھے کہ لڑکے نے لڑکی سے پوچھا۔ ”تم پبلک کے سارے واقعات اپنی جہی کو تو نہیں بتاؤ گی نا؟“

”ارے نہیں! لڑکی نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

”میری مٹی تو ذرا نہیں کرتیں۔ وہ تو میرا شو ہری ہے جسے طرح طرح کے سوال کرنے کی عادت ہے۔“  
یاسمین مغل۔ کاشمیر

## فی الحال

”تم بتاؤ، تم مجرم ہو یا نہیں؟“ جج نے غصے سے کنبے میں کھڑے ملزم سے دریافت کیا۔  
”جناب والا! فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“  
ملزم نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”مجھے میں نے دیکھ لیا کے دلائل نہیں سنے۔“

صائمہ عمران۔ لاہور

## رجمنائی

ایک نجی محفل کے اختتام پر ایک صاحب جانے کے لیے اٹھے تو میزبان انہیں چھوڑنے دروازے تک آیا۔ وہ صاحب کو کھڑاتے ہوئے دروازے سے نکلنے لگے تو میزبان نے کہا۔

”جب تم قریبی چوراہے پر پہنچو گے تو تمہیں دو ٹیکسیاں نظر آئیں گی۔ جو تمہارے بالکل قریب ہو، اس میں بیٹھ جانا۔ اس کے برابر دلی میں بیٹھنے کی ہرگز کوشش مت کرنا کیونکہ وہ وہاں موجود ہی نہیں ہوگی۔“

شہلا اظہر۔ ویراؤن

## بوجھ

بیڑی کی پچیسویں سالگرہ پر باپ نے اس سے کہا۔ ”بیٹا! اب تم جوان ہو گئے ہو میں چاہتا ہوں کہ اب تم میرا کچھ بوجھ اٹھاؤ۔“

”ضرور اباجی! آپ بتائیے میں کیا کروں۔“ بیٹے نے سعادت مندی سے کہا۔  
”بیٹا! تمہاری پیدائش کے وقت اسپتال کے

اغراجات کے لیے ہم نے بینک سے کچھ قرضہ لیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی آخری تین قسطیں تم ادا کر دو۔“

عائشہ غلام۔ سرانی ٹاؤن

## احترام

ایک اطالوی موسیقار کے بارے میں دو باتیں مشہور تھیں۔ ایک اس کی بد صورتی اور دوسرے خواتین کے لیے اس کا محترم رویہ۔ ایک مرتبہ وہ لوپیرا کے لیے ریسرسل کروا رہا تھا جس میں اطالوی جوان ساز بجا رہا تھا اور ایک امریکی لڑکی گاد رہی تھی۔ وہ بار بار بے شری ہو جاتی تھی۔ موسیقار کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا مگر وہ اپنی عادت سے مجبور صنف نازک کے لیے سخت کلمہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ زریب برزدا یا۔ ”ڈکٹر سٹوفر کو بس پر لعنت ہو، جس نے امریکہ دریافت کیا۔“

ارم کمال۔ فیصل آباد

## اسم گلنگ

ایک پولیس مین نے ٹرک والے کو روکا اور تلاشی لی مگر کچھ نہیں ملا۔ پولیس والے نے پوچھا۔ ”میں حیران ہوں۔ تم روزانہ گزرتے ہو اور ٹرک میں کچھ نہیں ہوتا۔ کیا وجہ ہے آخر تم کیا کرتے ہو۔“  
ٹرک والے نے جواب دیا۔ ”اسم گلنگ۔“

پولیس والے نے قہر ہو کر پوچھا۔ ”دیکھتے ہو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی۔“  
ٹرک والے نے پولیس والے کو ایک پرچی دی اور کہا۔

”اس میرے جانے کے بعد کھولنا۔“  
پولیس والے نے اس کے جانے کے بعد پرچی کھولی تو اس میں لکھا تھا۔ ”میں ٹرک اسمگل کرتا ہوں۔“

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

## نسلی برتری

ایک سفید فام سیاح گھومنا گھامنا ایک ایسے گاؤں میں جا نکلا جہاں تمام تر آبادی سیاہ فاموں پر مشتمل تھی۔ وہ شرب خانے میں داخل ہوا تو سیاہ فام بارمین نے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا نسلی برتری پر یقین رکھتے ہو؟“

”ہرگز نہیں!“ سیاح نے جواب دیا۔  
”مگر ہم یقین رکھتے ہیں۔“ سیاہ فام بارمین چلایا۔ ”یہاں سے فوراً دفعان ہو جاؤ۔“

جیا ممتاز۔ گلستان جوہر

## سادگی

کھلاڑی ریس میں دوڑ رہے تھے۔ ریس دیکھتے ہوئے سردار صاحب نے پاس کھڑے ہوئے آدمی سے پوچھا۔

”انعام کس کو ملے گا؟“  
”سب سے آگے والے کو۔“ آدمی نے جواب دیا۔  
”تو پھر پیچھے والے کیوں بھاگ رہے ہیں؟“ سردار نے حیرت سے پوچھا۔

آمنہ اجالہ ڈھری

## ایڈیٹر

ایک اخبار کے مالک نے ایڈیٹر کے منصب کے لیے آئے ہوئے امیدوار سے کہا۔

”یوں تو آپ بڑھے لکھے اور قابل آدمی لگتے ہیں لیکن مجھے اپنے اخبار کے لیے ایک بے حد ذمہ دار ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ کیا آپ کامیابی سے اخبار چلا سکیں گے؟“

”بالکل جناب!“ امیدوار نے اعتماد سے کہا۔  
”یہاں آنے سے پہلے میں اپنے مالک کی پندرہ لاکھ کی کار چلاتا تھا تو کیا آپ پانچ سو روپے کا اخبار نہیں چلا سکیں گے؟“

صائمہ عمران۔ سرانی ٹاؤن



رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن مسعود روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص کسی کی موت پر اپنے دھار پیٹے، مگر بیان بھائے اور عید چہالت کی سی باتیں کرے، وہ ہم تک سے نہیں ہے۔“

تشریح:- اس میں فوج کی حرمت بیان کی گئی ہے یعنی فوج کرنے کا عمل ان لوگوں جیسا ہے جو غیر مسلم ہیں یا یہ کہ وہ ہماری امت سے خارج ہے۔

(ابن ماجہ)

ظرف،

ایک نوجوان یر و شلم کی ایک لگی سے گزر رہا تھا، اچانک ایک شخص نے اس کی راہ روک کر اسے برا بھلا کہا شروع کر دیا۔

”اے بے دین و گمراہ! تو ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے منحرف کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تجھے ذلیل و خوار کرے۔“

نوجوان نے مسکرا کر اسے دعائیں دینا شروع کر دیں وہاں موجود ایک شخص نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”یہ شریر شخص تمہیں برا بھلا کہہ رہا ہے، گالیاں دے رہا ہے اور تم اسے دعائیں دے رہے ہو۔ آخر تم اسے جواب کیوں نہیں دیتے؟“

شریف نوجوان نے جواب دیا۔ ”جس کے پاس دینے کے لیے جو کچھ ہوتا ہے، وہ دوسروں کو دہی بچھ دیتا ہے۔ اس کے پاس گالیاں ہیں، لہذا اس نے مجھے گالیاں دیں اور میں نے دعا دی۔“

یہ شریف نوجوان حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا،

”جاہل کے سامنے عقل کی بات مت کرو کیونکہ پہلے وہ بحث کرے گا اور پھر اپنی ہار دیکھ کر آپ کا دشمن بن جائے گا۔“

دعوت امام حسینؑ

سیدنا امام حسینؑ ایک مرتبہ کچھ مسالکین کے پاس سے گزرے جو کھینچے زمین پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو لجاجت سے عرض کی۔

”حضرت! تشریف لائیے، ہمارے ساتھ کھانے میں شرکت فرمائیے۔“

سیدنا حسینؑ سواری سے نیچے اترے ان کے ہمراہ زمین پر بیٹھے اور یہ کہتے ہوئے ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے۔

”اللہ بیکر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، ان کے ساتھ کھانا کھا کر فاجر بننے کو نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ اظہارِ محبت کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں تو آپ لوگوں کی دعوت قبول کر چکا اب آپ لوگ بھی میری دعوت قبول کریں۔“

ان کے لیے اس سے بڑھ کر اعزاز و اکرام کی کیا بات ہو سکتی تھی۔ ایک زبان ہو کر بولے۔

”ہاں ہاں، ہم آپ کی دعوت قبول کرتے ہیں۔“

سیدنا حسینؑ ان کو ہمراہ لیے ہوئے گھر تشریف لائے اور پھر تازہ بننے آپ کے یہ الفاظ اپنے سینے میں محفوظ کر لیے۔ آپ نے اپنی زوجہ محترمہ ”دبابہ“

سے فرمایا۔

”اپنی جمع شدہ پونجی نکال لاؤ۔“

پھر اس مال کو مسالکین میں تقسیم کر دیا۔

مسئلہ کامل،

امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں آیا ہے کہ جب کسی مسئلے کا حل انہیں نہیں ملتا تھا تو وہ دو تین قرآن ختم کر دیتے اور مسئلہ کامل انہیں سوجھ جاتا تھا۔

(شاہنواز فاروقی سائنٹ)

اولیاء کا احترام،

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو حضرت مولانا ضیاء الدین سنہامی کی عبادت کو گئے جو حنت ہمارے تھے اور اطلاع کرائی۔

مولانا نے فرمایا: میں دین میں نئی بات نکالنے والوں سے نہیں ملتا ہوں۔

نظام الدین کبھی سماع میں شریک رہتے اور مولانا اس کو بدعت اور ناجائز سمجھتے تھے۔

حضرت نظام الدین نے کہا: ”مولانا سے عرض کرو، میں نے سماع سے تو یہ کر لی ہے۔“

یہ سنت ہی مولانا نے فرمایا۔

”میرے سر کا عامر اتار کر مجھاد اور سلطان المشائخ سے کہو کہ اس پر پاؤں رکھتے ہوئے تشریف لائیں۔“

اپنی قوم سے دشمنی،

ایک مرتبہ مولانا شرف علی تھانوی سے کچھ لڑکوں نے سوال کیا کہ کتنے کو ناباک قرار دیا گیا ہے حالانکہ یہ بڑا وفادار اور فاضل ہے۔ رات کو چوکیدار کا کام سرانجام دیتا ہے۔ شکار میں مدد دیتا ہے۔

مولانا نے جواب دیا: کتنے میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن ایک عادت بڑی خراب ہے کہ اپنی ہی قوم کا دشمن ہے اپنی ہی قوم سے رشتہ ہے۔“

پیرٹ بھکر کھانا،

حضرت یحییٰ بن زکریا نے شیطان کو بہت سے

چندے اٹھائے ہوئے دیکھا۔ آپ نے پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟“

شیطان بولا: ”یہ شہوات ہیں۔ ان سے ابن آدم کو قید کرتا ہوں۔“

آپ نے دریافت کیا: ”کیا میرے لیے بھی کوئی ہے؟“

شیطان نے کہا: ”ایک رات آپ نے بیٹ بھکر کھا نا کھایا جس سے نماز میں سستی پیدا ہو گئی۔“

آپ نے فرمایا: ”میں آئندہ کبھی بیٹ بھکر نہیں کھاؤں گا۔“

شیطان نے جواب کہا: ”میں آئندہ کسی کو نصیحت نہیں کروں گا۔“

فانی،

ایک دن خلیفہ سلمان بن عبدالملک نے سز خلعت اور سبز عمامہ پہنا اور آئینہ دیکھا۔ اسے اپنی دجابت بہت جلدی معلوم ہوئی کہنے لگا۔

”میں کیا خیر واد نوجوان بادشاہ ہوں؟“

پاس ہی اس کی خادمہ کھڑی تھی۔ خلیفہ نے دیکھا کہ اس کی بات پر لونڈی کے ہونٹ ہلے ہیں۔ وہ بچھنے لگا۔

”تو فانی نے کیا کہا ہے؟“

وہ بولی: ”اچھی بات ہی نہیں ہے۔“

سلمان نے اصرار کیا: ”ان الفاظ کو ذرا دوسرے

اداکرو۔“

خادمہ نے چند اشعار پڑھے جن کا مفہوم یہ تھا۔

”تو بہترین اثاثہ ہے کاش باقی رہتا مگر کوئی انسان باقی نہیں رہ سکتا۔ جہاں تک میں جانتی ہوں تجھ میں کوئی عیب نہیں سولے اس کے کہ تو فانی ہے۔“

اس واقعے کے بعد سلمان عرف ایک ہفتہ زندہ رہا۔ بخار آیا اور بھی بخار اس کی موت کا سبب بنا۔

میلے صدیقی۔ کراچی

حادیثے،

حادثے زندگی میں بڑی آہستگی، بڑی خاموشی سے دے پاؤں اگر حب جاب گزرتا ہے ہیں جلتے جلتے مرکز میں نہیں دیکھتے، دم بھرنے کے لیے ٹھہرتے ہیں

تجربات کا مشاہدہ کرنا دوسری بات۔  
کونٹر فائلہ جرنل والا

### اثبات

○ مسلمان جہاں بھی گئے یہ اثبات ان کے ہمراہ تھا۔  
○ ایک روشن اور سیدھا سادہ دین، جس کی ہر  
ہدایت کا لازمی نتیجہ فلاح، سعادت اور کامرانی  
تھا۔  
○ ایک عادلانہ نظام حکومت جو شاہ و گدا میں  
کوئی امتیاز نہیں رکھتا تھا اور جو ہر قسم کے  
استحصال سے پاک تھا۔

○ ایک ایسا پیغام جو ان کی اخلاقی اور روحانی  
زندگی کا ضامن تھا۔  
○ ایک ایسا علم جس کی روشنی سے زندگی کی شاہراہ  
چمک اٹھی تھی اور اجالے حد امکان تک پہنچ  
گئے تھے۔

○ ایک ایسی تہذیب جس کی بنیاد طہارت و  
تقدس پر ڈالی گئی تھی۔  
○ ایک ایسا نظام عبادت جس نے بندوں میں  
ذوقِ خدائی پیدا کر دیا تھا اور ان کے دست  
بازو میں بجلی جیسی قوت تھری تھی۔  
(ڈاکٹر غلام حبیب لانی برقی)

صومیہ نذیر، بشما کمال نذیر۔ بری پور، ہزارہ

### شجرہ نسب

○ ایک بار کسی نے حضرت سلمان فارسیؓ سے ان  
کے خاندان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا۔  
"مسلمان ابنِ اسلام"  
غمرہ، افرامہ۔ کراچی



نہیں یہ دیکھنے کے لیے جس کی زندگی میں آکر وہ وہیں  
جا رہے ہیں۔ اس کے دل کی دنیا میں کتنی پہل چمک  
ہے۔ اس کی روح کو وہ کس طرح سسکتا ہوا چھوڑ  
کر آگے بڑھ گئے ہیں۔

مسترت الطاف احمد۔ کراچی

### انمول موتی

○ ہر نبی ہونے والا شخص ہے ونا نہیں ہوتا۔ اسی  
طرح ہر قریب رہنے والا شخص اپنا نہیں ہوتا۔  
ہم اعتبار کی مالا کو بھی ٹوٹنے سے ڈر کر اس  
انمول مالا کے موتی بکھر جائیں تو تلاش کے باوجود  
دوبارہ نہیں ملتے۔

○ کسی سے تلخ ہوتے ہوئے اتنی گنجائش ضرور  
رکھو کہ اگر واپس آنا پڑے تو راستہ کبھی ثابت  
نہ ہوتے۔

○ شک ایک آگ کی طرح ہے۔ جو اچھی سے  
اچھی چیز کو جلا کر رکھ کر دیتا ہے۔  
○ بعض رشتوں کو برقرار رکھنا، ان کو توڑ دینے  
سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔  
نازیہ رئیس۔ نواب شاہ

### عورت

○ عورت کا مطلب ہے "جسمی ہوئی چیز" لہذا  
جتنا چھپ کر رہے گی اتنی ہی "اسم باجسمی" ہوگی۔

### ادب بات

○ بعد مجبوری عورت کا مرد کے پاس سے گزر کر جانا  
یا اس کے ساتھ کام کرنا ادب بات ہے۔ اس کی  
صحبت اختیار کرنے کے لیے ایسا کرنا دوسری  
بات۔

○ ایک نظر دیکھ کر باضوری سوال و جواب کر کے  
جیون برساتی منتخب کرنا ادب بات ہے۔ محبت  
کا دھونگ رہا نا دوسری بات۔  
○ کسی کے قول پر بڑھ کر عمل کرنا ادب بات ہے اپنے

# خالد علی

قرۃ العین طاہرہ  
کہاں جاؤ گے مجھے چھوڑ کے میں یہ چھوڑ چکا تھا  
وہ جواب مجھ کو نہ دے سکا وہ تو خود میرا املا تھا  
وہ ملا تو صدیوں کے بعد بھی میرے لب پہ کوئی گویا تھا  
اُسے میری چپ نے ڈلا دیا مجھے گفتگو میں کمال تھا  
فرحت اشرف جٹ  
وہ دل کی بازی جہاں مجھ سے جتنا چاہے  
میں مان لوں گا وہیں مات اس سے کہہ دینا  
وفا کی باہ میں، میں آج بھی اکسلا ہوں  
کوئی نہیں ہے میرے پاس اُس سے کہہ دینا  
نثرین اکرام  
آج یوں موسم نے دی جتنی محبت کی خیر  
پھوٹ کر رونے لگے ہیں میں محبت اور دم  
تم نے جو نبی کر لیا محسوس منزل ہے قریب  
راستے کھونے لگے ہیں میں محبت اور دم  
ارم کمال  
اس شخص کی جاہت بھی عجب ہے کہ ہمیشہ  
خاطر میں نہ لانا، مدارت میں رہنا  
حزق قریشی  
شام سفر کا اور اٹا نہ ہی کچھ نہیں  
اک تیری بے چراغ، بھیلی ہے ایک نور  
رشار عظمت  
سکتے آیتوں کی کہ جہاں اچھی نہیں نکلتی  
مجھے وعدوں کی خالی سپہاں اچھی نہیں نکلتی  
گردن پر دست کے رنگوں کا آفرود کھوکھلا مجھ کو  
کھلے آنکھ میں اُردنی تیلیاں اچھی نہیں نکلتی  
خاسم اعوان  
مگدالہ اخوان باندی  
ایسا منظر ہے پس منظر تک جراتی کی جراتی ہے  
کسمبلی اصل کا عید نہیں لکھتا، کسمبلی سچا خواب نہیں ہوتا

کثری شاہین اعوان  
چند خوابوں کے عطا کر کے ابلے مجھ کو  
کروا دُنیا نے وقت کے حوالے مجھ کو  
جن کو سورج میری چوٹ سے ملا کر اٹھا  
اب وہ خیانت میں دیتے ہیں ابلے مجھ کو  
صوبہ نذیر  
بات مٹھری جو عدل پہ واعظ  
مجھ پر محنت، یہ التجا کیا ہے  
انہیں چاندی کا جب کہا تو گھنے لگے  
چاند کیجئے نا، یہ چاند سا کیا ہے  
سمیعہ احسان  
یہ تم سے کہہ دیا۔ کس نے کہ بازی ہار بیٹھے ہیں  
ابھی تم پہ لٹانے کو ہماری جان باقی ہے  
نوشاہ منظور  
مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے  
وہ میرے سب حوالے جا نہا ہے  
میں اس کی دستری میں ہوں مگر وہ  
مجھے میسری رضا سے مانگتا ہے  
مددہ وزیر  
اک بار وہ ملا تھا مجھے بے رنجی کے ساتھ  
اس دن سے دل کا شہر برابر اُداس ہے  
دیکھی ہے اُس کی آنکھ میں پہلی دفعہ غمی  
یوں لگ رہا ہے جیسے سمندر اُداس ہے  
نوبہ نذیر  
ہم بھی تو قرار و قول بھولے  
کون اپنا کہا نہا ہوتا ہے  
اب یاد نہ آ کر کچھ دنوں سے  
دل کسی اور کو چاہتا ہے

ماہر زاد  
کرو مجھ سے کوئی وعدہ کہیں نہ بھولنے کا  
تمہیں کیا فرق پر تباہ پھرنے میں بھرنے کی  
نور افروز  
بہت اسرار پوشیدہ ہیں اس تنہا لندی میں  
یہ محنت سو جو کہ دیوانے جہانگیر نہیں ہوتے  
تعجب کیا اگر اقبال دُنیا مجھ سے ناخوش ہے  
بہت سے لوگ دُنیا میں پسندیدہ نہیں ہوتے  
شبنم ششاد  
کیشل کالج یونین  
زندگی تو کب کی بونستی خاموش  
دل تو بس عادتاً دھڑکتا ہے  
نبینا احمد شہناز گل  
زندگی اس کے میرا نام نہ خال کرنا  
گر یہ طے ہے کہ یہی کیل دوبارہ ہوگا  
سونا حسن  
جو آنا چاہو رستے ہزار نہ آنا چاہو عند ہزاروں  
مزاج برہم طویل راستہ رستی بارش خواب موسم  
افرا اکرم  
سکھڑی میاں شریف  
اب کہاں ایسی طبیعت والے  
چوٹ کھا کر جو دعا کرتے تھے  
ترک احساس محبت مشکل  
ہاں مگر اہل وفا کرتے تھے  
ایفقا انا  
شاید اے عشق بھی نہ سمجھے  
جس کرب میں عقل مبتلا ہے  
ماریمہ چودھری  
آپنی کاوش بھی نہ کر میری اینٹری کے لیے  
تو کہیں میسر اگر فتار نہ سمجھا جائے  
نوبہا ربانی  
تمہارے ذہن میں جو بھی ہے صاف صاف کہو  
سناقت کا نشان ہے اگر مگر کرنا  
ہما مغل  
معرکہ اب کے ہوا بھی تو پھر ایسا ہوگا  
تیرے دیا پہ میسری سا کی کاپر ہوگا  
ایسا جانی اُسے بھول گئی ہے محنت  
یا پھر ایسا ہے میسر از قلم ہی کپڑا ہوگا

ساجی عامر  
میری ادائیگی میں کچھ دخل تمہارا بھی ہے محنت  
جب یاد تمہاری آتی ہے تو کھراچھا نہیں لگتا  
کوثر خالد  
جنم والو خدا حافظ تعفی میں لے چل کر دوش  
وطن میں گرا نہ حیرا ہو تو کھیرا جلا دینا  
نیلم شہزادی  
لوڈ دے ہیں میں لے گھر کے سب ہی آئیے  
پیاد میں ہارے ہوئے لوگ مجھ سے دیکھتے نہیں ملتے  
سبین اختر  
اس سے جدا تو ہو گیا پر یوں لگا مجھے  
جیسے جہاں میں کوئی دوسرا نہیں رہا  
وہ بے وفا نہیں مگر اتنا ضرور ہے  
پسند وہ جس طرح کا تھا ویسا نہیں رہا  
غنی اکرم  
فقط باتیں اندھیروں کی فقط قصے آجائوں کے  
چراغ آرزو لے کر تم نکلی، نہ ہم نکلے  
عابدہ عوری  
کسی بھی درد کی مدد سے ڈلا کر رنے تک  
میں خود کو جوڑتا رہتا ہوں پھر بکھرنے تک  
نیلم ظفر چودھری  
خواب خواہش، واہمہ ہے زندگی  
ایک بھانک حادثہ ہے زندگی  
آج تک یہ مسئلہ سلجھا نہیں  
میں خفا ہوں کہ خفا ہے زندگی  
عائشہ خان  
نی آئی پی ہری پور  
یہ تمہارا ہی حوصلہ محنت  
حال کو حسب حال رہتے دیا  
مددہ بٹول  
وہ مجھے اپنے ساتھ قید کر کے جانے  
خدا کرے کوئی ایسا قصود ہو مجھ سے  
صدیقہ انیس ملک  
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا  
ایک ہی شخص تھا جہاں میں کیا



# شاعری کی پختہ ہوتی ہے

سعدیہ ریاض

شاعری خوبصورت احساسات و جذبات کو الفاظ میں بیان کرنے کا نام ہے۔ کبھی کسی نظم، غزل یا شعر کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے شاعر نے ہمارے دل کے مال کو زبردستی دے دی ہو۔ ہماری کیفیت کو بیان کر دیا ہو تو شاعری نمکدانی کیفیت دھار دیتی ہے۔

اب اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام سعدیہ ریاض ہے۔ شاعری سے میرا کچھ لگاؤ ہے۔ میرا تعلق کراچی سے ہے۔ جس کو پہلے دو چینوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ جس کے لیے فیض احمد فیض نے کہا ہے:

دفتہ دفتہ شوکر رہی ہے یہیں ندوہم ہر دیواروں کو جاٹ رہا ہے نہ پانی کا زہر دودھ اتنی تک لکھی برقی اتنی گرتی ہوتی ہے لہر کی صورت میں ہے دونوں دروہوں کی گدلی لہر بستہ ہے اس کے کمرے پیچھے روشنیوں کا شہر اسے روشنیوں کے شہر...

ابن انشاء کی شاعری کا انداز مجھے سب سے مختلف، منفرد اور اچھا لگتا ہے۔ ان کی ایک دل کے تالوں کو چھو جانے والی نظریں برابر پڑھنے کو مل جاتا ہے۔

سب مایا ہے سب ڈھلتی پھرتی جیسا ہے اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے جو تم نے کہا ہے، فیض نے جو فرمایا ہے سب مایا ہے

ہاں گاہے گاہے دید کی دولت ہاتھ آئی یا ایک وہ لذت نام ہے جس کا ردوائی بس اس کے سوا تو جو بھی جواب کا مایا ہے سب مایا ہے

اک نام تو باقی رہتا ہے، گر جان نہیں جب دیکھ لیا اس سوئے میں نقصان نہیں تب شمع پہ دینے جان پتنگا آیا ہے سب مایا ہے

معلوم ہیں سب تیس مہیاں کا قصہ بھی سب ایک سے ہیں، یہ راہنما بھی یہ انشا بھی فراڈ بھی جو اک تہر سی کھود کے لایا ہے سب مایا ہے

کیوں درد کے نامے لکھتے لکھتے رات کرو جسی سات سمندر یاد کی ناریک بات کرو اس نادر سے کوئی ایک نے دھوکا کھایا ہے سب مایا ہے

جس گوری پر ہم ایک غزل ہر شام کہیں تم جلتے ہو ہم کیونکہ اس کا نام لکھیں دل اس کی بھی جو کھٹ بجوم کے دلیں آیا ہے سب مایا ہے

وہ لڑکی بھی جو چاند نگر کی رانی تھی وہ جس کی الہڑانگوں میں حیرانی تھی آج اس نے بھی پیغام نہیں بھجوایا ہے سب مایا ہے

جو لوگ ابھی تک نام و فضا کا لیتے ہیں وہ جان کے دھوکے کھاتے، دھوکے دیتے ہیں ہاں شوگر بھاکر ہم نے حکم لگایا ہے سب مایا ہے

جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہر جانی ہے اس شہر سے خود اک گنہگار نے بنائی ہے افواہ اس کیلئے ملتے پرتکھوا یا ہے سب مایا ہے

سب مایا ہے

جن انیلا میر سے پسندیدہ شعراء میں سے ایک ہیں۔ ان کے کلام میں محسوس کیا جانے والا سوز و گمناہ ہے اور وہ اپنے جذبات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔

نہ ہوا فیصیب قرار جاں، ہوں قرار بھی اب نہیں تیرا انتظار بہت کیا، تیرا انتظار بھی اب نہیں

تجھے کیا خبر مر و سال نے میں کیسے زخم دیکھاں تری یادگار بھی اک غلطی، تری یادگار بھی اب نہیں

نہ لگے رہے نہ گماں رہے، نہ گزارشیں ہیں نہ گفتگو وہ نشاط و وعدہ وصل کیا، ہمیں اعتبار بھی اب نہیں

کسے نذر دین دل و جاں ہم کہ نہیں وہ ساکلی خم بہ خم کیسے ہر نفس کا حساب دیں کہ نسیم یا رہی اب نہیں

وہ بجوم دل زدگان کو تھا، تجھے خروہ ہو کہ بکھر گیا تیسرے استلنے کی خبر ہو، سرورہ عباد بھی اب نہیں

وہ جوابی جاں سے گزرتے انہیں کیا خبر ہے کہ نہیں کسی جاںش کا زکریا کوئی سوگوار بھی اب نہیں

ہیں اب تو بال جنوں میں بھی وہ جو شوق شہر میں عام تھا وہ جو رنگ تھا کبھی کو کج، سر کوٹے یا رہی اب نہیں

انسان جس سے محبت کرتا ہے، اس پر اپنا حق اور دمان کھتا ہے۔ لیکن اگر کبھی یہ دمان ٹوٹ جلتے تو اس کی کوشیاں لے کر زخمی کرتی رہتی ہیں۔

اعجاز اسلام العبد کی یہ نظم بھی اسی طرح کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں، بھیر میں زملمے کی ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں

دوست دار بچوں میں سلو میں سی رہتی ہیں اک ذرا سی رہش سے، شک کی زد دہشتی پر

پھول بدگمانی کے اس طرح سے کھلتے ہیں زندگی سے پیارے بھی، اجنبی سے لگتے ہیں، عزیز کے ملتے ہیں

عمر بھر کی چاہت کو آسرا نہیں ملتا، وصال بہ یقینی ہیں راستہ نہیں ملتا

خاموشی کے دھنوں میں بات ٹوٹ جاتی ہے اور سیرا نہیں ملتا

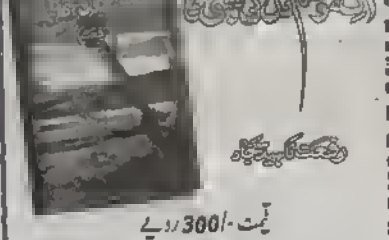
معذرت کے لفظوں کو روشنی نہیں ملتی، لذت پذیر لڑائی پھر کبھی نہیں ملتی

پھول رنگ و وعدہ کی مندریں مسکرتی ہیں، راہ مٹنے لگتی ہے

یہ رچی کے گارے سے لیے دلی کی مٹی سے فاصلہ کی اینٹوں سے اینٹ جڑنے لگی ہے خاک اڑنے لگی ہے

غائب ٹوٹ جاتے ہیں، دلیوں کے سائے سے عمر بھر کی محنت کو پی میں ٹوٹ جلتے ہیں

اک ذرا سی رہش سے، ساتھ چھوٹ جاتے ہیں بھیر میں زملمے کی، ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں



آیت 300/- روپے  
منقولہ کا پتہ:  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
فون نمبر: 32735021  
37، اردو بازار، کراچی

# Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan  
a Complete Set of 5 Painting  
Books in English



Art With You

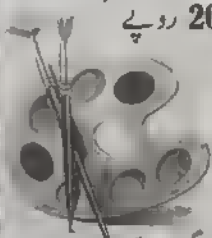
کی پانچوں کتابوں پر حیرت انگیز رعایت

Water Colour I & II  
Oil Colour  
Pastel Colour  
Pencil Colour

فی کتاب - 150/- روپے

نیا ایڈیشن بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ

200/- روپے



بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی فون: 32216361

بھڑاس بھی نکل جاتی ہوں اور بہت کچھ سنا بھی دیتی ہوں۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے سامنے والا چاہے جو بھی ہو اسے میری بات ذرا بڑی نہیں لگتی۔ پسندیدہ تحریریں کوئی ایک ہو تو مصحف، مرگ، برگ، جو چلے تو جاں سے گزر گئے، آئینوں کا شہر، پیر کاہل، ایمان امید اور محبت، رقص، جنوں، سفال، گر، مرگ و فدا اور بھی کئی ہیں، لکھنے بیٹھوں تو صفحے کم پڑ جائیں۔ پسندیدہ مصنفات میں عبیدہ احمد، فرحت، اشتیاق، نمرہ احمد بہت پسند ہیں اور نئی لکھنے والیوں میں ثانیاب جیلانی اور سائرہ رضا اول نمبر پر۔ سائرہ رضا کا انداز تحریر بہت پسند ہے۔ باریک سے باریک موضوع کو بھی اتنی عمدگی سے لکھتی ہیں کہ پڑھنے والا کئی ہفتے تحریر سے نکل ہی نہیں پاتا۔ اس کے علاوہ سمیرا حمید، شازیہ جمال، سدرہ سحر عمران، عنقہ محمد بیگ بھی خوب ہیں۔

4 - خوبیاں تو دوسرے ہی بات میں تو بہتر۔ خامیاں نہ پوچھو گی (کوئی ایک ہووے تے دساں) ہا ہا ہا۔ اجنبی لوگوں پر اعتبار کرتی ہوں، بات بھی کھا جاتی ہوں، غصہ بہت سے منہ پھٹ ہوں۔ روتی بہت ہوں۔ بنا سوچے سمجھے فتنے کرنے کی عادی ہوں۔ ہر وقت خوب سے خوب تر کی تنگ دود میں رہتی ہوں۔ بولتی بہت ہوں۔ جھوٹ تو اللہ معافی۔ تعریف آنکھوں کی بہت ہوتی ہے۔ اکثر کالج کی لڑکیاں میری ڈارک براؤن بڑی آنکھوں کی فین ہیں۔

5 - بارش کیا پوچھ لیا ہائے بارش میں نہاتے نہاتے نہتے نہیں اور لپوں پر رقصاں گیت "ساوان میں موہنی بن کے میں تو چمچ چمچ ناچوں" بارش کو اکیلے انجوائے کرنے کا اپنا مڑوے یا زیادہ سے زیادہ فریڈز کو ساوان اور بارش کے میسج کر لے بس کافی ہیں۔

6 - لطفے برے سے پسند نہیں۔ ہاں شہر پسند ہیں۔ کیا کیا سٹاکس جی۔ بہت سے اشعار پڑھ کر ڈائری میں محفوظ کر لیتی ہوں۔

# شعاع کے ساتھ

آداب

اقصی مریم ملغانی۔۔۔ کوئٹہ

1 - رواں سال کے کیلنڈر کو چار سال پیچھے کی جانب لے کر جاؤں تو چار سال بنتے ہیں۔ جی ہاں شعاع سے تعلق کو چار سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ تب میں نائنٹھ کلاس کی طالبہ تھی اور اب تھریڈ ایئر میں ہوں۔ شعاع کی سب سے اچھی بات جو مجھے لگتی ہے یہ وہ رسالہ ہے جو نہ صرف شہروں تک رسائی رکھتا ہے بلکہ اس کی پہنچ کچی بلی بستیوں، دسواؤں تک بھی ہے اور یہی اس کی شہرت کی اصل وجہ بھی ہے۔ دیہات کی کم پڑھی لکھی لڑکیاں بھی جب شعاع پڑھنے بیٹھتی ہیں تو اسے اپنی اولین درس گاہ سمجھتی ہیں۔ اس لیے کہ شعاع زندگی کے اونچے نیچے نیلوں سے گزرنے کا ہنر سکھاتا ہے۔

2 - صبح کا آغاز تو جناب امی صاحبہ کی ڈانٹ سے ہی ہوتا ہے۔ دن چڑھ گیا، سورج نکل آیا اور ابھی تک گھوڑے بچ کے سو رہی ہو تو جناب جب ہماری امی کا پارہ تھوڑا زیادہ اوپر کو چڑھنے لگتا ہے تو رضائی پھینک کر منہ پر ہاتھ رکھ کر جھانپاں روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناشتا عموماً "ای ہی تیار کر رہی ہیں اور میں پکانے ڈکارنے کا ہنر خوب جانتی ہوں۔ ہا ہا ہا۔ ساتھ ساتھ چھوٹے بھائی، بہنوں کے ہمراہ کسی مذاق ہلا گلا تو چلتا ہی ہے۔

پھر ناشتے کے برتن میں ہی دھوتی ہوں۔ فراغت کے بعد فٹ سے یونیفارم پہنا، جوتے پہنے، بیک لٹکائے صحن میں آکر ٹہلنے لگے اور دین والے کے بارن کا انتظار کرنے لگے جیسے ہی پول پول ہوئی میں بھاگتی امی کی دعا میں لیتی دین میں سوار ہو جاتی ہوں۔

پھر کیا ہوتا ہے۔ مینہ کا آغاز ہو تو پیاری سی کزن آسیہ قادر شعاع نکل کے بیٹھ جاتی ہے اور دین میں ہی ٹائٹل لکھنے سلسلوں اور کتابوں پر ممبر شروع۔ کالج پہنچ کر بھی جیسے ہی کوئی فری ہیرے ملا تو شعاع سے لطف اندوز ہونے لگے۔ میری عموماً "ساری کلاس فیلوز شعاع کی بات فیض ہیں۔

کالج سے واپسی پر کھانا کھایا اور پھر سے میٹھی نیند اونٹھ کے سو گئے۔ جیسے ہی شام ہوئی تو مملی جان جو قریب ہی رہتی ہیں آجاتی ہیں۔ کیونکہ انہیں میرے ہاتھ کی چائے بہت پسند ہے۔ چائے کے ساتھ پکڑوں یا سموسوں سے بھی بیٹ کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ شام کے سائے ڈھلنے لگتے ہیں تو مغرب کے فورا بعد ہی روٹی پکائی ہوں۔ اپنا عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد آتے ہیں تو امی کے ساتھ ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول اور میں اس دوران میں توبہ سے پہلے پہلے ڈرامہ دیکھ لیتی ہوں۔ جوں ہی گھڑی نے نو بجائے لی وی لاؤنج میں دسترخوان لگتا ہے اور ابا خبر بنتے ہیں ساتھ ہی ہم سب بھی نہ۔

کھانے کے فورا بعد میں کافی یا چائے لازمی پیتی ہوں۔ جھٹ پٹ چائے پانی، منگو اٹھائی اور اپنے کمرے میں۔ پھر شعاع ہوتا ہے، میں ہوتی ہوں اور کمائیوں کے ساتھ ہنسا کھیلا رونا دھونا۔ چلا رہتا ہے۔ نال مزے کی بات۔

3 - جی ہاں۔ بہت سے کرداروں میں اپنی جھٹک نظر آئی۔ عبیدہ احمد کے ٹائول "ایمان" امید اور محبت کی ایمان مجھ سے بہت ملتی ہے۔ بہت ہی حساس لڑکی ہوں، منہ پھٹ ہوں، مذاق مذاق میں اپنے دل کی



بندگن

## صبا فیصل ہرہ فیصلہ

شہناز رشید

صبا فیصل کا نام لیتے ہی ایک خوب صورت چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ جو بال بڑی بہن اور بھانجی کے دل بڑی مہارت سے ادا کرتی ہیں۔ صبا فیصل کافی وی سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ نوجوانی کے دور سے وہی وی سے وابستہ ہیں۔ پہلے بحیثیت نیوز کاسٹمر کے پھر بحیثیت اداکارہ کے۔

بندھن کے سلسلے میں اس بار ہمارا انتخاب یہی خوب صورت فنکارہ ہیں۔

”جی صبا فیصل! ایسی ہیں؟ آج کل اسکرین پر کچھ کم نظر آ رہی ہیں۔ وجہ؟“

”نہیں! ایسا تو نہیں ہے۔ مرآۃ العوس کو ہی دیکھ لیں۔ ختم ہونے کے دو تین ماہ بعد ہی دوبارہ دکھایا جا رہا ہے اور کچھ اور سیریز بھی آن اریہ ہیں۔ کبھی کبھی ایسا

ہوتا ہے کہ سارے تیار شدہ سیریز ایک ساتھ چلنا شروع ہو جاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم ہی ہیں اور جب گپ آجاتا ہے تو لگتا ہے کہ جیسے ہمارے پاس کام ہی نہیں ہے۔“

”مگر کل کہاں قیام ہے آپ کا؟ کراچی میں یا لاہور میں؟“

”یہ تو جلتا ہی رہتا ہے۔ کبھی کراچی تو کبھی لاہور۔ ویسے جب کوئی خاص موقع یا تہوار ہوتا ہے تو پھر لاہور میں ہی ہوتی ہوں۔ کیونکہ لاہور میں میری فیملی ہے۔“

”آپ کو یقیناً اسکول کالج کے زمانے سے غیر انصافی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شوق ہو گا۔ تب ہی آپ اس فیلڈ میں آئیں؟“

”جی بالکل! آپ نے ٹھیک جگہ کیا اور زمانہ طالب علمی سے ہی میری خواہش تھی کہ میں کوئی ایسا کام کروں کہ میرا نام ہو اور میں عام لوگوں میں پہچانی جاؤں تو بس مجھے ٹی وی ہی ایک ایسا ذریعہ لگتا تھا کہ جہاں میں اپنی صلاحیتیں دکھا سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے انٹرنس کر کے لیے آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گئی پھر دل چاہا کہ کچھ اور بھی کرنا چاہیے۔ نیوز ریڈر کے لیے آڈیشن دیا تو اس میں بھی کامیاب ہو گئی۔ تب میں نے انٹرنس کی جانب پھوڑی اور نیوز کاسٹمر بن گئی۔ پھر نیوز ریڈر ٹھیک کا شوق آیا تو نیوز ریڈر بن گئی اور اب اداکارہ ہوں۔“

”گنڈے شادی سے پہلے اس فیلڈ میں آئیں یا بعد میں؟“

”شادی سے بہت پہلے یوں سمجھیں کہ جب میٹرک میں تھی تو ٹی وی جوائن کر لیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ پڑھائی بھی کرتی تھی۔ ٹی وی میں کام کرتے کرتے ہی گریجویشن کیا میں نے۔“

”اور شادی کب ہوئی؟ اور آپ کی پسند کو کتنا عمل دخل ہے؟“

”انشاء اللہ تقریباً“ انیس سال ہو گئے ہیں اور میرے تین بچے ہیں۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ میرے میاں جن کا نام فیصل سلیم ہے۔ وہ چونکہ میرے ماموں کے بیٹے ہیں تو ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی بھی تھی۔ شاید والدین نے اس بات کو محسوس کیا یا پھر ہمارا جوڑنا ہوا تھا آسمانوں پر کہ دونوں گھروں کی رضا مندی سے ہمارا رشتہ ہو گیا۔“

”آج کل کا ماحول کافی آڑو ہے۔ آج کل تو خولہ رشتے واردوں میں ہو شادی یا برادری سے باہر۔ لڑکے لڑکی کا لٹنا اور پسند کرنا دل بوج بن گیا ہے۔ کیا آپ اس کے حق میں ہیں؟“

”میں ادرن میمن اور والدین کے فیصلوں کو کبھی غلط نہیں کہوں گی۔ کیونکہ کچھ بھی ہو، ان کے فیصلے ہمارے لیے ہر حال میں بہتر ہوتے ہیں۔ لیکن اب زمانہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ اب ماحول بدل گیا ہے۔ سوچ بدل گئی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ لڑکائی ضرور پہلے ایک دوسرے سے ملیں اور ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھیں۔ آج کے دور میں یہ بہت ضروری ہے۔“

”پہلے زمانے میں جوائنٹ فیملی سسٹم ہوا تھا تو سب کچھ ٹھیک رہتا تھا۔ مگر اب جوائنٹ فیملی کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔“

”یہ تو ہے۔ میں جب بیاہ کر آئی تھی تو جوائنٹ فیملی میں ہی آئی تھی اور تقریباً گیارہ سال جوائنٹ فیملی میں رہی اور بہت پیار محبت کے ساتھ ہمارا وقت گزرا۔ فیملی بھی زیادہ بڑی نہیں تھی والدین ایک بھائی اور دو ندیں تھیں۔ اب تو واقعی جوائنٹ فیملی کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔“

”شادی سے پہلے آپ اپنے کزن فیصل کو کتنا جانتی تھیں؟“

”شادی سے پہلے بھی فیصل کے ساتھ بہت دوستی اور بے تکلفی تھی۔ مگر بے تکلفی حدود میں رہ کر تھی۔ جس طرح کزنز میں دوستی ہوتی ہے اور شادی کے بعد تو ہم دوستوں کی طرح ہی رہے اور رہ رہے ہیں۔ ہم دونوں میں بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔“

”آپ کے میاں صاحب آپ کے کام میں کبھی رکاوٹ بنے؟“

”بالکل نہیں۔ کبھی نہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ شادی سے پہلے اپنے والدین کی رضامندی سے اس فیلڈ میں آئی اور شادی کے بعد اپنے شوہر کی رضامندی سے۔ شادی سے پہلے تو بہت کم وقت اس فیلڈ میں گزارا۔ زیادہ وقت تو میں نے شادی کے بعد گزارا ہے اور گزار رہی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر میرے میاں اجازت نہ دیتے تو میں نے کب کام کرنا تھا کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ اگر بیوی کو اپنے شوہر کی حمایت حاصل نہ ہو تو وہ کبھی بھی کچھ نہیں کر سکتی۔“



”شوہر نے تو اجازت دی۔ مگر جوائنٹ فیملی میں وہ کروڑ پھر سب کو دیکھنا پڑتا ہے سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے؟“

”جی بالکل ایسا ہے۔ مگر میری خوش قسمتی یہ تھی کہ مجھے بیاہ کر اپنے ماموں کے گھر ہی آنا تھا اور ہم سب میں آپس میں بہت سی بات چیت ہوتی تھی۔ لیکن ایک سیکے سے نکل کر دوسرے سیکے میں آگئی تھی تو مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور میرے سرسرا والے بہت ہی اچھے ہیں۔ انہوں نے مجھے روکا تو کاٹا نہیں۔ تب ہی تو گاڑی اچھی چل رہی ہے۔“

”شادی دھوم سے ہوئی تھی؟ آپ نے خود انجوائے کیا تھا؟“

”جی بالکل۔ بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی اور خود میں نے بھی بہت انجوائے کیا تھا۔ چونکہ ہم پنجابی ہیں تو آپ کو پتا ہی ہے کہ پنجابیوں میں کتنے مزے مزے کی ریسیں ہوتی ہیں تو میں نے بھی ساری مزے سے انجوائے کیں۔ کیونکہ میں کسی پرانے گھر تو جا نہیں رہی تھی۔ اپنے ماموں کے گھر ہی جاری تھی اس لیے کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔“

”بے شک آپ اپنے ماموں کے گھر جاری تھیں۔ لیکن آج کے زمانے کی شادی اور گزرے وقت کی شادیوں میں بہت فرق ہوتا تھا۔ آج لڑکی خود ناچ رہی ہوتی ہے۔ جبکہ پہلے ایسا نہیں تھا؟“

”پہلے بہت شرم و حیا ہوتی تھی۔ اب ایسا نہیں ہے۔ بے شک میں نے ریسیں انجوائے کی تھیں۔ مگر ایسا نہیں تھا کہ میں اتنی مگن ہو گئی تھی کہ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ دکن کون سی ہے۔ میں نے ساری ریسیں بیٹھ کر دیکھیں۔ مگر ناچ گانا نہیں کیا تھا۔“

”آپ نے کہا کہ ماموں کے گھر جاری تھی۔ اس لیے خوف ڈر نہیں تھا۔ مگر پھر بھی میکہ چھوڑتے وقت کیا احساسات تھے آپ کے؟“

”بھئی! آپ یقین کرو کہ میرے تو آنسو ہی نہیں قہقہہ رہے تھے۔ بہت زیادہ روئی تھی۔ کیونکہ میں گھر میں اپنے والدین اور بھائیوں کے بہت قریب تھی۔“

میرے لیے رخصتی کا وقت بہت مشکل وقت تھا۔ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔“

”صبا! آپ اب بھی بہت چارمگ ہیں تو نو جوانی میں تو بہت ہی خوب صورت ہوں گی۔ دکن بن کر کیسی لگ رہی تھیں؟“

”اپنے منہ سے تعریف ہو جائے گی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ میرا میک اپ بھی بہت خوب صورت کیا گیا تھا اور میرا ڈریس بھی بہت خوب صورت تھا۔ سچ! میں بہت حسین لگ رہی تھی۔“

”سرسرا کتنا بھی اچھا ہوا لڑکیوں کو اپنے میکہ کا ہر ماں ہوتا ہے۔ کچھ رعب ڈالا اپنے میکے کا اور کبھی ناراض ہو کر سیکے لگیں؟“

”ہاں! سرسرا میں میکے کا ماں تو ہوتا ہے لڑکی کو۔ سوچ لینا چاہیے کہ وہ جن گھر میں بیاہ کر جاتی ہے۔ اب وہی اس کا اصلی گھر ہے اور اسے اپنے گھر سے اپنے اخلاق سے سرسرا والوں کو اپنا بنانا ہے۔ میکے میں تو ہم سہماں ہوتی ہیں۔ جہاں ہم نے اٹھارہ یا تیس سال گزارنے ہوتے ہیں۔ مگر مجھے لڑکیوں کی یہ بات بری لگتی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر روٹھ کر میکے چلی جاتی ہیں۔“

”شادی کو کامیاب بنانے کے کیا گام ہیں؟“

”کمپوز مائز انڈر اسائنڈنگ بہت ضروری ہے۔ لڑائیاں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں تو کیا ہم گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں؟ سرسرا بھی ہمارا گھر ہے۔ اگر اونچ نیچ ہوتی ہے تو ہمیں وہاں رہ کر ہی سارے حالات کو بہتر کرنا چاہیے۔ کہ بات بات پر روٹھ کر سیکے جانا چاہیے۔“

”اچھا تو لڑائی تو آپ کی بھی ہوتی ہوگی۔ پہلی لڑائی یاد ہے؟“

”بے ساختہ بنتے ہوئے۔“ ”تیری پرانی بات آپ نے پوچھ لی۔ یہ پوچھیں کہ آخری لڑائی کب اور کس بات پر ہوئی تھی۔ جب بھی ہم دونوں میں لڑائی ہوتی ہے میں پہل میں ہی کرتی ہوں۔“

”غصے کے تیز ہیں فیصل کیا؟ اچھی اور بری عادتیں

وقت چیزوں کی ضرورت رہتی ہے۔ ایک گھریلو عورت تو چند جوڑوں اور جوتیوں میں گزارہ کر سکتی ہے۔ مگر ایک شوہر کی عورت ایسا نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں اگر خرچ کرتی ہوں تو بچت بھی ضرور کرتی ہوں۔“

”مطلب آپ فیلڈ میں ہیں تو ڈیرائنو چیزوں کو اہمیت دیتی ہیں؟“

”نہیں! ایسا کچھ نہیں ہے کہ مجھے ”ڈیرائنو“ چیزیں ہی چاہئیں۔ ڈیرائنو چیزیں بہت مہنگی ہوتی ہیں۔ مجھے اچھی چیز چاہیے ہوتی ہے۔ خواہ وہ چار سو کی ہو یا اس سے زیادہ۔ اور اگر کوئی میری چیز دیکھ کے کہتا ہے کہ یہ ڈریس اچھا لگ رہا ہے یا یہ جو نا اچھا لگ رہا ہے تو میں اس کی صحیح قیمت بتا دیتی ہوں۔ یہ نہیں کہتی کہ یہ بہت مہنگا ہے۔“

”شادی کے بعد کبھی مشکل وقت دیکھا؟“

”مشکل وقت دیکھا۔ مگر ایسا نہیں کہ خدا انخواستہ اس کی وجہ سے کوئی لڑائی جھگڑے ہوئے ہوں۔ جب شادی ہوئی تو فیصل جاب کرتے تھے۔ ان کی جدوجہد کا پیڑ پڑھا۔ وہ اپنی تنخواہ مجھے لاکر دیتے تھے اور میں بہت سنبھال کر ان کو رکھتی تھی اور بہت خیال سے خرچ کرتی تھی۔ پھر جب دوسری تنخواہ پر پہلی تنخواہ کی بچت دیکھتی تھی تو اچھی خاصی ہوتی ہوئی تھی۔ اگر عورت سلیقہ مند ہوتی ہے تو ہر حال میں گزارہ کر لیتی ہے۔ جب پیسہ کم تھا تو اسی حساب سے خرچ کرتی تھی اور اب پیسہ زیادہ ہے تو اسے اسی حساب سے خرچ کرتی ہوں۔ مگر بچت ہر حال میں کرتی ہوں۔“

”تخفے کے معاملے میں سربراہ دیتے ہیں یا خود شاپنگ کراتے ہیں اور پہلے سے بتا دیتے ہیں؟“

”فیصل نے جب مجھے کچھ دنا ہوتا ہے تو تحفہ خرید کر نہیں دیتے۔ بلکہ مجھے کیش دے دیتے ہیں کہ اپنی پسند سے خرید لو۔ اور جب ہم ایک ساتھ شاپنگ پہ جاتے ہیں تو پھر سارا خرچ یہ خود ہی کرتے ہیں۔“

”مہنگی شاپنگ کرتی ہیں یا بار گھنٹہ کرتی ہیں؟“

”بار گھنٹہ کرتی ہوں۔ مگر میں کبھی نہیں دکھا سکتی۔ کیونکہ میں اس فیلڈ میں ہوں اور مجھے ہر

”جی! فیصل غصے کے تیز ہیں۔ جبکہ میرا غصہ بہت کم ہے۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بری عادت تو غصے والی ہے اور اچھی عادت یہ ہے کہ بہت خیال رکھتے ہیں۔ بہت رومانٹک ہیں۔ بہت سی خوبیاں ہیں فیصل میں۔“

”آپ نے بتایا کہ آپ فیصل کو بہت حسین لگتی ہیں۔ گویا دل کھول کر تعریف کرتے ہیں؟“

”جی! دل کھول کر تعریف کرتے ہیں۔ لیکن مزے کی بات یہ کہ میں انہیں میک اپ میں حسین نہیں لگتی بلکہ ان کا دل چاہتا ہے کہ میں سادہ رہوں۔ بقول ان کے کہ میں انہیں گھر میں ایک گھریلو عورت کے طے میں زیادہ اچھی لگتی ہوں۔ ان کا کتنا تو یہ بھی ہے کہ تجھ پنہ کے لیے وی کافی ہے۔“

”اچھا یہ بتائیں کہ منہ دکھائی میں کیا ملتا تھا؟“

”منہ دکھائی میں اللہ کے نام کالا کٹ تھا۔ سونے کی موٹی سی پٹن میں اللہ لکھا تھا اور قرآن پڑھا ہوا تھا۔ بہت خوب صورت گفت تھا۔“

”بہنی مون کہاں منایا؟“

”دکنس نہیں۔ کراچی کی سڑکوں پر موٹر بائیک پہ گھومتے تھے اور وہی ہمارا اپنی مون تھا۔“

”آپ نے بتایا کہ آپ انہیں گھر کے چلے میں اچھی لگتی ہیں تو آپ کتنی گھریلو ہیں؟“

”بہت زیادہ گھریلو ہوں۔ اگر آپ کے کہنے کا مقصد ہے کہ مجھے گھرواری کتنی آتی ہے تو اللہ کا بڑا شکر ہے کہ ماہر ہوں گھرواری میں۔ سب کچھ پکا لیتی ہوں اور بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔ سلائی کرکھائی میں ماہر ہوں۔ جب بچے پچھوئے تھے تو ان کے کپڑے بھی خود ہی سلائی کرتی تھی۔ اور اپنے کپڑے بھی خود ہی سلائی کرتی تھی۔“

”مہنگی شاپنگ کرتی ہیں یا بار گھنٹہ کرتی ہیں؟“

”بار گھنٹہ کرتی ہوں۔ مگر میں کبھی نہیں دکھا سکتی۔ کیونکہ میں اس فیلڈ میں ہوں اور مجھے ہر

”مہنگی شاپنگ کرتی ہیں یا بار گھنٹہ کرتی ہیں؟“

”بار گھنٹہ کرتی ہوں۔ مگر میں کبھی نہیں دکھا سکتی۔ کیونکہ میں اس فیلڈ میں ہوں اور مجھے ہر

”مہنگی شاپنگ کرتی ہیں یا بار گھنٹہ کرتی ہیں؟“

”بار گھنٹہ کرتی ہوں۔ مگر میں کبھی نہیں دکھا سکتی۔ کیونکہ میں اس فیلڈ میں ہوں اور مجھے ہر

”مہنگی شاپنگ کرتی ہیں یا بار گھنٹہ کرتی ہیں؟“

”بار گھنٹہ کرتی ہوں۔ مگر میں کبھی نہیں دکھا سکتی۔ کیونکہ میں اس فیلڈ میں ہوں اور مجھے ہر

”مہنگی شاپنگ کرتی ہیں یا بار گھنٹہ کرتی ہیں؟“

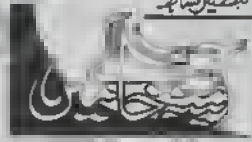
”بار گھنٹہ کرتی ہوں۔ مگر میں کبھی نہیں دکھا سکتی۔ کیونکہ میں اس فیلڈ میں ہوں اور مجھے ہر

”مہنگی شاپنگ کرتی ہیں یا بار گھنٹہ کرتی ہیں؟“

”بار گھنٹہ کرتی ہوں۔ مگر میں کبھی نہیں دکھا سکتی۔ کیونکہ میں اس فیلڈ میں ہوں اور مجھے ہر



بیکہ شہزادہ



## پہلی نظر

پہلی نظر کی محبت پر بہت کم لوگ یقین رکھتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے خیال میں پہلی نظر میں صرف پسندیدگی ہی ہوتی ہے۔ پھر محبت تو آہستہ آہستہ چند ملاقاتوں کے بعد ہی جنم لیتی ہے۔ مگر حجاب آپچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کے نزدیک پہلی نظری سب کچھ ہوتی ہے۔ وہ کسی پر پہلی نظر دیتے ہی اسے زندگی بھر کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر بیٹھتے ہیں۔

معروف ہندکو برسن اور ماڈل کرن خان اپنی ایک دوست کے ساتھ ریسٹورانٹ میں لپچ کرنے لگیں۔ ابھی انہیں وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ انہیں محسوس ہوا کہ کوئی انہیں گھور رہا ہے۔ انہوں نے ادھر

ادھر دیکھا تو کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کو مسلسل اپنی طرف متوجہ پایا۔ کرن کو برا لگا۔ کرن کی دوست کو ان صاحب کی نظرس کچھ میٹھی میٹھی سی محسوس ہوئیں۔ انہوں نے کرن کی توجہ اس طرف دلائی تو کرن نے انہیں جھاڑ دیا اور انہیں وہاں سے اٹھنے کو کہا۔ لپچ کے بعد دونوں کاشپنگ کار وکرام تھل۔ لہذا دونوں اٹھ کر ایک قریبی شاہنگ سینٹر چلی گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ صاحب بھی اٹھ کر ان کے پیچھے آگئے ہیں۔ کرن نے شاہنگ سینٹر پہنچ کر بار کنگ ایریا میں گاڑی پارک کی اور خود دوست کے ساتھ اندر چلی گئیں۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ شاہنگ کر کے لوٹیں تو

انہوں نے ان صاحب کو کرن کی گاڑی سے نیک لگائے کھڑا پایا۔ انہیں دیکھ کر کرن تو تھوڑی دیر پر ہی ٹھہر گئیں۔ تاہم ان کی دوست نے ان صاحب سے پوچھا کہ ”کیا بات ہے؟“

ان صاحب نے بتایا کہ ”مجھے آپ کی دوست پسند آئی ہیں۔ مجھے ان سے شادی کرنی ہے۔“

پھر انہوں نے کرن کی دوست کو اپنا رابطہ کارڈ دیا کہ وہ اس پر انہیں کرن کا جواب بتادیں۔ کرن کی دوست نے کارڈ لے لیا اور بعد میں کرن کے ”نہ نہ“ کرنے

کے باوجود علی ناصر کو فون کر کے کرن کی تفصیلات اور رابطہ نمبر دے دیا۔ علی صاحب نے کرن کو فون کرنے شروع کر دیے۔ مگر کرن پھر بھی نہ مانیں۔ علی صاحب نے اپنی والدہ کو کرن کا پروگرام دکھایا اور کہا کہ ”میں اسے آپ کی بہو بنانا چاہتا ہوں۔ مگر یہ نہیں مانتی۔ اب اسے منانا آپ کا کام ہے۔“

پھر جب علی صاحب کی والدہ نے کرن سے بات کی تو دونوں کی فوراً ”کی دوستی ہوگئی۔ کرن نے سوچا کہ یہ صاحب باقاعدہ فیملی والے ہیں۔ اس لیے ان سے رشتہ کیا جاسکتا ہے۔ یوں علی صاحب کی والدہ کی وجہ سے کرن نے ہاں کر دی۔ علی صاحب کو کرن کی ”ہاں“ پر اعتبار نہیں تھا یا شاید کچھ زیادہ ہی جلدی تھی کہ انہوں نے جھٹ نکال بھی کر ڈالا۔ کرن کو اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ نکاح کے لیے کوئی جوڑا خرید سکیں یا اپنی دوستوں ہی کو مدعو کر سکیں۔

(کرن جی: آپ کو ڈھیروں مبارک باد اور زندگی کا سفر خوش گوار رہنے کی دعائیں۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ آپ نے شوہر سے وابستہ ہونے کے باوجود فیصلہ کرتے وقت فیملی اور رشتوں کو اہمیت دی۔ ورنہ اب تو ہمارے معاشرے میں بد قسمتی سے فیملی اور رشتوں کو دیوار سے لگا دینے کا چلن عام ہو گیا ہے)

## کچھ ادھر ادھر سے

مشرف صاحب کے وکیل اور معتقد خاص احمد رضا

قصوری نے دلیل دی ہے کہ جنرل صاحب نے خود تو کسی کو قتل نہیں کیا۔ احمد رضا قصوری صاحب کو یہ دلیل اس وقت یاد نہ آئی۔ جب انہوں نے اپنے والد صاحب کے قتل کی ایف آئی آر میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو نامزد کر کے انہیں پھانسی کی سزا دلائی۔ اس وقت عدالت میں یہ کیوں نہیں کہا کہ بھٹو نے اپنے ہاتھ سے گولی نہیں چلائی۔

(المہر ہاشمی۔ بین السطور)

☆ دکھ کی بات ہے کہ جن بمادر پولیس افسران نے کراچی آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ انہیں پرویز مشرف کے دور میں چین چین کر قتل کیا گیا اور ریاست چپ چاپ ان کے قتل ہونے پر خوشیاں مناتی رہی۔ اس کے بعد کون ریاست کے ساتھ کھڑا ہو کر شہریوں کو بچانے کی کوشش کرتا۔

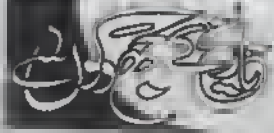
(روف کلاسرا۔ راز و نیاز)

☆ کراچی میں 19 ہزار اسلحہ سے بھرے کنٹینر غائب ہونے کا مسئلہ کئی سال پرانا ہے۔ اسلحہ کے کنٹینر سابق وزیر پورٹ اینڈ شپنگ کے دور میں آئے۔ اب یہی اسلحہ کراچی میں استعمال ہو رہا ہے اور شہر جل رہا ہے۔

(ڈی جی ریجنل منسٹر جنرل رضوان کلیدالت میں بیان)

☆ میڈیا کے سارے ارسلان اور سقراط یک زبان ہو کر کہے جا رہے ہیں کہ اگر شاہ رخ کو پھانسی ہو جاتی تو قاتلوں کے لیے عبرت کا سامان ہو جاتا۔ عبرت۔؟ کس کے لیے عبرت۔؟ ان کے لیے جو چیف جسٹس اور آرمی چیف کے ہوتے ہوئے شہر کے بچوں بچ لائیں گرا رہے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے عبرت جو تمام گواہوں اور شہوتوں کی موجودگی میں رہا ہو جاتے ہیں؟

(محمد فرنور عالم۔ حرف آزاد)



## حضرت زینب بنت علی رضی اللہ عنہا

تاریخ میں جب بھی شہداء کی یاد آتا ہے تو زینب بنت علی رضی اللہ عنہا کے حالات و واقعات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ زینب بنت علی رضی اللہ عنہا آنحضور کی نواسی، شہر خدا علی المرتضیٰ اور خاتون جنت فاطمہ الزہراء کی نور نظر اور شہید کریم الام حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی بہادر اور جرات مند بہن تھیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ عموں اور محمد کی والدہ بھی ہیں جو اپنے عظیم ماموں حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ میدانِ کربلا میں خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

حضرت زینب کی ولادت 4 ہجری میں ہوئی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت ان کی عمر 6 سال سے کچھ زائد تھی۔

حضرت زینب کی ولادت کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجاز کے لیے مدینہ سے باہر تشریف لے گئے تھے جب مدینہ منورہ پہنچے تو آپ نے اپنی نواسی کو گور میں اٹھایا۔ لعابِ مبارک اس کے منہ میں ڈالا اور مجبوراً کھلائی۔ پھر فرمایا۔

”یہ مجھے بہت پیاری لگ رہی ہے۔ یہ اپنی نانی خدیجہ سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بڑی بیٹی کے نام پر اپنی اس نواسی کا نام بھی زینب رکھا۔ 6 سال کی عمر میں حضرت زینب نے اپنے والدین کے علاوہ اپنے نانا جان سے اس قدر تربیت حاصل کر لی تھی کہ اپنی بے مثال ذہانت و فطانت کی وجہ سے وہ اسلام کے بنیادی عقائد و

ان سب کے بعد جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی تھیں اور جو میرے دل کا قرار تھا اب وہ بھی مجھ سے چھین جائے گا۔ اے کاش میں اس کے بدلے میں اپنی جان قربان کر دیتی اور اسے زندہ نہ پانچتا۔“

ان جذبات میں کوئی تصنع ہے نہ کسی قسم کی غیر فطری بات۔ یہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں اور ان میں کوئی مبالغہ بھی نہیں۔

## استقامت کے کوہِ گراں

اس موقع پر حضرت امام حسینؑ نے عریمت کا پہاڑ بن کر اپنی بہن کو نہایت بلخ انداز اور پر غم الفاظ میں صبر کی تلقین فرمائی۔ انہوں نے فرمایا۔

”اے میری بہن! صبر کو اپنی ڈھال بناؤ۔ اللہ سے لو لگاؤ۔ اللہ کے ذکر سے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کو بتا ہے باقی ساری کائنات کا مقدر فنا ہے۔ ساری کائنات سے اعلا و ارفع اور مقدس ہستی ہمارے نانا جان کی تھی۔ (وہ جس دنیا میں ہمیشہ نہیں رہے) ہمیں ان ہی کے اسمہ حسنہ کی پیروی کرنا ہے۔ اے میری پیاری بہن! میری بات سنو۔ میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میں راہ حق میں شہادت پا جاؤں تو گریبان نہ پھاڑنا نہ بین کرنا نہ چہرے اور بالوں کو نوچنا۔“

میدانِ کربلا کا معرکہ گرم ہوا تو سب سے پہلے حضرت زینبؑ کے نوحہ بیٹے عون اور محمد بن عبد اللہ یزیدی فوجوں کے مقابلے پر نکلے۔ وہ بڑی بہادری سے لڑے اور جامِ شہادت نوش کیا۔ ان کے دادا جعفر اور والد عبد اللہ بن جعفر بھی شیردل تھے اور وہ خود تو شیر خدا کے نواسے تھے۔

واقعات کی کڑا کا دل و زواقد جس طرح رونما ہو وہ ایک المناک تاریخ ہے۔ شہادتِ اہل بیت اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد صرف خواتین اور بچے ہی بچے تھے۔ ان کے خاندان اور قافلے کی خواتین کو قیدی بنایا گیا۔ پورے قافلے میں سے صرف آپ کے ایک نوحہ بیٹے علی بن حسین المعروف زین العابدین جو

شدید بیمار تھے، بچ پائے۔ کچھ بد بختوں نے زین العابدین پر ہتھیار اٹھانا چاہے، مگر حضرت زینب ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور فرمایا۔

”خدا کی قسم جب تک میں زندہ ہوں، میرے بیمار بھتیجے کو کوئی قتل نہیں کر سکتا۔“

حضرت زینبؑ نے عموں کے اس موقع پر اپنے نانا محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو خطاب کیا اور میدانِ جنگ کا دردناک نقشہ کھینچا، جہاں اہل بیت کے لاشے بکھرے پڑے تھے اور جہاں آپ کے محبوب نواسے کا بے سرحجمہ ہاتھ۔ بس پھر کیا تھا دشمن اپنی دشمنی کے باوجود بے ساختہ رونے لگے۔

## شیر خدا کی شیر دل بیٹی

یہ سارے مناظر دل و دماغ تھے۔ مگر اگلی منزل میں مشکل تر تھیں۔ قافلہ اہل بیت کو یزید کے دربار میں لے جانے کے لیے لے کر لے کر لے کر لے کر لے کر لے کر شروع ہوا تو یزیدی فوجوں کے حصار میں اسیرانِ اہل بیت کو پہلے کوفے کے ظالم گورنر عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں پیش کیا گیا۔ قافلے کا گزر کوفہ کے بازاروں میں سے ہوا تو کوفی بزدلوں کی تعداد میں اس منظر کو دیکھنے کے لیے گھروں سے نکل آئے۔ اس موقع پر حضرت زینبؑ سے کوفیوں کی عمد شکنی اور غداری پر خاموش نہ رہا گیا۔ انہوں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”اے دھوکے باز! بد عمدی کرنے والو! اللہ تمہیں کبھی سکون عطا نہ کرے۔ تم نے میرے بھائی کے ساتھ جو غداری کی اس نے ثابت کر دیا کہ تمہارے خمیر میں خیر نہیں۔ تم خوشامدی اور بزدل ہو۔ نواسے رسول کے قتل میں تم بالواسطہ شریک ہو۔ تم نے بیعت کر کے توڑ دی اور حمایت کا اعلان کر کے پیٹھ پھیر گئے۔ یاد رکھو تم اللہ کے قہر سے نہ بچ سکو گے۔“

و مشقِ پیچھے سے پہلے کوفہ کے گورنر عبید اللہ بن زیاد نے کوفہ میں دربار منعقد کیا اور اسیرانِ کربلا اس

ایمانیات پرست اچھی گفتگو کرتی تھیں اور اپنی گفتگو میں ہر موقع اشعار بھی پڑھتی تھیں۔ انہیں آنحضور کے ساتھ پانچ سال کی عمر میں حج کرنے کی سعادت بھی ملی۔ ان کی والدہ حضرت فاطمہؑ بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے چھ ماہ بعد انتقال فرما گئیں۔ یوں حضرت زینبؑ بہت چھوٹی تھیں۔ جب ماں کی مامتا سے محروم ہو گئیں۔ حضرت علیؑ نے اپنی بیٹی کی بہت اچھی تربیت کی۔ ان کی شادی آپ نے اپنے بھتیجے حضرت عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب سے کر دی۔ ان ہی سے ان کے بیٹے عون اور محمد پیدا ہوئے۔

## بہن کی بھائی کے ساتھ محبت

حضرت علیؑ کی شہادت کے موقع پر حضرت زینبؑ بہت غمزدہ ہوئیں اور انہوں نے اپنے محبوب والد کا مریحہ بھی کیا۔ حضرت زینبؑ کی زندگی اول و آخر عظمتوں کی داستان ہے مگر میدانِ کربلا اور اس کے بعد کی مشغلوں میں ان کا جو کردار سامنے آتا ہے اس کی بہت کم مثالیں انسانی تاریخ میں ملتی ہیں۔ میدانِ کربلا میں 9 محرم کو صورتِ حال ویسے کران کی زبان پر وردناک اشعار آئے۔ حضرت زینبؑ کے اشعار کا مجموعہ یوں تھا۔

”اے کاش میں یہ منظر دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہتی، جب میرا بھائی اور پورا خاندان ظالموں کے نرے میں آگئے ہیں۔ نانا ابو والدہ محترمہ بابا جان اور براور بزرگ حسن سب کی جدائی پر دل پھٹ گیا تھا۔ مگر



کے سامنے پیش کیے گئے۔

بد بخت عبید اللہ بن زیاد نے اس مصیبت زدہ اور غم سے چور خانوادہ رسول کے قافلے کو اذیت پہنچانے کے لیے ہمت بے ہودگی اور زیادہ گوئی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے جو الفاظ کہے وہ الفاظ تاریخ کے صفحات میں خود تاریخ کے لیے اذیت کا باعث ہیں۔

شیر خدا کی بیٹی اس دہشت گردی کے عالم میں بھی بے خوف کلمہ حق بلند کرتے ہوئے بولیں۔

”تعریف اور حمد و شکر ہے اس ہستی کے لیے جس نے اپنے محبوب رسول کے ذریعے ہمیں عزت بخشی۔ ان شاء اللہ فائق رسوا اور ذلیل ہوں گے اور ان کے نظریات لعنت زدہ قرار پائیں گے“ یہ گفتگو بری طویل تھی۔ عبید اللہ بن زیاد جب زنج بوجھا تو اس نے علی بن حسین (امام زین العابدین) کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اس لڑکے کو کیوں قتل نہیں کیا گیا؟ اسے میرے سامنے قتل کر دیا جائے۔“

حضرت زینبؓ اپنے جیتے جی سے لپٹ گئیں اور فرمایا۔ ”پہلے مجھے قتل کرو پھر اسے قتل کرنا۔“

### کوفہ سے شام روانگی

آخر ابن زیاد نے اپنا فیصلہ بدل لیا اور یہ قافلہ کوفہ سے شام کی طرف سرکاری دستوں کے محاصرے میں روانہ کر دیا گیا۔ کئی دنوں کی مسافت کے بعد یہ مظلوم یزید کے دربار میں پیش کیے گئے۔ نواسہ رسول کا مبارک سر جسے آنحضور پر اسے بوسہ دیا کرتے تھے نیزے کی آلی پر بویا ہوا تھا۔ یزید کے دربار میں ان مظلوموں کو پیش کیا گیا تو اس نے امام کا سر دیکھ کر کہا کہ میں نے اسے نیزے پر پروٹنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

یہاں بھی یزید کے ساتھ جو مکالمہ ہوا اس میں حضرت زینبؓ نے کمال حکمت و دانش اور جرات و بہادری کے ساتھ اس کے تمام اعتراضات و خرافات کا بھرپور جواب دیا۔ یزید کے دربار میں حضرت زینبؓ نے ایک مؤثر اور دردناک خطاب فرمایا۔ اس میں

انہوں نے یزید کو باور کرایا کہ اپنے زعم میں وہ سمجھ رہا ہے کہ اسے کاسیانی مل گئی اور اہل بیت سرنگوں ہو گئے، مگر حقیقت میں اہل بیت کا کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ یزید اور اس کے پورے ٹولے نے اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیا ہے۔

قل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کرہا کے بعد۔

### سفر جانب مدینہ

کچھ دن یزید نے ان لوگوں کو دمشق میں ٹھہرائے رکھا، پھر اس نے حکم دیا کہ ان خواتین کو سوار ہوں پر سوار کیا جائے اور مدینہ تک بحفاظت پہنچایا جائے۔ یزید نے صحابی رسول حضرت نعمان بن بشیر انصاری کو جو دمشق میں مقیم تھے ذمہ داری سونپی کہ وہ اپنی نگرانی میں قافلے کو مدینہ تک پہنچائیں۔ اونٹوں پر حمل رکھے گئے تھے۔ حضرت زینبؓ نے فرمایا کہ ”محملوں پر سیاہ چادریں ڈال دی جائیں اس لیے کہ محملوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں سوار تھیں اور سفر کیا تھا۔ ان کو یہ سفر بڑے میں کرنا تھا کہ ان پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ یہ خاتون جنت کی بیٹیاں

تھیں جنہوں نے فرمایا تھا کہ ان کے جنازے کے وقت چشم فلک بھی ان کے گھرن کو نہ دیکھ سکے۔ واقعات کرہا کی خبر مدینہ منورہ پہنچ چکی تھی۔

جب یہ قافلہ مدینہ کے قریب پہنچا تو مدینہ میں موجود صحابہ و تابعین اور اہل مدینہ بڑی تعداد میں ان کے استقبال کے لیے شہرے باہر نکلے مشہور صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری سب سے آگے آگے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ فرما رہے تھے کہ

”یہ قوم اپنے نبی کو روز قیامت کی مانند دکھائے گی۔“ اپنے غم خوار رشتے داروں اور نانا حضور کے جانثار صحابہ کو دیکھ کر۔ حضرت زینبؓ بھی رونے لگیں۔

حضرت جابر کو خطاب کر کے کہا۔

”اے میرے نانا کے صحابی! آپ نے جس بچے کو اپنے ہاتھوں سے اپنے آقا کے مبارک کندھوں پر چڑھی بار بٹھایا تھا اس کا جسد اطہر گوشتوں کے سموں سے بچلا گیا اس کا سر نیزے کی نوک کی زینت بن گیا۔“

اور اس کے ساتھ ہی حضرت زینبؓ ربے ہوشی طاری ہو گئی اور وہ گر گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب حضرت زینبؓ فرط غم سے غش کھا گئیں۔ انہیں اٹھا کر ان کے گھر لایا گیا۔ پورے مدینہ پر غم کی چادر تن گئی اور ہر گھر میں ربے چھوٹے مرد و خواتین سب ہی زار و قطار روئے۔ اسکے دن حضرت زینبؓ صبح نبوی میں تشریف لے گئیں۔ آنحضور کے روضہ مبارک پر حاضر ہوئیں اور صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کے بعد اس پورے منظر کو بیان کیا۔ جس سے آل رسول و چار ہوئی تھی۔ اس موقع پر بھی سب لوگ رونے لگے مگر حضرت زینبؓ نے آج اسی انداز میں لوگوں کو صبر کی تلقین کی جس انداز میں شب کرہا میں ان کے محبوب بھائی نے انہیں تلقین فرمائی تھی۔

### عظمت ہی عظمت

بنات اہل بیت کا ایک واقعہ بعض مورخین نے حضرت زینبؓ کی سیرت میں بیان کیا ہے۔ جو اہل بیت کی عظمتوں کو مزید واضح کرتا ہے۔ حضرت زینبؓ اور ان کی دوسری بہنوں نے صحابی رسول حضرت نعمان بن بشیر کو بلایا۔ ان کے حسن سلوک اور غم خواری کا شکریہ ادا کیا اور دوران سفر ان کی خدمت کے اعتراف کے طور پر اپنی چوڑیاں اتار کر پیش کر دیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ”اس وقت ہمارے پاس کچھ اور ہوتا تو وہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا۔“ حضرت نعمان بن بشیر نے بات سن کر زار و قطار رونے اور کہا۔

”اے بنات رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم میں تو آپ کی خدمت کو اپنے لیے توشہ آخرت سمجھتا ہوں۔ اگر میں نے دنیا کے لالچ میں یہ کام کیا ہو تو مجھے

قیامت کو کیا اجر ملے گا اللہ آپ کے غموں کا مداوا فرمائے۔ آپ اپنی چوڑیاں اپنے پاس رکھیں۔“

قافلہ کرہا اور حضرت زینبؓ کی یہ داستان خونچکاں طویل ہے۔ واقعات اتنے اندونماک ہیں کہ انسان کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ امت مسلمہ کا الیہ دیکھیے کہ خانوادہ رسول کے ساتھ یہ قلم ڈھالنے والے اسی رسول کا کلمہ پڑھتے تھے۔

(یہ شکر یہ معارف اسلامی لاہور)



### ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بہا ناول	آمنہ شاہ	500/-
درد و روم	ماحت جمیں	750/-
زعمی اک روشتی	رخسانہ زارعدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر جس	رخسانہ زارعدنان	200/-
شہول کے دروازے	شازبہ چمہری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازبہ چمہری	250/-
دل ایک شہر جوں	آمینہ مرزا	450/-
آنکھوں کا شہر	فاطمہ انصاری	500/-
بول بھلائی تیری کیاں	فاطمہ انصاری	600/-
چلاں دے رنگ کا لے	فاطمہ انصاری	250/-
یہ کیاں یہ چہ پارے	فاطمہ انصاری	300/-
صحن سے عورت	غزل العزیز	200/-
دل اسے ڈھونڈ لایا	آمینہ لاقی	350/-
بکھرتا چائیں خواب	آمینہ لاقی	200/-

نارنگی نکلوانے کے لیے کتاب ایک فریغ 30/- روپے  
مکتبہ نے دیا ہے  
مکتبہ و مہمان ڈائجسٹ 370 اردو بازار کراچی۔  
فون نمبر 32216361



## موم کے پیکوان خاکہ جیلانی

فالوہ

اجزا :

دودھ  
لال شربت  
رنگین سویاں  
جیلی  
پستے / بادام  
انٹاس کے ٹکڑے  
چینی  
ونلا آئس کریم

ایک کلو  
آوہا کپ  
ایک کپ  
آدھا پیکنٹ  
دو کھانے کے چمچے  
ایک کپ  
آوہا کپ  
حسب ضرورت

ترکیب :

دودھ کو پکا کر تین پاؤ کریں، پھر چینی ڈال کر ٹھنڈا کریں اور لال شربت مکس کر کے فریزر میں رکھ دیں۔ سویاں ابل لیں۔ بادام پستے کتر لیں۔ جیلی جاکر چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے کریں۔ گلاسوں میں پہلے سویاں اور۔ انٹاس کے ٹکڑے ڈالیں پھر ٹھنڈا دودھ، تین بڑے چمچے آئس کریم کے ڈالیں۔ آخر میں سب سے اوپر بادام پستے چھڑک کر ٹھنڈا ٹھنڈا پیش کریں۔

نوڈلز کباب

اجزا :

جاوڑ  
لسن ادرک پیسٹ  
چینی  
مکس خشک میوے  
پھول گو بھی  
پھلیاں  
گاجر  
آلو

ایک کلو  
دو کھانے کے چمچے  
دھاتی کپ  
چار کھانے کے چمچے  
ایک کپ  
ایک عدد  
ایک عدد  
دو عدد

اجزا :

اٹلے ہوئے نوڈلز  
گوشت  
انڈے  
آلو  
لیموں کارس  
سویا ساس  
ڈنل روٹی کا چورا  
لسن ادرک پیسٹ  
ہلدی / سرخ مرچ  
نمک  
تیل  
ترکیب :

گوشت میں لسن ادرک پیسٹ، ہلدی، مرچ اور نمک ڈال کر گلائیں۔ الگ کڑاہی میں تیل گرم کر کے گوشت اور اٹلے ہوئے آلو ڈال کر فرانی کریں ٹھنڈا کر کے میس کر لیں (پینا نہیں ہے) اب اس میں سویا ساس، پٹی ساس، اچینو موتو، لیموں کارس، پیسی کالی مرچ اور نوڈلز ڈال کر مکس کریں اور کسی بھی شیب میں کباب بنالیں۔ انڈوں میں ڈنو کر ڈنل روٹی کا چورا لگائیں اور تھوڑی دیر فرنیج میں رکھنے کے بعد گھرے تیل میں تلیں اور کھچھ کے ساتھ پیش کریں۔

نورتن پلاؤ

تیمہ  
کھیرے  
لسن پیسٹ  
پانز  
نماؤ کھچھ  
کئی سرخ مرچ  
پراٹھے  
گرم  
نمک  
تیل

ایک پاؤ  
دو عدد  
ایک چائے کا چمچ  
ایک عدد  
آوہا کپ  
ایک چائے کا چمچ  
چار عدد  
حسب ضرورت  
حسب ذائقہ  
حسب ذائقہ

پیانو چوب کر کے سنہری کریں پھر لسن پیسٹ اور تیمہ ڈال کر مکس کریں۔ گل جائے تو نمک، نماؤ کھچھ اور کئی مرچ ڈال کر بھون لیں۔ پراٹھے پر قیمہ کریم اور ایک کش کیا ہوا کھیرا رکھ کر رول کریں اور ٹوٹھ پک (تیل) لگا کر کنارے بند کر لیں۔ دوسرے کھیرے کے چھلکے سمیت لہائی میں کٹے سلائس اور چلی گارلک ساس کے ساتھ پیش کریں۔

اٹلے کارن  
فوڈلرز  
چھوٹی الائچی  
تیزبات  
نمک  
تیل  
آوہا کپ  
ایک ایک چٹکی  
چار عدد  
ایک بڑا پتا  
حسب ذائقہ  
حسب ضرورت

تیل گرم کر کے لونگ، الائچی، تیزبات، زہرہ اور لسن ادرک پیسٹ ڈال کر بھونیں، پھر چوکور کئی کاغذ، ابل ہوئی پھلیاں، پھول گو بھی، آلو اور بے بی کارن مکس کریں۔ اس کے بعد چینی اور نمک ڈال کر ابلنے دیں جاوڑ ڈال کر درمیانی آگ پر پکائیں۔ پانی خشک ہو جائے تو پٹکے ہاتھ سے مکس کر کے فوڈلرز (سرخ، سبز، زرد) الگ الگ چھڑک دیں۔ میوہ ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔ سلاؤ اور راتنے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

کو کبر پیف رول

دار چینی ملائیں۔ اسے چرے پر لگائیں۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ یہ چرے کے لیے بہترین ماسک ہے۔

☆ کچے کیلے کو لٹل کے صاف کپڑے پر رکھ کے پھیل لیں۔ پھر اس کی پوٹلی سی بنا کر اسے چرے پر اچھی طرح ملیں۔ دس منٹ بعد سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ یہ عمل چرے کے لیے سکیئرنگ کا کام کرے گا۔ باقاعدگی سے کرنے پر اس سے چرے کے داغ و جبے بھی دور ہو جاتے ہیں۔

☆ کچے ہوئے کیلے کا گودا چرے پر ملیں۔ تیس منٹ بعد سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ اس ماسک کو بھی باقاعدگی سے لگانے سے چرے کے داغ و جبے دور ہوتے ہیں اور رنگت نکھر جاتی ہے۔

☆ اگر آپ کے سر میں تیلی ہے تو سرسوں کے تیل میں کیلے کے تنے کا عرق کافی مقدار میں ایک اینڈ اور تھوڑی دای پھینٹ کر شامل کر لیں۔ اسے سر پر لگائیں۔ پھر کوئی کپڑا یا اسکا فیلے کر اسے سر باندھ لیں۔ ایک گھنٹے بعد عام طریقے سے سر دھولیں۔ کچھ ہی عرصے میں بالوں کی خشکی سے نجات مل جائے گی۔

☆ اگر بال گرتے ہوں تو آدھا پاؤدنی، ایک پاؤدودھ اور آدھا لیٹر کیلے کے تنے کا عرق لے کر انہیں اچھی طرح ملا لیں۔ پہلے اس سے سر دھوئیں اور آدھے گھنٹے بعد سادہ پانی سے سر دھولیں۔ یہ عمل ایک مہینے تک روزانہ کرنے سے بال گرتا بند ہو جاتے ہیں۔

☆ بالوں کو لمبا اور گھنا کرنے کے لیے کیلے کی جڑوں کا عرق ایک لیٹر، چند رکھنہ کا عرق ایک لیٹر، خشک آملہ ایک پاؤ، ہندی کے پتے آدھا پاؤ لیں۔ انہیں ایک برتن میں ڈالیں اور جوئے پر چڑھا دیں۔ آٹھ دو مہینے۔ جب عرق آدھا رہ جائے تو اس میں چار چھٹانک تلوں کا تیل بھی شامل کر دیں۔ جب تک پک کر سارا عرق جل جائے اور صرف تیل ہی باقی بچے تو اسے چھان کر کسی بوتل میں رکھ لیں۔ یہ تیل باقاعدگی سے استعمال کرنے سے بال لمبے اور گھنے ہو جاتے ہیں۔



ادھار

## ادھار

قدرت نے پھلوں اور سبزیوں میں کچھ ایسے قدرتی خواص رکھے ہیں جو بالوں اور چرے کی خوبصورتی اور دلکشی برصا نے میں بے حد معاون ہیں۔ کیلا صرف کھانے ہی میں خوش ذائقہ نہیں بلکہ حسن و دلکشی حاصل کرنے کا قدرتی ذریعہ بھی ہے۔ اس میں ایسے اجزاء شامل ہیں جو جلد کو نمی فراہم کرتے اور داغ و جبے دور کرتے ہیں۔ نیز یہ بالوں کے لیے بھی بے حد فائدہ مند ہے۔

☆ چرے کی رنگت نکھارنے کے لیے کیلے کے سبز پتوں کا عرق دس قطرے، لیموں کے رس کے دس قطرے اور عرق گلاب کے پانچ قطرے لے کر انہیں ملا لیں۔ اس مخلول کو رات سونے سے پہلے چرے پر لگائیں۔ صبح کسی اچھے صابن سے منہ دھولیں۔

☆ کیلے کے پتوں کا عرق اور گریپ فروٹ کا رس برابر مقدار میں لے کر اس میں تھوڑی سی پسلی ہوئی